ماہنامہ
کرن
فروری 2015
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
اس شمارے کے ساتھ
کرن کتابچہ
کچن گارڈننگ

چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

حمد	صدیق فتح پوری	11
نعت	ناصر کاظمی	11

انٹرویو

علی عباس سے ملاقات	شاہین رشید	12
آواز کی دنیا سے	عاطف مظہر	23
میری بھی سنیے	سیرین سہانی	18
مقابل ہے آئینہ	مقدس رباب	30

ناول

ایک ساگر ہے زندگی	نفیسہ سعید	32
ردائے وفا	فرحین اظفر	182

مکمل ناول

دریچہ محبت	شفق افتخار	144
محبت خواب سویرا	صدف ریحان	62

ناولٹ

سالا خالا اور اوپر والا	فاخرہ گل	200
جو دل چاہیے	نازیہ جمال	221
چلو سنگ ہمارے	عائشہ ناز علی	251
توبہ	ام طیفور	112

افسانے

بکھرے خواب	نور عین	51
کوئی ستارہ سنبھال رکھنا	عفت جیا	133
نیک نیتی	سیمابنت عاصم	245

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان [illegible] ---- 700 روپے

[illegible] ---- 5000 روپے

[illegible] ---- 8000 روپے

کرن کرن خوشبو	شعاع عمیر	272
یادوں کے دریچے سے	بشریٰ محمود	275
مجھے یہ شعر پسند ہے	شگفتہ سلیمان	277
مسکراتی کرنیں	ادارہ	278
کرن کا دسترخوان	خالدہ جیلانی	281
حسن و صحت	ادارہ	283
نہلے پہ دہلا	ذوالقرنین	285
نامے میرے نام	مدیرہ کرن	286

فروری 2015

جلد 37 شمارہ 11

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

[illegible] 37 [illegible]

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone. 32721777, 32726617. 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

فروری 2015ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
سال 2015ء کا ماہ اوّل گزر گیا مگر سانحہ پشاور کے شہدا کی بازگشت ہوتی رہی۔ ماہ فروری البتہ اس حوالے سے منفرد ہے کہ 5 فروری کو پوری قوم یوم یکجہتی کشمیر منائے گی۔ یہ دن آزادی کے اُن متوالوں کے نام ہے جو گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصے سے اپنی آزادی اور حق خود ارادیت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ بہت سے نوجوانوں نے گل لالہ کی طرح اس دھرتی کی پیشانی کو سرخ کیا اور کئی ملت کے سپوت بھارتی ظلم و جبر کے آگے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے ہوئے ہیں۔ پتا نہیں ظلم کی یہ سیاہ رات کب کٹے گی مگر ہم بحیثیت قوم ناامید نہیں ایک روشن سویرا اس رات کا سینہ چاک کرکے ضرور طلوع ہوگا۔ ضرورت صرف مسلسل جدوجہد اور اتفاق کی ہے۔ دُعا ہے کہ ماہ فروری بہار کے ساتھ ہمارے ملک میں سلامتی اور امن و آشتی کا پیغام لائے۔ آمین۔

سالگرہ نمبر

یوں تو کرن کا ہر شمارہ خاص شمارہ ہوتا ہے۔ اور ہم ہر شمارہ پوری محنت اور کوشش سے سجا سنوار کر پیش کرتے ہیں مگر مارچ کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ مصنفین اور قارئین سے گزارش ہے وہ اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں شامل اشاعت ہو سکیں۔

اس شمارے میں،

- اداکار علی عباس سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "سبرین ہسبانی" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"،
- "آواز کی دنیا سے" اس ماہ مہمان ہیں "عاطف مظہر"،
- اس ماہ "مقدس رباب" کے "مقابل ہے آئینہ"،
- "اک ساگر ہے زندگی" نفیسہ سعید کا سلسلے وار ناول،
- "ردائے وفا" فرحین اظفر کا سلسلے وار ناول،
- "دریچۂ محبت" شفق افتخار کے مکمل ناول کا دوسرا اور آخری حصہ،
- "محبت، خواب، سویرا" صدف ریحان گیلانی کا مکمل ناول،
- "توبہ" ام طیفور کا ناولٹ،
- "چلو سنگ ہمارے" عائشہ ناز علی کا ناولٹ،
- "جو دل چاہے" نازیہ جمال کا ناولٹ،
- "خالہ، سالا۔ اور ادھر پروالا" فائزہ گل کی دلچسپ مزاحیہ تحریر،
- نور مین، عفت جیا اور سیما بنت عاصم کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب "کچن گارڈننگ" علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

حمد باری تعالیٰ

رستے میں مسافر کو تری یاد اگر ہے
پُرلطف سفر ہے وہی پُرلطف سفر ہے

تیرے بنا بنتا نہیں ہے کام کسی کا
محتاج ترا دہر میں ہر فرد و بشر ہے

سوکھے ہوئے اشجار کو کرتا ہے ثمر ور
رحمت سے تری سبز ہر اک شاخِ شجر ہے

تیرے ہی کرم سے ہیں شب و روز منور
ہے شام اگر تیری تو تیری ہی سحر ہے

کوئی نہیں در ایسا جہاں ملتا سکوں ہو
عالم کے لیے جائے اماں تیرا ہی در ہے

بن مانگے عطا کرتا ہے وہ شان ہے تیری
کیا کس کو ضرورت ہے تجھے سب کی خبر ہے

پاتا ہے سکوں آکے ترے گھر میں ہر انساں
محفوظ ہر اک رنج و بلا سے ترا گھر ہے

صدیق فتح پوری

تزئینِ کائنات برنگِ دگر ہے آج
جشنِ ولادتِ شہِ جن و بشر ہے آج

صدیوں سے فرشِ راہ تھے جس کے لیے نجوم
آغوشِ آمنہ میں وہ رشکِ قمر ہے آج

صبحِ ازل کو جس نے دیا حسنِ لازوال
وہ موجِ نورِ زینتِ دیوار و در ہے آج

کس کے قدم سے چمکی ہے بطحا کی سرزمیں
ظلمت کدوں میں شورِ نویدِ سحر ہے آج

اے چشمِ شوق شوکتِ نظارہ دیکھنا
ماہِ فلک چراغِ سرِ رہ گزر ہے آج

شوقِ نظارہ نے وہ تراشا ہے آئینہ
جس آئینے میں جلوہ آئینہ گر ہے آج

ناصر درِ حضورؐ سے جو چاہو مانگ لو
وا خاص و عام کے لیے بابِ اثر ہے آج

ناصر کاظمی

علی عباس سے ملاقات

شاہین رشید

علی عباس کا انٹرویو کرنے سے پہلے مجھے قطعی یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ ایک نامور شخصیت کے فرزند ہیں کیونکہ فیلڈ میں میرا آنا جانا نہیں ہے ہاں ان سے ٹائم لیتے وقت مجھے اس بات پہ ضرور حیرانی ہوئی تھی کہ آج کے دور کا یہ نوجوان اور اتنی شائستہ گفتگو اور لہجے میں احترام۔۔۔ بڑا اچھا لگا در حقیقت ہمارے سینئر آرٹسٹ بہت اچھے ہیں۔ برسوں سے کام کر رہے۔ شہرت کی بلندیوں پر ہیں۔ مگر اس کے باوجود لہجے میں انکساری قائم ہے اور صحافیوں سے تعاون کا ہنر بھی پہلے جیسا ہی ہے۔ تو جب سینئر فنکار خود اچھے ہوں تو اولاد کیوں نہیں اچھی ہوگی۔۔۔ تو جناب علی عباس معروف فنکار وسیم عباس کے بیٹے اور عنایت حسین بھٹی کے پوتے ہیں۔

★ "کیسے ہیں علی عباس؟"

✲ "جی اللہ کا شکر ہے۔"

★ "کیا مصروفیات ہیں آج کل؟ آن ایر کیا ہے اور انڈر پروڈکشن کیا ہیں؟"

✲ "آن ایر تو "سسرال میرا" اور "لاڈو میں پلی" ہے اور مصروفیات میں ایک سیریل موبل پروڈکشن کا کر رہا ہوں "ننھا" اس کا نام ہے ایک اور سیریل انجلین ملک ڈائریکٹ کر رہی ہیں اس کا نام "کورٹ روم" ہے اس میں میرا لائر کا کردار ہے اور ڈرامہ بھی لائرز پہ ہی Rase کرتا ہے اس طرح اے اینڈ بی پروڈکشن کے لیے بھی ایک سیریل انڈر پروڈکشن ہے "کوئی میکے کو دے دو سندیس" یہ جیو کے لیے ہوگا۔ ایک سیریل اے آر وائی ڈیجیٹل کے لیے بھی زیر تکمیل ہے۔"

★ "ماشاء اللہ کافی کام کر رہے ہیں آپ۔ اور "سسرال میرا" آپ کا آن ایئر ہے۔ اس سوپ میں آپ کو بڑا نرم دل، رحم دل اور محبت کرنے والا انسان دکھایا گیا ہے۔ اصل میں کیسے ہیں؟"

✲ "نرم دل نرم لہجے والا تو ہوں۔ مگر اصل زندگی میں تھوڑا سا غصے والا بھی ہوں۔ لیکن جہاں تک خواتین اور لڑکیوں کا سوال ہے تو میں ہمیشہ سے ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔۔۔ تو میرے کردار میں غصہ ہے مگر مجھ میں غصہ نہیں ہے۔"

★ "ہمارے ڈرامے کیا ہماری حقیقی زندگی سے میچ کرتے ہیں؟"

✲ "جی ہاں کرتے ہیں اور کافی حد تک کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہمیں ڈرامے میں ناظرین کو کچھ سمجھانا ہوتا ہے تو چویشن کو تھوڑا سا بڑھا دیا جاتا ہے۔ اصل زندگی میں خواتین کے ساتھ بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جو

ہم اور آپ تک پہنچ ہی نہیں پاتا تو ڈراما اصل زندگی کی ہی کہانی ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے کی ہی کہانیاں ہوتی ہیں۔"

★ "چلیں جی آپ اپنے بارے میں کچھ بتایئے۔ پھر دیگر سوال بھی کریں گے؟"

✱ "جی میرا نام جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے علی عباس ہے اور پیار سے مجھے سب "بنٹی" کہتے ہیں اور گیارہ فروری 1986ء لاہور میں میرا جنم ہوا اور ہائیٹ 5 فٹ 10 انچ ہے۔ میں گھر میں بڑا ہوں' پھر میری دو بہنیں ہیں اور ان کے بعد ایک چھوٹا بھائی ہے۔"

★ "دیگر بھائی بہنیں بھی اس فیلڈ میں ہیں؟ اور تعلیم کتنی ہے؟"

✱ "نہیں جی... بس ایک میں ہوں اس فیلڈ میں جو آ گیا۔ اور میں نے ایل ایل بی کیا ہے اور وکالت میں نے کرنے کی کوشش کی مگر ہوئی نہیں کیونکہ اس پروفیشن میں جھوٹ بہت بولنا پڑتا ہے اور مجھے جو غصہ آتا ہے وہ جھوٹ پر ہی آتا ہے۔ اس لیے میں اس فیلڈ میں نہیں چل سکتا تھا۔ پھر میں نے سی ایس ایس کے پیپر دیے اور clear بھی کر لیے مگر میں انٹرویو کے لیے نہیں گیا۔ کیونکہ مجھے اس فیلڈ میں آنا تھا اس کے بعد این سی اے جوائن کیا اور فلم اینڈ ٹیلی ویژن کی ڈگری حاصل کی۔"

★ "آپ نے کہا کہ وکالت اس لیے نہیں کی کہ جھوٹ بولنا پڑتا ہے تو اس کا اندازہ تو آپ کو پڑھائی کے پہلے دوسرے سال ہی ہو گیا ہو گا' پھر اس میں ڈگری کیوں لی؟"

✱ "یہ ڈگری میں نے صرف اپنے ابا کی خواہش پر لی ہے۔ دنیا میں واحد میرے ابا ہیں جن کی بات میں ٹال نہیں سکتا۔ اور میرے ابا کا یہ کہنا تھا کہ اگر میں اس فیلڈ میں آنا بھی چاہتا ہوں تو پہلے اپنی پڑھائی مکمل کروں۔ ان کی خواہش تھی کہ ایل ایل بی بھی کروں اور سی ایس ایس بھی کروں۔"

★ "پڑھاکو تھے؟"

✱ "بہت پڑھاکو تو نہیں تھا مگر ان طالب علموں میں سے ضرور تھا جو سارا سال تو عیاشی کرتے تھے اور آخری دس پندرہ دن میں پڑھ کر پاس ہو جاتے تھے۔"

★ "گڈ... اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں والدین کے بارے میں؟ کہاں سے تعلق ہے آپ کا؟"

✱ "جی میرا تعلق تو لاہور سے ہے اور ابا میرے فلم'

تھیٹر اور ٹی وی کے ایکٹر ہیں سب انہیں "وسیم عباس" کے نام سے جانتے ہیں اور والدہ میری ہاؤس وائف ہیں۔"

★ "پھر آپ کو تو اس فیلڈ میں آنے میں مشکل نہیں ہوئی ہوگی؟"

✱ "نہیں جی۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے تو بہت مشکل ہوئی اس فیلڈ میں آنے کے لیے۔ میرے ابا تو چاہتے ہی نہیں تھے کہ میں شوبز میں آؤں۔"

★ "کیوں؟۔ خود تو انہوں نے پیسہ بھی کمایا اور نام بھی؟"

✱ "بات یہ ہے کہ اب تو یہ ایک انڈسٹری بن گئی ہے جبکہ جس زمانے میں انہوں نے کام کیا اور نام کمایا اس زمانے میں شوبز انڈسٹری نہیں تھی۔ لیکن الحمد وللہ انہوں نے اپنی محنت سے نام کمایا وہ بڑے اسٹارز تھے اور ہیں اور انشاللہ رہیں گے۔ اللہ انہیں لمبی زندگی عطا کرے۔ وہ منع اس لیے کرتے تھے کہ اس فیلڈ میں غیر یقینی صورت حال بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی ایک دن میں اگر آپ بادشاہ ہیں تو دوسرے دن فقیر۔ تو وہ اس بات سے ہمیشہ گھبراتے تھے۔ اور اس لیے انہوں نے میری پڑھائی پہ بہت زیادہ توجہ دی اور جب میں نے اس فیلڈ کو جوائن کیا تو ہم دونوں کے درمیان یہ بات تہ پائی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے معاملات میں نہیں بولیں گے پروفیشنلی اور ہمیشہ بہترین دوست کی طرح رہیں گے اور اس لیے انہوں نے کبھی کہیں میرا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی مجھے ریفرنس دینے کے لیے کہا۔ میں جو کچھ بھی آج ہوں۔ جو بھی میری تھوڑی بہت پہچان ہے وہ میری اپنی وجہ سے ہے' میں خود سے نکلا' خود سے کام ڈھونڈا خود ہی جا جا کے آڈیشن دیے لوگوں کو اسسٹ کیا اور پھر اس کام میں آیا۔"

★ "تو گویا آپ چاہیں گے کہ آپ کی اپنی پہچان ہو۔ لوگ یہ نہیں کہیں کہ یہ وسیم بھائی کے بیٹے ہیں بلکہ یہ کہیں کہ وسیم عباس ان کے والد ہیں؟"

✱ "مجھے بہت فخر ہوتا ہے جب میں اپنے والد کے نام سے پہچانا جاتا ہوں لیکن میں یہ بھی چاہوں گا کہ میری اپنی ایک پہچان ہو۔ اب جیسے کہ آپ کو بھی نہیں معلوم تھا کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔ آپ نے میرا کام دیکھ کر مجھ سے رابطہ کیا تو اس لیے میں اپنی پہچان بنانے کی کوشش کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میرے ابا کو بھی یہ بات پسند آئے گی کہ ان کا بیٹا اپنے کام سے پہچانا جائے۔"

★ "پہلا پروگرام یا ڈرامہ کونسا تھا اور شہرت کس ڈرامے نے دی آپ کو؟"

✱ "جب میں طالب علم تھا تو ایک شو ہوتا اس میں ایک پروگرام ہوتا تھا گیارہ نمبر اس پروگرام میں لوگوں سے کافی بدتمیزی کرنی ہوتی تھی۔ وہ میں نے کیا اور پھر بہ حیثیت اداکار کے جو بہتر کام مجھ سے ہوئے ان میں 'سسرال میرا' ہے اور "لاڈوں میں پلی" ہے اور ان دونوں سیریلز کی بدولت مجھے پہچان ملی اور لوگ آٹو گراف بھی لیتے ہیں اور تصویر بھی کھنچواتے ہیں۔"

★ "آپ نے شاید اسسٹنٹ ڈائریکٹر کا بھی تو کام کیا تھا؟"

✱ "جی میں نے معروف فنکار فیصل رحمٰن کے ساتھ بہ حیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے کام کیا تھا اور مجھے اس کام کے 5000 ہزار ملے تھے۔ دو دن کام کیا تھا اور دو دن کے اس معاوضے کو میں نے یوں خرچ کیا کہ دو ہزار اپنی والدہ کو دیئے اور تین ہزار کے اپنے لیے جوتے خریدے تھے۔"

★ "بہت شوق سے اور اپنی ڈگریوں کو ایک طرف رکھ کر آپ اس فیلڈ میں آئے ہیں۔ سب اچھا اچھا نظر آ رہا ہے یا کچھ برا بھی نظر آ رہا ہے؟"

✱ "برائی تو معاشرے میں ہر جگہ ہے شوبز میں بھی ہے اور مجھے جو سب سے بڑی برائی نظر آتی ہے وہ یہ کہ اس فیلڈ کو لوگوں نے قبول نہیں کیا ہے لوگ اداکاروں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان سے ملنا بھی چاہتے ہیں لیکن جہاں وہ اپنی بحث ہار رہے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ آپ تو اداکار ہیں مجھے بچپن میں اس بات پر بہت غصہ آتا تھا جب لوگ کہتے تھے کہ چونکہ

تم ایک اداکار کے بیٹے ہو اس لیے اداکاری ہی کر رہے ہو گے۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ تو جہاں کوئی ہارنے لگتا ہے تو وہاں یہ وہ شوبز کو بری جگہ سمجھ کر اپنے آپ کو Superior سمجھنے لگتا ہے۔۔۔ اور مجھے ہمیشہ سے ہی اس بات پر غصہ آتا ہے۔ اس لیے جب میں پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ کام کرتا ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے کہ میں پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔"

★ "اب تو یہ انڈسٹری بن گیا ہے میڈیا تو ظاہر ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں۔۔۔ یہ بتائیں گھر کے بڑے ہیں تو گھر کو رونق بخشی؟"

✱ قہقہہ۔۔۔ "جی میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں اور میری شادی ماشاء اللہ سے دو سال پہلے ہو گئی ہے اور میرے ابا کو جلدی تھی کیونکہ انہیں "دادا" بننا تھا سو ان کی اس خواہش کو بھی پورا کر دیا اور ماشاء اللہ سے میری ایک بیٹی ہے جس کا نام "پریسہ" ہے Parisa اور الحمدوللہ وہ ایک سال کی ہے اور میری شادی میرے والدین کی پسند سے ہوئی ہے۔"

★ "اچھا ویری گڈ۔۔۔ پھر تو گھر والوں سے تعلقات بہت اچھے ہوں گے؟"

✱ "الحمدوللہ بہت اچھے تعلقات ہیں مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں اختلافات کی گنجائش نکل ہی آتی ہے۔ میری فیملی لاہور میں ہوتی ہے اور میں کراچی میں۔ تو فیملی کو مس کرتا ہوں۔ خاص طور پر اپنی بیٹی کو بہت مس کرتا ہوں۔"

★ "کوئی شکایت گھر والوں سے؟ یا کوئی بات جو بری لگتی ہو؟"

✱ "میں اپنے گھر والوں سے بہت مختلف ہوں۔ اس لیے گھر والوں کی بہت سی باتیں مجھے بری لگتی ہیں۔ میں بہت صاف گو بندہ ہوں اور کسی کو بھی صاف گوئی پسند نہیں ہوتی۔ تو گھر والوں کو میری باتیں بری لگتی ہیں اور مجھے گھر والوں کی باتیں بری لگتی ہیں۔"

★ "وکالت آپ نے پڑھی اور بقول آپ کے کہ اس پیشے میں جھوٹ بہت ہے اور کیا بات آپ نے محسوس کی؟"

✱ "میں نے بہت ساری باتیں نوٹ کی ہیں۔ جھوٹ کے بارے میں تو آپ کو بتایا ہے۔۔۔ پھر یہ کہ قانون کی پڑھائی کرنے کے بعد جب میں پریکٹس کرنے نکلا تو میں نے دیکھا کہ ہمارے یہاں کوئی قانون فالو نہیں ہوتا۔ ہر بندہ اپنا ہی قانون لے کر چل رہا ہے اور اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے کی جو پستی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اگر قانون نافذ ہے تو صرف کتابوں میں اصل زندگی میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

★ "حسد کرتے ہیں یا رشک؟"

✱ "رشک تو ضرور کرتا ہوں مگر اللہ کا شکر ہے کہ حسد نہیں کرتا اور اللہ نے مجھ میں یہ بہت بڑی خوبی ڈالی ہے کہ مجھے کسی کو دیکھ کر کسی بھی قسم کی کوئی جلسی نہیں ہوتی' میرے پاس جو گاڑی ہے' جو فون ہے' جو کمرہ ہے' جو گھر ہے اس کے لیے میں اپنے رب کا بہت شکر ادا کرتا ہوں۔"

★ "سب کو کام کے سلسلے میں تعریف ہی پسند ہوتی ہے۔ آپ کو بھی پسند ہوگی۔ کبھی تنقید کا سامنا بھی ہوا؟"

✱ "بالکل نہیں ہوا اور آپ یقین نہیں کریں گی کہ تنقید مجھے تعریف سے زیادہ پسند ہے۔۔۔ مگر کوئی کرتا ہی نہیں۔ شاید سب کو میرا کام زیادہ پسند آتا ہے۔۔۔ اور یہ میرے رب کی مجھ پر بہت بڑی عنایت ہے۔"

★ "بجٹ بنا کر خرچ کرتے ہیں؟"

✱ "نہیں جی۔۔۔ کوئی بجٹ نہیں کوئی پلاننگ نہیں۔ میرے پاس جتنے پیسے آتے ہیں وہ سب کے سب خرچ کر دیتا ہوں' میں اپنی مرضی سے کھانا کھاتا ہوں۔ اپنی مرضی سے گھومتا پھرتا ہوں اور یہ بھی سوچتا ہوں کہ پیسے جمع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اس لیے جو آ رہا ہے اس کو خرچ کر کے اس پل کو انجوائے کیا جائے۔۔۔ بچت کا کام میری بیوی کرتی ہے اور وہ ہی "کل" کے بارے میں سوچتی ہے۔"

★ "کراچی میں وقت گزارا؟"

* "جی میں نے بہت برا وقت بھی گزارا ہے کیونکہ ہماری فیلڈ میں Acceptance نہیں ہے اور میں اپنے ابا کی سوچ کے بغیر آیا۔ مجھے بہت فرسٹریشن رہی میں نے اپنے کام کا پہلا سال بہت برا گزارا اور بہت دعائیں مانگیں 'بہت محنت کی اور وہ میری زندگی کا شاید بہت برا وقت تھا 'مگر شاید اچھا بھی ہو 'کیونکہ اسی پریڈ میں میں نے بہت محنت بھی کی۔"

★ "ڈرامے کا کوئی کردار جو یادگار بن گیا ہو؟"

* "ابھی کچھ ہی عرصے کی بات ہے۔ سیریل "انتہا" میں میرا کردار ایک سرپھرے لڑکے کا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ نفسیاتی ہو جاتا ہے اور جب پہلی شوٹ کی عدنان والی قریشی کے ساتھ تو میری ان سے کچھ زیادہ ہیلو ہائے نہیں تھی۔ تو جب شوٹ ہو گئی تو سب نے بہت تعریف کی اور عدنان نے مجھ سے بہت سیریس سوال پوچھا کہ جو شاید مجھے ساری زندگی یاد رہے گا کہ "کیا تم نے پہلے بھی کوئی نفسیاتی کردار کیا ہے" اور یہ سوال انہوں نے مجھے ایک کونے میں لے جا کر کہا۔ میں نے کہا نہیں۔ تو کہنے لگے "تم نے بہت اچھا پرفارم کیا ہے۔"

★ "ڈراموں میں کام کرنے والے خود اپنا ڈرامہ نہیں دیکھ پاتے 'آپ دیکھتے ہیں؟"

* "اپنے ڈرامے بھی دیکھتا ہوں۔ دوسروں کے بھی دیکھتا ہوں 'کیونکہ یہ میرا پروفیشن ہے میری study ہے 'مجھے سیکھنا ہے اور فلمیں بھی میں بہت زیادہ دیکھتا ہوں اور بہت دل چاہتا ہے کام کرنے کا اور ان شاء اللہ ضرور کروں گا۔"

★ "کردار کونسا کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی خواہش کوئی آرزو؟"

* "میں سمپل ہیرو نہیں بننا چاہتا۔۔۔ میں بہت پاور فل رول کرنا چاہتا ہوں 'ایسے کردار جس میں ایکٹنگ کا مارجن ہو اور "انتہا" کے اندر جو کردار کر رہا ہوں ویسے کردار بھی کرنا چاہتا تھا اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ایک اچھا کردار کرنے کو ملا۔۔۔ اب دعا ہے کہ ناظرین کو بھی میرا کام پسند آئے۔"

★ "کسی کردار کو کر کے پچھتاوا ہوا؟"

* "جی بالکل ہوا میں اس ڈرامے کا نام نہیں لے سکتا کیونکہ بری بات ہو جائے گی اس میں بہت ہی سمپل کردار ہیں۔ اسے کر کے پچھتا رہا ہوں۔ بس وہ ایک ہیرو ہے۔"

★ "آپ ہر ڈرامے میں ایک عدد چھوٹی داڑھی کے ساتھ ہوتے ہیں کیا اسے مستقل رکھیں گے؟"

* "فی الحال تو مستقل ہے کیونکہ اگر اسے میں نے صاف کر دیا تو میں بہت ہی کم عمر "پو" لگوں گا۔۔۔ اس لیے فی الحال یہ چلے گی۔" قہقہہ۔

★ "اپنے مستقبل کے لیے کیا سوچتے ہیں۔ کیا پلاننگ کی ہے آپ نے؟"

* "مجھے بہت محنت کرنی ہے بہت بڑا نام بنانا ہے اپنا۔ اپنے دادا اور ابا کی طرح اپنا نام بنانا ہے اور اپنے ماں باپ کی خدمت کرنی ہے اور اپنی بیٹی کی بہت ہی اچھی تعلیم و تربیت کرنی ہے اور ڈائریکشن میں بھی آنے کا ارادہ ہے جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا۔ لیکن ابھی نہیں بلکہ سال دو سال بعد۔"

★ "مارننگ شو میں نظر نہیں آتے۔۔۔ پسند نہیں ہے کیا؟"

* "اتفاق ہے کہ نہیں جا سکا۔ لیکن ویسے مجھے مارننگ شو اچھے بھی نہیں لگتے۔۔۔ میرا تو خیال ہے کہ انہیں بند ہو جانا چاہیے۔"

★ "کھانے پینے میں دیسی کھانے پسند ہیں یا بدیسی؟"

* "دیسی کھانے بہت پسند ہیں اور ہاتھ سے کھانا کھانا اچھا لگتا ہے۔"

★ "شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟"

* "جب آپ کسی سے چھپنا چاہتے ہیں۔ ورنہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ پیار ہی کرتے ہیں ہم سے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے علی عباس سے اجازت چاہی۔ اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

میری بھی سنیے

سبرین ہسبانی

شاہین رشید

1 "میرا نام؟"
"سبرین ہسبانی۔"

2 "پسندیدہ نام؟"
"یہی جو والدین نے رکھا۔"

3 "پیار کا نام؟"
"صبا۔"

4 "وہ دن جب دنیا میں آئی؟"
"دن تو مجھے نہیں پتا۔ البتہ 10 ستمبر کو اس دنیا میں آئی۔"

5 "اپنی ایک عادت جو پسند نہیں؟"
"ہر کام سے جلدی گھبرا جاتی ہوں۔ کوئی کام مسلسل نہیں کر پاتی۔"

6 "مجھ میں کمی ہے؟"
"قوت فیصلہ کی۔ اپنے اوپر اعتماد نہیں لگتا ہے کہ اگر خود سے کوئی فیصلہ کروں گی تو غلط ہو جائے گا۔"

7 "مجھے ہنسی آتی ہے؟"
"جب گھر میں کوئی لڑائی جھگڑا ہو اور میں خاموش رہوں تو گھر والے کہتے ہیں کہ یہ تو دیوار ہے اس کے سامنے تو کوئی بات کرنا یا شیئر کرنا فضول ہے... سچ بتاؤں مجھے بہت گھبراہٹ ہوتی ہے ان باتوں سے۔"

8 "میرے پسندیدہ شہر؟"
"لاہور' اسلام آباد' کراچی بلکہ سارا ملک مجھے بہت پسند ہے۔"

9 "خوشی کا بہترین لمحہ؟"
"لمحہ نہیں... بلکہ وہ وقت یاد کرتی ہوں جب صنم کی شادی ہوئی۔ سچ میں اپنی زندگی میں ایسی شادی جس میں سادگی بے انتہا تھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بہت انجوائے کیا۔"

10 "شادی میں پسندیدہ رسمیں؟"
"مجھے شادی کی ساری رسمیں اچھی لگتی ہیں اور سندھ کی تو رسمیں بہت خوب صورت ہیں۔ ہم نے "صنم" کی شادی میں تمام رسمیں کیں مگر بہت سادگی کے ساتھ۔"

11 "بہت کوفت ہوتی ہے؟"
"جب میں وقت پر پہنچ جاؤں اور شوٹ کے لیے دوسرے لوگ نہ آئیں... مجھے انتظار کرنے میں بہت کوفت ہوتی ہے۔"

12 "موڈ خراب ہو جاتا ہے؟"
"جب مجھے وقت پر کھانا نہ ملے یا وقت پہ کھانا تیار نہ ہو اور کوئی کام وقت پر شروع نہ ہو۔"

13 "اپنے لیے کن چیزوں پہ خرچ کرتی ہوں؟"
"پرفیومز' بیگز اور جوتے... نہیں چلی جاؤں ان

چیزوں کی شاپنگ کیے بغیر تو گھر آتی ہی نہیں ہوں۔"

14 "میری ایک اچھی عادت؟"

"میں جھوٹ نہیں بولتی۔"

15 "مذہب سے لگاؤ؟"

"بہت زیادہ... مگر نماز پڑھنے میں کوتاہی ہو جاتی ہے کوشش کرتی ہوں کہ اس میں باقاعدگی لے آؤں۔"

16 "میری ایک بات جو مجھے دوسروں میں نمایاں کرتی ہے؟"

"میں بہت نرم دل اور نرم لہجہ رکھتی ہوں۔ میرے بات کرنے کا انداز سب کو بہت پسند ہے۔"

17 "مجھے یقین ہے کہ؟"

"کہ ہر انسان کو اس کی قسمت میں لکھا ہوا ہی ملتا ہے۔ کوئی کسی سے اس کی کوئی چیز چھین نہیں سکتا۔"

18 "اپنے ڈراموں میں میرے پسندیدہ ڈرامے؟"

"ہوں... مشکل سوال ہے۔ ویسے مجھے اپنا سب سے پہلا ڈرامہ "بالی" اور پھر یاسر نواز کی ڈائریکشن میں "ادھوری محبت" مجھے بہت پسند ہے۔"

19 "وہ لڑکے برے لگتے ہیں؟"

"جو عورت کی کمائی پر گھر چلاتے ہیں۔ دعوت میں جائیں یا ویسے آؤٹنگ کے لیے جائیں تب بھی بل لڑکی دے تو بہت برے لگتے ہیں اور ہاں وہ لڑکے یا مرد بھی برے لگتے ہیں جو لڑکیوں کو خوامخواہ ہی بلیک میل کریں۔"

20 "میری صبح کی روٹین؟"

"پانی پیتی ہوں اور پھر اپنا سیل فون چیک کرتی ہوں ضروری SMS ہو تو جواب بھی دے دیتی ہوں۔"

21 "اپنے کیے گئے فیصلوں پہ میری رائے؟"

قہقہہ "جو بھی فیصلے کیے سب کے سب غلط ثابت ہوئے۔ اب سب سے مشورہ کر کے ہی کوئی کام کرتی ہوں۔"

22 "کن باتوں سے ڈرتی ہوں؟"

"کہ کوئی اسکینڈل نہ بن جائے۔ کیونکہ کچھ بے گناہ لوگ بھی پھنس جاتے ہیں۔ اور یہ کہ مجھ سے کوئی

ایسی غلطی سرزد نہ ہو جائے کہ دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث بنے۔"

23 "خرچ میں کنجوسی نہیں کرتی؟"

"جب امی اور چھوٹی بہن شاپنگ پہ میرے ساتھ ہوں۔ دل چاہتا ہے یہ ڈھیر ساری شاپنگ کریں۔"

24 "دکھی ہوتی ہوں تو؟"

"اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیتی ہوں۔"

25 "میں بخل سے کام نہیں لیتی؟"

"دوسروں کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتی۔ جس طرح میرا دل چاہتا ہے کہ لوگ میری تعریف کریں اس طرح دوسروں کا بھی دل چاہتا ہے کہ ان کے اچھے کاموں کی تعریف ہو۔"

26 "سیاست دان جو مجھے پسند ہیں؟"

"نیلسن منڈیلا اور مہاتیر محمد۔"

27 "اگر اس فیلڈ میں نہ ہوتی تو؟"

"تو یقیناً" میں تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوتی۔ کیونکہ مجھے ٹیچنگ کا شعبہ بہت اچھا لگتا ہے اور بہت اچھی ٹیچر ثابت ہوتی۔"

28 "جن پر مجھے اندھا اعتماد ہے؟"

"اپنی بہن قلعم بلوچ اور اپنی ماں پر۔ ان پر میں کسی

قسم کا شک بھی نہیں کر سکتی۔"

29 "کن سیاست دانوں سے شکایت ہے؟"
"سب سے کیونکہ کسی نے اس ملک کے لیے کچھ نہیں کیا۔ سب ہماری دھرتی پر بوجھ ہیں۔ اللہ انہیں نیک ہدایت دے۔"

30 "بارش انجوائے کرتی ہوں؟"
"اپنے گھر والوں کے ساتھ۔۔۔ اور اچھے موسم میں گھر سے باہر ہوتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ اڑ کر گھر پہنچ جاؤں۔"

31 "فیوچر پلاننگ؟"
"کچھ خاص نہیں۔۔۔ بس زیادہ سے زیادہ کام کرنا چاہتی ہوں۔ زیادہ سے زیادہ ڈرامے کرنا چاہتی ہوں اور ماشاءاللہ آج کل کر بھی رہی ہوں۔"

32 "تاریخ سے لگاؤ (History)؟"
"بہت زیادہ لگاؤ ہے۔ تاریخ کی کتابیں بھی پڑھتی ہوں۔ اور پھر اپنے آپ کو اس دور میں محسوس کرتی ہوں۔"

33 "پسندیدہ تاریخی دور؟"
"سچ بتاؤں۔۔۔ مجھ میں تو پرانی روح ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ میں اس دور میں ان فٹ ہوں۔ اس لیے مجھے سب تاریخی دور اچھے لگتے ہیں۔"

34 "کن کھانوں کو ہمیشہ کھانا چاہتی ہوں؟"
"دال چاول۔۔۔ اور کسی بھی انداز میں پکے ہوئے چاول۔"

35 "24 گھنٹوں میں کونسا وقت اچھا لگتا ہے؟"
"شام کا اور پھر رات کا۔۔۔ بہت سکون کا وقت ہوتا ہے۔"

36 "میری صبح کب ہوتی ہے؟"
"صبح۔۔۔ سچ بتاؤں۔۔۔ میری تو صبح آنکھ ہی نہیں کھلتی، کیونکہ مجھے صبح جلدی اٹھنے کی عادت نہیں ہے۔"

37 "ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور ہر عورت کے پیچھے؟"
"بالکل ہوتا ہے کسی نہ کسی کا ہاتھ اور میری کامیابیوں کے پیچھے میرے بھائیوں کا ہاتھ ہے۔ اگر وہ منع کرتے یا سختی کرتے تو میں کبھی اس فیلڈ میں نہ ہوتی۔"

38 "زندگی میں ایک بار ملنا چاہتی تھی؟"
"مدر ٹریسا، ہیلن، منٹو اور مرزا غالب۔"

39 "لڑکوں سے کہنا چاہتی ہوں؟"
"کہ ارے نادانوں لڑکیوں کے پیچھے پڑ کر کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ پڑھو لکھو اور اپنا فیوچر بناؤ۔"

40 "اپنے گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"صرف اور صرف اپنے کمرے میں سکون ملتا ہے۔ ویسے تو پورے گھر میں سکون ہے مگر اپنے کمرے کی تو بات ہی الگ ہے۔"

41 "ایک کردار جو کرنا چاہتی ہوں؟"
"مجھے تھر کی عورت کا کردار کرنے کی بہت زیادہ خواہش تھی اور ڈرامہ سیریل "سنجھنا" میں میری یہ خواہش پوری ہوئی۔ اب تو جو مل جائے کر لیتی ہوں۔ مگر وہ کردار کرتی ہوں جو پاور فل ہوں۔"

42 "مجھے رشک آتا ہے؟"
"ملائشیا اور انڈیا کی ترقی دیکھ کر ہمارے ساتھ کے ملک ہیں اور ان ملکوں نے کتنی ترقی کی ہے۔ اور ہم۔۔۔ بس رہنے دیں۔"

43 "رنگ اور لباس کے معاملے میں؟"
"بہت چوزی ہوں۔ رنگوں میں کالا اور سفید رنگ کو ترجیح دیتی ہوں اور لباس میں خاص خیال رکھتی ہوں کہ صاف ستھرا، استری کیا ہوا ہو اور ایسا نہ ہو کہ جسم نمایاں ہو۔"

44 "کس طرح کی موویز دیکھتی ہوں؟"
"ہر طرح کی دیکھتی ہوں۔ لیکن مجھے پرانی طرز کی انگریزی موویز بہت پسند ہیں۔ اس زمانے کے لباس، ان کا رہن سہن مجھے بہت متاثر کرتے ہیں تو اس لیے پرانی موویز ضرور دیکھتی ہوں۔"

45 "ایس ایم ایس کرنا پسند ہے یا فون کرنا؟"
"مجھے فون کرنا پسند ہے۔ لیکن اگر کسی کا ایس ایم ایس آجائے اور کوئی ضروری بات پوچھی ہو تو جواب

ضرور دیتی ہوں۔"

46 "دنیا گھومنا چاہتی ہوں؟"

"صنم کے ساتھ اور اپنی امی کے ساتھ پوری دنیا گھومنا چاہتی ہوں۔ دیکھیں کہ یہ خواہش کب پوری ہوتی ہے۔"

47 "میری نظر میں دنیا کی خوش قسمت ترین شخصیات؟"

"فہرست لمبی ہے۔۔۔ لیکن اگر شوبز کی بات کریں بلکہ فلموں کی بات کریں تو مجھے امیتابھ بچن اور شاہ رخ خان کی قسمت پر رشک آتا ہے کیونکہ سنا ہے کہ انہوں نے کسی کی سپورٹ کے بغیر سب کامیابیاں حاصل کی ہیں۔"

48 "اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتی ہوں؟"

"بالکل کرلیتی ہوں۔ کوئی شرم محسوس نہیں کرتی۔"

49 "میری دیرینہ خواہش؟"

"کہ میرا اپنا گھر ہو جو میں اپنے ذاتی پیسوں سے بناؤں اور خوب سجاؤں۔"

50 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتی؟"

"اے ٹی ایم کارڈ اور سیل فون۔"

51 "کن الفاظ کا استعمال زیادہ کرتی ہوں؟"

"ارے واہ Seriously اور بھی بے ساختہ بہت کچھ بول جاتی ہوں۔"

52 "دنوں اور مہینوں میں کیا پسند ہے؟"

"دنوں میں اتوار اور پیر۔ اس لحاظ سے کہ اتوار چھٹی ہوتی ہے۔ فیملی کے ساتھ وقت گزار کر اچھا لگتا ہے اور پیر اس لیے کہ نیا دن ہوتا ہے نئی امیدیں اور نیا کام

اور مہینوں میں فروری اور دسمبر۔ فروری چھوٹا ہوتا ہے اور دسمبر سال کا آخری مہینہ ہوتا ہے۔"

53 "گھر کے کام جو کرنے کو دل نہیں چاہتا؟"

قہقہہ۔۔۔ "گھر کے کام۔۔۔ سچ کسی کام کو کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ اس لیے کام کرنے والیاں رکھی ہوئی ہیں۔"

54 "اغوا کرنا چاہتی ہوں؟"

"سب سیاست دانوں کو اور تاوان میں ان کی دولت لے کر قومی خزانے کو بھرنا چاہتی ہوں۔"

55 "کون سا مشروب مزے لے لے کر پیتی ہوں؟"

"پانی آپ یقین کریں۔ جب میں پانی پیتی ہوں تو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ کہتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے تم بہت ہی لذیذ شروب پی رہی ہو تو میں کہتی ہوں کہ بھلا پانی سے بڑھ کر کوئی مشروب کیا لذیذ ہو گا۔"

56 "کھانا کہاں کھانا پسند کرتی ہوں؟"

"میں کھانے کی زیادہ شوقین نہیں ہوں۔ گھر میں جو پکا ہو کھالیتی ہوں اور کہیں جا کر کھانا تو پھر ضرور دل چاہتا ہے کہ باربی کیوں ٹونائیٹ میں کھانا کھاؤں۔"

57 "شاپنگ کے لیے مخصوص جگہ؟"

"کوئی نہیں ہے۔ جہاں سے اچھی چیزیں مل جائیں۔ لیکن جب زیادہ گھوم پھر کر شاپنگ کرنے کو دل نہ چاہے تو پھر پارک ٹاور اور فورم چلی جاتی ہوں۔"

58 "کسی سے پہلی بار ملوں تو بے ساختہ کیا کہتی ہوں؟"

"السلام علیکم۔۔۔ کیا حال ہیں جی۔"

59 "بہت پیار کرتی ہوں؟"

"امی، صنم اور اپنے بھانجے سے۔"

60 "پسندیدہ چینل پر پسندیدہ موسم؟"

"سب اچھے ہیں۔ مگر ڈرامے شوق سے دیکھتی ہوں اور وہ چینل جس میں صنم کے پروگرام ہو رہے ہوں۔ اور موسم تو بہار اور بارش کا پسند ہے۔"

☆ ☆

آواز کی دنیا سے

عاطف مظہر

شاہین رشید

ریڈیو' آر جے کو اچھی سیلری نہیں دیتا لیکن شہرت ضرور دیتا ہے اور ریڈیو کے آر جے اس شوق میں آتے بھی نہیں کہ انہیں پیسہ ملے گا بلکہ وہ اپنے شوق اور جنوں کی خاطر آتے ہیں' ورنہ اگر پیسہ ہی سب کچھ ہوتا تو آج ریڈیو اسٹیشن ویران پڑے ہوئے ہوتے۔ آج ریڈیو پہ جتنے بھی آر جے کام کر رہے ہیں وہ صرف اور صرف اپنے شوق کی خاطر۔ اس لیے وہ اس شوق کے ساتھ ساتھ اپنی جاب پر بھی توجہ دیتے ہیں کہ اصل کمائی ان کی جاب ہی ہوتی ہے۔

آج ہم آپ کی ملاقات خوب صورت آواز کے مالک عاطف مظہر صاحب سے کروائیں گے عاطف مظہر ایک اسپورٹس چینل سے بھی وابستہ ہیں اور کرکٹ کمنٹری بھی کرتے ہیں۔

★ "جی عاطف صاحب کیسے ہیں آپ؟"

✱ "اللہ کا کرم ہے۔"

★ "آج کل کیا مصروفیات ہیں۔۔۔ اور ریڈیو کے علاوہ کیا کیا کرتے ہیں؟"

✱ "جناب میں ریڈیو کراچی ایف ایم 96 سے وابستہ ہوں اور مارننگ شو کرتا ہوں۔ صبح 7 بجے سے 10 بجے تک اور ریڈیو کے علاوہ میں جیو سپر سے وابستہ ہوں۔ کمرشل وائس اوور بھی کرتا ہوں اور ڈراموں کی ڈبنگ بھی کرتا ہوں۔ اور ریڈیو اور جیو سپر سے کرکٹ کی کمنٹری بھی کرتا ہوں اور نہ صرف ڈومیسٹک بلکہ انٹرنیشنل میچز کی بھی کمنٹری کرتا ہوں۔"

★ "گویا۔۔۔ چند دن بعد شروع ہونے والے کرکٹ ورلڈ کپ کی کمنٹری بھی آپ کریں گے۔۔۔ تو کہاں سے کریں گے ریڈیو سے یا ٹی وی سے؟"

✱ "جہاں سے موقعہ مل گیا۔۔۔ ویسے ریڈیو سے ہی کروں گا کیونکہ میرا زیادہ تعلق ریڈیو سے ہی ہے۔۔۔ اور میں نے زیادہ تر کمنٹری ریڈیو سے ہی کی ہے۔"

★ "ورلڈ کپ کے میچز ہوں یا کرکٹ کا کوئی ٹورنامنٹ' لائٹ چلی جائے تو لوگ ریڈیو کی طرف ہی لپکتے ہیں مگر جہاں چھکا اور چوکا لگتا ہے آپ کے ریڈیو سے اشتہار شروع ہو جاتے ہیں۔۔۔ بہت کوفت ہوتی ہے؟"

* "ہاں جی' یہ تو ہے اور صرف کمنٹری ہی تو نہیں سنوائی ہوتی' کمانا بھی تو ہوتا ہے اور یہی موقعہ ہوتا ہے کمانے کا۔ لوگ کوفت کا شکار بھی ہوتے ہیں اور شکایتیں بھی کرتے ہیں مگر کیا کریں کہ یہ مجبوری ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ریڈیو ٹی وی سے زیادہ اسٹرونگ میڈیا ہے اور اب تو اور بھی زیادہ ہو گیا ہے جب سے کاروں میں اور موبائل میں ریڈیو آگیا ہے اور جب سے F.M چینلز کھل گئے ہیں آپ یقین کریں کہ صبح کا مارننگ شو خواتین کچن میں ریڈیو رکھ کر شوق سے سن رہی ہوتی ہیں اور پراٹھے بھی پکا رہی ہوتی ہیں۔"

★ "اچھا۔ پھر تو آپ خواتین کے پسندیدہ آر جے ہوں گے اور آپ کا بھی دل چاہتا ہو گا صبح پراٹھے کھانے کو؟"

* "بالکل۔۔۔ جی پسندیدہ ہیں ہم خواتین کے۔۔۔ ہاں دل تو چاہتا ہے پراٹھے کھانے کو مگر میں آج کل ڈائیٹ پہ ہوں۔ حالانکہ میں اپنی ہائیٹ کے حساب سے نارمل ویٹ رکھتا ہوں مگر پھر بھی۔۔۔ اور میری ہائیٹ ماشاءاللہ سے ساڑھے چھ فٹ ہے۔"

★ "پھر تو بیگم بھی لمبی ہوں گی؟"

* "نہیں وہ شاید 5 فٹ یا 5.4 فٹ ہوں گی اور میری بیگم بھی ریڈیو سے وابستہ ہیں پہلے ان کا نام نزہت حسین تھا اب نزہت عاطف ہیں اور وہ میرے شو کے بعد شو کرتی ہیں۔"

★ "ریڈیو پہ آمد کیسے ہوئی' کیا کشش لے کر آئی آپ کو اس فیلڈ میں؟"

* "میں 1999ء سے ریڈیو سے وابستہ ہوں۔ اس زمانے میں میں طالب علم تھا اور ریڈیو بڑے شوق سے سنتا تھا۔۔۔ اس زمانے میں ہی F.M - 100 کی نشریات شروع ہوئی تھیں' تو ایک دو آر جے کو سن کر لگا کہ یہ تو بڑا زبردست کام ہے۔۔۔ اور ہمیں بھی کرنا چاہیے' پہلے گھر میں بولنے کی پریکٹس کی' پھر آڈیشن کرکے گئے۔۔۔ سلیکشن نہیں ہوا' پھر دوبارہ گئے۔ پھر سلیکٹ نہیں ہوئے۔ پھر محنت کی اور چار' پانچ دفعہ ناکام ہونے کے بعد فائنلی انہوں نے کہا کہ اس لڑکے کو چانس دینا چاہیے۔۔۔ اور بس جب چانس مل گیا تو پھر میں نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا اور میرے کام کی شروعات F.M-101 سے ہوئی ایف ایم 100 میں تو بعد میں آیا۔۔۔ بے شک پہلا چینل FM100 تھا۔ تو FM100 جوائن کرنے سے پہلے میں دبئی چلا گیا تھا اور دبئی کے ریڈیو سے میں نے تقریباً "3 سال کام کیا اور جب دبئی سے واپس آیا تو میں نے FM100 کو جوائن کیا۔"

★ "دبئی سے کیسے آفر آئی؟"

* "میں نے تقریباً "4 ماہ ایف ایم 101 سے کام کیا اور دبئی ریڈیو والوں نے میرا پروگرام سن کر مجھے آفر دی انہیں میری آواز اور میرا انداز اچھا لگا۔۔۔ انہوں نے میری پروفائل مانگی' کچھ پروگراموں کی ریکارڈنگز مانگیں اور پھر انٹرویو کے بعد میرا ویزا آگیا۔۔۔ اور وہاں ایف ایم 106.2 میں اور جب واپس آیا تو بہ حیثیت کریٹو منیجر کے ایف ایم 100 جوائن کیا اور ساتھ ساتھ شوز بھی کیے۔"

★ "دبئی سے واپسی کچھ گھریلو پرابلمز کی وجہ سے ہوئی۔ مگر دبئی والوں نے روکا تو ہو گا؟ کیونکہ وہاں کا ماحول اور قوانین بہت اعلا ہیں؟"

* "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔ انہوں نے بہت کہا' مگر میں رک نہیں سکتا تھا کیونکہ میری والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔۔۔ اور میں افسوس اس لیے نہیں کرتا کہ جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہی ہوتا اور الحمدللہ میں بہت خوش ہوں جہاں پہ بھی ہوں۔ لیکن اگر دوبارہ آفر آئی تو ضرور جاؤں گا۔"

★ "ریڈیو پاکستان سرکاری ادارہ ہے۔ پیسوں کے معاملے میں انتہائی کنجوس۔۔۔ تو آپ کو بھی کم ہی ملتے ہوں گے؟"

* "جی ہاں۔۔۔ پیسے تو بہت ہی کم ملتے تھے' بہ مشکل ایک پروگرام کے 75 روپے ملا کرتے تھے اور شوق کا اندازہ آپ اس بات سے کریں کہ اس زمانے میں نہ ہمارے پاس بائیک تھی' نہ کار ہوتی تھی' صبح 5 بجے

اپنے گھر سے نکلتے تھے' بس میں بیٹھتے تھے' گرومندر آتے تھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کا سفر کرکے ریڈیو پاکستان پہنچتے تھے' شو سے ایک گھنٹہ پہلے پہنچ جاتا تھا اور پھر پروگرام۔۔۔ تو کریز تھا' جنون تھا اور دلچسپ بات تو یہ کہ جب میں دبئی سے پہلی بار واپس آیا تو پاکستان میں آکر نہ کسی کو سلام دعا کیا نہ حال احوال پوچھا' سیدھا رخ ریڈیو پاکستان کی طرف کیا۔ اتنا پاگل تھا ریڈیو کے معاملے میں۔"

★ "گھر والوں نے نہیں کہا کہ اس میں تو کمائی بھی نہیں ہے' نہ ہی اسکوپ کیوں زندگی برباد کررہے ہو؟"

✱ "نہیں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں کہا' بلکہ میری امی نے مجھے بہت سپورٹ کیا' کیونکہ وہ بھی اپنے اسکول کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بہت ایکٹو رہتی تھیں' تو انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ بیٹا اپنا شوق پورا کرو مگر اپنی پڑھائی سے غافل مت ہونا اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ کافی چھوٹی عمر سے میں نے کافی زیادہ کمانا شروع کردیا 2000ء میں دبئی گیا اور تین ساڑھے تین ہزار درہم ملتے تھے تو خود سوچیں کہ پاکستانی کتنے ہوتے ہوں گے۔ 2000ء میں میری عمر بھی 20'21 سال تھی اور اتنی عمر میں زیادہ کمائی کا عمل شروع ہوجائے تو پھر پڑھائی میں کہاں دل لگتا ہے۔۔۔ مگر میں نے پھر بھی کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کیا۔"

★ "اچھا رسپانس ملے تو مزید کچھ کرنے کو دل چاہتا ہے۔۔۔ تو ایسا ہوا؟"

✱ "جی بہت رسپانس ملا اور اس کے لیے میں اپنے رب کا جتنا بھی شکر کروں کم ہے۔۔۔ اور حد تو یہ ہے کہ جب ہم روڈ شو میں جاتے تھے تو لڑکیوں کو اس حد تک میں نے دیوانہ دیکھا کہ وہ میری شرٹس پکڑ رہی ہیں' چھوٹا ان کے لیے اعزاز ہوتا تھا کہ پتا نہیں عاطف مظہر کیا چیز ہے۔۔۔ دبئی میں بھی لوگ پسند کرتے تھے مگر پاکستان جیسا کراؤڈ میں نے نہیں دیکھا مگر سچ بتاؤں کہ ریڈیو کو جو میں نے سمجھا وہ دبئی ریڈیو میں۔ وہاں انڈین اسٹارز بھی تھے پاکستانی اسٹارز بھی تھے ان کے ساتھ جب میں نے کام شروع کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے

بیسک چیزیں تو آتی ہی نہیں ہیں۔ تو وہاں میں نے پروڈکشن سیکھی اسکرپٹ رائٹنگ شروع کی کمرشلز کے بارے میں سیکھا' وائس اوور کس طرح کرتے ہیں۔۔۔ اصل میں جو کچھ سیکھا وہ دبئی ریڈیو سے سیکھا۔"

★ "آپ نے 1999ء میں ریڈیو جوائن کیا۔ اب 2015ء ہے اتنے سالوں میں آپ نے کیا چینج دیکھا ایف ایم میں انداز بدلا یا اسی پیٹرن پہ چل رہا ہے سب کچھ؟"

✱ "جب ہم نے شروع کیا تھا تو اس وقت ریڈیو انڈسٹری نہیں تھا آج ریڈیو پوری انڈسٹری ہے اس وقت تقریباً" 15'14 ریڈیو اسٹیشن تو صرف کراچی میں ہی ہیں۔۔۔ اور پورے ملک میں تو نہ جانے کتنے ہی ہوں گے جہاں تک چینج کی بات ہے تو پہلے زمانے میں امیچورٹی زیادہ تھی۔ بچگانہ پن زیادہ تھا۔ اب میچورٹی آگئی ہے۔۔۔ لائیو کالز لیتے ہیں' فوری فوری رسپانس آتا ہے لوگوں کا۔۔۔ اور انفارمیشن بتانے میں۔۔۔ تو باقی تو سب کچھ وہی ہے۔"

★ "آج کل کے نوجوان آر جے کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟"

✱ "آج کل تو سین یہ ہے کہ ہر پتھر کے نیچے آپ کو ایک آر جے نظر آئے گا ہمارے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔۔۔ صرف بارہ تیرہ آوازیں تھیں جنہیں لوگ جانتے

تھے انہیں پسند کرتے تھے اور ان کے بارے میں ہر بات جاننا چاہتے تھے۔ ان کے انٹرویوز آتے تھے تو بڑے شوق سے لوگ خریدتے تھے اور پڑھتے تھے آج کل ایسا نہیں ہے۔۔۔ اب صرف ریڈیو اسٹیشن نہیں ہے اب ویب ریڈیو بھی کھل گئے ہیں تو ہر کوئی اپنے آپ کو آر جے کہہ رہا ہوتا ہے اور جب کوانٹیٹی آجاتی ہے۔ تو کوالٹی کم ہو جاتی ہے اس لیے آپ کو اچھے آر جے بہت کم ملیں گے آج کے نوجوان آر جے سے میں تو مطمئن نہیں ہوں اور جو مجھ سے گائیڈنس مانگتا ہے اس کو میں ضرور گائیڈ کرتا ہوں۔"

★ "آر جے میں کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے؟"

✱ "سب سے بنیادی خوبی تو آپ کی آواز ہے کیونکہ یہ کہلاتی ہے آواز کی دنیا۔ آپ کے الفاظ کا چناؤ' اس کا اتار چڑھاؤ' کس طرح سے کانوں کو پلے کرنا چاہیے کونسا گانا کب چلانا چاہیے اور اس سے پہلے کیا بات کرنی چاہیے۔ کالر سے کس طرح بات کرنی ہے۔۔۔ پھر یہ کہ انہیں عزت دینی چاہیے' آج کل تو تم اور آپ کے الفاظ کم اور تو تڑاک زیادہ ہونے لگا ہے۔ ہم میں تو ہمت نہیں ہوتی کہ اپنے کسی کالر سے تم یا تو کر کے بات کریں۔ پہلے ریڈیو کو فیملی ریڈیو سمجھا جاتا تھا جبکہ آج ایسا نہیں ہے۔"

★ "ریڈیو پہ کام کرنے والے ہمارے حساب سے آل راؤنڈر ہوتے ہیں ہر کام کر رہے ہوتے ہیں۔۔۔ ٹی وی پہ بھی۔۔۔ تو آپ آئے ٹی وی پر؟"

✱ "میں ٹی وی پہ بھی کام کرتا ہوں۔ اسکرین پہ آیا ہوں' جیو سپر کے پروگراموں میں ہمارا ایک پروگرام ہوتا تھا "سپر آئی" لائیو شو ہوتا تھا اور تمام بڑے سپر کھلاڑیوں کے ساتھ میں نے پروگرام کیے ہیں اور میرے انٹرویوز بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً "سی این بی سی پاکستان" "جاگ ٹی وی" پہ ہوا خود میں نے بھی اینکرنگ کی ہے اسپورٹ کے حوالے سے۔"

★ "لوگ جانتے پہچانتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں؟"

✱ "شہرت کس کو بری لگتی ہے۔۔۔ اگر آپ کو دس لوگ جانتے ہیں اور آپ کا عزت سے نام لیتے ہیں تو یہ بات کس کو بری لگے گی تو اس لحاظ سے مجھے بھی شہرت اچھی لگتی ہے۔"

★ "Wake up کراچی آپ کے پروگرام کا نام ہے۔ گویا سوئے ہوئے لوگوں کو جگاتے ہیں؟"

✱ "بالکل جی۔۔۔ سوئے ہوئے لوگوں کو جگاتا ہوں اور لائیو کالز بھی لیتا ہوں اور ہر طرح کے لوگ یعنی ہر عمر کے لوگ ہمیں کال کر رہے ہوتے ہیں اور سب محبت کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ تیز طرار اور چلبلے نوجوان بھی ہوتے ہیں ان سے بات کرنے کا اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔ وہ بدتمیزی نہیں کرتے۔"

★ "کس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ آپ کے پروگراموں کو اور آواز کو پسند کرتے ہیں؟"

✱ "میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک بار میں ٹیکسی میں تھا اور ڈرائیور مجھ سے اپنی باتیں کر رہا تھا تو میں نے بھی اسے بتایا کہ میں ریڈیو پر کام کرتا ہوں تو بے ساختہ بولا "او تم ریڈیو پہ کام کرتا ہے۔ ہم کو عاطف مظفر سے ملنا ہے ہم اس کا بہت بڑا فین ہے" اور وہ پورے راستے عاطف مظفر ہی کرتا رہا۔۔۔ اور میں سنتا رہا۔۔۔ اور جب میں ٹیکسی سے اترنے لگا تو میں نے اسے بتایا کہ "مجھے ہی عاطف مظفر کہتے ہیں" تو آپ یقین کریں کہ اس کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی وہ اتر کر مجھ سے گلے ملا اور اس نے مجھ سے کرایہ بھی نہیں لیا اور اپنا فون نمبر دیا اور کہا کہ میں آپ کے لیے چوبیس گھنٹے حاضر ہوں آپ نے جہاں جانا ہو مجھے کال کر دیا کریں اور کچھ ایسے فینز بھی ہیں جو میں دبئی گیا تو وہ مجھے دبئی کال کرتے تھے بات کرنے کے لیے۔"

★ "گھر میں سب سے زیادہ کون آپ کے پروگرام کو پسند کرتا ہے؟"

✱ "سب ہی کرتے ہیں' مگر میری ماں میری بہت بڑی فین تھیں۔ جب وہ حیات تھیں تو بڑی باقاعدگی

سے میرے شوز سنتی تھیں۔ میری حوصلہ افزائی کرتی تھیں اپنی پسند کے گانے لگواتی تھیں۔ تو مجھے بھی بہت خوشی ہوتی تھی۔ اور موڈ کا اثر ہمارے پروگراموں پر ضرور ہوتا ہے۔"

★ "اپنے موڈ کے بندے ہیں یا دوسروں کے موڈ سے پروگرام ملتے ہیں؟"

✻ "لوگ میرے بارے میں کہتے ہیں کہ میں موڈی آرجے ہوں۔ اپنے حساب سے چلتا ہوں۔ گانے بھی اپنی پسند سے لگاتا ہوں۔"

★ "اچھا۔۔۔ گڈ اب میں چاہوں گی کہ آپ اپنا فیملی بیک گراونڈ بتائیے؟"

✻ "میرے والدین انڈیا آگرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ میں کراچی میں 16 نمبر کو پیدا ہوا۔ میری تین بہنیں ہیں اور میں اکلوتا ہوں اور اکلوتا ہونے کی وجہ سے کوئی لاڈ نہیں اٹھوائے کیونکہ میری امی کہتی تھیں کہ میرے لیے سب بچے برابر ہیں۔ میں اپنی امی سے شکوہ بھی کرتا تھا کہ اکلوتا ہونے کے باوجود بھی ایکسٹرا توجہ نہیں ملتی مجھے۔ تو وہ ڈانٹ دیا کرتی تھیں کہ تم اکلوتے نہیں ہو' میرے تو چار بچے ہیں۔"

★ "شادی۔۔۔؟ پسند کی؟"

✻ "شادی چار سال قبل ہوئی' ابھی فارغ البال ہوں۔ دعا کریں اللہ اپنا کرم کرے۔۔۔ پسند کی تھی مگر آپ اسے لومیرج نہیں کہہ سکتے ریڈیو پہ ہی پسند کیا اور ڈائریکٹ بول دیا کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے ایک دو دن کا ٹائم لیا اور پھر کہا کہ والدین کو ہمارے گھر بھیج دیں۔ والدین گئے بات پکی ہو گئی اور شادی ہو گئی۔ اور یہ بات سچ ثابت ہوتی ہے کہ "رشتے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔"

★ "مزاجاً" کیسے ہیں؟"

✻ "ہمیشہ اچھا رہا' نرم دل' نرم مزاج اور میری بیوی مجھے کہتی ہے کہ میں ہر رشتے میں اچھا ہوں۔ ماں کے ساتھ بھی' بہنوں کے ساتھ اور شوہر تو میں ہوں ہی اچھا۔ قہقہہ۔۔۔ اور مجھے یقین ہے کہ جب اللہ تعالیٰ مجھے اولاد کی نعمت سے نوازے گا تو میں باپ بھی بہت اچھا ہوں گا اور میں غلط کو غلط کہتا ہوں۔ مگر غصہ نہیں کرتا۔ میرا ٹمپرامنٹ بہت اچھا ہے ہاں جب نوجوان تھا تو اس وقت میرا ٹمپرامنٹ بہت تیز تھا۔ مگر اب سب سیٹ ہے۔"

★ "کھانے پینے میں کیا پسند ہے۔ گھر کا کھانا پسند ہے یا باہر کا؟"

✻ "میں خود بھی بہت اچھا پکا لیتا ہوں کیونکہ جب دبئی تھا تو سب کام خود ہی کرتا تھا۔ بچپن میں میں اپنی ماں کے ساتھ بہت کلوز رہا ہوں اور ان کے ساتھ کھانا پکانے میں ہاتھ بٹاتا رہتا تھا۔ باہر کے کھانوں کا شوقین ہوں۔ گھر کے کھانوں میں مجھے بریانی بہت پسند ہے اور آج کل نہیں کھا رہا کیونکہ ڈائیٹنگ پہ ہوں۔"

★ "فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

✻ "آرام کرتا ہوں۔ مطالعہ کا شوق بالکل بھی نہیں ہے۔ بس کبھی کوئی اچھا میگزین ہاتھ آجائے تو پڑھ لیتا ہوں۔ خواتین ڈائجسٹ بھی بہت پڑھے ہیں۔ اخبار جہاں میں تین عورتیں تین کہانیاں کسی زمانے میں بہت شوق سے پڑھتا تھا۔"

★ "گھومنے پھرنے کا شوق ہے؟ سیاست؟"

✻ "شوق ہے' مگر شوق کے ہاتھوں پاگل نہیں ہوں۔۔۔ سیاست سے بالکل لگاؤ نہیں ہے۔۔۔ ویسے ہمارے یہاں تو ہر لیول کی سیاست ہوتی ہے۔"

★ "کبھی سیاست کا شکار ہوئے؟"

✻ "ہاں آفشلی طور پر ہو چکا ہوں مگر وضاحت نہیں کر سکتا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اجازت چاہی۔۔۔ اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے اپنی مصروفیات سے ٹائم دیا۔

✿ ✿

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- عفرا خان
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ---------- موسیٰ رضا

مقابل ہے آئینہ

مقدس رباب

ادارہ

★ "آپ کا پورا نام 'گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"

☼ "مقدس رباب اور اکثر رباب نام کی ہی پکار پڑتی ہے۔"

★ "کبھی آئینے نے آپ سے یا آپ نے آئینے سے کچھ کہا؟"

☼ "جب بھی آئینہ دیکھتی ہوں تو اس ذات باری تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے کسی چیز کی کمی نہیں رکھی۔"

★ "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

☼ "میری فیملی اور میرے دوست یعنی کہ ڈائجسٹ!"

★ "آپ اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟"

☼ "جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا۔ وہ لمحے آج بھی سوچوں تو اذیت حد سے سوا ہو جاتی ہے۔"

★ "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"

☼ "ایک ایسا آفاقی جذبہ جو آپ کو انسانیت جیسے بلند رتبے پہ فائز کرتی ہے زندگی محبت کے بغیر ادھوری ہے۔ محبت ہر رشتے کو جوڑے رکھتی ہے۔"

★ "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟"

☼ "حج کی سعادت حاصل کروں اور بہت عرصے سے ایک خواہش ہے کہ کربلا کی سرزمین دیکھوں جہاں پر حسین ابن حیدر نے سجدہ شکر ادا کیا۔"

★ "پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کیا ہو؟"

☼ "میرے بچوں کی ہر کامیابی میرے لیے خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ اور کرن میں اپنا نام دیکھ کر جو خوشی ملی وہ بیان سے باہر ہے۔"

★ "آپ اپنے گزرے کل' آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"

☼ "اپنے رب پہ توکل اور اچھی امید!"

★ "اپنے آپ کو بیان کریں؟"

☼ "حد سے زیادہ صاف گو' نرم دل اور حساس۔"

★ "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟"

☼ "جب ملٹری ہسپتال کراچی میں میرے بیٹے کا آپریشن ہوا تھا۔ اپنوں سے دور رہ کر میں نے وہ دن اذیت میں گزارے تھے آج وہ دن خوفزدہ کر دیتے ہیں۔"

★ "آپ کی کمزوری اور طاقت کیا ہے؟"

☼ "میری فیملی میری کمزوری اور طاقت میرا بھائی۔"

★ "آپ خوش گوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"

☼ "بہت زیادہ خوش ہو کر اور بچوں کی پسند کی ڈشز بنا کر۔"

★ "آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟"

☼ "رب اللہ تعالیٰ کی ایسی آزمائش جس پر پورا اترنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔"

★ "گھر آپ کی نظر میں؟"

☼ "عورت کا حسین خواب اور ایسی پناہ گاہ جو اسے دنیا کی غلیظ نظروں سے محفوظ رکھتی ہے۔"

★ "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟"

☼ "معاف کر دیتی ہوں کہ یہ سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ البتہ اس انسان سے دوبارہ ملنا ملانا میرے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔ یعنی بھولتی نہیں ہوں۔"

★ "اپنی کامیابیوں میں کسے حصہ دار ٹھہراتی ہیں؟"

☼ "ماں کی دعائیں اور رحمت خداوندی۔"

★ "سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کر دیا یا واقعی یہ ترقی ہے؟"

☼ "مشینوں نے ایک دم کاہل اور سست کر دیا ہے۔ اسی لیے آج کا ہر دوسرا انسان ڈپریشن کا شکار ہے۔"

★ "کوئی عجیب خواہش؟"

☼ "کہ ہمارا پیارا ملک علامہ اقبال کے خواب جیسا

ہو جائے قائداعظم اور خان لیاقت علی خان جیسے عظیم حکمران ایک بار پھر ہمارا مقدر بن جائیں (آمین)"

★ "برکھارت کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

☼ "خواب ہوئے وہ دن جب ہم بھی برکھارت انجوائے کرتے تھے اب تو یہ شوق بچوں میں منتقل ہو گیا ہے۔"

★ "آپ جو ہیں وہ نہ ہوتی تو کیا ہوتیں؟"

☼ "میں اب بھی کرن کی قاری ہوں اور تب بھی کرن کی قاری ہی ہوتی ہاہاہا۔"

★ "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں، جب؟"

☼ "بہت توجہ اور دھیان سے اپنے رب کی عبادت کرتی ہوں یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرا پالن ہار مجھے دیکھ بھی رہا ہے اور سن بھی رہا ہے۔"

★ "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

☼ "اچھا رویہ، خلوص اور بچوں کی مسکراہٹ۔"

★ "کیا آپ نے اپنی زندگی میں وہ سب پا لیا ہے، جو آپ پانا چاہتی تھیں؟"

☼ "بے شک میرے مالک نے میری اوقات سے بڑھ کر نوازا ہے۔ شکر ہے اس پاک ذات کا میں کیا اور میری اوقات کیا۔"

★ "آپ کی ایک خوبی یا خامی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟"

☼ "خوبی یہ ہے کہ میں بہت جلد معاف کر دیتی ہوں اور خامی یہ ہے کہ اکثر مجھ سے نماز قضا ہو جاتی ہے۔ یقیناً" یہ بہت بڑی خامی ہے۔"

★ "کوئی ایسا واقعہ جو آج بھی آپ کو شرمندہ کر دیتا ہو؟"

☼ "الحمدللہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے۔"

★ "کیا آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟"

☼ "اللہ پر چھوڑ دیتی ہوں۔ کیونکہ قسمت میں جو لکھا ہے ہونا تو وہی ہے۔"

★ "متاثر کن کتاب مصنف، مووی؟"

☼ "قرآن پاک جو سب کتابوں سے افضل بھی ہے اور مکمل ضابطہ حیات بھی ہے۔ نگہت عبداللہ اور مووی دیکھتی ہی نہیں۔"

★ "آپ کا غرور؟"

☼ "غرور تو صرف رب کائنات کو ہی جچتا ہے۔ البتہ مجھے اپنے باپ جیسے شفیق بھائی پر ناز ہے۔ جس نے ہم بہنوں سے چھوٹا ہونے کے باوجود باپ جیسی شفقت بھی دی اور بھائیوں سامان بھی۔ سدا خوش رہو میرے بھائی آمین۔"

★ "کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو رلاتی ہے؟"

☼ "بہت چھوٹی سی بات بھی اکثر رلا دیتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ شکست آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی تو دیتی ہے۔ اس لیے وقتی شکست پر مایوس نہیں ہونا چاہیے۔"

★ "کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا ہو؟"

☼ "کرن کی ہر اچھی تبصرہ نگار پہ رشک آتا ہے۔ جیسے فوزیہ ثمر، انیقہ انا اور کئی دوسری بس دل میں خواہش ہوتی ہے کہ کاش ان میں میرا نام بھی شامل ہو جائے اسے آپ حسد نہیں کہہ سکتے ہاہاہا۔"

★ "مطالعہ کی اہمیت آپ کی زندگی میں؟"

☼ "جس طرح انسان کو زندہ رہنے کے لیے ہوا اور پانی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روح کی کتھارس کے لیے ایک اچھی کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔"

★ "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"

☼ "شرم و حیا کا پیکر ثانی زہرا حضرت بی بی زینبؓ۔"

★ "ہمارا پیارا ملک سارا کا سارا خوب صورت ہے آپ کا کوئی خاص پسندیدہ مقام؟"

☼ "کراچی میں صرف ایک سال میں نے قیام کیا تھا اور اتنی خوب صورت یادیں سمیٹی ہیں کہ بتا نہیں سکتی۔ خدا جانے وہ کون لوگ ہیں۔ جو اس شہر کی روشنیاں گل کر کے اسے اندھیروں میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔ خدا سے دعا گو ہوں کہ خدا ایسے دشمنوں کو غارت کرے اور اس پیارے شہر کو پھر سے روشنیوں کا گہوارہ بنا دے۔ آمین۔"

ملک صاحب اپنے گھر والوں کو بے خبر رکھ کر اپنے کم سن بیٹے ایشال کا نکاح کر دیتے ہیں جبکہ ایشال کی دلچسپی اپنی کزن عریشہ میں ہے۔

حبیبہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے حیدر آباد سے کراچی آئی ہے۔ شاہ زین کے والد نے اسے اپنے آفس میں اپائنٹ کر لیا شاہ زین حبیبہ میں دلچسپی لینے لگا۔

فرہاد تین بھائی ہیں۔ فرہاد کے دونوں بھائی معاشی طور پر مستحکم ہیں اور دونوں اپنی بیوی بچوں کی ضروریات کو دل کھول کر پورا کرتے ہیں جبکہ فرہاد اپنی بیوی زینب اور بچوں کی ضروریات پوری کرنے میں بے حد کنجوسی سے کام لیتا ہے۔ جو زینب کو بالکل پسند نہیں۔

فرہاد کے بڑے بھائی کی بیوی فضہ زینب کی خوب صورتی سے حسد کرتی ہیں اور آئے دن اس حسد کا اظہار کرتی رہتی ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

آٹھویں قسط

"میری بات کا جواب دو زینب۔"

کچھ دیر انتظار کے بعد سالار نے اسے ایک بار پھر سے پکارا' چائے میں چمچہ چلاتے زینب یک دم چونک اٹھی اپنی جھکی جھکی نظریں اٹھا کر اسے تکا جو اپنی بات کے جواب کا انتظار لیے بے چینی سے اس کی جانب متوجہ تھا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں زینب بے حد محبت' ایسی بے اختیار محبت جس پر اب شاید مجھے خود بھی اختیار نہیں رہا اور شاید اس محبت میں میں اس دن ہی گرفتار ہو گیا تھا جس دن میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم ایک شادی شدہ عورت ہو میں خود کو نہ روک پایا اور یہ بات تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔"

اک دم وہ بات کرتے کرتے سانس لینے کے لیے رکا زینب نے بغور اس کے چہرے کی جانب نظر ڈالی اک انجانا کرب سا اس کے چہرے پر دکھائی دے رہا تھا۔

"اور میں یہ بھی جانتا ہوں زینب کہ تم بھی مجھے پسند کرتی ہو۔"

اپنی دونوں کہنیاں ٹیبل پر ٹکائے آگے کی جانب جھکا زینب کو محسوس ہوا شاید وہ اس کے لیے لفظ "محبت" استعمال کرتے ہوئے جھجک سا گیا ہے۔

"ہاں یہ سچ ہے کہ میں آپ کو بے حد پسند کرتی ہوں مگر اس کا مطلب وہ نہیں جو آپ سمجھ بیٹھے ہیں۔"

وہ جب بولی تو اسے اپنا لہجہ خود بھی سچ سے عاری محسوس ہوا۔

"واٹ" سالار کو جیسے کرنٹ لگا۔

"میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔"

حیرت اس کے لہجہ میں در آئی۔

"سالار آپ میرے ایک بہت اچھے دوست ہیں ایک ایسے قابل اعتبار دوست جس پر شاید اس دنیا میں میں سب سے زیادہ بھروسہ اور اعتماد کر سکتی ہوں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں فرہاد اور اپنی بچیوں کو چھوڑ کر آپ سے شادی کر لوں پتا نہیں آپ نے ایسا سوچا بھی کس طرح مجھے تو اس بات پر حیرت ہے۔"

وہ خود پر کافی حد تک قابو پا چکی تھی جس کا اندازہ اس کے لہجہ کی خود اعتمادی کو دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

"تم غلط کہہ رہی ہو زینب عورت اور مرد کبھی دوست نہیں ہو سکتے یا شاید میرے نزدیک ایسی دوستی کوئی معنی نہیں رکھتی اور ویسے بھی ہمارے اس معاشرے میں ایسی دوستی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی اور یہ ہی وہ سبب ہے جس کے باعث میں تمہیں عزت دینے کی کوشش کر رہا ہوں مگر تم جانے کیوں یہ سب کھلے دل سے قبول کرتے ہوئے گھبرا رہی ہو۔"

وہ آج ہر بات واضح کر دینا چاہتا تھا پھر جانے زندگی میں ایسا موقع ملے نہ ملے کیونکہ اسے تقریباً ایک ہفتہ تک نازیہ کے ساتھ ابروڈ چلے جانا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے مریم کی چھٹی کا ٹائم ہونے والا ہے۔"

سالار کی کسی بھی بات کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔

"یاد رکھو زینب قسمت ہر انسان کو اس کی زندگی بدلنے کا ایک موقع ضرور دیتی ہے جو آج تمہیں بھی مل رہا ہے مگر تم شاید اپنے در پر دستک دینے والی اس خوش قسمتی کو دنیا کے خوف سے ٹھکرا رہی ہو ابھی بھی سوچ لو وقت ہے ایسا نہ ہو کل کو تمہیں پچھتانا پڑے۔"

سالار نے ایک آخری کوشش اور کی۔

"میری اچھی یا بری قسمت میرے بچوں اور شوہر کے ساتھ ہے۔"

نہیں جانتی تھی کہ فرہاد کی بے اعتنائی کے باعث کسی دوسرے مرد سے کی جانے والی دوستی کے نام پر حاصل

ہونے والی تسکین اسے آج اس مقام پر لا کھڑا کرے گی جس کے ایک طرف کھائی ہوگی اور دوسری جانب محبت کے نام پر بہتا تیز دریا جو اپنے ساتھ سب کچھ بہالے جانے کو تیار تھا۔ سالار کا یہ مطالبہ اس کے لیے بالکل ناقابل یقین تھا۔ اسے کبھی یہ امید نہ تھی کہ کوئی مرد اس قدر دلیر بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تو ہمیشہ یہی سمجھتی رہی کہ اس کے اور سالار کے درمیان جو ڈھکا چھپا سلسلہ چل رہا ہے' وہ ہمیشہ ایسے ہی چلتا رہے گا۔ مگر حالات نے آج جو رخ اختیار کیا وہ اس کے تصور میں بھی نہ تھا۔ مرد کی ایسی مضبوط محبت کا تصور بھی شاید اس کے نزدیک محال تھا۔ اس نے تو اپنی زندگی میں ہمیشہ فرہاد جیسے مرد کو ہی دیکھا تھا۔ لاپروا' بے خبر اور محبت سے قطعی عاری شخص جس کے نزدیک کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا مگر شاید سالار بھی نازیہ کے لیے فرہاد جیسا ہی ایک مرد تھا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ بے اختیار رو اٹھی۔

"مجھے بہت افسوس ہے سالار تم نے میری محبت کے حصول کی خاطر اپنی پیاری بیوی کو یکسر فراموش کر دیا تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ مجھ سے دوسری شادی کی خبر نازیہ کے لیے کس قدر اذیت کا باعث ثابت ہوگی۔"

"اس کا ذکر مت کرو' وہ سب کچھ جانتی ہے اور وہ خود چاہتی ہے کہ میں تم سے شادی کر لوں اور یہ اس کی خواہش تھی جو آج میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔"

سالار کا جواب اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ نازیہ سب کچھ جانتی ہے۔ اس سوچ نے ہی اسے مزید شرمندہ کر دیا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔" کرسی پیچھے کھسکاتی وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

سالار بنا کچھ کہے میز پر رکھی گاڑی کی چابی اٹھاتا اس کے قریب سے گزرتا دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ یقیناً" وہ ناراض ہو چکا تھا۔ جس کا اندازہ اس کے چہرے کو دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی زینب اسے منانے کی ہمت خود میں نہ رکھتی تھی۔ اسی لیے تھکے تھکے انداز میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے چل دی۔

☆ ☆ ☆

"اماں کیا سوچ رہی ہو؟"

ماں کو کئی دیر تک خیالوں میں ڈوبا دیکھ کر وہ بے اختیار اس کا کندھا ہلا بیٹھی۔

"ہں۔۔۔ ہاں کچھ نہیں۔۔۔"

انہوں نے ایک نظر اپنے بالکل سامنے کھڑی بیٹی پر ڈالی۔ سرو قد اور خوب صورت خدوخال کی مالک' اپنی عمر سے قدرے بڑی دکھائی دے رہی تھی۔

"یہ تو بالکل میری جوانی ہے۔ ہو بہو میرے جیسی۔" وہ یکدم ہی خوف زدہ ہو گئیں۔

"یہ اتنی بڑی ہو گئی اور مجھے آج تک پتا ہی نہ چلا۔" اس خیال کے آتے ہی انہوں نے یکدم اک جھرجھری سی لی۔

"کیا ہوا اماں۔" اس نے دوبارہ ماں کا کندھا ہلایا۔

"اور یہ سب کیا ہے؟" جواب نہ پا کر ماں کے سامنے بکھرے کاغذات پر نظر ڈالتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔"

وہ جلدی جلدی تمام کاغذات سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اماں کیا ہوا تمہیں' کیوں اس قدر پریشان ہو؟"

ماں کے چہرے پر چھائے تاثرات نے اسے پریشان کر دیا۔

"نہیں بیٹا تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں بھلا کیوں پریشان ہونے لگی۔" وہ شاید خود پر قابو پا چکی تھیں۔

"تمہارے امتحانات کب سے شروع ہو رہے ہیں؟"

"شاید اگلے ماہ کی بیس تاریخ ہے۔"

"اچھا۔"

ماں نے ہاتھ میں تھمے تمام کاغذات ایک خالی لفافے میں ڈال دیے اور پھر وہ خاکی لفافہ ٹرنک کے اندر رکھ کر واپس پلٹ آئی۔

"اماں۔"

اس نے کچھ سوچتے ہوئے ایک بار پھر ماں کو پکارا۔

"کیا ہوا؟"

"اماں مجھے نیا ٹی وی لے کر دو۔" شاید اب وہ اپنے گھر میں پھیلے سناٹے سے تنگ آچکی تھی۔

"ٹی وی۔"

اماں نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کچھ دور لکڑی کی ٹیبل پر موجود ایک کالے سے ڈبے پر نظر ڈالی۔

"اماں اب یہ ٹھیک نہیں ہو سکتا' جانے کتنا پرانا ہے' مجھے تو اب نیا ٹی وی لے کر دو۔ جس پر کیبل بھی آتا ہو اب تو سارے ہی محلے کے لوگ کیبل پر ڈرامے اور فلمیں دیکھتے ہیں ایک سوائے ہمارے۔"

وہ شاید اپنی ماں کا ارادہ بھانپ چکی تھی۔ اس لیے لاڈ سے بولی۔

"اچھا فاطمہ خالہ کے پاس میری ایک کمیٹی ہے' پوچھتی ہوں کب تک دیں گی۔"

حالانکہ یہ کمیٹی انہوں نے اپنے علاج کے لیے ڈالی تھی' مگر بیٹی کی اس فرمائش کو شاید وہ زندگی میں پہلی بار رد نہ کر سکیں۔

"بس اماں۔ پھر ان سے کہو ہمیں جلدی سے کمیٹی دے دیں۔" ماں کی ہاں نے یک دم ہی اس کے دل کو خوشی سے بھر دیا۔

"اچھا۔"

اماں نے باہر نکلتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی' جہاں خوشی کے سارے رنگ بکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"یا اللہ اسے ہمیشہ اتنا ہی خوش رکھنا۔" بے اختیار ہی ان کے دل سے یہ دعا نکلی۔

"آمین۔" اپنی دعا پر خود ہی آمین کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

"سالار' نازیہ کو علاج کے لیے ملک سے باہر لے کر جا رہا ہے۔"

اپنے تئیں فضا بھابھی نے اسے نئی خبر سنائی۔

"ہاں مجھے پتا ہے اس کا آپریشن ہے' شاید پیٹ میں ٹیومر ہے' میری تو دعا ہے اللہ اسے جلد ہی صحت و تندرستی عطا فرمائے۔"

"ہاں بھئی ہم سب کی تو یہ ہی دعا ہے' مگر اس آپریشن کے بعد ہو سکتا ہے وہ ساری زندگی ماں نہ بن سکے اور یہ اس کی زندگی کی کتنی بڑی خواہش ہے یہ ہم سب ہی جانتے ہیں۔"

"مگر اللہ کی مرضی کے آگے ہم سب بے اختیار ہیں بھابھی۔" وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سنا ہے اس نے تو سالار کو دوسری شادی کی اجازت بھی دے دی ہے مگر بھئی آفرین ہے اس مرد پر جو اپنی بیوی سے اس قدر بے لوث محبت کرتا ہے کہ اسے ہر بیماری سمیت دل سے قبول کرنے پر آمادہ ہے' کہتا ہے مجھے صرف نازیہ کا ساتھ چاہیے۔ بچے غیر ضروری ہیں۔"

فضا بھابھی جو ایک بار شروع ہوتیں تو بمشکل ہی چپ ہوا کرتیں۔

"بھابھی عورت کوئی درخت نہیں جو پھل نہ دے تو کاٹ کر پھینک دیا جائے۔"

"نہیں بھئی یہ تو اپنی اپنی سوچ کی بات ہے' ورنہ آج کل تو لوگ بچوں والیوں کو بھی نکال باہر کرتے ہیں۔ کئی مرد' بیٹوں کا بہانہ بنا کر دوسری گھر لے آتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ نہ صرف مرد اس زمانے میں تو عورت کو بھی سکون نہیں۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی یہاں وہاں منہ مارتی ہیں۔ بس یہ عشق انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔"

جانے وہ کیا جتانا چاہتی تھیں زینب سمجھ نہ پائی۔

"آپ کے لیے چائے بناؤں۔"

انہیں اس موضوع سے ہٹانے کا کوئی اور طریقہ اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا۔

"ہاں بنا لو ڈرائیور کسی کام سے گیا ہے' اسے واپس آنے میں کچھ ٹائم لگے گا۔" وہ ٹانگ پہ ٹانگ دھرتے ہوئے اطمینان سے بولیں۔ زینب خاموشی سے کچن کی جانب بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼
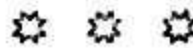
"مجھے تو ابھی بھی یقین نہیں آرہا کہ تم میرے ساتھ ہو' ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہارا یہ ساتھ صرف ایک خواب ہے جو آنکھیں کھولتے ہی ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔"

جہاز کے ٹیک آف کرتے ہی وہ عریشہ کا ہاتھ تھامتے نہایت ہی پیار سے بولا۔

"سچ جانو یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا' وہ سب کچھ جو اس قدر مشکل اور دشوار لگ رہا تھا' اتنی آسانی سے ہو جائے گا آئی کانٹ بلیو اٹ۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بے یقینی سے بولی۔

"ہاں عریشہ نہ صرف ایسا ہوتا ہے بلکہ اب تو ہمارے ساتھ ہو چکا ہے اور ایسے ہی واقعات ہیں جو اللہ پر ہمارا یقین مزید مضبوط کرتے ہیں اور شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں اور ہمیں ہمیشہ وہی ملتا ہے جو ہمارے نصیب میں لکھ دیا جاتا ہے۔"

"ایک بات تو بتاؤ ایشال۔ اسے جیسے اچانک ہی کچھ یاد آگیا۔

"تم نے اپنی کزن کو طلاق تو دی نہیں اور اگر کل وہ کسی بھی لمحہ تمہارے اور میرے درمیان آگئی تو۔"

دل کا خدشہ اس کی زبان پر در آیا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا تمہارے اور میرے درمیان اب کوئی نہیں آسکتا۔"

اس نے پیار سے اپنا بازو عریشہ کے گرد حمائل کرکے اسے خود کے قریب کرلیا۔

"اور یہ خیال ہمیشہ کے لیے اپنے دل سے نکال دو مجھے فی الحال اب لوٹ کر پاکستان بھی نہیں جانا' وہ میرا ایک گزرا ہوا تلخ ترین کل تھی' جس کا خوف تمہارے ساتھ نے میرے دل سے بالکل نکال دیا ہے۔ اب اسے طلاق دینے یا نہ دینے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی اپنی زندگی کا معاملہ ہے چاہے تو میرے نام پر بیٹھ کر اسے برباد کردے۔"

اس کے لہجہ کی سختی نے اریشہ کے دل میں موجود تمام خدشات کو دور کردیا۔ وہ ایک دم ہی شانت ہوگئی اور پرسکون انداز میں ایشال کے کندھے سے اپنا سر ٹکائے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

"ملک صاحب آ گئے ہیں۔"
کان سے لگا فون بند کرتے ہوئے فضل چاچا نے اطلاع دی۔
"اکیلے...."
اس کے دل میں آنے والا خیال سکینہ کی زبان پر سوال بن گیا۔
"پتا نہیں۔"
چاچا مختصر سا جواب دیتے ہوئے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ وہ اپنی جگہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد ملک انکل' چاچا فضل کی ہمراہی میں اندر داخل ہوئے۔ وہ آج بھی تنہا تھے۔ اس کا دل یکدم بجھ سا گیا۔
"السلام علیکم انکل۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"وعلیکم السلام! کیسی ہو بیٹا۔" اس کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے ملک صاحب نے اسے خود سے قریب کرلیا۔
"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" خود بخود اس کی آواز بھیگ سی گئی۔
"صاحب کے لیے کھانا لگاؤ۔" ان کا مختصر سا سامان کمرے میں رکھ کر چاچا نے سکینہ کو مخاطب کیا۔
"نہیں میں کھانا نہیں کھاؤں گا' ہو سکے تو ایک کپ کافی بنا دیں۔"
جانے کیوں انکل کچھ بجھے بجھے سے تھے یا شاید اسے وہم ہوا تھا۔
"اب تمہارا گریجویشن کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" آنٹی کے کچن میں جاتے ہی ملک انکل نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔
"میرا ارادہ....؟"
وہ یکدم گڑبڑا سی گئی۔ سوال اس کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔
"ہاں بیٹا' میں چاہتا ہوں تم ہائر ایجوکیشن حاصل کرو' ماسٹرز کرلو یا کوئی اور ڈگری جو تم کرنا چاہو۔" انہوں نے تھکے تھکے انداز میں اپنا سر صوفہ کی بیک سے ٹکالیا۔
مطلب یہ کہ اس کا تنہائی کا یہ سفر ابھی ختم نہیں ہوا' منزل ابھی بھی کہیں دور کھڑی تھی۔ وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ گریجویشن کے بعد ملک صاحب اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اس کا یہ خیال' خام ثابت ہوا' اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ انہیں کیا جواب دے۔
"اگر تمہیں انٹرسٹ ہو تو فیشن ڈیزائننگ کرلو۔" اسے خاموش دیکھ کر وہ سیدھے ہو بیٹھے۔
"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔" اس کی آواز کچھ بھاری سی ہو گئی۔
سکینہ نے چھوٹی سی ٹرالی ان کے صوفہ کے قریب کی۔
"آپ کافی لیں' میں ذرا فریش ہو کر آتی ہوں۔"
اس وقت وہاں سے اٹھنے کا اس سے بہتر بہانہ اسے کوئی اور نہ سوجھا۔ "اوکے بیٹا' ویسے آپ کا فنکشن کل کس وقت ہوگا۔"
"صبح دس بجے۔"
انہیں جواب دے کر وہ اندر اپنے کمرے میں آ گئی اور پھر واش روم میں داخل ہوتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگی۔ وہ چاچا فضل اور سکینہ کے ساتھ قید تنہائی کاٹتے ہوئے تھک سی گئی تھی اور اب مزید اس گھر میں اس طرح زندگی گزارنے کا تصور بھی اس کے نزدیک سوہان روح تھا۔ جس کے خوف نے اسے اس طرح رونے پر مجبور کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"حبیبہ۔"

"ہاں۔" اس نے اک ادا سے اپنے بالوں کو جھٹکتے ہوئے شاہ زین پر نظر ڈالی۔

"کچھ نہیں۔" جانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا جو کہہ نہ پایا۔

"او کے۔"

کریدنے کی عادت اس میں بالکل نہ تھی۔

"ایک بات پوچھوں۔"

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ اک بار پھر سے بول اٹھا۔

"پوچھو کیا پوچھنا چاہ رہے ہو۔"

پچھلے کچھ دنوں سے ان کے درمیان موجود تکلف کی دیوار تقریباً" گر چکی تھی اور وہ دونوں دوستانہ انداز سے ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔

"تم نے کبھی محبت کی ہے؟" بہت سوچتے ہوئے اس نے دھیرے سے سوال کیا۔

حبیبہ نے چونکتے ہوئے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی' جہاں امید کے کئی جگنو جھلملا رہے تھے۔

"نہیں۔ ابھی تک کوئی ایسا ملا ہی نہیں جس سے محبت کی جاسکے۔" اپنی گردن نفی میں ہلاتے ہوئے وہ نہایت صاف گوئی سے بولی۔

"کمال ہے تم جیسی خوب صورت لڑکی کو محبت کرنے کے لیے کوئی ملا نہیں یا تم نے کبھی اپنے آس پاس دیکھا نہیں۔" شاہ زین کی آواز مزید گمبھیر ہو گئی۔

"واؤ۔ آپ کی آواز تو بہت خوب صورت ہے۔"

تعریف کے ساتھ ہی وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ شاہ زین کے آس پاس نقرئی گھنٹیوں کی آواز گونج اٹھی۔ وہ کچھ دیر قبل والے طلسم سے باہر نکل آیا۔

"اور تمہاری ہنسی میری آواز سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے۔" گھنی گھنی مونچھوں کے سائے تلے اس کے لب مسکرائے۔

"چلو جی حساب برابر ہو گیا۔ تعریف کے بدلے تعریف اب چلیں۔" اپنا ہینڈ بیگ سنبھالتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

شاہ زین جیسے جیسے اسے سمجھ رہا تھا اپنے سابقہ خیالات پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ تو خاصی نرم خو اور محبت کرنے والی لڑکی تھی' جبکہ شاہ زین اسے بد مزاج مغرور اور جانے کیا کیا سمجھتا رہا۔

"چلو۔"

گاڑی کی چابی اٹھاتا وہ اس کے نہایت قریب آگیا۔ اسے ہمیشہ سے یوں ہی حبیبہ کے سنگ چلنا اچھا لگتا' اس کی ہمراہی میں پارکنگ تک آتے آتے اس کے دل نے کئی بار اس ساتھ کے امر ہو جانے کی دعا کی۔

☼ ☼ ☼

اس کا موڈ آج صبح سے ہی بہت خوش گوار تھا۔ نئے سوٹ کے ساتھ ہلکا ہلکا میک اپ کیے وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ فرہاد کی پسند کا کھانا تیار کرتے ہوئے وہ ہلکا ہلکا گنگنا رہی تھی۔ جب بیرونی دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔

"باہر کا گیٹ کیوں کھلا ہوا ہے۔" صحن میں آتے ہی اس نے زوردار آواز لگائی۔

"فائزہ کرایہ دے کر گئی تھی میں کنڈی لگانا بھول گئی۔"

اس نے جلدی سے کچن سے باہر نکل کر وضاحت دی۔ خلاف توقع وہ خاموشی سے لاؤنج کی جانب بڑھ گیا۔

"تم فریش ہو جاؤ میں کھانا لگا رہی ہوں۔" زینب نے کچن کی جانب پلٹتے ہوئے اسے ہدایت دی۔

"اچھا۔"

اور جب وہ کھانا کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئی تو فرہاد ہاتھ میں کپڑا پکڑے کمرے میں موجود واحد کھڑکی صاف کرنے میں مصروف تھا بنا کچھ کہے کھانا لکڑی کی چھوٹی سی ٹیبل پر رکھے وہ اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

"تم میرے انتظار میں بلاوجہ بھوکی مت بیٹھو' کھانا کھالو میں نہا دھو کر فریش ہونے کے بعد کھاؤں گا۔"

بنا اس پر توجہ دیے وہیں سے ہی اس نے کہا۔

"اچھا۔" زینب کا خوش فہم دل مرجھا سا گیا۔

"اسے اپنی جانب راغب کرنے کے لیے تو خود کو بدل' اس سے لگاوٹ کی باتیں کیا کر' اپنی محبت ظاہر کر' بچے یہ سب زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے۔" ماں کا رٹایا ہوا سبق پہلے ہی مرحلے پر ناکام ہو گیا۔

"تم گھر کی ڈسٹنگ نہیں کرتی ہو۔ ٹیلی فون کا اسٹینڈ دیکھو کس قدر گندا ہے کہ اس پر ہاتھ رکھنے کا تصور کم از کم میرے نزدیک تو قدرے محال ہے۔"

اب وہ پورے جوش و خروش سے فون کا اسٹینڈ صاف کر رہا تھا۔

"مگر میں نے تو سارے گھر کی صبح ہی صفائی کی ہے' پھر یہ گرد کہاں سے آگئی؟" وہ حیرت کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا چڑ بھی گئی۔

"تو تمہارا مطلب یہ ہوا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" حسب عادت نہایت ہی دھیمی آواز کے ساتھ وہ اسے گھورتا ہوا بولا۔

"میں نے ایسا کب کہا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو؟" زینب کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی تیز ہو گئی۔

"تم سے تو کوئی بات کرنا حرام ہے' ہر وقت لڑنے کے لیے تیار کھڑی رہتی ہو' جانے کس بات پر بلاوجہ چراغ پا ہو رہی ہو' میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا جس پر تم میرا سر پھاڑنے پر آمادہ دکھائی دے رہی ہو۔"

"میں آپ سے کب لڑی۔" وہ قدرے حیران ہوئی۔

"تم ہمیشہ یہ کیوں ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہو کہ میں جھوٹا ہوں۔" چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت طاری کرتے ہوئے وہ طنزیہ بولا۔

"اور یہ تم کہیں جا رہی ہو جو اس قدر تیار ہو۔"

اسے مکمل طور پر تپانے کے بعد' اب اس کی توجہ زینب کے سراپے کی جانب مرکوز ہوئی۔

"نہیں ویسے ہی نیا سوٹ سل کر آیا تھا۔ اس کی فٹنگ چیک کر رہی تھی۔"

غصہ اور دکھ کی شدت سے اس کی آواز بھرا سی گئی جس پر فرہاد نے کوئی توجہ نہ دی۔

"اگر سوٹ سل کر ہی آگیا ہے تو ضروری تو نہیں کہ اسے گھر پر پہن کر خراب کیا جائے' اتنا مہنگا سوٹ تم نے

کچن کے کاموں میں ہی برباد کردینا ہے۔" اس کی گفتگو اب دوسری پٹڑی پر چڑھ گئی۔
زینب خاموشی سے اندر واش روم میں آگئی' کپڑے تبدیل کرکے اس نے خوب رگڑ رگڑ کر اپنا منہ بھی دھو ڈالا۔ اس تمام عمل میں آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے بہہ کر چہرہ بھگوتے رہے۔

☆ ☆ ☆

"بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔"
بے ڈھنگی آواز کے ساتھ ہی شوکے کا بے ہنگم قہقہہ اس کی ساعتوں سے ٹکرایا مارے خوف کے اس کے قدم خود بخود تیز ہوگئے۔
"ارے کیا ہوا' کیوں اس قدر بھاگی جارہی ہو۔"
اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں ہلکان ہوتی ارم نے اسے بازو سے تھام کر روکنا چاہا۔
"کچھ نہیں بس ایسے ہی ڈر گئی تھی۔"
ارم پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ شوکا دور دور تک کہیں نہیں تھا۔ اس کے قدموں کی رفتار خود بخود مدھم ہوگئی۔
"میرا خیال ہے تم اس خبیث شوکے سے ڈر گئی تھیں۔"
"ہاں۔"
اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔
"ارے وہ منحوس تو پیچھے اس بک اسٹال پر ہی کھڑا تھا' تم جانے کیوں ڈر کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ حد ہے۔" ارم کی بات سنتے ہی وہ شرمندہ سی ہوگئی۔
"تم اپنی اماں کو شوکے کی حرکتوں کے بارے میں کیوں نہیں بتاتیں' تاکہ وہ اس کے گھر جاکر اس کی ماں یا باپ سے شکایت کریں' ہوسکتا ہے اس طرح ہی وہ سدھر جائے۔ سنا ہے اس کا باپ کافی سخت آدمی ہے اور وہ اس سے ڈرتا بھی ہے۔"
ارم بے خبر تھی کہ اماں ہر بات جانتی ہیں۔ اس نے بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا' کیونکہ ان تمام باتوں کا کوئی فائدہ نہ تھا' اسی لیے خاموشی سے سنتی رہی۔
"مجھے نہیں لگتا کہ وہ اپنے گھر والوں سے ڈرتا ہوگا۔" کندھے پر ڈھلکتی چادر' اس نے اچھی طرح سر پر جمائی۔
"چلو لعنت بھیجو شوکے پر' یہ بتاؤ امرود کھاؤ گی۔"
سامنے ہی چھابڑی میں امرود سجائے چاچا رمضان اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا تھا۔
"ہاں۔"
اثبات میں سر ہلاتے وہ اس کے ساتھ ہی آگئی۔ ہرے ہرے امرود اسے بہت پسند تھے۔ ارم نے ہی پیسے دے کر امرود خریدے' چھوٹی چھوٹی پلاسٹک کی دو تھیلیاں' ایک اس کی جانب بڑھادی۔ بنا کچھ کہے اس نے خاموشی سے تھیلی تھام لی۔ یہ امرود کی تھیلی اس پر ایک طرح کا قرض تھی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ارم جب بھی اپنی جیب خرچ سے اسے کچھ لے کر دیتی' بدلے میں وہ بھی اسے کچھ نہ کچھ ضرور دے دیا کرتی' ان کی یہ دوستی اسی طرح قائم و دائم تھی۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم پاپا!"

فون کے دوسرے سرے پر یقیناً" ایشال تھا۔ جس کی اتنے دنوں بعد سنی جانے والی آواز نے بھی ملک صاحب کے اندر کی پژمردگی کو دور نہیں کیا۔ انہوں نے فون اپنے کان سے ذرا سا دور کرتے ہوئے ایک ترچھی نظر کچھ فاصلے پر کھڑی اس ہستی پر ڈالی جسے اپنوں میں لے جانے کی خواہش نے انہیں شاید خود بھی اپنوں سے دور کر دیا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا۔"

آہستہ سے جواب دیتے ہوئے انہوں نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔

"پاپا ہم خیریت سے لندن پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے سوچا آپ کو بھی اطلاع کر دوں۔"

دوسری جانب موجود ایشال کا جوش و خروش ان کی سرد آواز نے خاصا کم کر دیا تھا۔

"مما سے میری بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا آپ آؤٹ آف سٹی ہیں۔ اس لیے سوچا آپ سے بھی بات کرلوں۔ آپ بزی تو نہیں تھے۔"

ان کی طویل خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے ایشال نے سوال کیا۔

"ہاں اس وقت میں ایک ضروری میٹنگ میں ہوں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔"

"او کے پاپا ٹیک کیئر اللہ حافظ۔"

ایشال کے فون بند کرتے ہی انہیں اپنی سرد مہری کے احساس نے گھیر لیا۔

"غلطی میری ہی تھی مجھے بنا سوچے سمجھے یہ رشتہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہر شخص خواہ وہ میری اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق دار ہے اور یہ حق اسے اللہ کی طرف سے ملا ہے۔ پھر ہم کون ہوتے ہیں کسی سے اس کا یہ حق چھیننے والے کاش یہ بات مجھے پہلے سمجھ آ گئی ہوتی تو اتنی بھاری ذمہ داری اپنے کاندھوں پر نہ لیتا۔"

انہوں نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا جہاں آف وائٹ سوٹ میں تیار کھڑی وہ انہیں منتظر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"ایشال کی حد تک تو ٹھیک تھا مگر اب اس کا کیا ہو گا جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا ہے میں اس معصوم بچی کو کس طرح بتاؤں۔"

"انکل چلیں دس بجنے والے ہیں۔"

ملک صاحب کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اس نے پکارا۔

"ہاں چلو۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"سکینہ۔ سکینہ۔"

کھڑے ہوتے ہی انہوں نے آواز لگائی۔

"جی صاحب جی۔" سکینہ کچن سے بھاگ کر باہر نکل آئی۔

"اپنا سارا ضروری سامان پیک کر لو تم سب لوگ میرے ساتھ کراچی چل رہے ہو۔"

ان کے اس چھوٹے سے جملے نے وہاں موجود ہر فرد کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑا دی۔

"شکر الحمد للہ۔" سکینہ زیر لب بڑبڑائی۔

ہمیں کب تک جانا ہے؟

جب وہ بولی تو خوشی اس کی آواز سے جھلک رہی تھی۔ اس نے تو پچھلے کئی سالوں سے اپنی زندگی کی ہر خوشی کو اس چھوٹی سی لڑکی کے نام سے منسوب کر لیا تھا۔ جسے اس نے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔

"جلد ہی۔ میرا خیال ہے ایک دو دن تک۔"

جواب دیتے ہوئے وہ باہر کی جانب بڑھ گئے۔
"اپنی اولاد کی خوشیوں کی خاطر مجھے اس بچی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہیے۔"
دماغ میں در آنے والی اس سوچ نے انہیں یقیناً" کسی فیصلے تک پہنچا دیا تھا جس کا اندازہ ان کے چہرے کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اماں کو رات سے پھر بخار تھا۔ اس لیے آج وہ اسکول بھی نہیں گئی' چائے بنا کر بمشکل انہیں ناشتا کروایا اور پھر اپنا مختصر سا ناشتا لیے صحن میں بچھی چارپائی پر آبیٹھی' جب بیرونی دروازہ کھول کر فاطمہ خالہ اندر داخل ہوئیں۔
"کیسی طبیعت ہے اب تمہاری ماں کی؟" اس کے پاس سے گزرتے ہوئے لحہ بھر کو رکیں۔
"بخار بہت تیز ہے۔" اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔
"اللہ بہتر کرے گا۔"
خالہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے دعا کی اور اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا' کچن میں موجود تمام برتن دھونے کے بعد خود بھی اندر کمرے میں ہی آگئی' جہاں فاطمہ خالہ اماں کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ اماں کی طبیعت رات کے مقابلے میں خاصی بہتر نظر آرہی تھی۔
"میں نے آفتاب سے کہا ہے وہ تمہیں آج شام اسپتال لے جائے گا۔" آفتاب ان کے بڑے بیٹے کا نام تھا۔
"اللہ تعالیٰ تمہیں صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ اس بچی کا خدا کے بعد تم واحد سہارا ہو' سوچو اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو یہ غریب کہاں جائے گی۔"
خالہ نے اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ خاموشی سے چارپائی کے نزدیک جا کھڑی ہوئی۔
"نہیں خالہ مجھے اسپتال نہیں جانا' بس ذرا بخار ہے' دوائی لوں گی تو ان شاء اللہ رات تک ٹھیک ہو جاؤں گی۔"
"یہ بخار بار بار کیوں ہو رہا ہے؟ یہ بات تم خود بھی اچھی طرح جانتی ہو۔" فاطمہ کے لہجہ میں پیار بھری خفگی آگئی۔
"بیماری کو نظرانداز کرنے سے بیماری ختم نہیں ہوتی اور نہ ہی کم ہوتی ہے' بلکہ بڑھتی ہے اور اپنی بیماری تم خود بڑھا رہی ہو' اسے مسلسل نظرانداز کرکے۔" اماں کو کیا بیماری تھی وہ سمجھ نہ پائی۔
"میری مانو تو اپنے علاج پر توجہ دو' باقی جو مولا سائیں بہتر کرے ہونا تو وہی ہے' جو اس سوہنے رب نے مقدر میں لکھ دیا ہے' مگر انسان کو اپنے حق میں ہمیشہ اچھے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے' ہمارے رب کا بھی یہ ہی حکم ہے۔"
خالہ میرا ایک کام ہے' اگر آپ کرسکیں تو۔
اماں نے جیسے خالہ کی تمام باتوں کو نظرانداز کردیا۔
"ہاں بیٹا بولو۔۔۔"
"جاؤ ایک کپ چائے بنا لاؤ۔"
اماں نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اسے مخاطب کیا۔ وہ سمجھ گئی اماں اس کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتیں اس لیے خاموشی سے باہر نکل آئی۔ جب وہ چائے لے کر کمرے میں آئی تو اماں نے اپنے قریب رکھا چھوٹا سا پرانا باکس بند کرکے اس کے حوالے کردیا۔
"یہ ٹرنک میں رکھ دو۔"
وہ اس باکس کو ٹرنک میں رکھ کر واپس پلٹی تو خالہ نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ کا ٹکڑا نہایت احتیاط سے اپنے دوپٹے کے

پلو سے باندھ لیا۔

"اچھا بیٹا اب میں چلتی ہوں۔" خالی کپ انہوں نے اس کے حوالے کیا۔

"اگر اس فون نمبر پر میرا رابطہ نہ ہو سکا تو ان شاء اللہ آفتاب کو اس پتے پر ضرور بھیجوں گی' تاکہ وہ وہاں جا کر ان سے خود ملے اور تمہارا تمام حال من و عن بیان کر سکے' مجھے امید ہے اللہ تعالیٰ ضرور کوئی بہتری کی صورت نکالے گا۔ بس تم اس سے اچھے کی امید رکھو۔"

انہیں تسلی دے کر وہ باہر نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

"یاسمین آپا آرہی ہیں۔"

فرہاد نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے اطلاع بہم پہنچائی۔

"اچھا کب۔"

اس کے ہاتھ مریم کا بیگ پیک کرتے کرتے رک گئے۔

"شاید کل شام تک۔"

"خیریت سے آرہی ہیں۔" ان کی آمد کبھی بلا سبب نہ ہوتی تھی۔

"تم ان کے میاں کو تو جانتی ہو' کس قدر بدذات آدمی ہے۔ اپنی زندگی میں خود سکون کرتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو کرنے دیتا ہے۔ ہماری اتنی اچھی نیک اور سیدھی بہن کے نصیب میں یہ ہی گھٹیا شخص رہ گیا تھا۔"

فرہاد ہمیشہ اپنے بہنوئی کے لیے ایسے ہی الفاظ استعمال کرتا جس کی وہ عادی تھی' مگر پھر بھی یہ اس کے سوال کا جواب نہ تھا۔

"جب رشتہ لینا تھا تو ہمارے آگے پیچھے پھرتے تھے اور اب ایسی ماتھے پر آنکھیں رکھی ہیں' جیسے جانتے ہی نہیں۔"

"تو کیا آپا کا کوئی جھگڑا ہو گیا ہے؟" اس تمام تمہید سے اس نے یہ ہی نتیجہ نکالا۔

"نہیں اس خبیث نے اب اپنا کاروبار شروع کرنا ہے' جس کے لیے کچھ رقم درکار ہے۔ وہ لینے آپا کو بھیجا ہے' حالانکہ اس سے قبل صبر انہیں پیسے بھیج چکا ہے۔"

او وہ تو بھول ہی گئی تھی' آپا کی اکثر و بیشتر آمد ایسے ہی کسی مقصد کے لیے ہوتی تھی۔ "اچھا۔"

اس نے خاموشی سے مریم کا بیگ پیک کر کے رکھا۔ آپا کے شوہر سے تو اس کا زیادہ واسطہ نہ پڑا تھا' مگر آپا کی آمد اس کی زندگی میں موجود تھوڑے سے سکون کو ضرور درہم برہم کر دیا کرتی تھی اور یقیناً "اب ایسا ہی ہونے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

"شاہ زین یہاں آؤ۔"

مما نے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

"جی مما۔"

وہ خاموشی سے ان کے قریب آن کھڑا ہوا۔

"یہ لڑکی دیکھو کیسی ہے؟"

لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظر آنے والی لڑکی اس کے لیے قطعی اجنبی تھی۔

"یہ کون ہے؟" اس نے حیرت سے مما کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میری دوست کی بیٹی ہے' بلکہ تمہارے پاپا سے تو ان کی دور کی رشتہ داری بھی ہے۔ ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے۔"

"حیرت ہے' پھر تو میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

"ملاقات بھی ہو جائے گی' پہلے یہ بتاؤ لڑکی کیسی ہے' بڑی قابل ڈاکٹر ہے۔" مما نے لیپ ٹاپ کا رخ مکمل طور پر اس کی جانب کر دیا۔

"اچھی ہے۔"

مختصر سا جواب دے کر اس نے ٹیبل پر رکھا اپنا سیل فون اٹھا لیا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ اب تمہاری شادی کر دی جائے۔"

اس کی طرف سے کیے جانے والے کسی بھی ممکنہ سوال سے ناامید ہونے کے بعد مما نے خود ہی بات آگے بڑھائی۔

"اسی سلسلے میں، میں تمہیں لڑکی دکھا رہی تھی۔ اگر تمہیں پسند ہو تو ہم بات آگے بڑھائیں۔"

بلی تھیلے سے باہر آگئی۔ وہ مما کی باندھی جانے والی تمہید کی وجہ شروع میں ہی سمجھ چکا تھا۔ صرف ان کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

"پلیز مما! آپ اس سلسلے میں کسی کی بیٹی کو کوئی امید مت دلائیں اور نہ ہی مجھ سے پوچھے بغیر کہیں رشتہ دیکھنے جائیں۔ مجھے جب شادی کرنا ہو گی میں خود ہی آپ کو بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے' مگر کب تک۔" مما لیپ ٹاپ بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اور اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو ہمیں اعتراض نہیں' مگر کوشش کرو جو فیصلہ کرنا ہے جلد کرو' میں اب گھر کی تنہائی سے اکتا گئی ہوں۔"

مما کی بات ختم ہوتے ہی حبیبہ کا سراپا چھم سے اس کے تصور میں اتر آیا اور اس کے لب خود بخود مسکرا اٹھے۔

"میں کوشش کروں گا مما! آپ کی یہ خواہش جلد پوری کر سکوں۔"

ماں کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے مکمل یقین دہانی کرائی۔ ایک طرف سے مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ اب اسے صرف حبیبہ سے بات کرنی تھی۔ جس کے لیے وہ موقع کا منتظر تھا۔

✵ ✵ ✵

"تین تین بیٹے دیے ہیں میں نے اس شخص کو' مگر دیکھ لو قدر نہیں۔"

یاسمین آپا نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا۔ تین بیٹوں کی ماں ہونے کا مان ان کے لہجے میں ہمیشہ ہی جھلکتا تھا۔

"جی۔" وہ صرف اس قدر ہی کہہ سکی۔

"اور ایک میرا بھائی ہے' کبھی نہیں سوچا کہ ایک بیٹا بھی ہونا چاہیے۔"

ان کا اشارہ یقیناً" فرہاد کی جانب تھا۔

"بیٹی یا بیٹا کچھ اپنے اختیار میں نہیں ہوتا' یہ سب دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔" اسے یاسمین آپا کی بات خاصی بری لگی۔

"دینے والا تو اللہ ہی ہے' مگر لوگ کب یہ سب سمجھتے ہیں' اب میرے دیور کو ہی دیکھ لو' یہاں تیسری بیٹی پیدا ہوئی وہاں دوسری بیوی کر لی۔"

"ہر شخص آپ کے دیور جیسا نہیں ہوتا۔"

اب ان کے پاس مزید بیٹھنا محال تھا' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں بھئی خوش نصیب ہو' جو فرہاد جیسا شوہر ملا' سیدھا سادہ کسی معاملے میں نہ بولنے والا۔ ایک ہمیں دیکھو ہر وقت کی چخ چخ۔"

وہ ہمیشہ سے ایسی ہی باتیں کیا کرتیں۔

"قبر کا حال صرف مردہ جانتا ہے۔ آپا یا ہر والوں کو سب کچھ ٹھیک اور اچھا نظر آتا ہے۔"
آہستہ آواز میں جواب دیتی وہ کچن میں آگئی' تاکہ رات کے کھانے کی تیاری کر سکے۔

✲ ✲ ✲

اماں گھر آئیں تو خاصی گھبرائی ہوئی تھیں۔ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے دروازے کی کنڈی لگادی۔
"کیا ہوا اماں' کیوں اتنی پریشان ہو؟" وہ تیزی سے ماں کی جانب بڑھی۔
"کچھ نہیں' گلی میں پولیس آئی ہے 'شوکے' کے دوست ارشد علی کو گرفتار کرنے۔"
ماں نے ہاتھ میں تھمی دوائیوں کا لفافہ قریبی ٹیبل پر دھرتے ہوئے اپنی چادر سے منہ پونچھا۔
"پھر کسی کی جیب کاٹی ہوگی یا سائیکل چوری کی ہوگی۔ ان دونوں کا تو یہ ہی کام ہے' مگر تم کیوں اس قدر پریشان ہو رہی ہو۔ اچھا ہے پولیس لے جائے' جان چھوٹے محلے والوں کی۔"
پانی کے کولر سے سلور کا کٹورا لبالب بھرا اور ماں کے قریب آگئی۔
"نہیں اس بار ایسا کچھ نہیں ہے۔" ماں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پانی کا کٹورا تھام لیا۔
"اس بار سنا ہے اس نے شوکے' کے ساتھ مل کر کوئی لڑکی اغوا کی تھی اور پھر دونوں نے مل کر اسے مار دیا۔ لڑکی کی لاش کسی خالی پلاٹ سے ملی ہے۔"
"اوہ۔"
ماں کی دی جانے والی اطلاع نے اسے بھی خوف زدہ کردیا اور یک دم ہی اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہوگیا۔
"اچھا ہے' اب ان دونوں بدمعاشوں کو پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔ کم از کم اس طرح محلے والوں کو تو سکون نصیب ہوگا۔"
"سکون کیسا شوکے' کے باپ کے پاس تھوڑا حرام کا پیسہ ہے' تگ و دو کر کے بیٹے کو چھڑوا لے گا۔"
یہ بات بھی سچ تھی' وہ خاموش ہوگئی۔ سارے خوف کے اس کا دل اب بھی تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔
"آج کتنے ہی دن ہوگئے خالہ فاطمہ کو فون نمبر دیے ہوئے' مگر انہوں نے کچھ بتایا ہی نہیں۔" کچھ سوچتے ہوئے اماں زیرلب بڑبڑائیں۔
"کس کا فون نمبر اماں۔"
وہ چارپائی پر ان کے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔
"ہے میرے ایک قریبی عزیز کا۔"
آج پہلی بار ماں کے منہ سے قریبی عزیز کا لفظ سنا تھا۔ اسے قدرے حیرت ہوئی۔
"سوچ رہی ہوں نکڑ والے پی سی او جاکر انہیں خود ہی فون کرلوں' میرا باکس تو نکال کرلانا' وہ جو لوہے کے ٹرنک میں رکھا ہے۔"
وہ یہ باکس کئی بار وہاں سے نکال کرلائی تھی۔ مگر پھر بھی اماں ہر بار اسے جگہ کی یاددہانی ضرور کرواتیں' اس نے خاموشی سے باکس لاکر ان کے قریب رکھ دیا۔ اماں نے کھول کر اندر سے ایک کارڈ نکالا اور مٹھی میں دباتے ہوئے پھر سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔
"یہ واپس اپنی جگہ رکھ آؤ میں ابھی آتی ہوں۔"
"رکو اماں مجھے بھی ساتھ لے کر جانا میں نے اکیلے گھر میں نہیں رہنا۔"
کچھ دیر قبل والی خبر کا خوف ابھی بھی پوری طرح اس کے اندر پنجے گاڑھے بیٹھا تھا۔ اسے خالی گھر میں ہر طرف شوکے کا ہیولہ دکھائی دے رہا تھا۔ اماں نے رک کر ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

"اچھا آجا مگر اپنی چادر لے کر آنا۔"

اسے ہدایت دیتیں وہ باہر کی جانب بڑھ گئیں۔ وہ تیزی سے باکس اپنی جگہ واپس رکھ کر ماں کے پیچھے لپکی' دروازے کو باہر سے کنڈی لگائے وہ دونوں ماں بیٹیاں صغیر پی سی او آگئیں۔ اپنی زندگی میں پہلی بار وہ اس پی سی او آئی تھی اور شاید زندگی میں پہلی بار اس کی ماں کسی کو فون کرنے آئی تھی۔ ورنہ آج تک وہ یہ ہی سمجھتی رہی کہ ان کا اس دنیا میں کوئی ایسا عزیز نہیں ہے جسے فون کرنے کی کبھی ضرورت پیش آئے۔ پی سی او ررش تھا پردہ لگا کر عورتوں کا حصہ علیحدہ کردیا گیا تھا۔ وہ اندر والے حصے میں جا بیٹھیں۔ چھٹی کا دن تھا۔ گلی میں کرکٹ کھیلتے بچوں کا شور اندر تک سنائی دے رہا تھا۔

"لائیں نمبر دیں۔"

ان سے پہلی والی عورت کے فارغ ہوتے ہی فون کے قریب بیٹھے شخص نے آواز لگائی' ماں نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی پرچی اسے تھمادی۔ دکان والے نے نمبر ملانے کے بعد فون ماں کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ بددلی سے باہر کھیلتے بچوں کو دیکھنے لگی۔ ماں کی طرف سے اس کی توجہ بالکل ہٹ گئی۔ جب اچانک ماں کی نسبتاً" تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"آپ کو کچھ علم ہے' وہ کب تک واپس آئیں گے۔"

ماں کے لہجے میں مایوسی تھی دوسری طرف سے کیا کہا گیا اسے آواز نہ آئی ماں کس سے بات کرنا چاہتی تھی اپنی بے دھیانی میں وہ سن ہی نہ پائی اسے بے حد افسوس ہوا۔

"اچھا میرا کوئی فون نمبر تو نہیں ہے مگر وہ جب بھی آئیں ان سے کہنا میرا فون تھا۔" ماں اتنا کہہ کر رک گئیں۔

"اس نے تو کہا تھا تم زندگی میں جب بھی مجھے پکاروگی میں تمہیں اپنا منتظر ملوں گا۔" ماں کی بڑبڑاہٹ اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"میرا نام..." ماں زیرلب بڑبڑائیں۔

فون کی دوسری جانب موجود شخصیت نے یقیناً" ماں کا نام پوچھا تھا وہ ہمہ تن گوش ہوگئی اسی پل کسی نے دکان کے سامنے موجود آم کے درخت پر پتھر مارا بہت ساری چڑیوں کا تیز شور اس کی سماعتوں سے ٹکرایا "نام میں کیا رکھا ہے۔ ان سے کہنا میں ہفتہ بھر میں پھر سے فون کروں گی ایک ہفتہ تک واپس تو آجائیں گے نا۔"

وہ جاننا چاہتی تھی کہ ماں کس کو فون کر رہی ہے مگر باوجود کوشش کے اسے ناکامی ہوئی ماں نے اپنی مطلوبہ شخصیت کا دوبارہ نام بھی نہ لیا "میرا نام تو شاید اب انہیں یاد بھی نہ ہوگا اس لیے بتانے کا کیا فائدہ۔

چلو پھر ایک ماہ بعد کرلوں گی فون اللہ حافظ۔"

فون بند کرتے ہی انہوں نے مٹھی میں دبے روپے دکان والے کے حوالے کیے' باقی رقم واپس دوپٹے کے پلو میں لپیٹتی اور اسے ساتھ لیے دکان سے باہر نکل آئیں گھر سے پی سی او جاتے سمے ماں کے قدموں میں جو تیزی تھی وہ اب قدرے کم ہوچکی تھی تیز دھوپ میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ماں کی سنگت میں اس نے اپنے گھر کی دہلیز کے اندر قدم رکھ دیے۔

☆ ☆ ☆
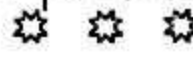
گاڑی کے سگنل پر رکتے ہی اس کی نگاہ دائیں جانب سڑک کے کنارے کھڑے اس لڑکے پر پڑی جس کے ہاتھوں میں تھمے سرخ تازہ گلاب کے پھول دیکھنے والوں کی نگاہوں کو ایک تراوٹ بخش رہے تھے۔

"سر آپ کو کیسے پتا چلا مجھے سرخ گلاب بہت پسند ہیں۔"

کانوں میں حبیبہ کی آواز آتے ہی وہ چونک اٹھا فوراً" اشارے سے اس لڑکے کو اپنے قریب بلایا۔

"یہ سارے پھول پیچھے سیٹ پر رکھ دو۔"

پرس نکال کر ین مانگے ہی کچھ نوٹ اس لڑکے کو تھمادیے جنہیں دیکھتے ہی اس کے چہرے پر پہلے حیرت اور پھر یک دم خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔

"تھینک یو سر" خوشی سے اس نے شاہ زین کو سلوٹ مارا۔

سبز بتی روشن ہو گئی اس نے تیزی سے گاڑی آگے کی سمت بڑھائی وہ جلد از جلد آفس پہنچ کر یہ سارے پھول حبیبہ کو دینا چاہتا تھا تیز رفتاری کے باعث وہ پندرہ منٹ کے لگ بھگ آفس کی پارکنگ میں موجود تھا گاڑی پارکنگ میں چھوڑ کر وہ دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر پہنچا اسے کسی بہانے حبیبہ کو نیچے گاڑی تک لانا تھا وہ آفس میں سب کے سامنے یہ پھول دے کر اس کا کوئی تماشا بنوانا نہیں چاہتا تھا اسے ہمیشہ خدشہ رہتا کہیں وہ کسی چھوٹی سی بات کو لے کر ناراض نہ ہو جائے کیونکہ وہ ایسی ہی تھی' پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ آفس ہال کے بڑے سے داخلی دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا قریب لگے آئینہ میں اپنا اچھی طرح جائزہ لے کر ٹائی کی ناٹ ٹھیک کی تیز تیز چلتی سانسوں کو بحال کیا۔

"السلام علیکم صاحب۔" دروازے پر ہاتھ رکھتے ہی کرم دین اسے دھکیلتا ہوا باہر نکل آیا۔

"وعلیکم السلام"

سر کی جنبش سے سلام کا جواب دیتا وہ اندر داخل ہوا سامنے ٹیبل پر کرن اپنے کمپیوٹر میں مصروف تھی اس سے چند قدم دور حبیبہ کی ٹیبل اس کے وجود سے یکسر خالی تھی ٹیبل کے نیچے موجود کرسی اس بات کی علامت تھی کہ اسے باہر ہی نہیں نکالا گیا۔

"حبیبہ کہاں ہے؟" صاف لگ رہا تھا وہ آج نہیں آئی پھر بھی وہ کرن سے تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

"وہ تو آج نہیں آئی سر۔"

"اوہ۔!" کچھ دیر قبل والی اس کی ساری خوشی یکدم کافور ہو گئی۔

"خیریت۔"

اس کا اشارہ حبیبہ کی غیر حاضری کی سمت تھا۔

"جی سر اس کے ٹرم ختم ہوئے ہیں جس کے بعد اس کی یونیورسٹی تقریباً" دس دن کے لیے بند ہوتی ہے لہٰذا یہ دس دن وہ اپنے چاچا کے ساتھ گزار رہی ہے۔"

اسے حیرت ہوئی حبیبہ نے اسے کل کیوں نہیں بتایا کہ وہ ایک ہفتہ کی چھٹیوں پر جا رہی ہے' شاہ زین نے اپنے آفس میں قدم رکھتے ہی موبائل نکال کر اس کا نمبر ملایا حبیبہ کا سیل آف تھا اس کا خوشگوار موڈ یک دم ہی خراب ہو گیا' جب رات گھر واپس آیا تو سرخ گلابوں کی مہک پوری گاڑی میں پھیلی ہوئی تھی اس کا دل نہ چاہا ان پھولوں کو نکال کر پھینک دے جو خریدنے سے قبل حبیبہ کے نام منسوب کر چکا تھا' گھر آتے ہی اس نے تمام پھول نکال کر ڈرائنگ روم فریج میں رکھ دیے۔

☆ ☆ ☆

ہر انسان کی زندگی میں ایک ٹرننگ پوائنٹ ضرور آتا ہے جس کے بعد اس کی زندگی مکمل طور پر تبدیل ہو جاتی ہے مگر اس کی زندگی میں یہ پوائنٹ دوسری بار آ گیا تھا پہلی بار جب وہ اپنی ماں' گھر بار' سکھی ساتھیوں اور صحن میں لگے پیپل کے بڑے سے پیڑ سمیت سب کچھ چھوڑ چھاڑ ملک صاحب کی سنگت میں چاچا فضل اور آنٹی سکینہ کے ہمراہ اس گھر میں آئی تھی جہاں آنے کے بعد اس کی زندگی یکسر طور پر تبدیل ہو گئی تھی اب ایک بار پھر وہ یہ سب چھوڑ چھاڑ کر کسی دوسری راہ پر گامزن ہونے چلی تھی۔ نہیں جانتی تھی اب اس کی منزل کہاں ہے مگر شاید منزل تو اسے ابھی تک ملی ہی نہیں تھی اس نے خالی خالی نگاہوں سے پورے گھر پر ایک نظر دوڑائی' سکینہ نے اس کا ضروری سامان سب پیک کر دیا تھا یک دم بھی اس کے دل میں ایک ہوک سا اٹھا۔

"چاچا۔ چاچا۔" وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"کیا ہوا بیٹا کیا بات ہے؟" چاچا فضل دین بھاگا ہوا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔
"مجھے اماں کی قبر پر جانا ہے۔"
آج کتنے سالوں بعد ماں کی قبر پر جانے کی خواہش نے دل میں کروٹ لے کر بیدار ہو گئی۔
"اس وقت۔" چاچا نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔
"ابھی تو بیٹا مغرب ہونے والی ہے۔"
"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"
"رات کو اس طرح قبرستان نہیں جانا چاہیے۔" پیکنگ کا کام چھوڑ کر سکینہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"کچھ نہیں ہوتا آنٹی وہاں قبروں میں موجود لوگ تو خود اتنے بے بس ہوتے ہیں کہ باہر نکل کر اپنے پیاروں کے آنسو صاف کرنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتے پھر وہ بیچارے ہمیں کیا نقصان پہنچائیں گے۔"
ماں کی یاد میں اس کا دل دھاڑیں مار کر رونے کو چاہا۔
"اور پھر میں کراچی جانے سے قبل ایک بار اپنا گھر بھی دیکھنا چاہتی ہوں وہ گھر جہاں میری اک عمر اپنی ماں کے ساتھ گزری مجھے فاطمہ خالہ اور ارم سے بھی ملنا ہے مجھے وہ گلیاں دیکھنی ہیں آنٹی جہاں میرا بچپن مدفون ہے۔"
یاسیت اس کے لہجے میں گھلی ہوئی تھی۔
"اچھا میں ملک صاحب سے اجازت لے لوں پھر آپ کو لے چلتا ہوں۔"
فضل دین نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا اور وہ مطمئن ہو گئی مگر رات انکل کی واپسی کے ساتھ ہی اس کا یہ اطمینان بھی رخصت ہو گیا۔
"فی الحال تو تمہاری یہ خواہش پوری کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔"
انہوں نے اک نگاہ اس کے ستے ہوئے چہرے پر ڈالی۔
"کیوں کہ ہمیں کل گیارہ بجے ایئرپورٹ پہنچنا ہے اس سے قبل بہت سارے ایسے کام ہیں جو فضل دین نے نپٹانے ہیں، بہرحال زندگی رہی تو میں بہت جلد تمہیں واپس لا کر ان تمام لوگوں سے ضرور ملوانے لے جاؤں گا ابھی تو پرسوں تمہارا ٹیسٹ ہے یونیورسٹی میں داخلے کے لیے۔"
آنٹی سکینہ نے چونک کر ملک صاحب کی طرف دیکھا۔
"البتہ صبح سویرے سکینہ کے ساتھ قبرستان ضرور چلی جانا کیونکہ یہ ایک ایسا خواہش ہے، جس کے لیے میں تمہیں منع نہیں کر سکتا۔"
"جی۔۔۔"
وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی۔
مطلب کہ منزل ابھی بھی کہیں دور کھڑی تھی اسے یہاں سے جا کر پھر یونیورسٹی میں داخلہ لینا تھا اور جانے ابھی بھی ایشال اسے اپنا شرف ملاقات بخشتا نہیں۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی اور نہ ہی جاننا چاہتی تھی یہ ہی سوچ کر اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا شاید اسی میں اس کی بہتری تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں) ☼

نورِ عین
بکھرے خواب

"نہیں اماں میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں یہ پھیکی پھیکی پیلی دال نہیں کھاؤں گی بالکل نہیں۔" عائزہ نے دال سے بھری پلیٹ اور روٹیوں کی چنگیر پیچھے ہٹاتے ہوئے منہ بسورا۔

"کھالے عائزہ کیوں میرے لیے آزمائش کھڑی کرتی ہے دیکھ تیرا ابا کوئی زمیندار نہیں ہے سبزی کی چھوٹی سی دکان ہے اوپر سے تم پانچ بہن بھائیوں کی ذمہ داری اب اتنے بڑے کنبے کے لیے روز روز مرغ مسلم پکنے سے تو رہا تو کچھ بھی کرلے آج تو تجھے اسی دال سے روٹی کھانے پڑے گی۔" ثوبیہ بیگم نے غصے سے اس کے سر پر ایک چپت لگاتے ہوئے کہا۔

"غلطی ہوگئی مجھ سے جو بھٹک کر تیرے گھر آگئی پتا نہیں میری قسمت میں اس گھر کی دیواروں سے سر ٹکرانا کیوں لکھا ہے۔ ورنہ میرے جیسی لڑکیاں تو پاکستان جیسے ملک میں پیدا ہی نہیں ہوتیں وہ تو انگریزوں کے چمچماتے دیس کی شہزادیاں ہوتی ہیں جو اپنی مرضی سے آزادی کے ساتھ بڑی شاندار زندگی گزارتی ہیں اور ایک میں ہوں کہ دو کمروں کے ٹوٹے پھوٹے مکان میں اپنی مرضی کی چیزیں کھانے کو بھی ترستی ہوں۔" عائزہ نے بھرائی ہوئی آواز میں شکوہ کیا۔

"ہزاروں سے اچھے ہیں کم از کم دو وقت کی روٹی تو نصیب ہے نا اور دیکھ اپنی چٹی چمڑی پر اتنا غرور نہ کیا کر اس نے تو مٹی میں مل جانا ہے۔ صبر شکر سے زندگی گزارے گی تو خود بھی سکھی رہے گی اور ناصر کو بھی سکھی رکھے گی ایک بات یاد رکھنا کبھی رزق کی ناقدری نہ کرنا ورنہ دینے والا اگر غضبناک ہوجائے تو اسی رزق کے پیچھے رول دیتا ہے۔" ثوبیہ بی بی کا لہجہ دبنگ تھا۔

"دیکھ اماں میرے سامنے ناصر کا نام نہ ہی لے وہ صرف میری خالہ کا بیٹا اور تیرا بھانجا ہے نہ تو میں بچپن کی منگنی کو مانتی ہوں اور نہ ہی وہ میرے معیار پر پورا اترتا ہے۔" دبلے پتلے نرم دل سے ناصر کا سراپا اس کی نظروں کے سامنے لہرایا تو وہ ناک چڑھاتے ہوئے خفگی سے گویا ہوئی۔

"اپنی بکواس بند کر عائزہ! کیا کمی ہے ناصر میں اپنا مکان ہے۔ موٹر سائیکلوں کی ورکشاپ ہے محنتی لڑکا ہے تجھے رانی بنا کر رکھے گا تجھ جیسی بددماغ لڑکی کے ساتھ اور کسی کا گزارہ ہونا بھی نہیں اب زیادہ نخرے مت کر اور روٹی کھالے۔" ثوبیہ بی بی نے چنگیر کو عائزہ کی طرف کھسکایا۔

"مجھے اس سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں بلکہ مجھے پاکستان میں شادی کرنی ہی نہیں ہے۔ میں تو کسی ایسے بندے سے شادی کروں گی جو پڑھا لکھا ہو فر فر انگریزی بولتا ہو اور مجھے بیاہ کر اس شہر بلکہ اس ملک سے ہی دور لے جائے ایسے دیس لے جائے جہاں میرے جیسی شہزادیاں بستی ہوں میری خواہشیں منہ سے نکلنے سے پہلے ہی پوری ہوجائیں۔ میں گھوموں پھروں ناچوں گاؤں بس عیش کروں۔ صرف عیش۔" عائزہ نے آنکھیں میچتے ہوئے چہچہا لیا۔

"دفع ہو تجھے روٹی کھانی ہی نہیں ہے میں ہی پاگل ہوں جو تیری منت کررہی ہوں۔" ثوبیہ بی بی نے روٹی اور دال اٹھاتے ہوئے جل کر کہا۔

"اور ہاں جب بھوک لگے تو یہی روٹی کھالینا نئی روٹی پکا کر آٹا ضائع نہ کرنا۔" ثوبیہ بی بی دروازے کے پاس رک کر عائزہ سے مخاطب ہوئیں جس نے ابھی تک آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ دو تین گھنٹے بھوک برداشت کرنے کے بعد عائزہ نے مجبور ہو کر دال سے ہی پیٹ بھرنا ہے۔

"پتا نہیں اس لڑکی کو عقل کب آئے گی۔" اپنے سر پر ہاتھ مارتی ہوئیں وہ دروازہ پار کر گئیں۔

☼ ☼ ☼

"واہ نازو تیری ساس مٹھائی تو بڑی مزے دار لے کر آئی ہیں میں جاتے ہوئے اپنے ساتھ گھر لے کر جاؤں گی۔" عائزہ نے نرم نرم گلاب جامن منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں لے جانا مٹھائی تم سے اچھی تھوڑی ہے بلکہ پھل بھی لے جانا میری ساس پھلوں کا ٹوکرا بھی تو لائی تھیں۔" نازو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھئی تیری تو موجیں ہو گئیں اب تو تجھے تھرڈ ایئر میں داخلہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں دو ماہ بعد تو تو بیاہ کر کینیڈا چلی جائے گی پھر تو بس عیش کرنا اور خوب گھومنا پھرنا۔ شکر منا کہ تیری جان اس لوڈشیڈنگ کے عذاب سے چھوٹ جائے گی ویسے اپنی رشتے والی سے کہنا کہ میرے لیے بھی کوئی ایسا ہی ملک سے باہر سیٹل بندہ ڈھونڈ دے میرے لیے رشتہ ڈھونڈنا تو آسان ہی ہو گا نا جب تیرے جیسی معمولی شکل و صورت ایک مزدور کی بیٹی کے لیے باہر کا رشتہ مل سکتا ہے تو میرے لیے تو کوئی مشکل ہو ہی نہیں سکتی۔" آخری بات دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اس نے مسکراتے ہوئے اگلا گلاب جامن اٹھایا۔

"ہاں بھئی ہاں تیرے لیے بھی کوئی شہزادہ ڈھونڈ لیتے ہیں لیکن ابھی تو تو منگنی کی رسم کے لیے لڑکے والوں کے گھر جانے کی تیاری کر آخر میری سب سے پکی اور خوب صورت سہیلی ہے ذرا لڑکے والوں پر ہمارا رعب بھی تو پڑنا چاہیے نا انہیں بھی تو پتا چلے کہ ہمارے جاننے والوں میں بھی ایک چاند کا ٹکڑا موجود ہے۔" عائزہ کے نرم و ملائم بے داغ چہرے کو دیکھتے ہوئے نازو نے فخر سے کہا تو غرور سے عائزہ کی گردن میں جیسے کلف لگ گیا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں میں نہیں جاؤں گی تو اور کون جائے گا۔" عائزہ تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو منگنی کے دن نازو کے سسرالیوں کی تعریفوں کے ٹوکرے وصول کرتے ہوئے دیکھنے لگی بس آٹوگراف دینے کی کمی تھی۔

☼ ☼ ☼

بلیک شفون کا سوٹ پہنے جس کے گلے اور بازوؤں پر سلور لیس لگی تھی وہ ہلکے ہلکے میک اپ سمیت نک سک سے تیار تھی ریشمی بالوں کو ایک سائیڈ سے سلور پنز لگا کر دوسری سائیڈ پر ایسے ہی کھلا چھوڑ دیا تھا اتنے سے سنگھار سے ہی اس کا روپ لو دینے لگا تھا۔ سلور ہیل والے جوتے پہنے وہ سہولت سے ادھر ادھر گشت کر رہی تھی لوگوں کا مڑ مڑ کر دیکھنا اور نگاہوں میں چھپی ستائش اسے ہواؤں میں اڑائے جا رہی تھی۔

"بیوٹی فل۔" وہ دولہے کو گفٹ دینے کے لیے ذرا سا جھکی جب کوٹ پینٹ پہنے ڈیسنٹ سے دولہا نے ہولے سے کہا۔

اس نے بدک کر پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن اس کے پیچھے خالی اسٹیج اس کا منہ چڑا رہا تھا یعنی فواد نے اسے ہی مخاطب کیا تھا اس کا سارا جسم ٹھنڈا پڑ گیا سر سائیں سائیں کر رہا تھا وہ قدرے کونے میں بیٹھی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس کی دوستوں، رشتہ داروں اور بہنوں نے اسے بارہا خوب صورت کہا تھا لیکن دل کبھی ایسے نہیں دھڑکا تھا پھر آج ایسا کیا ہوا کہ وہ کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپتی ہی چلی جا رہی ہے۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا۔" گمبھیر آواز پر اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو فواد پانی کا گلاس لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"آپ.... لیکن آپ یہاں کیوں آئے سب لوگ کیا سوچیں گے۔" عائزہ نے اسٹیج کی طرف دیکھتے ہوئے گھبرا کر کہا جہاں سب لوگ اب فوٹو سیشن کروا رہے تھے۔

"لوگ کچھ نہیں کہیں گے آپ غالباً نازو کی سہیلی ہیں مجھے فضا نے بتایا تھا۔" اس نے اپنی بہن کا نام لیا۔

"یہ لیں پانی پی لیں پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔" فواد کے نرم لہجے پر عائزہ نے جھجکتے ہوئے پانی کا گلاس تھاما۔

"میں اپنی امی سے بہت اٹیچ ہوں اسی لیے شادی کا فیصلہ بھی ان پر چھوڑ دیا۔ امی نے مجھے نازو کی تصویر تک نہیں دکھائی آپ کو دیکھا تو سوچا کہ آپ کے ذریعے ان سے پیغام رسانی کی جائے اسی لیے آپ کو مخاطب کر بیٹھا لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ آپ میرے ایک لفظ پر یوں بے جان ہو جائیں گی کیا خوب صورت چہروں کو خوب صورت نہیں کہنا چاہیے؟" اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔ "ویسے بھی آج تو مجھے اپنے سسرال والوں کو

جاسئے ان کو سراہنے کا پورا حق ہے۔" فواد نے اس کے سارے اعتراضات کا جواب ہی دے ڈالا۔

"نہیں اصل میں مجھے امید نہیں تھی کہ آپ مجھے اس طرح مخاطب کریں گے یہاں پاکستان میں ایسی باتوں کو معیوب سمجھا جاتا ہے ویسے بھی میں نے کبھی بھائی اور ابا کے علاوہ کسی مرد سے بات نہیں کی بس اس لیے۔ خیر آپ بتائیں آپ کو نازو سے کیا کہنا ہے اور میں آپ کی مدد کیسے کر سکتی ہوں۔" عائزہ اب اپنے آپ کو کمپوز کر چکی تھی سو واپس اپنی جون میں آتے ہوئے بولی۔

"آپ انہیں یہ نمبر دے دیجیے گا ان سے کہیے گا کہ رات دس بجے اس نمبر پر کال کریں مجھے ان سے ضروری بات کرنی ہے۔" فواد نے اس کی طرف کاغذ کا ایک ٹکڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اور بتائیں فواد جی آپ کو کھانے میں کیا کیا پسند ہے۔" عائزہ نے کاغذ کا ٹکڑا بیگ میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔

باتوں ہی باتوں میں کھانا بھی لگ گیا عائزہ اب اس کے مشاغل کے بارے میں بات کر رہی تھی۔

" Please Give Me a Bread "

فواد نے شستہ لہجے میں عائزہ کے قریب پڑے نان کی جانب اشارہ کیا تو وہ جیسے اس کے لہجے اور الفاظ پر فدا ہی ہو گئی۔

"نہیں نازو کی قسمت میں فواد جیسا فر فر انگریزی بولنے والا شخص ہو ہی نہیں سکتا یہ تو میرے خوابوں کا شہزادہ ہے اور اسے میری تقدیر ہی بننا چاہیے۔" گھر واپس آتے ہوئے وہ مسکراتے ہوئے سوچتی رہی اور پھر رات کے دس بجے اس کی انگلیوں نے فواد کا دیا ہوا نمبر ڈائل کیا تھا اسے یہ بتانے کے لیے کہ نازو کو اس سے بات کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔

☼ ☼ ☼

"دنیا میں چمگادڑ کی ایک ایسی قسم پائی جاتی ہے جو سوئے ہوئے انسانوں کو اپنے پروں سے ہوا دے دے کر مدہوشی کی نیند سلا دیتی ہے اور جب شکار بے سدھ ہو جاتا ہے تو اس کا خون چوس کر اسے مار ڈالتی ہے۔"

"اف کیسی کیسی خطرناک باتیں سن رہی ہو جلدی جلدی کھیرے کاٹو میری ساس آنے ہی والی ہوں گی ابھی بیٹھے میں کسٹرڈ بھی تیار کرنا ہے۔" نازو نے ٹی وی بند کرتے ہوئے سستی سے کھیرے کاٹتی عائزہ کو مخاطب کیا۔

"کھیرے تم کاٹو کسٹرڈ میں بنا لیتی ہوں۔" عائزہ نے نازو کو چھری تھمائی۔

"نہیں عائزہ تم رہنے دو پہلے ہی سارا کھانا تم نے تیار کیا ہے اب میٹھا بھی بناؤ گی تو تھک جاؤ گی تم بیٹھے بیٹھے سلاد بنا لو کسٹرڈ میں بنا لوں، ویسے تمہاری اتنی مدد کرنے کا شکریہ ورنہ آج کل کون کسی کے اتنے کام آتا ہے۔" نازو نے چھری اور پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"شکریہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں اور جب میں نے کہہ دیا کہ کسٹرڈ میں بناؤں گی تو پھر میں ہی بناؤں گی۔" عائزہ نے کھڑے ہوئے قدرے رعب دار لہجے میں کہا تو نازو ہنس دی۔

اسی وقت شائستہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔

"واہ بھئی واہ لڑکی ہو تو عائزہ جیسی جتنی خوب صورت اتنی ہی خوب سیرت اگر میرا جواد اتنا چھوٹا نہ ہوتا تو میں اسے اپنی بہو بنا لیتی۔" شائستہ بیگم نے عائزہ کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا تو وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا اٹھی نازو تو جیسے پس منظر میں چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں تو چاہتا ہوں کہ ایک لمحے کی بھی دیر نہ ہو اور تم دلہن بن کر میرے گھر آ جاؤ لیکن تم تو جانتی ہو نا کہ میں اپنی امی کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ نازو سے منگنی تو میرے گلے کی ہڈی بن گئی ہے جو نہ اگلتے بنتی ہے نہ نگلتے۔" فواد نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

"آپ شائستہ خالہ سے بات تو کریں وہ تو مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں وہ مجھے پسند بھی بہت کرتی ہیں چاہیں تو پوچھ کر دیکھ لیں۔" عائزہ نے نزاکت سے کہا۔

"امی اپنے اصول کی بہت پکی ہیں وہ بنا وجہ کے بھی منگنی نہیں توڑیں گی چاہے جو بھی ہو جائے ویسے بھی تم خود ہی سوچو ہم لوگوں کو بلاوجہ منگنی توڑنے کا کیا جواز دیں گے ابھی میری چھوٹی بہنوں اور بھائی کی شادیاں ہونی ہیں ایسے تو میں ان کے راستے کی رکاوٹ بن جاؤں گا۔ کیا تم مجھے منگنی سے پہلے نہیں مل سکتی تھی؟" نواو نے تیز لہجے میں کہا۔

"اور اگر یہ منگنی ٹوٹنے کی کوئی وجہ بن جائے تو۔۔۔" عائزہ کا انداز عجیب سا اسرار لیے ہوا تھا۔

"منگنی ٹوٹنے کی وجہ پھر تو کمال ہو جائے لیکن یہ سب ہو گا کیسے؟" نواو کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا۔

"تو پھر غور سے سنو۔" اب کے عائزہ کا لہجہ کھنکھنا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ لو سارے دلائل میں نے تو شازیہ کو بہت منع کیا تھا مگر اس نے مباحثے میں میرا نام زبردستی لکھ دیا خیر اب جو بھی ہو تیاری تو کرنی ہی ہے نا اس لیے تمہارے پاس چلی آئی آخر کو تم میری پکی سہیلی ہو اس مباحثے کی تیاری تم نہیں کرواؤ گی تو اور کون کروائے گا۔" عائزہ نے مان بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں لیکن مجھے بتاؤ تو سہی کہ مجھے کرنا کیا ہے۔" نازو نے نرم لہجے میں کہا۔

"بحث کا موضوع ہے "ساس رحمت یا زحمت" میں اس کے حق میں دلائل دوں گی جبکہ تمہیں ساس کی مخالفت میں دلائل دینا ہوں گے یہ سارے پوائنٹس تمہارے پاس موجود کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں بس تم نے انہیں تیز لہجے میں بولنا ہے جیسے دوسری اسٹوڈنٹس بولتی ہیں اور میں ساس کے حق میں بولوں گی۔" نازو کو ساری تفصیل سمجھا کر اب وہ اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی موبائل پر ریکارڈنگ کا بٹن دب چکا تھا۔

"ساس تو اللہ کی رحمت ہے گھر کا سکون ہے پھر اسے عزت دینا کیا مشکل ہے۔" عائزہ نے ابتدا کی۔

"رحمت نہیں زحمت ساس تو گھر کا سکون تباہ کرنے والی ڈائن ہے ایسی ڈائن کو عزت کی نہیں موت کی ضرورت ہوتی ہے۔" نازو نے چیخ کر کہا۔ اور پھر اگلے پندرہ منٹ یہ بحث زور و شور سے جاری رہی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تمہیں منگنی پر دیکھا تھا اور اب آج دیکھ رہی ہوں بھئی اتنا حسین چہرہ دکھانے میں اتنی کنجوسی کیوں، مجھے تو جیسے ہی نازو نے فون کیا کہ فضا آئی ہے میں تو سارے کام چھوڑ چھاڑ کر یہاں آ گئی۔" فضا سے گلے ملتے ہوئے عائزہ نے گرم جوشی سے کہا۔

"ہائے اللہ باجی مذاق تو نہ کریں آپ تو خود اتنی پیاری اتنی سوہنی ہیں پھر بھی اتنے بڑے دل والی ہیں۔ حسین لڑکیاں تو اپنے پروں پر پانی بھی نہیں پڑنے دیتیں اور آپ دوسری لڑکیوں کی اتنے کھلے دل سے تعریف کر دیتی ہیں کمال ہے۔" فضا اچھی خاصی متاثر ہو گئی تھی حسین کہلوانا ہر لڑکی کی کمزوری ہوتی ہے پھر فضا کیسے ٹریپ نہ ہوتی۔

"میں سموسے تل کر لاتی ہوں تم دونوں باتیں کرو۔" نازو نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی آج کل تمہاری کیا مصروفیات ہیں۔" عائزہ نے فضا سے سوال کیا۔

"کچھ نہیں باجی چھٹیاں ہیں تو کھانا، پینا، فلمیں گانے دیکھنا اور ڈھیر سارا سونا۔" فضا نے ایک ہی سانس میں اپنا سارا شیڈول عائزہ کے گوش گزار کر دیا۔

"تمہیں گانے پسند ہیں نا یہ لو میرے موبائل پر گانے سنو میرے پاس بہت اچھی کولیکشن ہے تمہیں بہت مزا آئے گا تم میوزک انجوائے کرو میں ذرا نازو کو دیکھ کر آتی ہوں۔" کمرے میں داخل ہوتی ہوئی شائستہ بیگم کو سلام کر کے وہ تیزی سے کچن کی جانب بڑھی۔

"مجھے ایسی لڑکی سے اپنے بیٹے کی شادی نہیں کرنی جو سسرال اور ساس کو زحمت سمجھے غضب خدا کا ایسے اوچھے خیالات ہیں اور ان کو ریکارڈ بھی کروا رکھا ہے' آپ ہمیں منگنی کا سامان واپس کر دیں آپ کا سامان

آپ تک پہنچ جائے گا۔" کمرے سے آتی تیز آوازوں پر نازو اور عائزہ کمرے میں پہنچیں تو شائستہ بیگم گرج رہی تھیں اور حاجرہ بیگم ہکا بکا ان کی الزام تراشیاں سن رہی تھیں۔

"لیکن بہن جی آخر ہوا کیا آپ سے کس نے کہا کہ نازو ایسا سوچتی ہے۔" حاجرہ بیگم منمناتے ہوئے بولیں۔

"اس موبائل فون نے آپ کی بیٹی کے کرتوتوں کا پردہ چاک کیا ہے فضا گانے سن رہی تھی یہ ریکارڈنگ بھی گانوں کی لسٹ میں شامل تھی جس میں آپ کی بیٹی نے اپنے گندے خیالات قید کیے ہیں۔ عائزہ بھی تو اس کی سہیلی ہے ارے جتنی اچھی صورت اتنے ہی اچھے خیالات جس گھر جائے گی اجالا کردے گی اور آپ کی بیٹی وہ تو کسی کے گھر کی روشنیوں کو بھی اندھیروں میں بدل دے۔" شائستہ بیگم کسی صورت چپ کرنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ ساتھ ہی ریکارڈنگ کو پلے بھی کردیا۔ نازو اور عائزہ کی آواز پورے کمرے میں گونجنے لگی۔

"نہیں خالہ ایسا نہیں ہے آپ بے شک عائزہ سے پوچھ لیں یہ تو اس کا کالج میں مقابلہ تھا میں اسے تیاری کروا رہی تھی۔ یہ سب اسی نے مجھے لکھ کر دیا تھا میری توبہ جو میں ایسی باتیں خیال میں بھی سوچوں۔ بتاؤ نا عائزہ خالہ کو یہ سب جھوٹ ہے میں نے جان بوجھ کر ایسا کچھ نہیں کہا۔" شائستہ بیگم کے چہرے کے تاثرات میں نرمی دیکھ کر وہ عائزہ کی جانب گھومی کہ اب وہی اسے اس عدالت سے باعزت بری کروا سکتی تھی حاجرہ بیگم تو جیسے سکتے میں تھیں۔

"نہیں شائستہ آنٹی میں جھوٹ نہیں بول سکتی ہمارے کالج میں کوئی مقابلہ نہیں تھا سوری نازو تمہاری اور اپنی باتیں ڈیلیٹ کردوں مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا لیکن..... آنٹی فضا نازو بدل گئی ہے میں نے اسے سمجھایا تھا کہ تم تو بیاہ کر باہر چلی جاؤ گی پھر اتنی نفرت کیوں تو یہ سمجھ گئی پلیز آنٹی آپ یہ رشتہ مت توڑیں ورنہ لوگ اسے جینے نہیں دیں گے۔" عائزہ نے اب شائستہ بیگم کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے جبکہ نازو بے یقینی اور شدید دکھ کے عالم میں کھڑی بس عائزہ کو دیکھتی جارہی تھی جو شائستہ بیگم کی نظروں میں کوئی عظیم دیوی بن بیٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

"نہیں عائزہ ہم بھلا بنا دیکھے بھالے تمہاری شادی کسی اجنبی خاندان میں کیسے کرسکتے ہیں۔ لڑکا کیا ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ کیا کرتا ہے۔ اس کی عادتیں کیسی ہیں یہ ساری باتیں جانے اور جانچے بغیر ہم تمہارا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں کیسے دے سکتے ہیں اور ویسے بھی حاجرہ بیگم ہماری محلے دار ہیں محلے داری کا لحاظ بھی تو رکھنا ہے۔ اچھا تو نہیں لگتا نا کہ جہاں سے نازو کو انکار ہوا ہے ہم وہاں تیری شادی کردیں' ویسے حیرت کی بات ہے نازو جیسی پیاری بچی کا رشتہ ٹوٹ کیسے گیا حاجرہ بہن تو کچھ بتاتی ہی نہیں۔" ثوبیہ بی بی کا قطعی لہجہ اب ہلکی سی رنجیدگی لیے ہوا تھا۔

"میرا رشتہ خود بخود نہیں ٹوٹا عائزہ نے جان بوجھ کر تڑوایا ہے ثوبیہ خالہ۔" جواب دینے کے لیے منہ کھولتی ہوئی عائزہ نازو کی دھماکے دار انٹری پر جہاں کی تہاں خاموش کھڑی رہ گئی۔

"عائزہ نے۔" ثوبیہ بی بی نے بے یقینی سے عائزہ کی سمت دیکھا تو وہ ان سے نظریں بھی نہ ملا پائی اب وہ شرمندگی سے نازو کے منہ سے اصل قصہ سن رہی تھیں۔

"اور تو عائزہ دیکھ لینا تو کبھی خوش نہیں رہے گی عیار انسان کو خوشی بھی غم کے لحاف میں لپیٹ کر دی جاتی ہے' تو بھی تو چمگادڑ ہے نا عائزہ وہی چمگادڑ جو اپنے پروں کی ہوا سے اپنے شکار کو غفلت کی نیند سلا کر اس کا خون چوس لیتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تو نے میرے ارمانوں کا خون چوس لیا ہے آج فواد کا فون آیا تھا مجھے مجھ سے معافی مانگ رہا تھا اس کا کہنا تھا کہ تم دونوں میں اتنی انڈر اسٹینڈنگ ہوچکی ہے کہ اب وہ تمہارے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرسکتا۔

اس نے مجھ سے اس بات کو راز رکھنے کا وعدہ لیا ہے اور فکر مت کرو میں تمہاری طرح بچ نہیں ہوں جو ہونے والی دلہن کو بدنامی کے اندھیروں میں دھکیل دوں اس "انڈر اسٹینڈنگ" کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گی تجھ سے صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ میرے حوالے سے اب تمہارے منہ سے کوئی بات نہ نکلے ورنہ پھر میرا منہ نہ کھلنے کی کوئی گارنٹی نہیں۔" نازو تحکمانہ انداز میں کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے پتا تھا کہ اب عائزہ محلے داروں میں اس کی ذات کے بخیے ادھیڑنے سے باز آجائے گی اور عائزہ وہ تو یوں خاموش تھی جیسے گونگی ہو۔

"انڈر اسٹینڈنگ مطلب اس کا منگیتر تجھ سے رابطے میں تھا۔" ثوبیہ بی بی کی سرسراتی ہوئی آواز صدمے سے چور تھی اب انہیں قائل کرنے کے لیے عائزہ کو کچھ نہیں کرنا پڑے گا کمرے سے باہر نکلتی ثوبیہ بیگم کے سست قدم اسے بتا چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

" Please Give Me a Water "

میگزین کے چکنے صفحے پر کینیڈا کے دلکش مناظر دیکھتی ہوئی وہ حماد سے مخاطب ہوئی جو اس کے قریب ہی پیڑھی پر بیٹھا اسکول کا کام کر رہا تھا۔

"آپی آپ نے مجھ سے کچھ کہا" حماد نے چونک کر سر اٹھایا۔

"ہاں بھئی تم سے ہی کہا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے ایک گلاس پانی دے دو۔" عائزہ نے کہا۔

"نہیں آپ نے کچھ اور کہا تھا" حماد نے سر کھجایا۔

"الو کہیں کے میں نے یہی کہا تھا لیکن انگلش میں کہا تھا تمہیں تو پتا ہے نا کہ تمہاری بہن اب انگریزوں کے ملک چلی جائے گی اب وہاں اردو میں تو بات نہیں ہو سکتی نا انگریزی میں گٹ پٹ کروں گی تو بات بنے گی اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ تم سے انگریزی میں بات کیا کروں میری بھی پریکٹس ہو جائے گی اور تمہاری انگریزی بھی اچھی ہو جائے گی' آخر تمہیں بھی تو پڑھ لکھ کر کینیڈا ہی شفٹ ہونا ہے اس لیے ابھی سے انگریزی سیکھ لو اچھا رہے گا۔" عائزہ کا لہجہ فخر اور غرور سے چور تھا۔

"نہ بھئی نہ مجھے کینیڈا نہیں جانا میرے سارے دوست یار تو یہاں ہیں میں وہاں جا کر کس کے ساتھ کھیلوں گا۔" حماد نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

"ارے بے وقوف وہاں کینیڈا میں تو کسی دوست یار کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اتنی پیاری سڑکیں پارک اور سینما ہیں کہ بس وہ تو جنت ہے جنت ویسے بھی تجھے ابھی تھوڑا جانا ہے بڑا ہو گا پڑھے لکھے گا تب ہی جائے گا نا" عائزہ نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی۔ "چل چھوڑ یہ سب یہ دیکھ ایسا ہو گا میرا کینیڈا۔" عائزہ نے میگزین کا رخ اس کی طرف کیا تو کچھ دیر کے لیے تو وہ بھی ٹرانس میں آگیا۔

جس وقت ثوبیہ بی بی بڑی سی چادر لپیٹے گھر میں داخل ہوئیں وہ دونوں بہن بھائی ذوق و شوق سے میگزین کی ورق گردانی کر رہے تھے۔

"آہا اماں آگئیں' اماں دیکھو نا کینیڈا کتنا پیارا ہے میں بھی کینیڈا جاؤں گا" حماد نے شوق کے عالم میں کہا تو چادر تہ کرتی ثوبیہ بی بی کے ہاتھ رک سے گئے۔

"چپ کر کوئی نہیں نہیں جا رہا تو جا فریج سے مجھے ٹھنڈا پانی لا کر دے پیاس سے حلق خشک ہو گیا ہے۔" ثوبیہ بی بی نے درشت انداز میں کہا۔

"تو بیٹھ حماد پانی میں لاتی ہوں۔" عائزہ تیزی سے کھڑی ہوئی۔

"نہیں مجھے تیرے ہاتھ سے پانی جیسی نعمت نہیں لینی' جا حماد پانی تو لے کر آ۔"

"اگلے مہینے کی بیس تاریخ کو تیری شادی ہے تیاری کر لے اور ہاں نکاح اسی جمعے ہی ہو گا فواد کو تیرے کاغذات بھی بنوانے ہیں اور میں نے نازو کا رشتہ ناصر سے طے کروا دیا ہے اگلے مہینے کی دس تاریخ کو اس کی رخصتی ہے اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لینا تاکہ تیری زندگی میں دکھ بسیرا نہ کریں۔" گھونٹ گھونٹ پانی پیتی ثوبیہ بی بی کے لہجے میں تھکن ہی تھکن تھی

آخر عائزہ ان کی اپنی بیٹی تھی لاکھ ناراضی سہی وہ دل سے تو یہی چاہتی تھیں ناکہ اس کی زندگی میں کبھی کوئی غم نہ آئے۔

☼ ☼ ☼

"ماشاء اللہ ماشاء اللہ میری بہو تو چاند کا ٹکڑا ہے لا تو ذرا تیری نظر اتار دوں۔" شائستہ بیگم نے اس کے اوپر سے لال مرچیں وارتے ہوئے کہا۔

"ماں میں بھی آپ کا بیٹا ہوں اور خوب صورت بھی ہوں بہو کے آنے سے تو آپ مجھے بھول ہی گئی ہیں۔" عائزہ کے بجے سنورے روپ کو دیکھتے ہوئے فواد نے ماں سے شکوہ کیا۔

"ارے کیسی باتیں کر رہا ہے ادھر آ تیری نظر بھی اتاروں اور ہاں ذرا جلدی آجانا ابھی بہو کے جوتے اور زیورات کی پیکنگ کرنی ہے اور فواد یاد آیا باہر جاتے ہی تم نے مجھے چار لاکھ روپیہ بھجوانا ہے۔ شادی پر قرض لیا تھا تب ہی تو اتنی دھوم دھام سے شادی ہوئی ہے میں وہ قرض اتار لوں پھر فضا کے لیے جہیز اکٹھا کرنا ہے۔

پتر عائزہ اپنی ماں کو میرا اسلام کہنا اس سے کہنا کسی دن ہمارے گھر کا چکر بھی لگا لے پرسوں تم نے کینیڈا چلے جانا ہے پھر تو ملاقات کے لیے کوئی بہانہ بھی نہیں رہ جانا۔" شائستہ بیگم نے فواد کے سر سے مرچیں وارتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

"تو نے تو نازو سے معافی بھی نہیں مانگی حالانکہ تجھے کتنا سمجھایا تھا خیر اللہ نے اس کے نصیب بھی بڑے اچھے جگائے ہیں ناصر نے اسلام آباد میں دکان خرید لی ہے اب وہ سبھی اسلام آباد شفٹ ہو رہے ہیں میں نے تیری طرف سے معافی مانگی تھی اس نے ہنستے ہوئے مجھے گلے لگایا وہ بہت خوش ہے۔ بہت خوش۔" ثوبیہ بی بی دل سے مطمئن تھیں۔

"لو ہو لماں تو کیا نازو نازو کرتی جا رہی ہے فواد نے اس سے معافی مانگ تو لی تھی ویسے بھی فواد جیسا انسان میرے جیسی فیشن ایبل اور پڑھی لکھی لڑکی کے ہی قابل تھا اس کا میرا جوڑ تھا تو یہ سب کچھ ہوا نا۔ تو مجھے یہ بتا کہ کھانے میں کیا بنا ہے۔" عائزہ نے لاڈ سے پوچھا۔

"مرغی بنائی ہے اور وہی بھلے بھی ہیں کہو تو روٹی ڈال دوں۔" ثوبیہ بی بی کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔

"او نہوں لماں تیرا داماد انگریز ہے انگریز اسے یہ پاکستانی کھانا کہاں پسند آئے گا وہ تو برگر کھانے کا شوقین ہے ابا سے بول KFC سے لیتا آئے پرسوں فواد مجھے KFC لے کر گیا تھا کیا مزے کا برگر تھا سچ یہ انگریزی کھانے بھی نا۔ یہ لے ابا کو فون ملا دیا ہے بات کر لے۔" عائزہ نے اپنا موبائل ثوبیہ بی بی کی طرف بڑھایا جسے انہوں نے تقریباً کھینچ کر پکڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ویلکم تو کینیڈا فواد! یہ بھابی جی ہیں نا پر نام بھابی جی۔" گھنی داڑھی مونچھ والے آدمی نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا وہ تھوڑا ڈر کر فواد کے لمبے چوڑے وجود کی اوٹ میں ہو گئی۔

"ڈرو نہیں عائزہ یہ بھلسکبھو ہیں ہمارے ساتھ گھر شیئر کرتے ہیں سکھ ہیں اور بہت اچھے بھی ہیں یہاں کینیڈا میں ہمیں اکٹھے رہتے کئی سال ہو گئے ہیں ان کی دو پیارے پیارے بچے بھی ہیں ابھی تو بھابی اور بچے چھٹیاں منانے بھابی کی بہن کی طرف گئے ہیں وہ آئیں گے تو تمہیں ملواؤں گا تمہیں یقیناً اچھا لگے گا۔" فواد نے تفصیل سے سمجھایا تو اس نے جھجکتے ہوئے آداب کہا۔ بھلسکبھو انہیں ٹیکسی میں بٹھا کر خود واپس جا چکے تھے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی وہ جیسے چابی سے بولنے والی گڑیا بن گئی۔

"ہائے اللہ جی یہاں کی سڑکیں کتنی پیاری ہیں۔ اف اللہ عمارتیں تو دیکھیں کتنی بڑی بڑی ہیں۔ ہائے فواد میں بھی ان گوریوں کی طرح پینٹ شرٹ پہنا کروں گی۔" عائزہ کا جوش ٹیکسی کی رفتار کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور فواد وہ مسکرا مسکرا کر اس کی باتوں کے جواب میں بس سرہلائے جا رہا تھا کہ وہ اسے بولنے کا موقع ہی کہاں دے رہی تھی۔

گھر تک پہنچنے سے پہلے اس کی آنکھوں نے ڈھیروں سپنے بن لیے تھے اور اسی کا محل گھر پہنچتے ہی دھڑام سے ڈھے گیا تھا۔

"یہ ہمارا گھر ہے" فواد نے دروازہ کھولا تو وہ مٹھی میں بھینچے دل کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ وہ گھر تو نہیں تھا وہ تو شاید مرغیوں کا کوئی ڈربا تھا جسے لمبائی چوڑائی اور اونچائی میں تھوڑا بڑھا دیا گیا تھا ایک سائیڈ پر کچن کاؤنٹر تھا اور یک کونے میں بڑا سا میٹرس' ایک طرف چھوٹا سا اٹیچ باتھ روم تھا اور بس میٹرس کے اوپر لگی لکڑی کی دو دراز میں سے ایک پر فواد نے سارا سامان رکھ دیا دوسری پہلے ہی سامان سے بھری ہوئی تھی۔

"آؤ نا عائزہ یہ ہمارا گھر ہے اور تمہیں اس کو بسانا ہے۔ تم فریش ہو جاؤ میں کھانے کے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔" عائزہ کی دلی کیفیت اور دل میں اٹھتے سوالات سے بے خبر وہ نارمل سے انداز میں بولتا ہوا باہر نکل گیا اور پھر عائزہ کے سوالات کا اس نے بڑی مدلل طریقے سے جواب دیا تھا۔

"میں نے کب کہا تھا کہ میں کینیڈا میں کوئی بڑا کام کرتا ہوں' محنت مزدوری کرتا ہوں یہ ناجائز تو نہیں ہے اور پھر اپنے زور بازو سے میں اتنا کمالیتا ہوں کہ مجھے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑتا ہے' یہاں پر اس سے اچھی رہائش گاہ میں افورڈ ہی نہیں کر سکتا ابھی شادی پر لیا ہوا قرض اتارنا ہے فضا کی شادی کرنی ہے پاکستان میں پورے گھر کو نئے سرے سے بنانا ہے جب یہ سب ذمہ داریاں پوری ہو جائیں گی تو پھر تمہیں خوب عیش کرواؤں گا لیکن اس کے لیے تمہیں آٹھ دس سال انتظار کرنا پڑے گا ویسے اگر تم چاہو اور میرا ساتھ دو تو یہ ساری ذمہ داریاں دو تین سالوں میں بھی پوری ہو سکتی ہیں۔"

فواد نے اس کو بہتر مستقبل کا خواب اور راستہ دونوں ہی دکھا ڈالے تھے اور وہ اس خواب کو سچ کرنے کے لیے اس کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئی لیکن وہ کیا کرے گی اس کا فیصلہ اس نے فواد پر چھوڑ دیا تھا اور پھر اگلے دو دن مستقبل کی پلاننگ کرتے گھومتے پھرتے بڑی سہولت سے کٹے تھے۔

☆ ☆ ☆

"سو بھئی عائزہ تیار ہو جاؤ آج ہم نے کام پر جانا ہے میں نے تمہاری نوکری کی بات کرلی ہے۔" اس دن فواد صبح منہ اندھیرے ہی گھر سے باہر نکل گیا تھا اور اب خوشی خوشی چابی جھلاتا گھر میں داخل ہوا۔

"سچ نوکری مل بھی گئی وہاں پاکستان میں تو بڑی بے روزگاری ہے۔ M-A پاس لوگ بھی نوکری کے لیے جوتیاں چٹخاتے رہتے ہیں مان گئی میں فواد کینیڈا واقعی کینیڈا ہے۔" عائزہ تیزی سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی اور پھر پھرتی سے ناشتا کرنے اور کپڑے بدل کر ہلکا ہلکا میک اپ کرنے کے بعد وہ بالکل تیار تھی۔

"عائزہ تم نے اتنے نئے کپڑے کام پر جانے کے لیے پہن لیے۔" گھر کے دروازے کو لاک کرتے ہوئے فواد نے ہولے سے کہا۔

"ہائے تو کام پر پرانے کپڑے پہن کر جاتی آپ بھی نا عجیب سی باتیں کرتے ہیں۔" عائزہ نے ماتھے پر ہولے سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"مزے کی بات یہ ہے کہ ہمیں کام پر جانے کے لیے ٹیکسی یا بس کا استعمال نہیں کرنا پڑے گا یونہی ہنستے کھیلتے باتیں کرتے کام پر چلے جایا کریں گے۔" فواد نے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ویسے دوپہر کو کھانے میں کیا بناؤں۔" عائزہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"دوپہر کا کھانا تو کام کرنے کے دوران وہی لوگ دے دیتے ہیں۔" فواد نے اپنے پاؤں میں پڑے پتھر کو ٹھوکر ماری۔

"تو پھر رات کو کھانے میں کیا بنے گا۔" عائزہ نے ایک نیا سوال کیا۔

"آج بھاسکیھو بھی واپس آ رہے ہیں شاید بھابھی ہمارے لیے کچھ بنا کر رکھ جائیں۔" فواد نے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

"بنا کر رکھ جائیں لیکن انہیں کہاں جانا ہے۔"
عائزہ نے حیرت سے پوچھا۔

"بھاسکبھیر اور ان کی بیگم وہیں قریب کے اسکول کی صفائی ستھرائی کا کام کرتے ہیں شام چار بجے سے رات دس بجے تک ان کی ڈیوٹی ہوتی ہے ان کے بچے بھی وہیں پڑھتے ہیں رات کو وہ وہیں اسکول میں ہی سو جاتے ہیں پرنسپل نے خصوصی اجازت دی ہے۔ صبح دس بجے وہ گھر آجاتے ہیں شام کو چار بجے پھر سے کام پر چلے جاتے ہیں۔" فواد نے اسے تفصیل سے ساری بات سمجھائی۔

"پھر تو ہمارا ان سے آمنا سامنا ہی نہیں ہوگا ایسی صورت حال میں وہ ہمارا رات کا کھانا ہم تک کیسے پہنچائیں گے گھر بھی لاک ہے اور چابی بھی ہمارے پاس ہے۔" عائزہ نے حیرانی سے پوچھا وہ بھاسکبھیر کو فواد کا پڑوسی سمجھ رہی تھی۔

"ارے بھئی گھر کی ایک چابی سکبھیر بھا کے پاس بھی تو ہے آخر وہ گھر ان کا بھی تو ہے۔" فواد نے گویا دھماکا کیا۔

"ان کا گھر کیا مطلب۔" عائزہ اب کے رک کر بولی۔

"بھئی مطلب تو صاف ہے صبح دس بجے سے شام چار بجے تک وہ گھر ان کا ہوتا ہے میں ان سے کرایے کا تیسرا حصہ وصول کرتا ہوں یہاں پر سبھی لوگ ایسے رہتے ہیں ویسے بھی ہم لوگوں نے شام پانچ بجے ہی گھر جانا ہوتا ہے دیکھا جائے تو ہم فائدے میں جا رہے ہیں میں شاید تمہیں پہلے بتانا بھول گیا۔" فواد کا انداز ہلکا پھلکا تھا جبکہ عائزہ کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو چکا تھا اس کا گھر جسے اس نے بڑی مشکل سے اپنا تسلیم کیا تھا وہ بھی اپنا نہیں تھا اس گھر کو کوئی اور بھی شیئر کرتا ہے یہ تصور ہی اس کے دل کو عجیب سی تنگی سے روشناس کروا رہا تھا۔ اس کا مقدر اسے کہاں لے کر جا رہا تھا شدید صدمے کے زیر اثر وہ بنا کوئی سوال جواب کیے اس کے ساتھ چل دی۔

"جاوید بھائی یہ میری بیوی ہے اسے بھی جھاڑو دے دیں میں اسے کام سمجھا دیتا ہوں۔" لال رنگ کی چھوٹی سی جیکٹ پہنتے ہوئے وہ اپنے سامنے کھڑے کرخت سے شکل والے آدمی سے بولا وہ دونوں میاں بیوی اس وقت ایک کیبن نما کمرے میں کھڑے تھے جہاں ہر طرف جھاڑو ہی جھاڑو پڑے تھے اور دیواروں پر ویسی ہی لال رنگ کی جیکٹیں ٹنگی تھیں جیسے فواد نے اس وقت پہن رکھی تھی۔

"جھ جھ۔ جھاڑو لیکن جھاڑو کا نوکری سے کیا لینا دینا آپ چلیں جلدی کریں ہمیں کام سے دیر ہو رہی ہے مذاق پھر کسی دن کر لیجیے گا۔" عائزہ تیزی سے اس کا بازو کھینچتی ہوئی بولی۔

"ہمیں یہی کام کرنا ہے عائزہ میں برسوں سے ان سڑکوں پر جھاڑو پھیر رہا ہوں یہ پاکستان اور انڈین لوگوں کی کمیونٹی ہے یہ لوگ اچھے خاصے پیسے بھی دے دیتے ہیں جو تنخواہ کے علاوہ ہوتے ہیں اور کھانا بھی اور اگر کبھی انہیں کوئی ذاتی کام پڑ جائے پھر تو موج ہو جاتی ہے اتنے پیسے ملتے ہیں کہ تنخواہ کم لگنے لگتی ہے۔" اب فواد کیبن کے باہر کھڑا عائزہ کو سمجھا رہا تھا۔

"آپ یہاں جھاڑو لگانے کا کام کرتے ہیں آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا اتنا غلیظ کام۔" عائزہ بولتے بولتے سانس لینے کے لیے رکی۔

"لیکن نہیں میں یہ کام نہیں کروں گی پڑھی لکھی ہوں کوئی باعزت کام بھی کر سکتی ہوں لیکن یہ کام نہیں۔ بالکل نہیں۔"

"پانچ جماعتیں پاس انسان کو کسی دفتر میں تو کام ملنے سے رہا اور میں یہ کام کر کے پاکستانی اکیسویں گریڈ کے افسر سے بھی اچھا کما لیتا ہوں اور یہ کوئی غلیظ کام نہیں ہے یہ کون سا پاکستانی سڑکیں ہیں جو دھول مٹی اڑاتی ہیں بس جھاڑو دکھانے کی دیر ہوتی ہے اور سڑکیں شیشے کی طرح چمکنے لگتی ہیں۔

ویسے بھی تم نے خود مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تھا تمہیں میرے کام سے مطلب ہے یا مجھ سے۔ ابھی بھی دیر نہیں ہوئی اگر تمہیں میرا ساتھ قبول نہیں تو میں تمہیں ابھی آزاد کر دیتا ہوں۔" فواد کے چہرے پر

نصے کے رنگ بڑے واضح تھے۔

"نہیں۔ میں نے ایسا کب کہا مجھے آزادی نہیں چاہیے بس مجھے یہ کام نہیں کرنا میں کچھ اور کرلوں گی۔" عائزہ نے دہل کر کہا جانتی تھی کہ اپنی مرضی کی شادی کر کے وہ اپنے میکے میں ناراض ہو کر جانے کا راستہ مسدود کر چکی ہے۔

"تم جیسی خوب صورت بیوی کو اکیلے کسی کام پر بھیجنا خود ایک بڑی مصیبت ہے یہ کھلا ڈلا معاشرہ تمہیں کہیں کا نہیں رہنے دے گا کام تو تمہیں یہ ہی کرنا ہو گا یہ لو جیکٹ پہنو جھاڑو پکڑو اور شروع ہو جاؤ میں ذرا دوسری کالونی کو صاف کر آؤں اور ہاں کام کو دل سے اور دیانت داری سے کرو تو ہر کام بڑا ہوتا ہے۔" فواد نے اس کو جھاڑو اور جیکٹ تھماتے ہوئے آخری بات قدرے نرمی سے کہی تھی۔

ایکسکیوزمی کی آواز پر سڑک پر جھاڑو لگاتی عائزہ نے مڑ کر دیکھا وہ شاید کوئی انڈین خاتون تھی جو اسے پکار رہی تھی اس کے گلے میں منگل سوتر تھا۔

"جی فرمایئے۔" عائزہ نے تھکے تھکے انداز میں پوچھا۔

"مجھے گھر پر کچھ کام ہے تم کرو گی۔" خاتون نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اے لڑکی کیا سوچنے لگیں اگر کام نہیں کرنا تو بتا دوں۔ میں کسی اور سے کروالوں گی ویسے سوچ لو میں تمہیں دس ڈالر دوں گی اور کھانا بھی ملے گا۔" خاتون نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پیشکش کی۔

"کھانا۔" عائزہ کو اچانک بھوک کے شدید احساس نے دبوچا تھا اگلے ہی لمحے وہ اپنا جھاڑو اٹھائے جانے کے لیے تیار تھی۔

"please give me a bread Madam"

وہ اندر جانے کو تھی جب اس جیسی لال جیکٹ پہنے ایک لڑکا وہاں آپہنچا۔

"Ok please wait" وہ خاتون لڑکے کی بات کا جواب دیتے ہوئے عائزہ کو گھر کے اندر لے آئی وہ لڑکا شاید ان کا مستقل خدمت گزار تھا۔

"یہاں پر تو بھی ایسے ہی بات کرتے ہیں۔ اور میں کبھی نہ جانے فواد کتنا پڑھا لکھا ہے۔" اپنی عقل پر ماتم کرتے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوئی تو کام کی نوعیت جان کر اسے دھچکا لگا تھا اسے واش روم صاف کرنا تھا اپنے گھر میں اس نے کبھی واش روم صاف نہیں کیا تھا اور یہاں غیروں کے لیے اتنا غلیظ کام کرنا پڑ رہا تھا اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ صاف انکار کر کے پلٹ جائے لیکن پیٹ کی بھوک بڑی ظالم چیز ہے سو متلاتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اس نے بڑی دقتوں سے مشکل کا یہ پہاڑ عبور کیا اور سارا وقت اپنی قسمت کو کوستی رہی اور جب ایک گھنٹے بعد وہ گھر سے باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹی پھوٹی کٹوری تھی جس میں پتلی سی بے رنگ دال بھری تھی بھلا جمعداروں کو کوئی گھر کے ٹیبل پر کھانا تھوڑی دیتا ہے وہ بے صبری سے وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھ میں پکڑی روٹی کو دال میں ڈبو ڈبو کر کھانے لگی۔

ابھی چار پانچ نوالے ہی حلق سے اترے تھے جب اس کا نوالے سے بھرا ہاتھ منہ تک جاتے جاتے رک گیا۔

یہ تو وہی دال ہے جسے کھانا وہ پسند نہیں کرتی تھی اور اب اتنی ذلت بھری روٹی اور وہ بھی اسی دال کے ساتھ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

"نہیں تانو میں چمگادڑ نہیں۔ بالکل نہیں ہوں بھلا میں وہ الو کی چمگادڑ ہو بھی کیسے سکتی ہوں وہ چمگادڑ تو میرا لالچ تھا جس نے پہلے مجھے سہانے خوابوں کی ٹھنڈی ہوا سے مدہوش کر دیا اتنا مدہوش کہ میں اچھے برے کی تمیز ہی کھو بیٹھی اور جب میں غفلت کی نیند سو گئی تو میری عزت نفس اور وقار کا خون پی ڈالا اس لالچ نے مجھے اپنے والدین کو پکارنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا خواب بھری آنکھوں کے لالچ کی خطرناک چمگادڑیوں ہی سارے راستے مسدود کر دیا کرتی ہے تم ہی بتاؤ تانو چمگادڑ کون ہے؟ میں یا میرا لالچ۔" زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

صدف ریحان گیلانی

بے فکر چہرے ' پر فکر چہرے ' جھنجلائے چہرے ' مسکرائے چہرے کوئی بے زار کوئی خوش باش صورت ' کوئی گھبرایا ہوا کوئی مطمئن سا کوئی تھکا ہوا تو کوئی تازہ دم ' بے پناہ لوگوں کا ہجوم تھا میرے اردگرد اور وہ میرے ساتھ تھی کبھی میرے ہم قدم کبھی میرے آگے کبھی میرے پیچھے حسب عادت پٹر پٹر زبان چل رہی تھی کبھی اس کی آواز میرے کانوں کے پردے پھاڑنے لگتی تو کبھی مدھم ہو جاتی۔

"تم اپنی زبان تالو سے لگا کر نہیں چل سکتیں۔" میں اس کے بے تکان بولنے پر چڑ گیا تھا آس پاس سے گزرتے لوگ بھی اس کی اونچی آواز کے باعث ہمارے طرف متوجہ ہوتے میں بے زار ہو رہا تھا اکتا کر اسے ڈپٹ دیا۔

وہ ایک ساعت کو چپ ہوئی پھر کھلکھلا کر ہنسی۔ ـــــ بھیڑ میں ' بے ہنگم شور اور اس کی کھنکتی چوڑیوں سی ہنسی ' بے ساختہ کئی گردنیں ہماری جانب گھومی تھیں اور بے اختیار میرا دل چاہا تھا اس بدتمیز لڑکی کو ایک ہاتھ رسید کر دوں۔

"ہنس کیوں رہی ہو پاگل ہو گئی ہو کیا؟" میری بے زاریت نقطہ عروج تک جا پہنچی تھی۔ اس نے بمشکل تمام اپنی ہنسی پر قابو پایا تھا۔ جگر جگر کرتی آنکھیں ' سرخ پڑتے عارض اور گھرے بھنور مجھے اس سے نظر چرانا پڑی ' ہنستی ہوئی وہ اتنی پیاری لگتی تھی کہ میں نا چاہتے ہوئے بھی نظر پھیر لیتا اس ڈر سے کہ کہیں اسے میری نظر ہی نہ لگ جائے۔

میں غصے سے تن فن کرتا تیزی سے دو چار قدم آگے بڑھ گیا۔ جب مڑ کر دیکھا تھا تو وہ میرے ساتھ نہیں تھی۔

اور میرا دل دھک سے رہ گیا

بے پناہ لوگ تھے بے انتہا بھیڑ اور ان میں وہ کہیں کھو گئی تو ـــــ میں دیوانہ وار پلٹا تھا۔ لوگوں کو دھکیلتا ' جم غفیر چیرتا ' ادھر ادھر دیکھتے ہوئے۔ دل دھڑ دھڑ کیے جا رہا تھا۔ اس کے کھو جانے کا تصور ہی سوہان روح تھا۔ جو میری رگوں سے جان نکال ـــــ رہا تھا اک لمحہ میں ہی میری حالت دگرگوں ہو گئی تھی قبل اس کے کہ میں چیخ اٹھتا وہ اک اسٹال پر کھڑی نظر آئی تھی۔

"او گاڈ۔" اسے دیکھتے ہی میری رکتی سانس بحال ہوئی ' رگوں میں جمتا خون پھر سے دوڑنے لگا میں نے لپک کر اس کا بازو جکڑ لیا تھا۔

"کیا ہوا؟؟" اس کی صورت ویسی ہی بے فکر اور پرسکون تھی جبکہ میرے چہرے کی رنگت یقیناً" اڑ چکی تھی جسے اس نے بھی محسوس کیا ' بھی مسکراتی نظریں مجھ پر مرکوز کیے مختصر سوال کیا تو میں اپنے حواس یکجا کرتے بے ساختہ اس خوف کا اظہار کر گیا۔

"اتنا رش ہے پلیز دینا میرے ساتھ رہو ' خدا ناخواستہ تم کھو گئیں تو ' پتا ہے ابھی ایک پل میں کیا قیامت گزر گئی مجھ پر میں تو سمجھا کہ تم ـــــ"

"او ہو تم سمجھے کہ میں اس رش کی نذر ہو گئی کمال کرتے ہو حدید ' اتنی ہی بچی ہوں نا میں کہ اس بھیڑ میں کھو جاؤں گی اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ ارے بابا اچھی خاصی سمجھدار ہوں اگر یہاں تم سے بچھڑ بھی گئی نا تو گھر تک با آسانی پہنچ جاؤں گی اپنا شہر ہے ' سارے راستے میرے دیکھے بھالے ہیں۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔ اور ادھر توجہ کرو مجھے یہ سوٹ لے دو دیکھو تو کتنا پیارا ہے۔" وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہی تھی اور میں چلا!

اٹھا تھا۔

"اف خدا! مزید ایک سوٹ اور اب بس کرو میری جیب کی دشمن۔"

"لے دونا' پلیز۔" وہ جس ادا سے بولی۔

میں بس اسے تکتا رہ گیا تھا۔

"اوئے ہیرو کدھر گم ہے؟" ایک زور دار ہاتھ میرے شانے پر پڑا تھا اور سارا طلسم ٹوٹ گیا تھا ہجوم میرے آس پاس جوں کا توں تھا مگر وہ کہیں نہیں تھی میں نے بے طرح جھنجلاتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ ہارون کی اکتائی صورت نگاہوں کے سامنے تھی۔ ماتھے پر بل ڈالے مجھے گھور رہا تھا۔

"اوئے آخر مسئلہ کیا ہے تیرے ساتھ' یہ تو چلنے

چلتے کہاں گم ہو جاتا ہے؟ کوئی چوتھی بار مراقبے میں گیا ہے تو' دیکھ بندے واپتر بن کے چل' نظر نہیں آرہا کتنا رش ہے یہاں' اگر تو اِدھر اُدھر ہو گیا تو کہاں ڈھونڈتا پھروں گا تجھے پہلے ہی میرا مغز پچی ہو رہا ہے کم از کم تو تو مجھے تنگ نہ کر۔" اس نے زور سے میری شرٹ کا کالر کھینچا۔

میں نے ناگواری سے اسے دیکھتے کالر آزاد کروایا اور بھنا کر بولا۔

"تو میری فکر نہ کر میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں کہ اِدھر اُدھر ہو گیا تو تجھے ملوں گا نہیں۔ چار برس سے اوپر کا عرصہ ہو گیا ہے مجھے اس دیار میں آئے سارے راستے جانتا ہوں' بہت اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں یہاں کی سڑکوں سے اور یہاں کے بندوں کی بھی پہچان ہے کسی کے ہتھے نہیں چڑھوں گا اور میری جان تو میرے بجائے اپنی مریانہ کا خیال رکھ' جو تھوڑی باؤلی بھی ہے اگر اس نے تجھے نہ پا کر بھاں بھاں کرنا شروع کر دیا نا تو پورا شہر دہلا دے گی۔"

"ارے ہاں مریانہ! کہاں گئیں ابھی تو میرے ساتھ تھیں۔" میرے کہنے پر وہ یکدم بوکھلا کر دائیں بائیں دیکھنے لگا وہ تینوں ہمارے پیچھے ہی چل رہی تھیں میں نے مڑتے ہوئے انہیں جیولری شاپ میں گھستے دیکھ لیا تھا۔ ہارون مجھ پر گرم ہو رہا تھا اس لیے اس بات سے بے خبر تھا اور اب چشم زدن میں اس کا چہرہ فق ہوا تو میں نے لبوں پر امڈ آنے والی مسکراہٹ بمشکل روکی۔

"اوئے ہیرو کہاں گئیں یہ تینوں؟" وہ ہونقوں کی طرح اچک اچک کر انہیں تلاشنے لگا وہ پل میں گھبرا گیا تھا مجھے اس کی یہ کیفیت کھلکھلانے پر مجبور کر رہی تھی مگر خود پر قابو کیے رہا کچھ دیر اس کی حالت سے لطف لینے کے بعد میں نے اس کے دونوں شانے پکڑے اور پورا کا پورا گھما کر جیولری شاپ کی گلاس وال کی جانب دھکیل دیا۔

"ذرا اُدھر تکو نا ہونق صاحب۔"

"اوہ!" اندر نظر پڑتے ہی اس نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

"یار جان نکال دی تھی میری توبہ ہے' بڑا خوار کرتی ہیں یہ لڑکیاں اب دیکھ چار گھنٹوں سے یہاں پریڈ کروا رہی ہیں اور ابھی تک ان کی خریداری مکمل نہیں ہوئی۔ پتا نہیں کس طرح کی چیز چاہیے ہوتی ہے انہیں' ایک جوتی بھی خریدنا ہوتی ہے تو دس دکانوں کے پھیرے لگائیں گی پھر کہیں جا کر شہزادیوں کو کوئی جوتی پسند آئے گی۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی' میرے جیسا بندہ اتنی دیر میں آدھا شہر خرید لے۔ جتنی دیر میں ان سے تین انچ کی لسٹ کے مطابق اشیاء نہیں خریدی گئیں چل کر دیکھیں تو اب کون سا جمعہ کا بندہ رہ گیا ہے جس کے لیے یہ اُدھر گئی ہیں۔" وہ سخت عاجز آیا ہوا تھا منہ بگاڑے بولتا ہوا مجھے بازو سے پکڑے گلاس ڈور کھولتا اندر گھس گیا۔ میں لڑکھڑاتا اس کے پیچھے تھا ہمارے اس بدتہذیب داخلے پر شاپ کیپر نے انتہائی چوکس ہو کر ہمیں گھورا۔ تو ہم دونوں نے ہی جھٹ ہونٹ پھیلا کر فرشی سلام جھاڑ دیا۔

"ہاں بھئی اب اور کیا کیا خریدنا ہے تم لوگوں نے؟" ہارون باچھیں کانوں سے لگا کر مریانہ کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

"ہم نے تو اپنی شاپنگ مکمل کر لی ہے ہارون بھائی بس یہ مریانہ ہی کو کچھ چاہیے۔" نوین اپنے شاپنگ بیگز سنبھالتی خاصی تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔ افرا بھی بے زاری سی کاؤنٹر پر کہنی ٹکائے کھڑی تھی' البتہ مریانہ کا چہرہ پرجوش تھا اور وہ پورے اشتیاق سے جیولری دیکھ رہی تھی۔

"ہائے اللہ کتنی ڈھیر ساری چوڑیاں ہیں اور کتنی پیاری پیاری' اف میرا تو دل چاہ رہا ہے یہ ساری کی ساری چوڑیاں خرید لوں۔" میری نگاہوں میں لوینہ کی موہنی صورت گھوم گئی۔

وہ دیوانی چوڑیاں دیکھتے ہی ایسے ہی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا کرتی تھی اور میں ہر بار اس سے وعدہ کرتا کہ اگلی مرتبہ اسے ڈھیر ساری چوڑیاں لے کر دوں گا اس بار وہ صرف وہ سیٹ پر ہی گزارا کر لے۔

"اُفوہ تم کتنے کنجوس ہو حدید۔" وہ بچوں کی طرح

منہ بسورلیتی اور میں اپنی جیب ٹٹول کر گردن جھکا لیتا۔
"واؤ کتنی خوب صورت جیولری ہے نا روفی میرا تو دل چاہ رہا ہے ساری کی ساری خرید لوں۔" دونوں ہاتھ چہرے پر رکھے پرشوق لہجے میں بولتی مریانہ اک پل کو مجھے اور نہ ہی لگی۔ جانے کیا بات تھی آج پل پل مجھے اس کی یاد ستا رہی تھی۔ اس کی باتیں اس کا لہجہ اس کا چہرہ اس کی مسکان کون سی ادا تھی جو میرے دل پر دستک نہیں دے رہی تھی میں اک آہ بھر کر رہ گیا۔
"ہاں جیولری تو تمام ہی اچھی ہے مگر یار ساری کی ساری تو نہیں خرید سکتے تم نے جو بھی لینا ہے لو اور پھر چلنے کی کرو دیکھو کتنا وقت ہو گیا ہے گھر میں انکل اور آنٹی انتظار کر رہے ہوں گے۔" ہارون نے اپنی رسٹ واچ مریانہ کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر اسے احساس دلایا۔
"ہاں واقعی بہت دیر ہو گئی ہے مما اور پاپا تو پریشان ہو گئے ہوں گے بس ابھی چلتے ہیں جسٹ اے منٹ۔" وہ پھر شوکیس پر جھک گئی تمام جیولری اتنی دلفریب اور جگر جگر کر رہی تھی کہ وہ چند لمحوں بعد گھبرا کر پلٹی۔
"روفی پلیز ہیلپ می میرا سوٹ پرپل کلر کا ہے اسی مناسبت سے مجھے بریسلٹ لینا ہے۔"
"او کے ہٹو تم" ہارون اسے ہٹا کر خود آگے بڑھا میں بھی بڑھ کر شوکیس سے چپک گیا کچھ ہی دیر بعد ہارون نے پرپل کلر کے موتیوں سے مرصع بریسلیٹ پیک کروایا تو میں بھی نارنجی رنگ کی گلے کی مالا کی طرف شاپ کیپر کو اشارہ کر چکا تھا۔
"یہ کس کے لیے؟" ہارون مسکرا رہا تھا۔
"کس کے لیے ہو سکتی ہے؟" الٹا میں نے سوال داغ دیا۔
"ہوں سمجھ گیا۔" اس نے معنی خیزی سے کہتے پیکٹ اٹھا کر مریانہ کو تھمایا تو میں نے بھی دوسرا پیکٹ اٹھا لیا۔
"ہاں بھئی لڑکیوں چلیں اب؟" ہارون پوچھ رہا تھا ان تینوں کے سرہلانے پر ہم نیویارک کے عظیم الشان شاپنگ پلازہ سے باہر نکل آئے۔
رات پوری طرح اپنی سیاہ چادر پھیلا چکی تھی۔ سر شام ہم یہاں آئے تھے جب ہر سو خوبصورت اجالا بکھرا ہوا تھا اب مصنوعی روشنیاں جھلملا رہی تھیں اس عرصے میں ہارون اور میں بری طرح تھک چکے تھے میرا تو دل چاہ رہا تھا یہیں کہیں پڑ کر سو جاؤں گر تا پڑتا بند ہوتی آنکھیں کھولتا میں ان سب کے ساتھ چل رہا تھا۔ اور یونہی شرارتوں بھرے جملوں میں ہم منزل مقصود تک جا پہنچے تھے۔ اپنے اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے تو ہارون کے حسب خیال لیزا آنٹی اور انکل اسفند ہمارے ہی انتظار میں بیٹھے تھے۔
"او تھینکس گاڈ تم لوگ آ گئے اتنا دیر لگا دیا آخر کہاں رہ گئے تھے تم سارے۔" ہمیں دیکھتے ہی لیزا آنٹی اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔
بائیس سال ہو گئے تھے انہیں انکل اسفند کے ساتھ رہتے اس عرصے میں وہ اردو تو بہت اچھی بولنے لگی تھیں مگر لہجہ نہ بدلا تھا۔ مغربی عورتوں کی بے وفائی بہت مشہور ہے لیکن لیزا آنٹی کو دیکھ کر یہ بات بالکل جھوٹی معلوم ہوتی۔ ان کا رہن سہن طور طریقہ اور خصوصاً بیٹیوں کی پرورش جیسے انہوں نے کی تھی اس سے لگتا تھا کہ جیسے کسی مشرقی عورت کی روح ان کے اندر حلول کر گئی ہو گی یا پھر یہ انکل اسفند کی محبتوں کا کمال تھا کہ نیویارک میں آباد اس چھوٹے سے خاندان کو انہوں نے پاکستان کی ہی خوشبو سے لبریز کیا ہوا تھا۔
ہارون کے چہرے پر شرمندگی پھیلی تھی۔
"سوری آنٹی ہم تو کوشش کر رہے تھے جلدی آنے کی مگر آپ کی اس لاڈلی نے دیر کروا دی۔ چار چیزیں خریدنے میں چار گھنٹے لگائے ہیں ان محترمہ نے ایک دکان سے دوسری اور پھر دوسری سے تیسری چل چل کر میری تو ٹانگیں شل ہو گئیں آج۔" اس کے چہرے پر اب بے چارگی اتر آئی تھی آنٹی نے مریانہ کو تیکھے چتون سے گھورا۔
"بہت غلط بات تم بہت تنگ کرتا ہے بے بی میں نے سمجھایا بھی تھا کہ جلدی آنا مگر تمہارے

دماگ (دماغ) میں میری کوئی بات نہیں آتا اوھر ہم پریشان تھا۔" وہ خفا نظر آرہی تھیں۔

"اوہو، مما اس میں پریشانی کی کیا بات آپ تو خوامخواہ گھبرا جاتی ہیں۔ اب بندہ کچھ خریدنے نکلے تو دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے، آخر سو چیزوں میں سے ایک چیز پسند کرنا کوئی آسان کام تو نہیں اور یہ دیکھیں ہم کتنی زبردست شاپنگ کرکے آئے ہیں۔" مریانہ بے تابی سے بولتی کارپٹ پر گھٹنے ٹکا کر بیٹھی اور شاپنگ بیگز الٹ دیئے جس میں سے رنگ برنگ چیزیں نکل کر بکھریں تو لیزا آنٹی ایک لمحے میں سارا غصہ بھول بھال ایک ایک چیز اشتیاق سے دیکھنے لگیں۔

"مما ادھر بھی دیکھیں۔" مریانہ کی دیکھا دیکھی نوین اور افزا نے بھی اپنے بیگز ان کے سامنے الٹ دیئے، انکل بھی بیٹیوں کے پاس آبیٹھے۔

"چل یار، اب ہماری یہاں کوئی جگہ نہیں رہی۔" ان سب کو مصروف دیکھ کر میں نے ہارون کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں یار ٹھیک کہتا ہے تو۔" اس نے مریانہ کے جگمگاتے چہرے پر نگاہ ڈالی جو ہر طرف سے بے نیاز اپنی سفید کلائی میں لشکارے مارتا بریسلیٹ دیکھتی خوش ہو رہی تھی۔ ہارون کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے میرے دھیان میں چھم سے ادینہ اتر آئی۔

فیروزی اور سرخ کانچ کی چوڑیوں سے سجی نازک کلائیاں میرے سامنے کیے بالکل یونہی خوشی سے دمکتا چہرہ لیے مجھ سے سوال کرتی ہوئی فیروزی رنگ کے کرتا شلوار میں ملبوس بڑا سا دوپٹا شانوں پر پھیلائے جس کے کناروں پر ستاروں بھری سرخ رنگ کی بیل لگی تھی ہلکا میک اپ کیسے کانوں میں چھوٹی سی بالیاں پہنے وہ بے انتہا پیاری لگ رہی تھی۔

"ہائے اللہ بتاؤ نا حدید۔" میں یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا اس نے دوبارہ استفسار کیا اور میں نے اس سے نظر ہٹا کے اخبار میں منہ دے لیا تھا جانے کیوں اسے ستانے کو دل چاہ رہا تھا اور اس میں برداشت کا مادہ تو تھا ہی نہیں بہت جلد جھنجلا جاتی تھی اس وقت بھی میرے کچھ نہ بولنے پر چڑ گئی۔

"سن نہیں رہے ہو میں کیا پوچھ رہی ہوں۔" اس نے میرے ہاتھ سے اخبار جھپٹ لیا تھا اور میں نے پیشانی شکن آلود کرتے ہوئے اسے گھورا۔

"یہ کیا طریقہ ہے دینا بہت بدتمیز ہوتی جارہی ہو تم۔ ادھر دو اخبار اور کتنی بار کہا ہے میں تم سے پورے پانچ برس بڑا ہوں۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے ادب لحاظ ملحوظ خاطر رکھا کرو۔ خبردار جو آئندہ مجھ سے تو تڑاخ کی تو۔" میں خوامخواہ حد درجے سنجیدہ ہو رہا تھا اور وہ پوری آنکھیں پھیلائے مجھے دیکھ رہی تھی پھر اس کی آنکھیں یکدم سکڑیں اور اس نے اخبار میرے سر پر دے مارا۔

"ہونہہ بڑے آئے کہیں سے، خود ہی تو کہتے ہو میں تمہارا دوست ہوں۔ بہت پکا والا دوست اور بھلا دوستوں میں تکلف کہاں ہوتا ہے میں تو تم ہی کہوں گی مجھے نہیں اچھا لگتا آپ واپ کرنا تمہیں اگر آپ آپ کروانا ہے تو جاکر ڈھونڈ لو کوئی اور دوست۔ آج سے میری اور تمہاری کٹی۔" الٹا وہ مجھے ہی دھمکی دے کر جانے لگی تھی کہ میں نے اس کا دوپٹا تھام لیا۔

"اچھا بابا مت کہو آپ، جا کہاں رہی ہو یہ چوڑیاں تو دکھاؤ کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔"

"سچ، اچھی لگ رہی ہیں نا اور یہ میرا سوٹ بھی۔" وہ پل میں خفگی دور کیے وہیں ٹھہر گئی تھی۔ بالکل میرے سامنے ایسے جیسے اجلا چاند۔

"اوہ ہیرو، پھر ڈوب گیا مراقبے میں۔ ایک تو میں تیری اس عادت سے بڑا عاجز ہوں اور یہ تو دیکھ کسے رہا ہے، اوئے بے غیرت وہ مریانہ ہے تیری ہونے والی بھابھی۔" ہارون نے میرے انہماک پر دبے لہجے میں چنگھاڑتے بے دردی سے میرے شانے پر دھپ جمائی۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ چشم تصور سے ادینہ کو دیکھتا میں مریانہ پر نگاہ جمائے ہوئے ہوں۔

"اوہ۔" میں کچھ خجل سا ہو گیا۔ اپنی جھینپ مٹانے کو میں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلائی۔ "ہاں پتا ہے مجھے وہ میری ہونے والی بھابھی ہے۔"

"تبھی دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔" اس نے منہ بنایا۔

"ہاں دیکھ رہا تھا اور وہ یہ کہ اس پیاری لڑکی کے ساتھ کھڑے ہوئے ہارون صاحب کیسے لگیں گے اور یقین کرو ابھی مجھ پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ یہ بات بالکل ایسے ہی ہوگی جیسے کہ حور کے پہلو میں لنگور ویسے یار آپس کی بات ہے بڑا بے جوڑ رشتہ ہے وہ خود اتنی پری چہرہ اور محترم ہارون تو۔" میں نے مسکراہٹ دباتے ہوئے الٹا اسے شرمندہ کر ڈالا۔ اس کے تیور بگڑ گئے۔

"تو ذرا اندر چل پھر بتاتا ہوں کہ محترم ہارون کیا ہیں۔" وہ غراتا میرے کان میں گھس آیا۔

"میں کمرے میں ہی نہیں جا رہا کیونکہ اب فائدہ ہی کیا دو چار گھنٹے تو رہ گئے ہیں صبح ہونے پر جو میں یہاں بیٹھ کر بھی گزار سکتا ہوں۔" میں ذرا متاثر نہ ہوا اس کی غراہٹ سے۔

"تو حدید...!" اس کی بات منہ ہی رہ گئی۔ لیزا آنٹی ہماری طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"تم دونوں کیا باتیں کر رہا ہو ادھر آکر بیٹھو ہمارے پاس، میں دودھ گرم کر کے لاتی ہوں وہ پی کر اپنے بیڈ روم میں جانا۔"

"تو تھینکس آنٹی، دودھ کی گنجائش نہیں، اب بس جا کر آرام کریں گے صبح جلدی اٹھنا بھی ہے۔" ہارون نے فوراً ان کی پیشکش پر معذرت کی تو مجھے بھی اس کی تائید میں سر ہلانا پڑا۔

"اوکے، جیسا تم لوگوں کا مرضی جاؤ آرام کرو، تھک گئے ہوگے یہ لڑکیاں تنگ بھی تو بہت کرتے ہیں۔ میں نے اسی واسطے تم سے کہا تھا کہ میں خود انہیں لے جاؤں گی پر تم بھی نہیں مانا۔" لیزا آنٹی نے ہارون کی بسورتی شکل دیکھتے ہوئے کہا تو وہ انتہائی مسکنت سے سر خم کر گیا۔

وہ بھی سچ کہہ رہی تھیں انہوں نے تو پہلے ہی ہمیں اس قسم کی خطرناک صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا لیکن کیا کیا جاتا ہارون کی دریا دلی کا کہ وہ خود دیوانہ ہو رہا تھا اپنی مریانہ کو اچھی اچھی شاپنگ کروانے کے لیے

کل اس کی سالگرہ جو تھی۔ اور اب وہ اپنی رنگین چیزوں میں کھوئی اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہی تھی یہی وجہ ہارون کے چہرے پر بارہ سے تیرہ بجا رہی تھی مجھے اس کی حالت زار پر ہنسی آنے لگی۔

"اوکے آنٹی گڈ نائٹ۔" آخر کار ہارون نے ایک بے بس نگاہ مریانہ پر نچھاور کرتے ہوئے با آواز بلند کہا در پردہ وہ مریانہ کو متوجہ کرنے کی سعی میں تھا اور وہ ہنوز ادھر ہی مگن۔

"اوکے مائے سن، جاؤ آرام کرو۔" آنٹی نے ہم دونوں کا کندھا تھپکا۔ ہارون تھک کر میرا ہاتھ تھامے مرے مرے قدموں سے بیڈ روم کی طرف چل پڑا۔

"بڑی ہی بے مروت لڑکی ہے، اب کیسے آنکھیں پھیر لی ہیں، توبہ چشم کہیں کی، ایک تو اتنا تھکا کر لائی اور بیٹھنے تک کا نہیں کہا۔ حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔ اس پر چھوٹے منہ شکریہ کا ایک لفظ نہیں کہا۔ کتنی مطلبی ہوتی ہیں یہ لڑکیاں ٹھیک ہے بھئی۔ کل کرے یہ کوئی فرمائش۔ میں نے بھی جو پوری کی ہو تو۔۔۔" وہ اس کی بے اعتنائی پر سلگتا بیر کر رہا تھا۔

"چہ چہ چہ صبر کر بچے صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔" میں نے چہرے پر دلگیری و دل فگاری طاری کرتے ہوئے اس کا ہاتھ سہلایا۔

"تو چپ رہ، بات نہ کر میرے ساتھ۔" وہ میرا ہاتھ جھٹک کر اوندھے منہ بیڈ پر جا گرا۔ میرے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا تھا اس کی حالت ہی کچھ ایسی تھی کہ میں ضبط نہ کر سکا۔ خوب ہنس چکنے کے بعد میں اس کے قریب آیا۔

"او ہیرو کر چکا تو اداکاری یا ابھی ایک آدھ المیہ نغمہ باقی ہے تو وہ بھی جلدی سے گا کر اپنے کمرے کو سدھار کیونکہ تیری اطلاع کے لیے مجھے بڑی نیند آرہی ہے۔ چل اٹھ ادھر سے یا بدولت کو محو استراحت ہونا ہے۔" میں نے اس کا موڈ قطعی نظر انداز کر دیا وہ سیدھا ہوا۔

"دیکھ حدید کے بچے، میرے منہ نہ لگ ورنہ میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔ دیکھ نہیں رہا میں کتنے غصے میں ہوں۔ میرا خون کھول رہا ہے، رگیں پھڑک رہی ہیں،

دل جل رہا ہے۔"

"ہاں کچھ جلنے کی بو تو مجھے بھی آ رہی ہے۔" اس کے رکتے ہی میں نے سوں سوں کر کے ناک چڑھائی۔

"میں کم از کم آج کی تاریخ میں یہاں سے اٹھنے والا نہیں تو اپنا بندوبست کہیں اور کر لے۔" اس نے تکیہ کھینچ کر سر پر دھر لیا۔

کھونچ مگر دھا' میں اس کے لمبے چوڑے وجود کو گھورتا اندر ہی اندر کھولتا سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

دروازے پر جانے کب سے دستک ہو رہی تھی۔ گہری نیند سے میری آنکھ اسی دھم دھم سے کھلی۔ آنکھیں مسلتے میں نے لپک کر دروازہ کھولا سامنے مریانہ کھڑی تھی۔

"گڈ مارننگ۔" اس کے ہونٹوں پر پیاری سی مسکان تھی۔ جینز پر لانگ شرٹ پہنے گلے میں اسکارف لپیٹے اپنی دمکتی رنگت کے ساتھ وہ نکھری نکھری سی اچھی لگ رہی تھی۔

"صبح بخیر' جیتی رہیے۔" جواباً مجھ پر بھی مسکرانا فرض تھا۔

"میں آپ کے لیے ناشتا لائی تھی آج آپ کچن میں نہیں آئے ابھی تک سو رہے تھے کیا؟" اس نے ہاتھوں میں پکڑی ٹرے میری جانب بڑھائی۔

"جی ہاں ایکچوئلی رات دیر بھی تو بہت ہو گئی تھی اس لیے جب سوئے تو حسب معمول سویرے آنکھ کیا کھلتی۔ ابھی آپ کی دستک سے ہی جاگا ہوں میں۔"

"ہاں یہ تو ہے' رات ہم بھی دیر سے سوئے تھے' میری بھی آنکھ دیر سے ہی کھلتی اگر میں الارم لگا کر نہ سوتی۔ نوین اور افزا تو ابھی تک سو رہی ہیں۔ خیر آپ ناشتا کریں میں ذرا ایک بار پھر رونی کے بیڈ روم کا دروازہ بجا لوں جانے کیسی نیند سویا ہے وہ کہ جاگ ہی نہیں رہا۔ کاہل انسان۔" وہ خود کلامی کے انداز سے کہتی پلٹنے کو تھی کہ میں نے پکار لیا۔

"ٹھہریں مریانہ' آپ کو ہارون کے بیڈ روم تک جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ یہاں میرے بیڈ پر سویا ہوا ہے۔"

"وہاٹ' وہ ادھر سو رہا ہے آپ کے بیڈ پر؟" وہ اک لحظہ کو حیران ہوئی اور دوسرے ہی پل کھلکھلا کر ہنس دی۔

"جی ہاں آپ اندر آیئے اور اس پوستی کو اٹھا کر لے جایئے۔" میں نے آگے سے ہٹتے ہوئے اسے جگہ دی تو وہ اندر آئی بے سدھ سوتے ہارون کو دیکھا۔

"رونی' رونی۔" وہ آگے بڑھ کر آہستہ سے اسے پکارنے لگی۔ میں نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور واش روم میں گھس گیا۔

"اف خدا! اسے تو دین و دنیا کی خبر نہیں ہے۔" میں باہر آیا تو وہ زچ ہوئی کھڑی تھی مدد طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔

"محنت میں عظمت ہے۔" میں کندھے اچکا تا ٹاول اٹھا کر منہ پونچھنے لگا۔

"اوہ گاڈ" وہ پیشانی پر آئے بال انگلیوں سے پرے کرتی پھر جھک گئی۔

"رونی رونی۔" کی پکار برابر جاری تھی اور وہ کم بخت کان لپیٹے پڑا تھا مجھے اندازا ہو گیا تھا کہ وہ جاگ چکا ہے مگر آنکھ کھولنے پر آمادہ نہیں۔ مقصد محض مریانہ کو ستانا تھا اور وہ بے چاری واقعی گھبرا گئی تھی۔

"رات کو یہ کوئی ٹرنکولائزر لے کر تو نہیں سویا۔ پلیز آپ ہی اسے دیکھیں۔ کیا ہو گیا ہے یہ جاگ کیوں نہیں رہا۔" اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"پریشان نہ ہوں اس کی نبض چیک کریں۔ ناک دبائیں دھڑکن بھی دیکھ لیں کہیں مر مرا تو نہیں گیا۔" میں ٹاول اسٹینڈ پر ڈال کر اپنی ٹرے سنبھالے بیٹھ چکا تھا۔

"ہائے اللہ نہ کرے۔" وہ میری اس قیاس آرائی پر بے طرح دہل گئی۔ ہول کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ اک نظر ہارون پر ڈالی جواب تک گہری نیند کا تاثر دے رہا تھا۔

"ٹیک اٹ ایزی' ابھی دیکھیے گا یہ جاگتا ہے کہ نہیں۔" اس کی پریشانی دیکھ کر ناچار مجھے اٹھنا ہی پڑا۔

میں نے اور کچھ نہ کیا بس ہارون کی گردن پر ہاتھ رکھ دیئے۔۔۔ اور اگلا پل نہیں ہوا تھا کہ وہ مجھے دھکیلا اٹھ بیٹھا۔

"الو گدھے' مارنے لگا تھا مجھے' تو دوست ہے کہ دشمن ابھی مجھے کچھ ہو۔۔۔" مجھ پر آنکھیں نکالنے کی سعی میں ناکام ہو کر بری طرح کھانسنے لگا آخر بے چارے کا ٹیٹوا دبتے دبتے رہ گیا تھا۔

"رونی' یہ کیا بدتمیزی ہے' میں کتنی دیر سے آوازیں دے رہی ہوں تم اٹھ کیوں نہیں رہے تھے۔" مریانہ نے سکھ کا سانس لے کر شکوہ کیا۔

"آپ کون ہیں خوب صورت خاتون۔" وہ بمشکل کھانسی روک کر اسے دیکھتا اتنی سنجیدگی سے پوچھنے لگا کہ مریانہ کے چھکے چھوٹ گئے۔

"رونی' واٹس رونگ ودیو' میں مریانہ ہوں کیا ہو گیا ہے تمہیں۔"

"کون مریانہ' کیسی مریانہ' کہاں کی مریانہ' کدھر ہے مریانہ۔" وہ ہنوز اسی سنجیدگی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا اور اس کی برداشت یہیں تک تھی وہ پاؤں پٹخ کر واک آؤٹ کر گئی۔ ہارون کے بلند و بانگ قہقہے میرے چھوٹے سے کمرے کے در و دیوار ہلانے لگے۔

"توبہ' اوئے رحم کر کیوں زلزلہ لانا چاہتا ہے۔ پورے امریکہ میں مجھے فقط ایک یہی ڈربہ نما کمرہ ملا ہے اگر یہ بھی تیرے بے سرے قہقہوں کے زیر ستم آگیا تو میں نمانا کدھر جاؤں گا۔" میں ایک ہی جست میں بیڈ پر جا بیٹھا اور اسے تھام کر قابو کیا۔

"او ہو' ہو سکون آگیا میری رات کی ساری تھکن دور ہو گئی دیکھا کیسے تنگ ہو کر گئی ہے۔" اپنا کارنامہ بیان کرتے اس کے قہقہے رکنے میں نہیں آرہے تھے۔

"شاباش' بڑا کمال دکھایا ہے ایک معصوم سی لڑکی کو ستا کر شرم نہ آئی تجھے بے ہودہ انسان۔" میں نے اسے ایک دھپ جمادی۔

مریانہ سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی وہ سادہ سی لڑکی اکثر اس بدتمیز کی خفگیوں کا بار اٹھاتی تھی وہ اسے ستا کر ایسے ہی خوش ہوتا تھا اور وہ گھنٹوں بے کل رہتی۔

"ارے واہ مجھے کیوں شرم آئے گی بلکہ مجھے تو مزا آتا ہے تنگ کر کے سچ بتا' جب میں اس سے ناراض ہوتا ہوں تو وہ پریشان ابھی ابھی سی اچھی لگتی ہے نا۔" ہارون نے میرے گھٹنے پر سر رکھ دیا۔ میں نے اسے نادیدہ نظروں سے گھورا۔

"دیکھ یار' رونی' یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ خوامخواہ اسے ستانا اور تیرا حظ اٹھانا تو ایک لڑکی کو تنگ کر کے خوش ہوتا ہے تف ہے تجھ پر اور پھر لڑکی بھی بھلا کون ہے وہ جو تجھ سے پیار کرتی ہے اب الو کوئی ہوش کے ناخن لے۔ مریانہ تجھ سے ناراض ہو گئی ہے' بہتر یہی ہو گا کہ تم فورا" سے پیشتر جا کر مناؤ۔ آج کا دن کتنا اہم ہے جسے وہ اچھے طریقے سے منانے کا سوچ بیٹھی ہے اور تم ہو کہ اس کی صبح ہی خراب کر دی' بہت افسوس کی بات ہے۔" میں نے اس کے سر کے نیچے سے گھٹنا کھینچ لیا۔

"اف' بڑا خبیث ہے تو حدید' خیر تجھ سے تو بعد میں نبٹوں گا پہلے مریانہ کا موڈ درست کر آؤں' اسے ناراض کر کے میں نے واقعی غلط کیا ہے" وہ سر سہلاتا نئے عزم کے ساتھ بیڈ سے اترا۔

"ویل ڈن' یہ کی ہے نا بات۔" میں بے ساختہ خوش ہوا کہ اس نے میری نصیحت پر عمل کرنے کا ارادہ باندھا تھا اور اس ارادے کے سنگ وہ کمرے سے بھی جا چکا تھا۔

میں مطمئن سا اٹھا الماری سے جائے نماز نکالی اور سر پر رومال باندھنے لگا۔ اپنے دیس میں تو کبھی نماز پڑھتے تھے تو کبھی نہیں بھی۔ میں چار سال قبل ایسا پکا نمازی نہ تھا جیسا کہ اب میں نماز کا دھیان رکھنے لگا تھا اب بھی اکثر پنجگانہ نماز تو ادا نہ ہوتی تھی مگر جو بھی وقت میسر آتا میں ضرور نماز کی ادائیگی کرتا۔

نماز فجر کا وقت تو گزر چکا تھا میں نے قضا نماز کی نیت باندھ لی اس کے بعد نماز اشراق بھی ادا کی پھر اپنے رب کے حضور ہاتھ پھیلا کر انتہائی ڈوب کر اپنے سب پیاروں کے لیے خوشیاں اور سکون کی دعائیں مانگنے لگا

میں ان سب سے میلوں کے فاصلے پر ہو کر بھی ذہنی اور دلی طور پر ان ہی کے درمیان رہتا تھا کہ اس میں میرا سکھ اور اطمینان تھا۔ ہر پل ہر لحظہ انہیں یاد کرنا میرے لیے باعث قرار تھا۔

"اتنی دور جا کر ہمیں بھول تو نہ جاؤ گے حدید۔" دلکش آنکھوں میں نمی لیے میری یاد کے پردے پر اکثر اوینہ کا چہرہ ابھرتا۔ نازک لبوں پر یہ خدشہ لیے وہ کتنی اداس تھی۔

"تم نے یہ کیسے سوچا میں ساری دنیا کو بھول سکتا ہوں لیکن تم سب کو نہیں۔" میں نے پر یقین و پر اعتماد لہجے میں کہتے اس کے آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"سچی تو پھر وعدہ کرو اپنی اس دوست کو کہیں بھی کبھی بھی نہیں بھولو گے۔" وہ اب عہد چاہتی تھی اپنا گلابی ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیا۔

"وعدہ۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور وہ یک لخت ہی میرے شانے پر سر ٹکائے بھل بھل رونے لگی تھی۔

"ویناپیاری یہ کیا ہے بھئی۔" میں اس کے رونے پر پریشان ہوا تھا۔ بھلا میں اس کی آنکھ میں آنسو کہاں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے تو اس کی آنکھیں ہنستی مسکراتی اچھی لگتی تھیں۔ میں نے بہت تیزی اور بہت پیار سے ان آنکھوں سے گرتے تمام گوہر آبدار اپنی ہتھیلیوں کی اوک میں سمیٹ لیے ان موتیوں میں سے ایک موتی بھی فرش پر گرنے نہیں دینا چاہتا تھا مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ یہ موتی زمین پر گریں وہ آنکھیں میری زیست کا چراغ تھیں۔

"مت روؤ وینا میں نے وعدہ تو کیا ہے یقین کرو میرا اور دیکھو پلیز تمہیں پتا ہے نا۔ میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔" اسے سمیٹے بہلانے کی سعی میں میرا اپنا دل کرلانے لگا تھا۔

"سوری بس کیا کروں مجھے یہی خیال دہلا رہا ہے کہ تم اتنی دور چلے جاؤ گے تو میں بالکل اکیلی ہو جاؤں گی۔ کون ہو گا میری سننے والا میری تو تمہارے علاوہ کسی سے دوستی بھی نہیں حتیٰ کہ اپنی بہنوں سے بھی نہیں۔

ان کی تو اپنی الگ دنیا ہے۔ ان کا اور میرا مزاج نہیں ملتا۔ بھائی ہے تو وہ بس ہر وقت تنگ کرنا جانتا ہے۔ اماں الگ میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ یہاں کوئی بھی نہ ہو گا تمہاری طرح خیال رکھنے والا تم ہی تو میرے اچھے دوست ہو تم چلے جاؤ گے تو میں تمہیں بہت یاد کیا کروں گی۔" وہ بری طرح سسک رہی تھی اور مجھے اس کی معصومیت پر ٹوٹ کر پیار آیا میرا بس نہیں چلا تھا اس پیاری سی لڑکی کو اپنے سینے میں چھپا لوں۔ وہ مجھے کتنی عزیز کس قدر پیاری تھی اس بات کا علم تو اسے بھی نہیں تھا۔

"وینا میں بھی تمہیں وہاں جا کر بہت مس کروں گا' لیکن دیکھو یوں رونے سے کیا حاصل ہم فکر نہ کرو میں سب کو سمجھا کر جاؤں گا کہ میرے پیچھے تمہارا بہت زیادہ خیال رکھیں۔ تمہاری ساری فرمائشیں پوری کریں اور رہا یہ سوال کہ تمہاری کون سنا کرے گا تو میں ہوں نا۔ تم مجھے خط لکھا کرنا اپنی ہر بات' ہر خیال' ہر سوچ' ہر شرارت میں تمہارے خطوط کا بے چینی سے منتظر رہا کروں گا پھر میں بھی تمہیں خط لکھا کروں گا بس اب خوش۔" میں نرمی سے اس کے بال سہلانے لگا وہ کچھ کہنے کے بجائے سوں سوں کرتی رہی۔

"حدید بھائی۔" میں یادوں کی چلمن اٹھائے ماضی کے آنگن میں جھانک رہا تھا جانے افرا کب آ کھڑی ہوئی تھی میں اس کی آواز پر چونکا۔ دعا کے لیے اٹھائے ہاتھ جوں کے توں تھے اور میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا میں نے جلدی سے منہ پر ہاتھ پھیر کر اس کی جانب رخ کیا۔

"کیا مانگ رہے تھے اتنا محو ہو کر۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"بس وہی معمول کی دعائیں" میں نے اٹھ کر جائے نماز تہہ کی جبکہ در حقیقت آج تو میں کچھ مانگنے کی بجائے ہاتھ پھیلائے ہی رہ گیا تھا بس اس کی یاد اس کا خیال یونہی تو بے خود کر دیتے تھے کہ آس پاس سب بھول جاتا۔

"آپ کو ہارون بھائی بلا رہے ہیں' جلدی سے

آجائیں۔" وہ جس مقصد سے آئی تھی پیغام دیتی دروانہ پار کر گئی تو میں بھی اس کے پیچھے ہی نکل آیا۔

☆ ☆ ☆

"واپس کب تک آؤ گے حدید؟" اور منہ اپنے ہر خط میں مجھ سے کچھ اور پوچھے نہ پوچھے یہ سوال ضرور پوچھا کرتی تھی اکثر اپنے خطوں میں وہ یادیں دہرایا کرتی۔

"سچ حدید میں تمہیں بہت یاد کرتی ہوں۔ بے حد اداس رہتی ہوں تمہارے لیے کبھی کبھی تو تمہاری کمی بے پناہ شدت سے محسوس ہوتی ہے اب پھر موسم رنگ بدل رہا ہے۔ بہار بہت چپکے سے اپنا خیمہ سمیٹ رہی ہے۔ فضا میں بکھری خوشبوئیں ماند پڑ رہی ہیں پھول کملا رہے ہیں گرمی اپنے پر پھیلا رہی ہے اور اس موسم کی طویل تپتی دوپہریں تو اب مجھے ڈرانے لگی ہیں تمہیں یاد ہے نا مجھے دوپہر میں کبھی نیند نہیں آتی تھی۔ تمام دوپہر میں جلے پیر کی بلی کی طرح پورے گھر میں چکر لیا کرتی۔ اس بے گھر کی خاموشی اور چار سو پھیلا سناٹا مجھے بے طرح گھبراہٹ میں مبتلا کر دیتا سب سو رہے ہوتے۔

اور کبھی تم گھر آتے تو میں تمہارے سر ہو جایا کرتی تھی کہ اف حدید یہ منحوس دوپہر تو گزارے نہیں گزر رہی۔ کتنی بوریت ہے کیا خیال ہے کوئی گیم نہ کھیلا جائے۔ اور تم ہمیشہ کی طرح فوراً" میری بات مان جاتے۔

اماں کو تو خدا موقع دے میرے لتے لینے کا وہ تو تاک میں رہتی ہیں کہ کب کوئی بات ہو اور وہ میرے کان کھینچیں۔ مائدہ کا تو پتا ہی ہے۔ اس کی اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہے۔ سارا دن سر جھکائے گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہے اس لیے اماں کی سر چڑھی ہے میں کتابوں میں سر کھپاتی ہوں۔ جو اماں کو کھٹکتا ہے۔

اب تو میں خود ان کی پھٹکاروں کی اس قدر عادی ہو گئی ہوں کہ جب تک دن بھر میں دو تین بار ان کی ڈانٹ نہ سن لوں مزا ہی نہیں آتا جان بوجھ کر انہیں تنگ کرتی رہتی ہو"۔ (ونا تمہاری یہ شرارتیں آخر کب باز آؤ گی اپنی حرکتوں سے۔) میں بے اختیار مسکرا دیا۔

"یہاں تو سب ہی مجھ سے نالاں ہیں اک بس پھوپھو ہی ہیں جو میری طرف داری کرتی ہیں تمہارے جانے کے بعد میں ان کے بہت قریب ہو گئی ہوں ہم تمام وقت تمہیں ہی یاد کرتی ہیں تمہاری باتیں کرتے ہیں میرے ساتھ ساتھ پھوپھی بہت اداس ہیں تمہارے لیے حدید کب آؤ گے؟"

"آؤں گا بہت جلد آؤں گا ونا بس تھوڑا انتظار اور یاد تو میں بھی بہت کرتا ہوں تمہیں کیا خبر میرے دن و رات کیسے بسر ہوتے ہیں تم سے دور۔ تمہیں دیکھے بنا۔ یہ میلوں کے فاصلے مجھے تڑپاتے ہیں لیکن کیا کروں میں نے تم سے دوری کا عذاب اسی لیے تو سہا ہے کہ خود کو اس قابل بنا سکوں کہ تمہاری ہر چاہ پوری کر سکوں تمہارے تمنائیں، تمہاری آرزوئیں تمہارے ارمان یقین کرو میں تمہارا دامن دنیا جہان کی خوشیوں سے بھر دینا چاہتا ہوں اور ان شاء اللہ وہ وقت بہت جلد آئے گا بہت جلد۔" میں تصور میں ونا کو مخاطب کیے اس سے ڈھیروں باتیں کرتا اس کے سنگ خواہشوں کی ریشم تاروں سے سہانے خواب بنتا لیکن جب اسے خط لکھنے بیٹھتا تو جانے کیا ہوتا ساری خوبصورت باتیں ذہن کے کسی گوشے میں ہی چھپی رہ جاتیں اور میں اسے کچھ بھی نہ لکھ پاتا جس کا اسے ہمیشہ گلہ رہتا۔

"اف خدایا حدید میں جتنی بے چینی سے تمہارے خط کی منتظر رہتی ہوں وہ اتنا ہی اختصار لیے ہوتا ہے۔ تمہارا خط پڑھتے مجھے بے ساختہ یہ محاورہ یاد آتا ہے "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" خدارا ایسا مختصر خط مت لکھا کرو مجھے بے حد غصہ آتا ہے بھلا یہ کیا طریقہ ہے میری طرح خط کیوں نہیں لکھتے جیسے میں لکھتی ہوں ڈھیر ساری ادھر ادھر کی باتیں، معنی و بے معنی باتیں، سر پیر والی تو کبھی بے سر پا باتیں، کام والی تو نکمی باتیں کچھ تو لکھا کرو نا۔

اپنی مصروفیات کے بارے میں ہی کہ وہاں کیا کرتے

ہو دن کیسے گزرتے ہیں ویک اینڈ کیسے گزارتے ہو۔ ہارون بھائی، مریانہ، تو ین، افزا کے بارے میں ہی لکھ دیا کرو۔ یا لیز آنٹی کا انداز گفتگو چلو اس بار ضرور تفصیلاً" لکھنا اور اب میری سنو میں آج کل بے حد خوش ہوں یوں تو میں ہمیشہ ہی خوش رہتی ہوں مگر ان دنوں بہت زیادہ خوش ہوں پوچھو کیوں تو وہ یوں کہ میں نے اماں سے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کی اجازت لے لی ہے۔

میں بے اندازہ خوش ہوں اور تم دعا کرو کہ جس طرح میرا یہ خواب حقیقت بن رہا ہے۔ اسی طرح میرے دوسرے تمام خواب بھی پورے ہوں۔ (آمین میں صرف تمہارے لیے ہی تو دعا کرتا ہوں دینا۔ تم کیا جانو کہ تم سے زیادہ تو میری تمنا ہے کہ وہ رب تمہارے سارے خوابوں کو جسم حقیقت کرے اور ایسا ہو گا ضرور ان شاء اللہ)

ہاں تمہیں ایک اور خبر بھی سناتی ہوں وہ یہ کہ بہت جلد مائدہ کی شامت بھی آنے والی ہے۔ اگر واقعی مائدہ کی شادی ہو گئی تو میرا کیا ہو گا۔ کیونکہ مائدہ کے جانے کے بعد گھر کے سارے کام میرے ناتواں کاندھوں پر آپڑیں گے تم تو جانتے ہو مجھے گھرداری سے رتی برابر رغبت نہیں۔ کس قدر کام چور ہوں میں بقول اماں بڈ حرام، نکمی، آلکسی کی ماری ہوئی، یوسنتن اور دیگر بہت کچھ بس تو ابھی سے سوچ کر ہول آرہے ہیں آخر کیا ہو گا میں تو اب یونیورسٹی بھی جانے لگوں گی پھر کیسے سنبھال پاؤں گی سارا گھر۔ (وہ تمہارا صارم بھی ابھی کسی لائق نہیں کہ اس کی ہی شادی کروی جائے اور مسئلہ حل ہو جائے) خیر دیکھا جائے گا ایسا وقت آیا تو بابا سے کہوں گی وہ اپنی اس شہزادی بیٹی کے لیے خود ہی ملازمہ کا انتظام کر دیں گے ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں ٹھیک ہے تم واقعی شہزادی ہو ادینہ بلکہ ملکہ میری، میرے دل کی بس کچھ دن اور میں پاکستان آیا تو خود تمہارے لیے خادماؤں کی لائن لگاؤں گا جو چٹکی بجاتے تمہارا ہر حکم بجا لائیں یہی خواہش ہے نا تمہاری اور میں تمہاری تمام خواہشات پوری کروں گا

آئی پرامس یو۔ آئی لائک یو اینڈ آئی ریئلی لو یو" میری سامنے اس کے خط بکھرے پڑے تھے اور میں اس کی یادوں میں کھویا خود سے بھی بیگانہ ہو گیا تھا۔ صحن ماضی کی چلمن اٹھی ہوئی تھی اور میں سہج سہج چلتا اندر کھو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کالج سے واپسی پر میرا معمول ہوا کرتا تھا کہ کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنا کہ میری پیاری ماں کی تاکید ہوتی تھی پھر اسٹور پر چلا جانا کہ یہ ابا کی ہدایت تھی۔ اور شام کو وہاں سے واپسی پر ماما جی کی طرف جانا تو لازمی ہوتا تھا کہ یہ میرے دل کی خوشی ہوتی تھی میری ہر شام وہیں گزرتی ایک ہی گلی میں کچھ فاصلے پر ہمارے گھر تھے میں وہاں جاتا تو رات گئے ہی لوٹتا اس روز بھی میں جلد ہی اسٹور سے اٹھ کر ادھر آگیا تھا گھر میں قدم رکھتے ہی مجھے ایسا لگا تھا کہ جیسے یہاں۔ سب ہی ایک دوسرے سے ناراض ہیں اماں صحن میں بچھی چارپائی پر کسی گہری سوچ میں گم۔ بیٹھی تھیں۔ صارم ان کے قریب ہی چت لیٹا آسمان پر اڑتی پتنگیں گن رہا تھا مائدہ اک کونے میں سوئی دھاگہ اور دوپٹا لیے کڑھائی کرتی مصروف نظر آئی کاملہ آپا باورچی خانے کی دہلیز میں کھڑی چاول چن رہی تھیں ان کا انداز بھی سوچتا ہوا تھا۔ اور دینا چھت پر جاتی سیڑھیوں پر بیٹھی منہ گھٹنوں پر رکھے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی میں نے سب کو دیکھتے ہی زوردار سلام جھاڑا۔ جس کا جواب مجھے صرف صارم کی طرف سے موصول ہوا۔ باقی سب نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا ضرور مگر پھر گردنیں نیچی کیے اپنے اپنے کام میں مگن ہو گئے۔

"آئیں حدید بھائی۔ کہیے کیسے مزاج ہیں؟" صارم نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تو میں چارپائی پر اماں کے پاس ٹک گیا۔

"میرے مزاج تو بہت اچھے ہیں مگر تم لوگوں کو کیا ہوا ہے۔ اتنے خاموش کیوں ہیں سارے۔ خیریت تو ہے نا" میں فطری طور پر فکر مند ہوا پہلے تو کبھی ایسا نہیں

ہوا تھا۔ اتنا سناٹا اور وہ بھی سب کے ہوتے ہوئے اور
تو ازیں نہیں تو کم از کم دینا اور صارم کی نوک جھونک تو
چل ہی رہی ہوتی۔ یہ دونوں اوپر تلے کے تھے اور ان کی
آپس میں بہت کم بنتی تھی ہمہ وقت چونچ لڑائے رکھتے
جس پر اماں کی انہیں پڑتی صلواتیں۔ اک شور ہنگامہ تو
مچا ہی رہتا تھا یہاں زندگی کی مکمل حرارت کے ساتھ مگر
آج تو بالکل چپ چھائی ہوئی تھی۔

"ارے خیریت کیسے ہو سکتی ہے اس جگہ جہاں ان
جیسی سوغاتیں ہوں' پاگل' سرپھری اولاد' جانے کس
گناہ کی سزا ہے یہ میرا تو دماغ خراب کر دیا ہے نامراد
نے۔" اماں تو بھری بیٹھی تھیں میرے استفسار پر اکتا
کر گویا ہوئیں انہوں نے جن کینہ توز نظروں سے دینا
کو دیکھا مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ آج پھر اس نے
انہیں تنگ کیا ہے۔

"کیا ہوا اماں کیا دینا نے بدتمیزی کی ہے مجھے بتائیں
ابھی کان کھینچتا ہوں اس کے۔" میں نے آہستگی سے
ان کا ہاتھ تھاما۔

"ارے کوئی ایک بدتمیزی ہو تو بتاؤں بھی۔ تم اس
کے جتنے مرضی کان کھینچ لو وہ لمبے تو ہو جائیں گے پر
سیدھے نہ ہوں گے میرا تو کلیجہ جلا رکھا ہے اس نے
کسی نہ کسی چیز کی کمی رہتی ہے اسے۔ روز نت نئی
فرمائشیں ہیں شہزادی صاحبہ کی۔ میں پوچھتی ہوں آخر
کیا بنے گا اس کا' ایسی بے صبری لڑکی ہے یہ' ذرا اس
کے مزاج میں سمجھداری نہیں۔ نہ بات سمجھتی ہے نہ
حالات۔ بس جو چاہتی ہے ہتھیلی پر دھرا مل جائے اسے
۔ اب آج کی ہی سن لو میرے منع کرنے کے باوجود اس
نے کالج میں ہونے والے کسی ڈرامے میں حصہ لے لیا
ہے اور اب کہتی ہے کہ مجھے اس ڈرامے میں پہننے کے
لیے نیا سوٹ چاہیے۔ ایک تو نافرمانی اوپر سے فرمائش
میں پوچھتی ہوں باپ نے فیکٹریاں لگا رکھی ہیں جو ہر
مانگ پوری کرتے چلے جائیں۔" اماں سخت تپی ہوئی
تھیں ادھر دینا نے جھکا سر اٹھایا۔

"باپ نے فیکٹریاں نہیں لگا رکھیں پر کپڑے والوں
نے تو لگا رکھی ہیں نا اور صرف ایک سوٹ ہی تو مانگ
رہی ہوں کچھ زیادہ تو نہیں۔ اس پر بھی آپ اتنا غصہ
ہو رہی ہیں بس چند سو روپے کا تو خرچہ ہے۔ حدید پلیز
تم ہی سمجھاؤ۔" ان سے کہتے وہ مجھ سے مدد کی خواستگار
ہوئی۔

"یہ کیا سمجھائے مجھے' سمجھنے کی ضرورت تو تجھے خود
ہے جانتی نہیں ہے گھر کے حالات تم لوگوں کا باپ بے
چارا دن رات محنت کرتا ہے تب کہیں جا کر اس گھر کا
چولہا جلتا ہے جو وہ صبح سے شام کو لہو کا بیل نہ بنے تو تم
لوگ کھانے کو ترسو پر تم جیسی اولاد صبر شکر تو ایک
طرف الٹا فرمائشوں کا انبار لگائے رکھتی ہے آئے دن
نت نئے کھٹ راگ ڈالے ہوتے ہیں۔ اب یہ نیا
تماشا شرم تو نہ آئے گی تجھے اوکاریاں کرتے۔ مجھے تو
سوچ کر ہی ہول اٹھ رہے ہیں اور تجھے حیا نہیں۔
انوکھے کام کرتی ہے کم بخت۔ میں تو عاجز آگئی ہوں
تیرے ان چوچلوں سے۔" اماں نے ماتھے پر ہاتھ
مارتے اپنی شدید بے بسی کا اظہار کیا وہ قل قل کرتی
ہنس پڑی۔

"تو اماں کی باتیں سنو میں کون سا برا کام کرنے لگی ہوں۔ جو شرم اور حیا کروں کئی لڑکیوں میں سے سلیکشن ہوئی ہے میری، آپ کو تو فخر ہونا چاہیے کہ آپ کی پوتی کوئی عام سی لڑکی نہیں ارے بہت خاص چیز ہیں ہم۔" اس نے اک ادا سے فرضی کالر جھاڑے۔

"میں بھاڑ میں بھجوائی ایسی خاص چیز سے۔ کان کھول کر سن لے میں تجھے ایک پیسہ نہیں دینے کی۔ پچھلے دنوں بھی اپنے اللے تللوں میں میرا ڈیڑھ ہزار ضائع کروایا تھا تو نے روپیہ کوئی درختوں پر نہیں آتا جو توڑ توڑ کر تجھ پر وارتی رہوں۔ آئی سمجھ۔" اماں بہت سختی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آگئی، بہت اچھی طرح، میں نے تو بابا سے روپے مانگے تھے انہوں نے کہا تھا اماں سے لے لینا لیکن آپ تو دے نہیں رہیں چلیں بالکل نہ دیں۔ رات کو بابا آئیں گے تو میں انہیں سے لے لوں گی۔" اماں کے اٹھتے ہی وہ بھی کھڑی ہو گئی لہجہ پرسکون اور اٹل تھا اور یہ تو اس کی فطرت تھی کہ جو سوچ لیا ہے وہی کرنا ہے اپنے فیصلے سے وہ ایک انچ بھی نہیں سرکتی تھی اور اماں کو تاؤ دلانے کے لیے یہی بات کافی تھی وہ اسے خون آشام نظروں سے گھورتی پھر بیٹھ گئیں۔

"دیکھو، دیکھو ذرا اس کی ڈھٹائی۔ اری نامراد جب میں کہہ رہی ہوں کہ یہ کام نہیں کرنا تو بھاڑ کیوں نہیں آئی اور تیرا باپ کہاں سے دے گا پیسے وہ تو آج کل خود پریشان ہوا پھر رہا ہے خبردار جو تو نے اور اسے ستایا۔ خدا جنت نصیب کرے تیری ماں کو، ایسی سیدھی ایسی بھولی تھی وہ جو کھلایا کھالیا جو پہنایا پہن لیا مجھے نہیں یاد کہ کبھی اس نے کوئی ضد کوئی فرمائش کی ہو۔ کبھی دکھ نہیں دیا تھا اس نے ہمیں۔ خدا سلامت رکھے تیرے باپ کو وہ بھی ایسا ہی سادہ منش ہے۔ میری دونوں بچیاں کاملہ اور مائدہ بالکل اپنی ماں جیسی ہیں اس کی طرح سیدھی اور صابر۔ اک تو ہی اللہ جانے کس پر گئی ہے ایسی ضدی ایسی ہٹ دھرم توبہ توبہ۔"

"دوہائے ڈیئر گرینڈ ماں یہ سوچ کر پریشان نہ ہوا کریں کہ میں کس پر گئی ہوں۔ مجھے بھلا کیا ضرورت ہے کسی پر جانے کی یو نو ہم جیسے یونیک لوگ کسی سے صورت، شکل، عادات، مزاج کچھ بھی مستعار نہیں لیتے ہم اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔ میں اونہ ہوں آپ کی پوتی اونہ افضال بس یہ یاد رکھا کریں اور ہاں جو کہہ رہی ہوں وہ بھی مت بھولیے گا ٹھیک ہے نا۔" ان کے چپ ہوتے ہی وہ شاہانہ انداز سے بولتی چلی گئی جس پر اماں پھر بھڑک اٹھیں۔

"سچ ہی کہتی ہے نامراد تو اپنے آپ پر ہی گئی ہے تیرے جیسی ڈھیٹ نہ تو اس خاندان میں پہلے کوئی تھی اور خدا کرے نہ آئندہ کوئی ہو۔ تیری ماں زندہ ہوتی تو مجھے اتنے بڑھاپے میں تیرے ہاتھوں جلنا تو نہ پڑتا وہی اٹھاتی تیرے ناز نخرے اور ایسے کرتوتوں پر اچھی طرح خبر بھی لیا کرتی۔ میں تو لحاظ کر جاتی ہوں ورنہ تو دل کرتا ہے ایک ہی بار مرمت کر کے رکھ دوں۔"

"آئے ہائے، نہ یاد کروایا کریں مجھے میری ماں۔ اے کاش کہ وہ زندہ ہوتیں تو یقین کریں کبھی مجھے اس قدر بے دردی سے کوسنے نہ دیتیں نہ بات بات پر نامراد کہتیں، میرے ذرا سے رونے سے ہی ان کا دل موم ہو جایا کرتا۔ ماں، ماں ہوتی ہے اپنی اولاد کے لیے وہی دل سے حساس اور مخلص ہوتی ہے اس جیسا کوئی اور نہیں۔ حتیٰ کہ دادی بھی نہیں۔ اب یہی دیکھ لیں میری ذرا سی خواہش پر آپ اتنی سیخ پا ہوئی بیٹھی ہیں۔ ہائے میری کم نصیبی کاش میں کسی بڑے گھر میں پیدا ہوئی ہوتی کسی خوبصورت ترین کوٹھی میں رہتی بے پناہ چاہنے والے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوتی، میری کوئی خواہش تشنہ نہ رہتی میری زندگی مکمل ہوتی۔ خوشیاں، سکھ، اطمینان ہائے مگر کیا ہو کہ میری یہ زندگی اور میرے خواب بس میرے خواب۔" وہ اک ادا سے پیشانی پر ہاتھ رکھے آہوں پر آہیں بھر رہی تھی۔ اماں اس کی اتنی دلگیری پر انگشت بدنداں تھیں میں زیر لب مسکرا دیا۔ صارم بڑی سنجیدگی سے اٹھا اور وینا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تو افسردہ نہ ہو میری بہن، تیرے خواب پورے

ہوسکتے ہیں۔ کیا ہوا جو تم کسی امیر گھرانے میں پیدا نہیں ہوئیں لیکن تم کسی امیر گھر میں جا تو سکتی ہو نا' میں کرتا ہوں تمہارے لیے کوشش ڈھونڈتا ہوں کوئی امیر کبیر آدمی جو تمہاری تمام خواہشات پوری کرسکے۔"

"ہائے سچ' ارے جگ جگ جیو میرے بھائی۔ تم نے تو میرے دل کی بات کہہ ڈالی تم کتنے اچھے ہو میرے بھائی۔" صارم کی غیر سنجیدگی پر وہ بھی یقیناً "غیر سنجیدہ ہی تھی مگر اس مکالمے پر لماں نے تو اپنے گال پیٹ لیے۔

"ہائے توبہ' اے چھوٹی مرجائے تو' دیدوں کا پانی مر گیا ہے تیرے بے حیا۔ کیسے پٹر پٹر زبان چلتی ہے تیری اور اس کم بخت کو دیکھو شرم بیچ کھائی ہے واہیات انسان ایسے باتیں کرتے ہیں بہنوں سے وہ نامراد تو ہے پاگل ساتھ تو بھی ہوگیا۔"

"اماں' لماں میں تو مذاق کررہا تھا دل رکھ رہا تھا اپنی بے چاری بہن کا۔" ان کا چپل کی طرف ہاتھ بڑھتا دیکھ کر صارم نے بھاگنے میں ہی عافیت جانی دینا بھی ہنستی ہوئی ملو کی لوٹ میں ہوگئی اگر وہ دونوں بروقت اپنی جگہ نہ چھوڑتے تو یقین واثق تھا ان دونوں میں سے وہ چپل ضرور کسی ایک کو شرف ملاقات بخشتی۔

"غضب خدا کا بالکل ہی آپے سے باہر ہوگئے ہو تم لوگ اپنی اوقات میں رہنا سیکھو حد ہوگئی اتنی بکواس کوئی لحاظ شرم ہی نہیں رہ گئی تم لوگوں کے اندر۔" اماں مارے غصے کے ہانپنے لگیں' چہرہ سرخ پڑ گیا' سانس پھول گئی۔

"اف اماں آپ بھی کن بے وقوفوں کی باتوں میں آرہی ہیں پلیز ریلیکس پریشان نہ ہوں غصہ مت کریں بیٹھ جائیں۔" میں نے لپک کر انہیں تھاما اور ٹھنڈا کرنے کی سعی کی انہوں نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ارے کیسے غصہ نہ کروں میرا تو خون ہی جلادیا ہے ان ظالموں نے۔"

"او ہو اب جانے بھی دیں اور یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپ کا خون جل گیا جبکہ آپ کا چہرہ تو لال انار ہورہا ہے اگر خون جلا ہوتا تو آپ کے چہرے کو زرد ہونا

چاہیے تھا۔" میں نے شرارت بھرے لہجے میں کہا تو انہوں نے گھور کر مجھے دیکھا۔

"بالکل درست کہہ رہے ہو بھائی آخر ہماری اماں جان نے پچھلے زمانے کا دیسی گھی خالص دودھ، تازہ سبزیاں، شیریں پھل کھا رکھے ہیں سرخ انار جوان کا نہیں ہوگا تو کیا ہمارا ہوگا۔" صارم ہنستا ہوا کچن سے نکلا ہاتھ میں پانی سے بھرا گلاس تھا جو اس نے اماں کی خدمت میں پیش کیا۔

"لیجیے اماں پانی پیجیے اور غصہ تھوک دیجیے۔"

"ہاں بس یہی تو کر سکتی ہوں میں۔ تھوک ہی دوں ایسے غصے کو جس کا کسی پر کوئی اثر نہیں۔" انہوں نے ہاتھ مار کر گلاس پرے کر دیا۔ وہ شدید ناراض ہو چکی تھیں میں اور صارم لگے ان کی منتیں کرنے اور آخر کار انہیں پانی پلا کر ہی دم لیا۔

"اچھا بھئی میں چلتا ہوں اور ہاں سنا کو امی یاد کر رہی تھیں کیا اسے لے جاؤں اپنے ساتھ۔" میں اٹھ کھڑا ہوا اور اماں سے اجازت چاہی۔

"جو مرضی آئے کرے جاتی ہے تو لے جاؤ اور ہاں سے کہنا بے شک جتنے دن چاہے اپنے پاس رکھے اور اگر ہو سکے تو تھوڑی سی عقل بھی سکھا دے اس مصیبت کی پوٹ کو۔" وہ تو پہلے ہی اکتائی ہوئی تھیں میرے کہنے پر انہوں نے جیسے شکر ادا کیا تھا۔ وہ سنا ترپ کر ہلو کی اوٹ سے نکلی اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے پیچھے آنے کا بھی۔ سب کو خدا حافظ کہتا میں دروازے کی سمت بڑھا۔

"سنا تم نے حدید، اماں مجھے مصیبت کہہ رہی تھیں۔" گھر سے نکلتے ہی وہ انتہائی مظلومیت سے بولی۔ آج تو مجھے بھی اس پر خوب ہی غصہ آیا تھا میں آگے چل پڑا۔

"ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔"

"کیا" یقیناً" اسے شاک لگا تھا اک پل کو تو وہ بالکل ہی چپ رہ گئی پھر چیخ کر بولی۔

"ہاں، ہاں اب تم بھی کہو۔ مصیبت، عذاب، پریشانی، میرا تو وجود ہی سب کے لیے آزار ہے میں تو ہوں ہی بری تم سارے ہی۔۔۔"

"منہ بند کر کے چلو۔" میں نے بری طرح چڑ کر ٹوکا اور مجھے خود محسوس ہوا میرا لہجہ قدرے سخت تھا اس کی جو میرے چہرے پر نظر پڑی تو پھر کچھ نہ کہا۔ بقیہ راستہ خاموشی میں ہی طے ہوا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میں اس کا بازو دبوچے اپنے کمرے میں لے گیا اسے کرسی پر دھکیلا اور جتنا غصہ مجھے آرہا تھا اس کا اظہار کرنے میں میں نے ذرا بھی بخل سے کام نہ لیا۔ میں نے اسے بری طرح ڈانٹا۔ خوب سنائیں، کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگاتے ہوئے میں جانے کیا کچھ کہہ گیا اور جب ذرا سانس لینے کو ٹھہر کر اسے دیکھا تو بے اختیار اپنا ہی سر دیوار سے ٹکرانے کو جی چاہا۔ وہ بڑی فرصت سے میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی یعنی اس نے کچھ بھی دھیان سے نہیں سنا تھا اور میں نے گویا بکواس کی تھی۔

"سنا، سنا" میں نے بے انتہا زچ ہوتے ہوئے اپنے ہی بال مٹھی میں جکڑ لیے۔

"لو ختم ہو گئی تمہاری تقریر، اتار لیا غصہ، چلو اچھی بات ہے۔ ویسے میں حیران ہوں تم بھی اتنا فضول بول لیتے ہو۔"

میگزین رکھ کر وہ مسکراتی ہوئی کھڑی ہوئی تو مجھے اس کے الفاظ نئے سرے سے تپا گئے میں نے اس کی پشت پر جھولتی لمبی چوٹی کھینچ لی۔

"او کوف۔" وہ چلائی تھی۔

"سنا ایمان سے میں سچ کہہ رہا ہوں کسی دن بہت بری طرح پٹو گی میرے ہاتھوں بہت ستانے لگی ہو سب کو میں کہتا ہوں باز آجاؤ۔"

"اوہو میں نے بھلا ایسا کیا کر دیا ہے کہ سارے ہی نہا دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔" معصومیت تو بس اس لڑکی پر ختم تھی مجھے اس پر مزید تاؤ آیا۔

"واہ بہت خوب اتنا کچھ کر کے بھی محترمہ فرما رہی ہیں کہ کیا کیا ہے اور جب واقعی کچھ ایسا ویسا کریں گی تو

پھر ہم مسکینوں کا تو خدا ہی وارث ہوگا دیکھ لڑکی سدھر جا۔ اماں عاجز آئی رہتی ہیں تمہاری حرکتوں کی وجہ سے کچھ شرم کرو کیوں پریشان کیے رکھتی ہو انہیں۔" میں نے اسے پھر سے کرسی پر دھکیلا اور خود سامنے بیٹھ گیا۔

"ارے واہ یہ خوب کہی تم نے۔ میں پریشان کرتی ہوں انہیں یا وہ پریشان کرتی ہیں مجھے اللہ کے فضل سے بابا کی بہت اچھی کمائی ہے مگر وہ ہماری اماں جان ایسی کنجوس ہیں کہ ان کی کمائی کے تین حصے دبا کر فقط ایک حصے سے ہم سب کو ترسا ترسا رلا رلا کر پالتی پوستی آئی ہیں جانے بچت کا اتنا مراق کیوں ہے انہیں۔

بابا تو جو کچھ کما کر لاتے ہیں سب ان کی ہتھیلی پر دھر دیتے ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں اماں کا وہ عزیز از جان بکسہ جسے وہ اپنی ماں کی نشانی بتا کر کسی کو بھی ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دیتیں وہ پورے کا پورا میرے باپ کی کمائی سے بھرا پڑا ہے یہ تو سراسر زیادتی ہے نا۔ وہ گھر کا خرچہ بھی کس درجہ کفایت سے کرتی ہیں وہ بھی سب کے سامنے ہے اور جب کسی ضرورت کے تحت ان سے چند روپے بھی مانگ لو تو صاف جیث انکار کر دیتی ہیں۔ اگر زیادہ اصرار کرو تو کوسنے اور گالیاں دینے پر اتر آتی ہیں ایک بار ان کے اس قیمتی خزانے کی چابی میرے ہاتھ لگ جائے پھر دیکھنا کیا کرتی ہوں میں۔" اس نے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی پر الٹا ہاتھ مار کر اپنے جارحانہ عزائم کا اظہار کیا میں حیران ہو کر رہ گیا وہ تو اماں سے بہت زیادہ بدگمان لگتی تھی میں نے بے ساختہ اسے ٹوکا۔

"اچھا اب زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری بات سچی ہو مگر اماں جو کرتی ہیں تو تم لوگوں کے بھلے کے لیے ہی کرتی ہیں آخر کو تین لڑکیوں کا بوجھ ہے ان پر کوئی مذاق نہیں۔ اگر آج بچت نہیں کریں گی تو کل کیسے اس فرض سے سبکدوش ہوں گی وہ سمجھدار خاتون ہیں اور تم بھی سمجھداری سے کام کیا کرو آئندہ ان سے فضول بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر ایسا ہی کچھ ضروری چاہیے ہوتا ہے تو مجھ سے کہہ دیا کرو میں جو ہوں۔"

"ہائے سچ حدید۔" اس کے بجھے چہرے پر یکدم روشنی اتری۔

"کیوں تمہیں کوئی شک ہے پہلے کبھی میں نے تمہاری کوئی بات ٹالی ہے ایک سے بڑھ کر ایک بے کار ضد پوری ہے تمہاری۔"

"ہاں یہ تو ہے ویسے میری کوئی بھی ضد بے کار نہیں ہوتی۔" وہ شرارت سے ہنسی پھر مجھے اپنی حالیہ فرمائش کی تفصیلات بتانے لگی اور میں دل کڑا کر کے سنتا گیا۔ اب خود چھری تلے گردن رکھ دی تھی تو بھگتنا تو تھا۔

☼ ☼ ☼

اور بہت عرصے بعد اس گھر میں بھی کوئی خوشی کی کرن چمکی تھی۔ ای کے بعد لیلیٰ نے اپنے ناتواں کندھوں پر ساری ذمہ داری لی تھی اور بحسن و خوبی سنبھالتی رہی تھیں۔ اب بس دن رات انہیں ایک ہی فکر تھی کہ اپنی پوتیوں کے فرض سے بھی جلد از جلد سبکدوش ہو جائیں اور اس سلسلے میں وہ روز قمل بھائی جی کے دوست کی فیملی سے چند خواتین کاملہ آپا کو دیکھنے آئی تھیں اور کاملہ آپا کو جتنا خدا نے نرم' دھیما اور حساس مزاج دیا تھا اتنی ہی پیاری صورت بھی دی تھی نازک سراپا' دلکش نقوش لیے گھنے بال' ان کی شخصیت تو ایسی من موہنی تھی کہ کوئی بھی انہیں ناپسند نہیں کر سکتا تھا وہ خواتین بھی پہلی ملاقات میں متاثر ہو گئی تھیں اور جاتے ہوئے بہت اصرار سے ہمیں بھی اپنے ہاں آنے کی دعوت دے گئی تھیں اور چونکہ ان کا گھرانہ اور ان لوگوں کو دیکھنا بھالنا ضروری تھا۔ اس لیے تیسرے روز اماں نے وہاں جانے کا ارادہ کیا امی تو ان کے ساتھ جا ہی رہی تھیں انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا اور وینا بھی ضد کر کے ساتھ ہولی۔

☼ ☼ ☼

میں اپنی ہی دھن میں مگن سا گھر میں داخل ہوا تھا صحن بالکل خالی تھا میں۔۔۔ کمرے کی طرف ہو لیا اور ابھی اندر جانے کو ہی تھا کہ وینا کی آواز نے مجھے وہیں

ٹھہرنے پر مجبور کردیا وہ بے بسی کے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"اف آپا! سمجھتی کیوں نہیں ہیں میں آپ کے بھلے کو ہی کہہ رہی ہوں اسی لیے تو میں اس روز ضد کر کے وہاں گئی تھی اور سچ پوچھیں تو مجھے ان لوگوں سے مل کر قطعاً" کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی وہ لوگ تو آپ کے معیار کے ہی نہیں ہیں بہت ہی فضول لوگ ہیں وہ اس روز تو ہمارے سامنے انہوں نے خود پر تھوڑی سی پالش کرلی تھی مگر اندر کا میل پھر بھی جھانک رہا تھا جو میں نے دوران گفتگو بخوبی محسوس لیا اف توبہ اور ان کا وہ چھوٹا سا پرانی طرز کا مکان۔ جس میں مجھے ڈھونڈنے سے بھی کوئی بہتر سہولت نظر نہیں آئی۔ پلستر اکھڑی دیواریں ٹوٹے فرش کمرے میں قدیم دیمک زدہ فرنیچر رکھا تھا اور سجاوٹ کے نام پر پیتل و تانبے کے برتن و گلدان یقین مانیں مجھے تو وہ گھر کسی اینٹیک شاپ کا نمونہ لگ رہا تھا چلیں گھر تو رہ گیا ایک طرف وہ شخص جس سے آپ کو تمام زندگی کے لیے منتھی کرنے کا سوچا جارہا ہے۔ ذرا ان کی خوبیوں پر بھی روشنی ڈال لیں کیا ہیں وہ کیپٹن شہریار صاحب ایک فوجی جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بمشکل چند ہزار تنخواہ پاتا ہے ان کی تو صورت بھی کوئی خاص نہیں اس پر ان کی نوکری وہ صاحب تو سرتاپا سرکاری ہیں۔ ان کے کپڑے سرکاری ان کے جوتے سرکاری' ان کا کھانا سرکاری یعنی ان کے پاس اپنا تو کچھ بھی نہیں وہ تمام عمر بھی محنت کریں نا تو ایک خوبصورت گھر نہیں بنا سکتے اب آپ خود سوچیں ایسی زندگی سے کیا حاصل کہ ایک ڈربے سے نکل کر دوسرے میں چلی جائیں۔"

"اف چھوٹی میں کیا کہوں مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہی۔" آپا کی آواز میں لاچاری تھی۔

"تو سمجھیں نا اس رشتے سے صاف انکار کردیں یہی آپ کے لیے بہتر ہے۔" اس نے مشورہ دیا۔

"پاگل ہوئی ہو کیسے انکار کردیں۔ بابا نے ان لوگوں کو ہاں کردی ہے اب بھلا میں انکار کر کے ایک نیا تماشا لگادوں یعنی سب کی خوشی ملیامیٹ کروں۔ نہ بابا نہ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں۔ اماں اور بابا میرے دشمن تو نہیں سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہے انہوں نے۔ اب تو جو ہو رہا ہے اللہ کرے بہتر ہو۔"

اپنی ذات ملیامیٹ کرنے کا حوصلہ ہے آپ میں تو پھر ٹھیک ہے جائیں گزاریں وہ سسکتی زندگی' اپنے خوابوں کو اپنے ہی ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار کر بھی کوئی سکھی رہ سکا ہے۔ آپ بھی نرا گھاٹے کا سودا کررہی ہیں دیکھ لیجیے گا آپ۔" وہ حد درجہ چڑی تھی۔

"اف اب تم مجھے بددعائیں تو مت دو اور یہ کیا خوابوں خوابوں کی رٹ لگا کر میرا بھی دماغ گھمارہی ہو حقیقت کی دنیا میں رہنا سیکھو چھوٹی۔ اس عمر کے خواب خود فریبی اور خود اذیتی کے سوا کچھ نہیں ہوتے آج یہ خواب تمہیں احساس محرومی کا شکار کیے ہوئے ہیں کل کو اگر خدانہ کرے تم ان کی تعبیر نہ پاسکیں تو بڑا دکھ ملے گا کیوں خود کو ان سنہری زنجیروں کا قیدی بنائے رکھتی ہو پگلی سمجھدار بنو۔ حقیقت کیسی بھی ہو اسے پوری طرح فیس کرنا چاہیے دنیا میں ہم سے ہزاروں لوگ ہیں اور کروڑوں ہم سے کمتر ہمیں اپنے اطراف نگاہ رکھنی چاہیے اپنے جیسوں کو دیکھیں خود سے نیچے والوں کو دیکھیں اس میں ہماری بقا ہے اگر ہم صرف خود سے اوپر والوں کو دیکھتے رہیں گے تو میری جان اس میں سراسر ٹھوکر لگنے کا خدشہ ہے تم خود کو سنبھالو ان خوابوں کے ریشم میں مت الجھو مجھے تو گھبراہٹ ہونے لگی ہے تمہاری باتوں سے مصنوعی دنیا میں رہنا چھوڑ دو اور بنو۔" وہ آپا کو ترغیب دے رہی تھی کہ الٹا وہ اس کی ناصح بن گئیں۔

"اف اسٹاپ آپا مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں مجھے اپنے خواب اور ان میں رہنا اچھا لگتا ہے اور دیکھیے گا میں ان خوابوں کی تعبیر پا کر رہوں گی۔ مجھے اس سسکتی زندگی سے نفرت ہے میں صرف ایسے شخص سے شادی کروں گی جو میرے تمام خوابوں کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو میں کسی ٹٹ پونجیے سے ہرگز

شادی نہیں کروں گی جو میری زندگی کو نری پریشانی بنا کر رکھ دے مجھ سے نہیں ترسا جاتا اور اسی خوشی کے لیے اور نہ ہی قتل کر سکتی ہوں اپنے خوابوں کو پتا نہیں آپ کس طرح کر لیتی ہیں یہ سب۔"

اس کے لہجے میں اتنی نخوت' رعونت اور کرختگی تھی کہ میں چند لمحوں کو تو سن ہو کر رہ گیا۔ اف یہ لڑکی اور اس کے خواب اتنے اونچے اتنے بلند کہ میں تو ان کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتا تھا کیا تھا میں۔ اک بہت عام سا شخص سادہ زندگی' محدود وسائل اور اس نے تو اپنا معیار بہت خاص بنا رکھا تھا اس نے خود کو خواہشوں کے اس قلعے میں محصور کر رکھا تھا جس کی فلک بوس فصیلیں دیکھنے کے لیے مجھے اپنا سر بہت اونچا کرنا پڑتا وہ تو بہت فاصلے پر تھی کہ میں ہاتھ بڑھا کر اسے محسوس بھی نہیں کر سکتا تھا میرے اور اس کے درمیان یہ کیسی خلیج تھی۔ اس کے ہی خوابوں کی خلیج میرا محبتوں سے لبریز دل اس کرب ناک کیفیت پر کرلانے لگا اک اذیت تھی کم مائیگی کا احساس دو چند ہو گیا پھر مجھ سے مزید کھڑا نہ رہا جا سکا میں تھکے تھکے قدموں سے واپس ہو لیا۔

☆ ☆ ☆

میں اسے چاہتا تھا آج سے نہیں جانے کب سے میں نے اسے بے پناہ محبت دی پل پل اس پر توجہ کا سایہ کیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا بھرپور خیال رکھا اس کے لبوں کی مسکان برقرار رکھنے کے لیے ہر جتن کیا۔ وہ کچھ اس طرح میری نس نس میں سما گئی تھی کہ میرے لیے اس بن جینے کا تصور محال تھا اور یہ احساس ہونے پر کہ میری اتنی محبتوں کے باوجود وہ مجھ سے کتنے فاصلے پر ہے میں کتنا ٹوٹ گیا تھا۔

وہ مجھے بہت عزیز تھی اور اس کی خوشیاں بھی۔ میں تو ہمیشہ سے اس کی خواہشوں کا احترام کرتا آیا تھا۔ تو کیا اب نہ کرتا۔ گو کہ یہ میرے لیے میری محبت کے لیے اک امتحان تھا اور مجھے اب اس امتحان سے گزرنا ہی تھا۔ بس پھر مجھ پر اک جنون سوار ہو گیا کچھ کر گزرنے کا' اور چند ہی دنوں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سب اتنا آسان بھی نہیں مجھے تو اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت عرصہ درکار ہو گا اور اتنا انتظار تو میں خود نہیں کر سکتا تھا۔

اور اچانک ان ہی دنوں میرا بہت پیارا دوست ہارون اپنے چچا کے پاس امریکہ جا رہا تھا وہ میرا ہمراز تھا جانتا تھا میرے دل کی ہر بات' یہ اسی کا مشورہ تھا کہ میں اس کے ساتھ چلوں یہاں تو کئی سالوں تک بھی میں محنت کرتا رہتا تو شاید اس کے خوابوں میں رنگ نہ بھر سکتا۔ جبکہ وہاں جا کر کچھ ہی عرصے تک میں اپنا مطلوب پا سکتا تھا اور اس کا مشورہ میرے دل کو لگا تھا۔

اور میرے اس فیصلے سے تو گھر بھر میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ امی نے تو رو رو کر برا حال کر لیا ابا الگ ناراض ہوئے۔ ماما جی نے سمجھانے کی کوشش کی۔ تائی اماں نے فتویٰ دے دیا لڑکا باؤلا ہو گیا ہے۔ کلمہ آپا نے الگ میری منتیں کیں ان کی شادی میں چند دن ہی تو رہ گئے تھے اور میں ان کی خوشیاں بے رنگ کر کے جا رہا تھا مائدہ اور صارم بھی خفا ہو گئے۔ بس اک وہی تھی جس نے بے پناہ خوش ہو کر میری پیٹھ تھپکی تھی۔

"واؤ تم نے تو کمال کر دیا۔ ایسا نادر خیال تمہاری کھوپڑی میں آیا کہاں سے تم تو اتنے عقل مند نہ تھے۔ تم نے تو حیران کر دیا ہے چلو شکر ہے ہم میں سے کسی کو تو اپنی زندگی کا خیال آیا کسی نے تو قدم آگے بڑھائے۔ تم تو وہاں جا کر تھوڑے ہی دنوں میں ڈالرز میں کھیلنے لگو گے۔ دیکھو مجھے ہرگز نہیں بھولنا اور وہاں جا کر سب سے پہلے مجھے ڈالر بھیجنا میں نے آج تک ڈالر نہیں دیکھے۔" وہ بول رہی تھی میں مسکرا کر رہ گیا۔

"اف میری کتنی ٹور بن جائے گی اپنی سہیلیوں میں' جب میں انہیں بتاؤں گی کہ میرا کزن امریکہ گیا ہے۔ یہ تو سارے پاگل ہیں تمہارا دل توڑ رہے ہیں تم بالکل نہ گھبراؤ اور جم کے تیاری کرو میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" اس نے سب کے چہروں پر نظر ڈالتے کہا جبکہ سارے اسے گھور رہے تھے۔

اور مجھے وہ پل نہیں بھولتا جب میں اپنے دیس سے اپنے سب پیاروں سے جدا ہونے کو تھا سب ہی اداس

تھے میرا اپنا دل ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا بس اک دینا ہی چڑیاں کی طرح چہک رہی تھی وہ بہت خوش تھی مگر جب میں گھر سے نکلنے لگا تو جہاں سب کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ بھی ایک دم چپ ہو گئی۔

"تمہیں کیا ہوا تم نے کیوں منہ لٹکا لیا؟"

"تم... تم اتنی دور جا رہے ہو۔ تم وہاں جا کر کہیں ہمیں بھول تو نہ جاؤ گے میں تمہیں بہت یاد کروں گی حدید رئیلی آئی مس یو۔" ایک ہی سانس میں بولتی اس کی آنکھیں بھی بھیگ چلی تھیں اور میرا دیوانہ دل اک دھرتال پر رقص کناں ہو گیا تھا وہ میری کمی محسوس کرے گی۔ میرے بغیر کیسے رہے گی مجھے یاد کرے گی میرے لیے یہ زاد راہ ہی بہت تھا میں اس کی کیفیت پر بے اختیار ہنستا رہا۔

اس سے دور جانے کا سوچ کر میری اپنی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ دل میں چھپا کے اسے بھی ساتھ لے چلوں مگر یہ ممکن کہاں' اپنی اس خواہش کو ممکن بنانے کے لیے ہی تو میں اک طویل سفر پر نکلا تھا اس سے اتنی دور آ گیا تھا اور اب یہاں میں تھا اور میری بے تابیاں۔ میں اس کے خطوط کا منتظر رہتا اس کی آواز سننے کو بے چین میرا تو بس نہیں چلتا تھا کہ اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں یا اسے اپنے پاس بلا لوں مگر ہائے یہ بیچ کی دیوار۔

☆ ☆ ☆

"اوہ ہیرو لگتا ہے گزشتہ رات پھر تجھ پر دورہ پڑا ہے اس کی یادوں کا۔ تیرے کمرے کا اجڑا نقشہ' یہ بکھرے کاغذ' یہ تیری سرخ آنکھیں۔ یہ الجھے بال بے ترتیب حال' اوئے ہوئے میرا یار تو پورے کا پورا مجنوں لگ رہا ہے۔" ہارون صبح ہی صبح میرے کمرے میں آن دھمکا تھا اور میرے آس پاس بکھرے دینا کے خط دیکھ کر اس نے بے تکلفی سے میری پشت پر ہاتھ جمایا تو میں بلبلا اٹھا۔

"اوہو ہو' لگتا ہے ہاتھ کچھ زیادہ زور سے پڑ گیا' سوری یار۔" وہ بے ہودگی سے دانت دکھاتا میرے کندھے پر جھول گیا تو میں نے اسے اٹھا کر پرے پٹخا۔

"سوری کے بچے' کسی دن تیرے یہ ہاتھ ہی توڑ دوں گا میں' لوہے جیسے وزنی ہاتھ ہیں تیرے لے کے میری کمر توڑ دی۔" میں نے اپنی پشت سہلاتے اسے گھورا۔

"نہ نہ حضور مجھ غریب پر یہ ظلم مت کیجیے گا۔ اگر آپ نے میرے یہ خوبصورت ہاتھ توڑ دیے تو میں کن ہاتھوں سے اپنی میانہ کا گھونگھٹ اٹھاؤں گا۔" وہ جس انداز سے گھگھیا کر بولا میں نے ہنستے ہوئے اسے ایک دھموکا جڑ دیا۔

"بڑا بد تمیز ہے تو۔"

"کم تو تم بھی نہیں ہو میاں دیوانے۔ اب یہ بتاؤ کیا دینا کا کوئی نیا خط نہیں آیا جو یہ پرانے بکھرائے بیٹھے ہو خیر تو ہے لگتا ہے رات بھر سوئے بھی نہیں ہو۔" وہ سیدھا ہوتے ہوئے میری آنکھوں کی سرخی دیکھ کر جان گیا۔ میں نے بھی مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیا۔

"ہاں یار اور صرف رات ہی نہیں میں تو کئی راتوں سے ٹھیک سے نہیں سو پا رہا جانے کیا بات ہے چند دنوں سے وہ مجھے بے پناہ یاد آ رہی ہے۔ ہر لمحہ' ہر گھڑی' ہر طرف' ہر منظر میں مجھے اس کا چہرہ نظر آتا ہے کسی دوسرے کی صورت پر اس کا گمان ہونے لگتا ہے میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ اتنا عرصہ اس سے دور خود کو سمجھا سمجھا کر گزارا ہے کیسے پہاڑ سے تھے یہ برس اور کس طرح گزرے ہیں میں ہی جانتا ہوں مگر اب لگتا ہے تھک گیا ہوں۔ مزید سفر کی سکت نہیں رہی اور دوری سہہ نہیں پاؤں گا اب اس جدائی کا کرب برداشت نہیں ہوتا مجھ سے۔" میرے وجود کی تمام تھکن میرے لہجے میں بولنے لگی تھی ہارون نے میرا کندھا تھپکا۔

"تو خود کو کیوں اذیت دے رہے ہو میرے بھائی۔ تم اب تھکو گے نہیں تو اور کیا ہو گا۔ اوینہ کے لیے خوشیاں جمع کرتے ہوئے تم نے دن دیکھا نہ رات۔ کبھی اپنی صحت کا خیال کیا نہ اپنی ذات کا۔

بس اندھادھند کام کرتے رہے ہو ایمان سے حدید اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کب کا اپنے عہد سے پھر گیا ہوتا مگر یار یہ تم ہی ہو جو اتنی مشقت کے بعد بھی تازہ دم دکھائی دیتے ہو۔ تمہاری وفا تمہاری ہمت کو مان گیا ہوں یار تو واقعی لوینہ سے سچا پیار کرتا ہے اور میری بات مان تو اب بس کر بڑا امتحان لے لیا اپنا۔ اب تو یہ سوچو کہ اس کی اور اپنی خوشیوں کے لیے تمہیں کب پاکستان جانا ہے۔"

"پاکستان تو جانا ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے میں اب اکتا گیا ہوں مگر پھر سوچتا ہوں کہ ابھی۔۔۔"

"اب بس کر یکلے' بہت کما لیے ڈالر' اتنا تو جمع کر لیا ہے تو نے کہ لوینہ کے خوابوں جیسا اک سجا سجایا گھر اور اس گھر کے پورچ میں لش پش کرتی گاڑی اور اس گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر سوٹڈ بوٹڈ تم اور تمہارے ساتھ "بنی سنوری وینا" آہا کیا تصویر ہے اور اس تصویر میں رنگ بھرنے کے لیے تمہیں خود پاکستان جانا پڑے گا۔

اور سنو کل امی کا بھی خط آیا ہے انہوں نے لکھا ہے کہ سب میری شادی کے لیے دعاگو ہیں اور یہ کہ سب کا ارمان ہے کہ یہ شادی پاکستان میں ہو۔ اور رات کو انکل سے میری بات ہوئی ہے مزے کی بات ان کی بھی یہی خواہش ہے وہ بھی کئی برسوں سے پاکستان نہیں گئے اپنے لوگوں سے نہیں ملے وہ چاہتے ہیں کہ مہرانہ کی شادی پاکستان میں کریں تاکہ سب اپنوں کے درمیان اس خوشی کو محسوس کر سکیں۔" یہ بتاتے ہوئے ہارون کا چہرا اندرونی مسرت سے جگمگانے لگا۔

"اوہ' بہت بہت مبارک ہو یار۔" میں نے بے پایاں خوشی سے اسے گلے لگا لیا۔

"تو اس کا مطلب ہے اب تم پاکستان جانے کی تیاری کرو گے۔"

"بالکل اور صرف ہم ہی نہیں تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے سمجھے' میں اب مزید تمہیں مجنوں کا جانشین بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔" ہارون کے لہجے میں میرے لیے فکر مندی اور پیار تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے یار' مگر میرا پروگرام تو کچھ اور تھا۔ وینا ابھی پڑھ رہی ہے یہ اس کا فائنل ایئر ہے اور میں نے سوچا ہے کہ جب وہ ایگزام سے فارغ ہو جائے گی تو میں اچانک جا کر اسے حیران کروں گا۔" میری آنکھوں میں اس خیال سے ہی اک تصور بندھ گیا تھا۔

"او بس رہنے دے حیران کرنے کا پروگرام بہت ہو گیا کہیں اس چکر میں تم خود پریشان نہ ہو جانا۔" ہارون نے ہاتھ لہرایا۔

"خدا نہ کرے۔" میں دہل گیا۔

"ہاں خدا نہ کرے' اور تو بالکل بدھو ہے قسم سے ٹھیک ہے وینا ابھی پڑھ رہی ہے تو اسے پڑھنے دو۔ میں یہ تو نہیں کہہ رہا کہ پاکستان جاتے ہی کھٹ سے شادی کرلو ارے بھئی جتنا عرصہ اسے تعلیم مکمل کرنے میں لگے گا تم اس عرصے میں بزنس سیٹ کر لینا گھر لے لینا اسے سجا لینا اور جب وہ پڑھائی سے فارغ ہو جائے تو اس گھر کو بسا لینا۔ لو جی اللہ اللہ تے خیر صلا۔" وہ تو پورا پروگرام ترتیب دیے بیٹھا تھا میں نے بھی پرسوچ انداز سے سر کو جنبش دی۔

"ہوں پروگرام تو اچھا ہے سوچا جا سکتا ہے۔"

"سوچا جا نہیں سکتا بلکہ سوچ لیا گیا ہے اور یہ ڈن ہو گیا ہے' ہم ایک ماہ کے اندر رخت سفر باندھ لیں گے اور پھر اپنا سوہنا دیس ہو گا' ہم تم ہوں گے اور رقص میں سارا عالم ہو گا اور سوچو وہ گھڑیاں کیسی گھڑیاں ہوں گی جب مابدولت سفید گھوڑی پر سوار' اور شہزادی مہرانہ گھونگھٹ نکالے ڈولی میں چھپی بیٹھی ہو گی او ہو ہو او بلے او بلے۔" وہ مارے خوشی کے دیوانہ ہوا بھنگڑا ڈالنے لگا ساتھ اس نے مجھے بھی گھما ڈالا میں اس کی دیوانگی پر ہنستا نہ تو کیا کرتا۔

میرا ابھی پاکستان جانے کا کوئی ارادہ تو نہیں تھا مگر ہارون نے میری ایک نہ چلنے دی وہ میری ہر بات ہر دلیل رد کرتا گیا۔ میں سہانے سپنے دیکھتا پاکستان جانے کی تیاری میں لگ گیا۔ اور پھر تو دن گزرنے کا پتا بھی نہ چلا اور وہ لمحہ بھی آن پہنچا۔ جب ہم نے نیویارک کی

حسین فضاؤں سے رخصت لی۔

☼ ☼ ☼

جوں جوں ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ رہے تھے رگوں میں دوڑتے لہو کی گردش تیز تر ہو رہی تھی اپنے وطن واپسی کا خوش کن خیال۔ اپنی فضاؤں میں سانس لینے کی تمنا اپنوں سے ملنے کی خوشی اپنے خوابوں کے پورا ہونے کی امید۔ نیویارک سے پاکستان تک اکیس گھنٹوں کا سفر میں نے انہی خیالوں کے سنگ طے کیا۔ اور جناح ٹرمینل پر جہاز کے اترتے ہی میرا بس نہیں چلا کہ جہاز کے اترنے سے پہلے ہی چھلانگ لگا کر اتروں اور دوڑتا ہوا گھر پہنچ جاؤں۔

ایئرپورٹ پر مجھے لینے کے لیے کوئی آنے والا نہیں تھا کیونکہ میں نے کسی کو اطلاع ہی نہ دی تھی ہاں ہارون کا پورا خاندان وہیں امڈ آیا تھا اسفند انکل اتنے عرصے بعد وطن واپس آئے تھے ان کا شاندار استقبال ہونا تو لازمی تھا وہ لوگ ادھر مصروف ہوئے تو میں نے ایک کو چھوڑ کر دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے سے ملتے ہارون کو پکڑ کر جانے کی اجازت چاہی۔

"تمہیں جلدی کس بات کی ہے ہمارے ساتھ چلو کچھ ریسٹ کر کے کھانا کھا کر پھر فریش ہو کر چلے جانا۔"

اس نے مشورہ دیا اور میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو میرے کھانے کی فکر نہ کر کھانا اب میں گھر جا کر امی کے ہاتھ کا ہی کھاؤں گا بس میں چلتا ہوں۔ کل ملاقات ہو گی ٹھیک ہے نا۔" اسے مزید کچھ بولنے کا موقع دیے بغیر زبردستی مصافحہ کرتا میں جلدی سے نکل آیا۔ مبادا انکل ہی نہ روک لیں۔

جلدی ہی ٹیکسی مل گئی تھی اور میں اپنے جانے پہچانے راستوں پر رواں دواں تھا تمام راستے میں خیالوں ہی خیالوں میں متوقع لمحوں کی حسن آفرینی سے حظ اٹھاتا رہا حتی کہ وہ لمحے بھی آن پہنچے جب میں اس پیارے سے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ ٹیکسی رکوا کر احساس ہوا کہ میں اپنے نہیں ماماجی کے دروازے کے آگے ہوں اپنی گھبراہٹ بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوتے میں نے یہیں اترنے کا ارادہ کر لیا۔

اس وقت جو میرے دل کی حالت تھی میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ بے پناہ خوشی کے باعث میرا چہرہ لو دے رہا تھا۔ دھڑکنیں منتشر لرزتا ہاتھ جو میں نے دستک دینے کے لیے دروازے پر رکھا تو وہ آپ ہی آپ یوں کھلتا چلا گیا جیسے اسے میرے آنے کی پہلے سے خبر ہو۔ میں نے دھڑکتے دل سے دہلیز پر قدم رکھا۔ سوٹ کیس گھسیٹ کر اندر کیے۔

"حد ہو گئی اتنی دیر' صارم تم کوئی کام وقت پر۔۔۔"

یک لخت تیز تیز بولتی وہ کچن سے نکلی تھی اور مجھ پر نظر پڑتے ہی گنگ ہو گئی منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میں اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

اس چہرے کی دید کو کتنا ترسی تھیں میری آنکھیں کتنے دن' کتنے مہینے کتنے سال میں نے اس گھڑی کا انتظار کیا تھا۔ کیسے کیسے رنگوں میں سوچتا تھا میں اور آج جب اسے دیکھا تو لگا کہ میرے گزشتہ سالوں کی تھکن اس سے دوری کا بن باس' اپنوں سے جدائی کی تڑپ' ساری تکلیفیں' اذیتیں سب دور ہو گئی ہوں مجھے جیسے میرے حوصلے اور صبر کا انعام مل گیا ہو۔ میں مسکرا دیا وہ یوں اچانک مجھے دیکھ کر خوب حیران تھی ابھی چند روز پہلے ہی تو میں نے اس سے بات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ ابھی مزید ایک سال تک میرا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔

"حد۔۔۔ حدید' تت' تم۔" اسے ہوش آہی گیا تھا وہ تیر کی سی تیزی سے مجھ تک آئی میرا بازو تھام کر گویا میرے ہونے کا یقین کیا اور اس کی اس بے اختیاری پر میں سر سے پیر تک شانت ہو گیا۔

"جی ہاں میں' کیسی ہو؟" میں نے ہینڈ بیگ نیچے صحن میں رکھا اور نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اف تم سچ میں یقین نہیں آرہا۔ یوں اچانک آگئے تم نے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی بتایا کیوں نہیں۔" وہ کچھ مسوسی سی بے ربط ہو رہی تھی میں ہنس دیا۔

"دھیرج۔۔۔ ذرا سانس تو لو۔۔۔ سب بتاتا ہوں۔"

"اف وہ لماں' پھوپھو دیکھیں تو کون آیا ہے ذرا باہر تو آئیں۔" اس نے یکدم چیخ کر سب کو مطلع کیا۔ اس کی ایک ہی پکار پر اماں اور امی اقتال و خیزاں اندر سے دوڑی آئیں۔

"خیر تو ہے کون آگیا؟ اے حدید میرا بچہ' میری جان۔" امی کی خوشی دیدنی تھی۔

میں لپک کر ان سے لپٹ گیا۔ کتنا ترسا تھا میں اس پیار کے لیے اس چہرے کو دیکھنے کے لیے' تھک کر ان کی گود میں سر رکھ کر سونے کے لیے۔ ان کی ترسی مامتا بھی مجھے یوں سامنے پاکر بے قرار ہوگئی تھی انہوں نے چٹا چٹ مجھ پر بوسوں کی بوچھاڑ کردی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے میری پلکیں بھی بھیگ گئیں۔

"اے ہائے اب چھوڑ بھی دے مجھے تو ملنے دے اپنے بچے سے۔" اماں کی بے تابی پر ہنستا میں ان کے کھلے بازوؤں میں سما گیا۔

"میں صدقے' میں واری' میرا بچہ میری تو آنکھیں ترس گئیں —— تجھے دیکھنے کو ہائے اتنے سال اللہ جانتا ہے کیسے گزارے ہیں ہم نے اب تو واپس نہیں جائے گا نا میرا بیٹا۔" ان کے پیار میں فکر گھلی تھی۔

"نہیں' میں جانے کے لیے تو نہیں آیا' میں آگیا ہوں واپس ہمیشہ کے لیے اپنی لماں جان کے پاس۔" میں نے ان کے ہاتھ چوم لیے۔

"او یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں حدید بھائی میرا جگر میرا یار۔" صارم باہر سے آرہا تھا ہاتھوں میں پکڑے شاپر اس نے چارپائی پر اچھالے اور میرے گلے آلگا۔ میں نے بھی اسے سینے میں بھینچ لیا اس کی شرارتوں کو اس کی باتوں کو کتنا مس کیا تھا میں نے۔

"اف آپ تو اداس ہی کر گئے تھے ہمیں' مت پوچھیں ہمارا حال اور یہ کیا آپ اتنی دور سے اکیلے آئے ہیں؟" وہ مجھ سے الگ ہوا' میرے پیچھے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔

"نہیں' اکیلا تو نہیں آیا' ہارون اور انکل اسفند کی فیملی ساتھ آئی ہے۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"اتنا عرصہ امریکہ میں گزارنے کا کیا فائدہ ہوا آپ تو ابھی تک ویسے ہی بھولے ہو میرے بھائی۔ میں تو کسی میم شیم اپنی کسی بھابھی شالی کا پوچھ رہا تھا وہ ساتھ نہیں آئیں۔" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"چل ہٹ کیسی فضول باتیں کرتا ہے' میرا بیٹا ایسا نہیں ہے مجھے اپنے بچے پر بھروسا تھا تو اتنی دور جانے دیا تھا ورنہ کبھی نہ جانے دیتی اگر تیرے جیسا ہوتا تو۔" اماں نے اسے ایک دھپ لگا کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں مسکراتا ہوا لاڈ سے ان کے کندھے سے لگ گیا جبکہ صارم تڑپ اٹھا۔

"کیا مطلب' اگر میرے جیسا ہوتا تو۔"

"اماں مذاق کر رہی ہیں اتنا سفر کرکے آیا ہے میرا بیٹا تھک گیا ہوگا کیا یہیں کھڑے کھڑے ساری باتیں کرلینی ہیں چلو حدید اندر آؤ بیٹا۔ صارم تم یہ سامان بھی کمرے میں رکھ دو اور چھوٹی تم فٹ ٹھنڈا پانی بنا کر لاؤ۔" امی میرا بازو پکڑے ہوئے بولیں اور میری جو اس پر نظر گئی تو حیران رہ گیا وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑ رہی تھی۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا وہ پلٹ کر کچن میں جا گھسی' امی مجھے اک سجے سجائے صاف ستھرے کمرے میں لے گئیں۔

وہی ماحول' وہی فضا' وہی آسودگی بخشتی ہوائیں' وہی آنگن' وہی پھولوں کی بھینی بھینی باس' وہی آسمان' وہی ستارے' وہی سب میرے اپنے میں تو جتنا بھی مسرور ہوتا کم تھا۔ میرے آنے کی اطلاع ابا جی اور ماما جی تک بھی پہنچ گئی تھی۔ اور وہ فوراً گھر آگئے تھے اور جن کے سینے سے لگتے ہی میں کتنا پرسکون ہوگیا تھا کلثوم آپا اور مائدہ بھی اپنے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آگئیں۔ اور دونوں کتنی اچھی لگ رہی تھیں اپنے ننھے منے بچوں کی شرارتوں پر الجھتی فکر مند ہوتی۔

"چھوٹی ذرا گڑیا کو دیکھنا۔ بار بار سیڑھیاں چڑھ اتر رہی ہے کہیں گر ہی نہ جائے ایک تو اس کے چھلانگیں لگانے کے شوق سے بڑی تنگ ہوں میں۔ منع کرنا اسے۔" آپا نے دہائی دی تو وہ دوڑایا۔

"چھوٹی منے کا بھی خیال رکھنا کہیں پھسل نہ جائے

نیا نیا چلنا سیکھا ہے گر جاتا ہے۔" مائرہ کو اپنے بیٹے کا خیال تھا۔

"چھوٹی عمر کا فیڈر دھو کر تازہ دودھ ڈال کر لانا۔" آپا نے اسے آواز دی۔

"او نہ بیٹا' ذرا بھاگ کے ہنڈیا دیکھنا میں بھول ہی گئی' کہیں سالن لگ ہی نہ جائے۔" یہ امی کا حکم نامہ تھا۔

اور میں نے دیکھا چھوٹی بھاگ بھاگ کے سارے کام کر رہی ہے۔ بچوں کا خیال' کچن کی دیکھ بھال اس کے ماتھے پر اک شکن نہیں تھی۔ انتہائی مصروف انداز میں وہ اک اک حکم بجا لا رہی تھی۔

مجھے یاد تھا وہ کوئی کام کرنا پسند نہیں کرتی تھی اسے خود سے اٹھ کر پانی پینا بھی برا لگتا تھا اپنے لیے چائے کا ایک کپ بنانا بھی اسے گوارا نہ ہوتا تھا اسے چولہے کی گرمی سے الرجی تھی۔ اک بار مارے لگاوٹ کے اس سے میں نے چائے کی فرمائش کر دی تو اس نے صاف کورا جواب دے دیا تھا اور اب میں جان بوجھ کر اس سے تین بار چائے بنوا چکا تھا اور اس نے ایک بار بھی انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ دو منٹوں میں کپ لیے آن حاضر ہوتی میری حیرت بجا تھی اسے ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے میں متحیر سا دیکھ رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں ـــــ کتنا وقار آ گیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔ اس کا وہ بھولا بھالا چہرہ کیسا پُر تمکنت ہو گیا تھا کہ میری نظریں بار بار اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

امی' کلثوم آپا اور مائرہ میرے پاس بیٹھیں تو سب بھول گئیں ونا نے ہی تن تنہا کھانا بنایا' دسترخوان بھی اکیلے ترتیب دیا۔ اور جب وہ سب کو بلانے آئی تو میں اسے کن انکھیوں سے دیکھتا شرارتاً" صارم سے کہنے لگا۔

"یار میں جاتے ہوئے یہاں اک ضدی' کام چور' تیکھے مگر نازک مزاج والی لڑکی کو چھوڑ گیا تھا وہ مجھے باہر جا کر بھی بہت یاد آتی رہی اور اب میں اک عرصے بعد واپس آیا ہوں مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی ذرا ڈھونڈنا تو اسے' میں اس سے ملنے کو بڑا بے تاب ہوں۔"

"نہیں کون سی لڑکی۔" صارم شاید سمجھا نہیں تھا لیکن ونا کے لبوں پر مدھم مسکان بکھر گئی۔ وہ میرا اشارہ سمجھ چکی تھی۔

"چلیں اٹھیں کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔" وہ بچوں کے پھیلائے کشن سمیٹتی ہوئی بولی۔

"پر مجھے تو بھوک نہیں ہے۔" میں گاؤ تکیہ کھینچ کر پشت کے نیچے رکھتا نیم دراز ہو گیا۔

"کیوں" وہ سیدھی ہوئی تو آنکھوں میں تشویش تھی۔

"بھئی تم نے تین بار مجھے اس قدر اچھی چائے پلائی ہے کہ اب میرا کھانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا۔"

"ارے ارے حدید بھائی' اس وقت کھانے سے انکار مت کیجیے۔ آپ نہیں جانتے کہ چھوٹی کتنا اچھا کھانا پکاتی ہے۔ اس کے ہاتھ کے بنے چکن ہرے مسالے اور بریانی کا تو جواب نہیں۔ میں تو جب بھی آتا ہوں خاص طور پر فرمائش کرکے چھوٹی سے کھانا پکواتا ہوں اگر آپ کو بھوک نہیں ہے تب بھی کھا کر دیکھیے انگلیاں نہ چاٹتے رہ جائیں تو کہیے گا۔" تولیے سے ہاتھ پونچھتے اندر آتے مائرہ کے شوہر یاسر نے جس طرح اس کی تعریف کی میری حیرانی دوچند ہو گئی۔

"یار یہ کیا کایا پلٹ ہوئی ہے میرے پیچھے' ونا اور اتنی سگھڑ' آئی ڈونٹ بلیو اٹ۔ کیوں ونا یہ تبدیلی کیسی؟" میں نے اسے دیکھا۔

"ارے یہ تو کوئی تبدیلی نہیں ہے حدید بھائی آگے آگے دیکھیے۔ یہ اپنی چھوٹی بہت اچھی بچی بن گئی ہے۔" صارم ہنس دیا۔

"کیا مطلب بچی بن گئی ہے اپنی چھوٹی ہے ہی بہت اچھی بچی۔" یاسر بھائی نے اس کا سر تھپکا وہ چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

"ایک اور مزے کی بات اس کی ایک اور خوبی بتاؤں یہ پہلے کی طرح ہر بات کا تو تڑاخ سے جواب دینے کی بجائے اب چپ ہو جاتی ہے۔" صارم مجھے بتا رہا تھا۔

"ویری گڈ' یہ تو بہت اچھی بات ہے' اماں تو خوش

ہوں گی۔" میں مسکراتا ہوا صارم اور یاسر بھائی کی ہمراہی میں دوسرے کمرے میں آگیا۔ یہاں فرش پر بچھائی گئی چاندنی پر نفاست سے کھانا چنا ہوا تھا۔

"آؤ' آؤ بیٹا' یہاں بیٹھو میرے پاس۔" ماما جی نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ کھانا واقعی بہت مزے کا تھا' یاسر بھائی نے سچ کہا تھا۔

میں نے کھانے کے دوران وینا کو خوب داد دی۔ سب ہی تعریف کررہے تھے اور وہ ہلکی سی مسکراہٹ سے سب کی مدح سمیٹ رہی تھی۔ کھانے کے بعد میرا ارادہ تھا کہ میں سب کے لیے لائے گفٹس ان کے حوالے کروں۔ لیکن اماں نے مجھے سختی سے تاکید کی اب آرام کرو باقی کام بعد میں۔ سب نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی تو میں نے بھی سر ہلادیا۔ یوں بھی دو راتوں سے مارے بے قراری کے میں سو نہیں پایا تھا اب چین ملتے ہی نیند آنے لگی تھی اور میں شدت سے اپنے پرسکون بستر کی ضرورت محسوس کررہا تھا سو سب کو شب بخیر کہتا میں اٹھ کھڑا ہوا۔

✡ ✡ ✡

"نہایت ہی چھوٹی لڑکی ہو تم' جب میں دور تھا تو ہر خط میں اداسی کے رونے روتی تھیں ہر بار پوچھتی تھیں کہ پاکستان کب آؤ گے؟ اور اب جبکہ میں آگیا ہوں تو تمہارے پاس میرے لیے وقت ہی نہیں ہے میں کب سے منتظر ہوں کہ تم دو گھڑی میرے پاس بیٹھو مجھ سے باتیں کرو مگر تم ہو کہ تمہیں ان اوتگے بوتگے کاموں سے فرصت نہیں۔" میں کب سے اس کی راہ دیکھ رہا تھا مگر وہ تھی کہ اس کے کام ہی ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے کوئی گھنٹہ بھر پہلے وہ مجھے دو منٹ میں آئی کہہ کر جو گم ہوئی تو واپس پلٹنے کا نام نہیں لیا تھا آخر کار صبر کا پیمانہ چھلکتے ہی میں خود اسے تلاشتا کچن میں جا پہنچا۔ وہ انتہائی محویت کے ساتھ روٹیاں پکانے میں مگن تھی۔ میں اس کی یہ مصروفیت دیکھ کر جل بھن ہی تو گیا۔

"اوہ' سوری پلیز ناراض نہ ہوں مجھے احساس ہے میں تو خود آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں مگر کیا کروں یہ کام' اچھا آپ اندر جاکر بیٹھیں میں بس ابھی آئی۔" آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے وہ جس لہجے میں بولی میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا بمشکل اپنے حواس بحال کرتے ہوئے میں نے اپنے آس پاس دیکھا۔

"وینا یہ کس سے باتیں کررہی ہو تم' آنکھیں کھول کر دیکھو یہ میں ہوں حدید۔ جو تم سے عمر میں بے شک پانچ سال بڑا ہے مگر جس کی اس بڑائی کو تم نے کبھی قابل اعتنا نہیں جانا ہمیشہ تم مجھ سے جس انداز اور بے تکلف لہجے میں بات کرتی رہی ہو نا تو پلیز اب بھی مجھ سے اسی طرح بات کرو' یہ آپ آپ کے تکلف میں کیوں پڑ رہی ہو کہ مجھے غیریت کا احساس ہونے لگے۔ یار صارم ذرا ادھر آنا دیکھنا تو اسے کیا ہو گیا۔" میں نے پاس سے گزرتے صارم کو آواز دی جو کندھوں پر تولیہ ڈالے واش روم کا رخ کررہا تھا میرے بلانے پر گھبرا کر پلٹا۔

"کسے کیا ہو گیا ہے۔" اس کے استفسار پر جب میں نے وینا کا طرز گفتگو بتایا تو وہ جھٹ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بھائی جان اس میں چھوٹی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم ٹھہرے غریب بندے' مظلوم پاکستانی اور آپ' ماشاء اللہ امریکہ کی سڑکیں' پیروں تلے روند آئے ہیں اب ہم آپ سے آپ کرکے بات نہ کریں تو پھر کیا کریں۔"

"تو بھی اپنے نام کا ایک مسخرہ ہے جا یار اپنا کام کر۔" میں نے ہنستے ہوئے اسے ایک ہاتھ رسید کردیا۔ وینا کے لبوں پر بھی مسکان کی کلی چٹکی تھی۔

"کھانے میں کتنی دیر ہے چھوٹی میں باتھ روم جارہا ہوں نہا کر آؤں تو مجھے کھانا تیار ملنا چاہیے۔" صارم اس سے کہتا ادھر مڑ گیا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے میں سینے پر ہاتھ باندھے دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"بس یہ دو روٹیاں رہ گئی ہیں یہ ڈال لوں پھر میں آتی ہوں۔ اندر ـــــ جائیں بہت گرمی ہو رہی ہے

یہاں۔" وہ بڑی فکر مندی سے کہہ رہی تھی۔

"تو کوئی بات نہیں تم بھی تو کھڑی ہو یہاں۔" میں نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ اس کا چہرہ پسینے سے بھیگ رہا تھا آگ کی تپش سے دہکتے رخسار بالوں کی چند شریر لٹیں ماتھے پر چپکی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے ہر روپ میں اچھی لگتی تھی اب بھی اس کا بھیگا بھیگا چہرہ مجھے ہر بار سے زیادہ اچھا لگا۔

"میں تو عادی ہوں اس گرمی کی اتنی تو گرمی پڑتی ہے پاکستان میں۔ امریکہ میں تو اتنی گرمی نہیں ہوتی نا۔" وہ بڑے بھولپن سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں کیونکہ ہر طرف سے پہاڑوں میں جو گھرا ہوا ہے امریکہ۔ سارا سال برف باری ہوتی ہے وہاں۔ ارے پاگل لڑکی وہاں بھی گرمی پڑتی ہے۔ سردی گرمی سارے ہی موسم ہیں وہاں۔ اور چھوڑو اس بات کو تم یہ بتاؤ تم یہ کیا کر رہی ہو۔ یاد ہے تم کہا کرتی تھیں کہ میں تو شہزادی ہوں اور شہزادیوں کو یہ عام عورتوں والے کام سوٹ نہیں کرتے میں عورت پر لازم و ملزوم ٹھہرائے جانے والے یہ کام کبھی نہیں کروں گی میں تو ملازمائیں رکھوں گی' جو چٹکی بجاتے میرا ہر حکم بجا لائیں تو اب کیا ہوئے تمہارے وہ پلان۔" میری بات پر اس کے مسکراتے ہونٹ سکڑ گئے تھے۔

"ہاں کہتی تو تھی پاگل جو تھی اور ضروری تو نہیں کہ جو ہم چاہیں وہ پورا بھی ہو۔"

"ہو سکتا ہے پورا کیوں نہیں اگر ہم یقین اور قوی امید رکھیں۔ تم شہزادی ہو اور شہزادی بن کے رہو۔ اب کوئی ضرورت نہیں یہ سارے کام کرنے کی۔"

"کیوں کیا آپ میری جگہ یہ سارے کام کریں گے۔"

"پھر وہی آپ! میں سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا ہوں انسان بن جاؤ دینا۔" میں نے گویا دانت کچکچائے۔

"اب جلدی سے یہ سب کام سمیٹ کر کچھ ٹائم مجھے دے دو ورنہ میں تمہارا سب کیا کرایا تلپٹ کر کے رکھ دوں گا سمجھیں۔" میں پیار بھری خفگی سے اسے وارن کرتا کچن سے نکل کر اس کے روم میں آگیا۔

یہ کمرہ پہلے تایا' ماما اور اس کا مشترکہ ہوا کرتا تھا اور اب ان دونوں کے بعد یہاں صرف دینا کی اجارہ داری تھی جو اس کے اعلا ذوق کی مظہر تھی۔ صاف ستھرا' با ترتیب کمرہ' فرش پر سادہ نیلا کارپٹ بچھا تھا کونے میں سنگل بیڈ اس سے کچھ فاصلے پر دو کرسیاں رائٹنگ ٹیبل ساتھ ہی کتابوں سے بھری بک شیلف تھی۔ دائیں طرف ایک الماری' بیڈ کی سائڈ وال پر ایک خوبصورت پینٹنگ آویزاں تھی جس سے کچھ پرے سرخ و سفید موتیوں سے بنا وال ہینگنگ اور یونہی جائزہ لیتے میری نظر نازک سے فریم میں قید دینا کی ہنستی مسکراتی تصویر پر جا ٹھہری یہ تصویر یقیناً" یونیورسٹی کی کسی تقریب میں اتاری گئی تھی لائٹ پنک امبرائیڈڈ سوٹ میں اس کا معصوم حسن کتنا دلفریب لگ رہا تھا میں تو کئی لمحے مبہوت سا اس تصویر کو دیکھتا رہا میرے انہماک کو کھڑکی سے اندر آتے ہوا کے شریر جھونکے نے توڑا جس سے رائٹنگ ٹیبل پر بکھری کتابوں کے اوراق پھڑپھڑائے تھے۔

میں چونک کر اس طرف چلا آیا ٹیبل پر پڑی کتابوں کے ساتھ کچھ میگزین تھے جن کی طرف جاتا میرا ہاتھ ان ہی کے درمیان رکھی میرون جلد والی ڈائری تک جا رکا میں نے بلا ارادہ اسے اٹھا کر کھول لیا۔ گو کہ کسی کی ڈائری بلا اجازت پڑھنا غیر اخلاقی حرکت قرار پاتی ہے لیکن یہ کسی اور کی تو نہیں دینا کی ڈائری تھی سو یہی سوچ کر میں نے اطمینان سے پہلے ورق پر نظر ڈالی سیاہ روشنائی سے اک غزل تحریر تھی میں نے کرسی سیدھی کی اور مزے سے بیٹھ گیا۔

کوئی دیوار ہے نہ در سائیں
ہم فقیروں کا کیا ہے گھر سائیں
آبلے پڑ گئے ہیں پیروں میں
ختم ہوتا نہیں سفر سائیں
کون رہتا ہے اس خرابے میں
ڈھونڈتی ہے کسے نظر سائیں
اک قیامت گزر گئی مجھ پر
اور مجھ کو نہیں خبر سائیں

ایک بھٹکے ہوئے مسافر کو
اور ہونا ہے دربدر سائیں

اللہ رحم کرے۔ یہ کس طرح کی شاعری لکھ رکھی ہے وینا نے میں نے صفحہ پلٹا اک قطعہ درج تھا۔

دھوکے کھا کر مجھ کو یہ معلوم ہوا
چاہ کا عنصر دنیا سے معدوم ہوا
کل کا دن اس الجھن کو سلجھائے گا
میں تجھ سے یا تو مجھ سے محروم ہوا

ہیں یہ کیا ہو گیا ہے وینا کو۔ میں نے اگلا صفحہ پلٹا اور اسی پل وہ آ گئی تھی۔

"ہائے میری ڈائری" میرے ہاتھوں پر نظر پڑتے ہی وہ چیخی۔ اس نے ٹرے تھام رکھی تھی جو جلدی سے ٹیبل پر رکھ کر میری جانب لپکی۔ میں نے بھی جھٹ ڈائری اس کی پہنچ سے دور کی۔

"سوری فرینڈ تمہاری ڈائری پڑھنے کے جرم کا مرتکب ہوا لیکن وینا یہ تو بتاؤ یہ کس قسم کی مایوسانہ اور فضول شاعری لکھ رکھی ہے تم نے یہ دیکھو۔" میں ڈائری سامنے کیے باآواز بلند پڑھنا چاہتا تھا کہ اس نے اچک لی۔

"بہت' بہت زیادہ غلط بات ہے کسی کی پرسنل چیزوں کو بلا اجازت ہاتھ نہیں لگاتے پتا ہے نا۔" اس کا چہرہ ہی نہیں لہجہ بھی انتہائی برہم ہو گیا تھا اس سے پہلے کبھی اس نے مجھ سے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ میں نگاہ حیران اس کے تتے چہرے پر ڈالتا کھڑا ہو گیا۔

"سوری' مجھے علم نہیں تھا کہ اتنے عرصے میں تم میرے لیے کسی ہو گئی ہو آئندہ احتیاط برتوں گا سوری اگین۔" میں بھی یکدم سنجیدہ ہو گیا تو وہ بوکھلا گئی۔

"اوہو میرا یہ مطلب نہیں تھا اور حد ہے میں اسے باہر کیسے بھول گئی اور آپ کھڑے کیوں ہو گئے بیٹھیں نا۔ اچھا یہ لیں جوس۔ کھانا ابھی لگاؤں گی ذرا ٹھہر کے آج گرمی بہت ہے اف میرا تو حشر ہو گیا پنکھے کی اسپیڈ تیز کر دوں توبہ توبہ جانے یہ گرمی کب جان چھوڑے گی۔" اس نے ڈائری دراز میں رکھ کر مقفل کر دی۔ چابی کھینچ کر ٹیبل کور کے نیچے کھسکا دی اور تیز تیز بولتے ہوئے گویا اپنی خفت مٹانے لگی میں نے بھی اپنے تنے نقوش ڈھیلے کیے۔

"اس لیے تو کہا ہے کہ خود کو اذیت دینے والے کام نہ کرو کیا ضروری تھا اتنی گرمی میں جلتے کھانا پکانا بازار سے منگوا لیتیں اتنے ہوٹل کس لیے ہیں بھلا اور اس جوس کی ضرورت مجھے نہیں تمہیں ہے چلو بیٹھو ادھر اور یہ پیو۔" میں نے ایک ہاتھ سے پکڑ کر اسے بٹھایا اور دوسرے سے منگو جوس کا گلاس اور اس کے منہ نہ کرنے کے باوجود اسے پلا کر ہی دم لیا۔

"اتنا کام کرتی ہو اور اپنا خیال بالکل بھی نہیں رکھتی ہو میں دیکھ رہا ہوں خود سے بہت لاپروا ہو گئی ہو۔ تم بہت بدل گئی ہو وینا یا مجھے لگ رہا ہے۔" میں نے اس سے پوچھا۔

مجھے اس کی ایک ایک بات یاد تھی اسے اپنی ذات سے پیار تھا اپنے خوابوں سے عشق اپنے آگے تو وہ کسی اور کو اہمیت دینے کی قائل ہی نہ تھی وہ بچپن ہی سے اپنی شخصیت کو سنوار کر رکھنے کی عادی تھی ہمیشہ نک سک سے درست بڑی نفیس طبیعت پائی تھی اس نے جبکہ اب میں اسے وہی دو دن پرانا سوٹ پہنے دیکھ رہا تھا' شکن آلود اور میلا کچیلا لگتا تھا کنگھا کیے بھی زمانہ گزر گیا ہے الجھی بکھری لٹوں کے درمیان اس کا زرد ستا چہرہ۔

مائرہ اور کلثوم آپا بھی بہنیں تھیں اور مجال ہے جو دونوں اٹھ کر پانی بھی پیتی ہوں ہر ہر کام کے لیے سارا دن چھوٹی' چھوٹی کی پکار پڑی رہتی اور وہ بھی ایسی فرماں بردار ہر پکار پر لبیک کہتی۔ میں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا اور اب اس کے حلیے پر غور کیا تو کھل گیا۔ وہ سر جھکا گئی تھی مجھے غصہ آ گیا۔

"خبردار جو اب تم نے کسی کام کو ہاتھ لگایا میں آج ہی امی سے کہہ کر کسی میڈ کا بندوبست کرواتا ہوں۔ تم نے تو خود کو ہلکان کر لیا ہے ذرا اپنی آپاؤں کو بھی جلنے دیا کرو تم جیسی چار چار نکل آئیں۔ جتنی وہ صحت مند ہیں اور تم ہو کہ حال سے بے حال ہوئی ہو گئی آئینہ دیکھے کتنے روز گزر گئے تمہیں۔ سارے کاموں

کی فکر پڑی رہتی ہے ذرا خود پر بھی غور کرلو کیا ہو گیا ہے تمہیں دینا؟"

"اُفوہ کچھ بھی تو نہیں ہوا مجھے۔ خوا مخواہ پریشان نہ ہوں اچھا انھیں میں کھانا لگا رہی تھی۔ کھانا کھالیں اماں بھی آپ کا پوچھ رہی تھیں۔" یونہی جھکے سر سے بولتے اس نے گلاس ٹرے میں رکھا اور اٹھنے لگی۔

"فی الحال مجھے بھوک ہے اور نہ تم کہیں جاؤ گی۔ اماں کو میں بتا آیا تھا کہ تمہارے کمرے میں ہوں۔ تم میرا وہ بیگ لے آؤ جو اس روز میں ادھر چھوڑ گیا تھا۔"

"وہ تو یہیں ہے وہ الماری میں ابھی لائی۔" وہ اٹھ کر بیگ لے آئی۔ میں نے بیگ کھول کر پورا اس کے سامنے الٹ دیا۔

"یہ سب تمہارے گفٹس ہیں گاہے بگاہے کسی نہ کسی موقع پر تمہارے لیے لیتا رہا تھا سب تو یاد نہیں ہاں یہ بریسلیٹ عید پر لیا تھا یہ پرفیوم تمہاری برتھ ڈے پر یہ اپنی برتھ ڈے پر' یہ شال کرسمس پر' یہ اس دن' یہ اس دن۔" مجھے جو جو یاد آتے گئے بتا تا گیا۔

"یا خدا' یہ اتنے گفٹس میرے لیے۔" اس کی دلنشین آنکھیں مزید کشادہ ہو گئیں۔

"جی ہاں جناب صرف آپ کے لیے پسند آئیں سب چیزیں۔"

"اُف اتنا کچھ لانے کی کیا ضرورت تھی بس کوئی ایک آدھ چیز لے آتے وہی میرے لیے کافی ہوتی آپ نے تو فضول خرچی کی انتہا کردی۔"

"اے اے لڑکی خبردار ان چیزوں کو فضول خرچی کہا تو۔ حد ہے تمہیں یہ چیزیں نظر آرہی ہیں ان میں چھپا میرا خلوص اور پیار نظر نہیں آرہا۔ تم نے تو مجھے ڈس ہارٹ کردیا ہے خوش ہونے کی بجائے حیران ہو رہی ہو۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم بہت خوش ہو گی آخر کو تمہارا کزن امریکہ سے آیا ہے بھئی تم نے اپنی سہیلیوں میں ٹور بھی تو بنانی ہو گی یاد ہے جب میں جا رہا تھا تو تم نے کیا کہا تھا؟" میں اس کی وہ بات یاد کر کے ہنس دیا۔ اور اس نے پلکیں اٹھائیں تو سیاہ پتلیاں جگمگا رہی تھیں۔

"یاد ہے' سب یاد ہے۔ میں بھولی نہیں اپنی بے وقوفیاں۔ تب میں پاگل تھی کہ ہر چمکتی چیز پر لپکنے والی۔ اب جان گئی ہوں کہ ہر شے سونا نہیں ہوتی۔"

"کیا مطلب؟" مجھے تو اس کے لفظوں نے حیران کردیا سمجھداری کی باتیں اور اونہہ کے منہ سے۔

"کچھ نہیں اور تھینک یو' یہ سب چیزیں اتنی خوبصورت ہیں اتنی اچھی' یہ ہینڈ بیگ تو بہت زبردست ہے' شال کا کلر کتنا پیارا ہے اور یہ فلاورواز تو میں اس کونے میں لگاؤں گی' یہ قلم کتنا نازک سا ہے اف آپ کی چوائس تو بہت فنٹاسٹک ہے۔ میں حیران ہو گئی ہوں یہ اتنی چیزیں میرے لیے۔" وہ ایک ایک چیز کو چھو کر خوش ہو رہی تھی۔

"میں' میں اماں کو دکھاتی ہوں' انہیں لے کر آتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگی میں نے ہاتھ پکڑ کر پھر بٹھالیا۔

"ابھی سمیٹو یہ سب' پھر کسی وقت دکھانا' اور یوں کرو جلدی سے تیار ہو جاؤ تم میرے ساتھ باہر جا رہی ہو' پتا ہے دینا میں وہاں تم سب کے ساتھ اپنے شہر کی سڑکیں بھی یاد کیا کرتا تھا اتنا دل چاہتا تھا کہ انہی سڑکوں پر گھوموں پھروں اس بے فکری اور اپنائیت کے ساتھ' جانتی ہو نیویارک کے سڑکیں ہیں تو بہت خوب صورت لیکن وہاں مجھے ہمیشہ اجنبیت کا احساس رہا۔

یہی خیال ساتھ ہوتا تھا کہ یہ لوگ یہ راستے اپنے نہیں وہاں وہ موج ہے ہی نہیں جو یہاں ہے نہ آپ جوس پی کر خالی ڈبا سڑک پر اچھال سکتے ہیں نہ چپس کھانے کے بعد ریپر میں ہوا بھر کر کسی کے آگے پٹاخہ پھوڑ سکتے ہو نہ پتھر کو ٹھوکروں سے اڑا سکتے ہو نہ وہاں گول گپوں کے چٹخارے ہیں کیا ہے وہاں کچھ بھی تو نہیں' مزا تو بس اپنے دیس میں ہے آج میرا دل چاہ رہا ہے میں اپنے راستوں پر چلوں خوب سیر کروں تم چلو گی نا میرے ساتھ۔" میں نے ابھی تک اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اس نے آہستگی سے ہاتھ کھینچتے ہوئے اقرار میں سر ہلایا تو میں شادمان ہو گیا۔

اور وہ میری زندگی کی یادگار اور دلفریب شام تھی جو میں نے اس کی قربت میں گزاری۔ یونہی سڑکوں پر

گھومتے اس سے باتیں کرتے گزرے دنوں کی یادیں
دہراتے' ساحل سمندر کے کنارے اس کے ہم قدم
چلتے اس کے سنگ آئس کریم کھاتے میرے لیے اس
شام کا اک اک لمحہ مسحور کن تھا اور اسی فسوں میں
کھوئے میں نے وینا کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا
تھا وہ بات جو میں اس سے کبھی نہ کہہ پایا اس شام بلا
جھجک کہتا چلا گیا۔

اپنے جذبات' محسوسات' اپنا ہر خیال وہ یقیناً"
حیران تھی سر جھکائے سن رہی تھی شاید ایسا اس کے
گمان میں نہ تھا وہ بالکل چپ کر گئی تھی چہرے پر سرخی
پھیل رہی تھی' پلکیں لرز رہی تھیں اور میں پہلی بار
اس کا محجوب روپ دیکھ کر مسرور ہو رہا تھا۔

"واپسی پر میں اسے ہارون کی طرف لے آیا وہاں
حسب توقع خوب رونق لگی ہوئی تھی اب چند دن ہی تو
رہ گئے تھے اس کی شادی میں۔

"آہا' حدید بھائی۔" مجھے دیکھتے ہی افزا نے نعرہ بلند
کیا تھا۔

"شکر ہے ہیرو' تیری شکل بھی نظر آئی ورنہ میں تو
یہی سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ میں تجھے وہیں چھوڑ آیا
ہوں۔" ہارون بے تابی سے میرے گلے آلگا۔

"یہ غالباً" نہیں یقیناً" اوینہ ہیں۔" نوین نے
میرے عقب میں کھڑی وینا کا ہاتھ پکڑ کر آگے کیا۔

"آف کورس۔" میں مسکرایا۔

"نائس ٹو میٹ یو۔" اپنی پہچان پر خوش نوین نے
وینا کے گال کا بوسہ لے لیا وہ اس انداز پر بری طرح
جھینپ گئی۔

"جوڑی تو ماشاء اللہ خوب زوردار ہے تیری۔"
ہارون نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں ہنس دیا۔

"یار نوین انہیں اندر لے جاؤ' سب سے ملواؤ۔"
ہارون کہہ رہا تھا۔

"آئیں اوینہ اندر چلتے ہیں آج تو خوب مزا آرہا ہے
تمام کزنز اکٹھے ہوئے ہیں۔" وہ دونوں اسے لے کر
اندرونی حصے کی طرف چلی گئیں میں وہیں لان میں
کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا ہارون بھی میرے سامنے ٹک
گیا۔

"اور سنا شہزادے کیسی گزر رہی ہے' بہت خوش
نظر آرہا ہے' لگتا ہے اوینہ سے خوب باتیں ہوئی ہیں
تیری۔" وہ میرا جگری یار ہمیشہ کی طرح میرے چہرے
کے رنگ پہچان گیا تھا۔ میں کھلکھلا اٹھا اور مختصراً"
اسے گزری شام کا احوال سنا دیا۔

"موج ہے بھئی تیری۔ جبکہ اپنی تو شامت آئی
ہوئی ہے۔ پہلے پتا ہوتا کہ پاکستان آکر یہ حالت ہوگی تو
انکل کے پاؤں پڑ کر وہیں سہرا بندھوا لیتا۔" وہ جانے
کیوں چڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"یہ پوچھ کیا نہیں ہوا۔ آج پورے چار دن ہو گئے
ہیں میں نے مہرانہ کو دیکھا نہیں اس کی آواز تک نہیں
سنی۔ اتنا ظالمانہ دستور ہے یہاں کا' ایک ہی گھر میں
رہتے ہوئے اتنا سخت پردہ کروایا جا رہا ہے اسے' امی
مجھے اندر کمروں میں گھسنے نہیں دیتیں بس اپنے کمرے
میں جاتا ہوں وہاں سے اٹھتا ہوں تو لان میں آبیٹھتا
ہوں' پھر اپنے کمرے میں یا گھر سے باہر عجیب زندگی
ہو گئی ہے میری' میں تو پریشان ہو گیا ہوں احتجاج کروں تو
کوئی سنتا نہیں' ابو الگ آنکھیں نکالتے ہیں' اس بے
چاری پر پتا نہیں کیا بیت رہی ہے۔ اللہ جانے اسے
کہاں باندھا ہوا ہے ان لوگوں نے اور تو اور لیزا آنٹی کی
سن لو' فرماتی ہیں خبردار جو میری بیٹی سے ملا' اسے تب
تک نہیں دیکھنے کا جب تک تمہارا شادی نہیں بن
جاتا۔" وہ تو اچھا خاصا تپا ہوا تھا لاوے کی طرح پھٹ
پڑا۔

"ریلیکس ڈیئر فرینڈ یہ تو یہاں کی روایات ہیں جو
اچھی بھی لگتی ہیں اب صرف آٹھ دن تو رہ گئے ہیں پھر
اس کے بعد تم نے ہی اسے دیکھنا اور سننا ہے تب پھر تم
ان سارے لوگوں کو یاد کیا کرو گے اور سوچو گے کہ کاش
میرے بن کہے ہی یہ لوگ مجھے کسی کمرے میں بند
کردیں۔ میری جان شادی سے پہلے لڑکا لڑکی میں یہ چند
دنوں کی مکمل دوری اسی لیے کی جاتی ہے کہ وہ اپنے
اندر اتنا اسٹیمنا اسٹور کرلیں کہ بعد میں ایک دوسرے

کو برداشت کر سکیں۔" میں نے اسے بھرپور تسلی دی۔

"کوئی بات نہیں بچے اڑا لے مذاق مجھ پر بھی وقت آئے گا نا' تب پوچھوں گا اب بتا بیٹے پہاڑ اونٹ تلے آیا ہے کہ نہیں۔" وہ مجھے گھورتے غصے میں الٹا محاورہ بول گیا تھا میں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"ابے گھامڑ' پہاڑ اونٹ تلے نہیں آتا' اونٹ پہاڑ تلے آتا ہے۔"

"ہاں' ہاں وہی' آیا کہیں سے بڑا اردو دان جانتا ہوں میں تجھے' اب زیادہ کھی کھی نہ کر۔" وہ برا مان گیا میں مسلسل ہنس رہا تھا کہ بعجلت کوریڈور کی سیڑھیاں اترتی ورشا کو دیکھ کر ہنسی ضبط کی۔

"حدید چلیں۔" وہ ہمارے پاس آرکی۔

"اتنی جلدی' ارے بھئی ابھی تو آپ لوگ آئے ہو' کچھ دیر تو ٹھہرو' یوں بھی ڈنر ٹائم تو ہو ہی چکا ہے۔" ہارون نے اپنے زاویے درست کیے۔

"نہیں بہت دیر ہو گئی ہے اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔" اس نے متفکر نگاہوں سے دیکھا۔

"اوکے یار' واقعی دیر ہو گئی ہے ہم کب کے گھر سے نکلے ہوئے ہیں اب تیری شادی پر ہی ملاقات ہو گی۔" میں نے ہارون سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"اکیلے ہی منہ اٹھا کر نہ آجانا سب کو لے کر آنا' اور ورنہ آپ بھی ضرور آیئے گا۔" وہ اسے دعوت دے رہا تھا اس نے آہستگی سے گردن ہلا دی۔ میں نے ہارون سے رخصت لی۔

☆ ☆ ☆

ہارون کی شادی' پھر اپنے بزنس کے لیے بھاگ دوڑ' اک خوبصورت سا گھر خریدنے کی لگن' میرے دن رات انتہائی مصروف ہو چکے تھے میں اکثر صبح کا نکلا رات گئے گھر واپس آتا' اس روز بھی میں بہت لیٹ ہو گیا تھا امی میرے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ میں شرمندہ ہو گیا وہ بہت غصے میں تھیں۔

"سوری امی' کچھ دیر ہو گئی' آپ سے تو کہا ہے آپ سو جایا کریں گیٹ کی چابی میرے پاس ہے' پھر بھی آپ ٹینشن لیتی ہیں۔" میں ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"تو کیا نہ لوں' ماں ہوں تمہاری' اتنے دن گزارے ہیں تمہاری جدائی میں' اب تو دل کرتا ہے ذرا دیر کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہ کروں تمہیں اور تم ہو کہ سارا سارا دن ہی غائب رہتے ہو۔ ذرا احساس نہیں تمہیں میرا' آخر کیا کرتے پھر رہے ہو۔ میرا تو دل ہولتا رہتا ہے' اتنی فکر مند ہو رہی تھی میں۔"

"وہ میری پیاری امی جان آپ کیوں فکرمند ہوتی ہیں' مجھے باہر کئی کام ہیں' آپ بس میرے لیے دعا کیا کیجیے' جلد ہی میرا کاروبار سیٹ ہو جائے میں ایک پیارا سا گھر لے لوں تو پھر انشاء اللہ زیادہ ٹائم آپ کے ساتھ گزاروں گا۔" میں نے ان کی گود میں سر رکھ دیا۔

"دعائیں تو میں ہر پل کرتی ہوں اپنے بچے کے لیے۔ خدا ہزار خوشیاں دے لیکن یہ گھر کا کیا چکر ہے' ارے پگلے یہ گھر کیا برا ہے۔ ہمارے گزارے لائق بہت ہے ہم یہیں ٹھیک ہیں۔ میں بتا رہی ہوں میں کہیں اور نہیں جانے کی۔ ساری عمر یہیں گزری ہے میری ماں بھی یہیں ہے ہم باقی باتیں چھوڑ کر بس اب گھر والی لانے کی سوچو۔" انہوں نے میرے سنورے بال بگاڑ دیے۔

"ہاؤ گھر والی۔" میں نے آنکھیں موند لیں' کتنا دلکش تصور تھا۔

"کیوں' باقی اتنی فکریں خود کو لگا رکھی ہیں۔ کیا یہ فکر نہیں ہے تمہیں' میں تو دن رات دعا کرتی ہوں خدا وہ خیر کی گھڑی لائے میرے آنگن میں بھی خوشیاں اتریں' میرے دل کا ارمان پورا ہو۔ تم ہاں کرو تو میں کل ہی اماں سے بات کروں۔"

"اماں سے بات۔" میں یکدم سیدھا ہو بیٹھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں امی؟"

"کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے۔" امی کا چہرہ میرے یوں بوکھلانے پر یک لخت رنگ بدل گیا۔

"نن، نہیں، کوئی اعتراض تو نہیں، لیکن اماں سے کیا بات کریں گی آپ۔"

"اچھا اب بنو نہیں بے وقوف یوں حیران ہوا کہ مجھے ہی ڈرا دیا۔ لو بھلا پوچھتا ہے اماں سے کیا بات کریں گی آپ۔ ارے بھئی ان سے یہی کہوں گی کہ اب وہ میری امانت میرے حوالے کریں۔" انہوں نے مزے سے بتایا۔ اور میں کچھ کچھ سمجھ کر بھی انجان بن گیا۔

"امانت کیسی امانت؟"

"چل ہٹ پاگل نہ ہو تو۔ اب معصوم بن رہا ہے میرے آگے، جیسے میں تجھے جانتی نہیں۔ اچھی طرح پہچانتی ہوں تیری آنکھوں کے رنگ، جو تیرے دل میں ہے نا، وہی میری بھی خواہش، اسی لیے تو تیرے جاتے ہی اماں کے کان میں بات ڈال دی تھی کہ چھوٹی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں وہ میرے حدید کی دلہن بنے گی اور خیر سے تم آگئے ہو تو اب اماں بھی انتظار میں ہیں کہ کب بات آگے بڑھے۔" انہوں نے بتایا اور میں اتنی ہی خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔

"سچ امی۔" میں بے اختیار ان سے لپٹ گیا۔

"ارے ارے لڑکے چھوڑ مجھے ہڈیاں توڑے گا میری۔" میں کچھ زیادہ ہی مسرت کا اظہار کر گیا تھا۔ امی چیخیں تو میں شرمندہ ہوتا ان سے الگ ہو گیا۔

"سوری امی۔"

"بے وقوف۔" انہوں نے ہنستے ہوئے میرا ماتھا چوم لیا۔

"میں جلدی اماں اور بھائی سے بات کرتی ہوں اور شادی کے لیے کوئی قریب ہی کی تاریخ مانگ لیتی ہوں گھر ہی کی تو بات ہے۔ زیادہ تیاری کیا کرنی ہے۔ خدا خیر کرے بعد میں پھر خود ہی اپنی پسند سے خریدتی رہے گی آج کل تو موئے فیشن بھی صبح کچھ تو شام تک کچھ ہو جاتے ہیں۔" وہ اپنے تئیں سب سوچے بیٹھی تھیں۔

"آپ بات ضرور کیجیے امی۔ مگر ابھی شادی کی ایسی کوئی جلدی نہ مچائیں ابھی تو میں بھی بے حد مصروف ہوں۔ پھر دیبا بھی پڑھ رہی ہے۔ وہ اطمینان سے اپنا ماسٹرز مکمل کر لے۔ میرے سارے کام بھی ہو جائیں، پھر شادی کا سوچیں گے۔" میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ حالانکہ جب سے اس پر حال دل عیاں کیا تھا۔ تب سے مستقل اک بے کلی دامن گیر ہو گئی تھی۔ اس کے بعد پھر میرا اس سے سامنا ہی بہت کم ہوا تھا اور جو ہوا بھی تھا تو میں بات کرتے کرتے رہ گیا۔ لیکن اب جو امی نے خوش خبری سنائی۔ اس نے مجھے یک لخت ہلکا پھلکا کر دیا۔ کیسا جاں فزا احساس تھا کہ وہ میرے نام سے منسوب ہے، وہ میری ہے۔ میں ساری تھکن بھول گیا۔ مگر وہیں امی کی اگلی بات نے مجھے چونکا دیا۔

"لو بھلا کیسا ماسٹرز کیا تمہیں نہیں پتا چھوٹی نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔"

"واٹ۔" مجھے اس انکشاف پر سخت اچنبھا ہوا۔

"اے لو۔ اسے تو بڑے دن ہو چلے ہیں یونیورسٹی چھوڑے ہوئے۔ بیمار پڑ گئی تھی۔ بڑی چھٹیاں ہو گئی تھیں اس کی پھر اس کے بعد گئی ہی نہیں۔ کہتی تھی اب پڑھنے کو جی نہیں چاہتا، جی اچاٹ ہو گیا ہے۔ یوں بھی اتنی پڑھائی کا کیا کرنا، جب لڑکی نے سولہ' اٹھارہ جماعتیں پڑھ کر بھی چولہا چوکا ہی سنبھالنا ہے۔ گرہستی ہی کرنی ہے تو وہ دس جماعتیں پڑھ کر بھی سنبھال سکتی ہے۔ لازمی تو نہیں اتنا مغز پچی کرے اور اب او بنہ وہ پہلے والی اوبنہ بھی نہیں رہی۔ اب تو بہت ذمہ دار اور سمجھ دار ہو گئی ہے۔ دیکھا نہیں کیسے سارا گھر سنبھال رکھا ہے۔ اماں بھی خوش اور پرسکون ہیں۔ ورنہ تو جب وہ یونیورسٹی جاتی تھی تو بے چاری اماں کو اپنی بوڑھی ہڈیاں گھسانی پڑتی تھیں۔ جس کی وجہ سے آئے دن ان کا بی پی ہائی رہتا تھا تو کبھی جوڑوں میں درد، اوبنہ سے الگ ان کی ٹھنی رہتی تھی۔ ہر وقت ہی کل کل ہوتی تھی وہاں۔ شکر کیا تھا جو اوبنہ نے بھی خود عقل کر لی۔ میں نے بھی اسے سمجھایا تھا کہ مت کھپاؤ اتنا دماغ۔ جو چار جماعتیں پڑھ لی ہیں وہی بہت ہیں۔ تم نے کون سا نوکری کرنا ہے۔ یوں بھی یونیورسٹی آنے جانے کے چکروں نے تو اس کی صحت ہی خراب کر دی تھی۔ رنگ تو ایسا سانولا گیا تھا کہ پوچھو

ہی مت۔ یہ تو اس نے جب سے پڑھائی کا بوجھ سر سے اتارا ہے تو پھر ہی منہ پر کوئی رونق نظر آنے لگی ہے۔ ورنہ تو نہ اسے اپنا ہوش ہوتا تھا' نہ کھانے پینے پر توجہ۔" امی جانے کیا کیا بتا رہی تھیں اور میں وینا کے اس اقدام پر محو حیرت تھا۔

اس کا تو اولین خواب تھا یونیورسٹی میں پڑھنا' ماسٹرز کرنا' لیکن یہ کیا اس نے اپنا یہ خواب ادھورا کیوں کر دیا۔ جبکہ پریولیس میں وہ بہت اچھے مارکس لے کر کامیاب ہوئی تھی۔ وہ کیوں اپنے ایک سال کی محنت ضائع کر رہی ہے پاگل ہو گئی ہے وہ۔ آخر ایسی کیا وجہ ہوئی ہے اور اس نے مجھے بتایا بھی نہیں۔ مجھ سے ہر بات شیئر کرنے والی وینا نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی کیوں بھلا۔ میں پریشان سا سوچ رہا تھا آخر وینا نے ایسا کیا تو کیوں؟

اور اگلے ہی دن میں اس سوال کا جواب لینے اس سے ملنے آیا تھا وہ تو مجھے نہ ملی وہ کالم آپا کی طرف گئی ہوئی تھی لیکن مجھے اس سوال کا جواب مل گیا تھا اور سوچتا ہوں کاش میں اس کھوج میں نہ پڑتا یہ سوال میرے دل میں نہ آتا۔ میں اس الجھن کو نہ ہی سلجھانے کی کوشش کرتا۔ اس گرہ کو یوں ہی لگے رہنے دیتا تو اچھا تھا کیا ملا مجھے اس گرہ کو کھول کر کاش اے کاش۔

☆ ☆ ☆

بال آیا نہ چھنک کے ٹوٹے
ٹوٹا جن کا مقدر تھا ٹوٹے
لب پہ الفاظ تو جواب آنکھوں میں
وہ ستارے ہوں کہ ساغر ٹوٹے
حسن تخلیق کی توہین ہو گی
ناز تخیل کی شہ پر ٹوٹے
نذر نا تو ہے ناگفتہ بیاں
نا تراشیدہ بھی پیکر ٹوٹے
تم اک امید کی خاطر روئے
اس صنم زار میں آذر ٹوٹے

خواب! بھلا کیا ہوتے ہیں یہ خواب؟ اور آنکھیں کیوں دیکھتی ہیں خواب؟ اس لیے کہ یہ عین فطرت ہے یا انسانی جبلت کہ جو اسے سعی و جستجو' شوق و خواہش ابتدا انتہا کے سارے راستے بتاتی ہے۔ ایک جہاں تسخیر ہو گیا تو اس سے آگے اور آگے کیا ہے؟ یہ لگن اسے کہیں ٹھہرنے نہیں دیتی۔ اک منزل سے اگلی منزل کا تعین اک خوش کن تصور باندھتا' دل ناداں کو بہلائے رکھنے کے بہانے ہی تو خواب ہیں اور کچھ لوگ ہوتے ہیں ایسے لوینہ افضال جیسے بے صبرے اور بے قرار جن کے خمیر میں ہی بے چینی' بے اطمینانی ہوتی ہے جو کسی مقام پر مطمئن ہوتے ہی نہیں اور ابھی اور ان کے طمع کی کوئی انتہا نہیں ہوتی جو روز امیدوں کی ڈوری کو اک نئی گرہ لگانا اپنا فرض اولین جانتے ہیں۔ جو تقدیر سے زیادہ تدبیر کو آزمانا چاہتے ہیں اور جن کی ناقص عقل یہ نہیں جانتی کہ اس چاہت میں وہ خود کو ہی آزمائش کے حوالے کر چکے ہیں۔

☆ ☆ ☆

میں بچپن سے ہی ایسی ہوں' شاید ماں کا پیار ماں کی گود' ماں کی تربیت نہیں ملی پھر مجھے پالنے والے ڈھیروں ہاتھ تھے بہرحال جو بھی تھا میں شروع ہی سے انوکھی اور ـــ خود پسند رہی ہوں۔ میں' میں اور بس میں۔ اس سے آگے مجھے کسی سے سروکار نہیں تھا۔ چھوٹی سی تھی تو کھانے پینے کی بڑی شوقین تھی بابا کی عادت تھی ہر شام گھر واپسی پر کوئی نہ کوئی پھل یا کوئی مٹھائی وغیرہ لے آتے۔ اماں سب کا حصہ الگ کرتیں اور میں اپنا تیر بہدف نسخہ آزماتے ہوئے گلا پھاڑنے لگتی۔ ابا مجھے بہلا پھسلا کر گود میں بٹھاتے' اور سب کا سب اٹھا کر میرے آگے ڈھیر کر دیتے" اماں بہتیرا واویلا مچاتیں' بابا کو ٹوکتیں' سمجھاتیں اور مجھ میں تو بابا کی جان تھی کسی نہ کسی طرح اماں کو ٹال دیتے۔ وہ بڑبڑاتی جاتیں اور میں مزے لے لے کر کھائے جاتی' یہ اچھا ہے' یہ پھیکا ہے' یہ گندہ ہے' یہ کڑوا ہے' میں کچھ چکھتی' کچھ کھاتی' یوں مجھ سے جو بچا کھچا رہ جاتا وہ باقی

سب کو کھانا پڑتا۔

نت نئی آفتیں مچاتا آئے دن کوئی نہ کوئی نقصان کرنا بھی میرے معاملات میں شامل تھا اپنے سب کھلونے توڑ بیٹھتی تو صارم کی چیزوں کی شامت آتی وہ بے چارا رو رو کر ہلکان ہوا جاتا اماں الگ سر پکڑ کر بیٹھی ہوتیں۔

اور جب ایک کی ڈانٹ اور اس پر دسیوں کی حمایت حاصل ہو تو ناپختہ کم سن ذہن ڈانٹنے والے کو ہی برا سمجھتا ہے' مجھے بھی دادی بری لگنے لگی تھیں۔

بڑی دونوں محلے کے سرکاری اسکول میں پڑھتی تھیں جب میں اسکول ایج کو پہنچی تو قریب ہی پرائیویٹ اسکول بھی کھل چکا تھا ابا خود مجھے بڑے شوق سے لے جا کر داخل کروا آئے۔ وہاں تقریباً" سارے ہی بچے اچھے کھاتے پیتے گھرانوں سے تھے۔ جن کے نت نئے خوبصورت بیگز' نفیس کاپیاں' رنگ برنگی پنسلیں' صاف ستھرے یونیفارم' شوز دیکھ دیکھ کر پہلی بار مجھے اپنی کم قیمت چیزیں نہایت بری لگیں۔ جس کا اظہار میں گاہے بگاہے کرتی رہتی اور بابا' دادی کی ناگواریت کے باوجود میری خواہش کو پورا کرنے کے لیے جتے رہتے۔

جوں جوں شعور آتا گیا میں زیادہ نخریلی ہوتی گئی۔ یہ نہیں کھانا وہ نہیں پہننا یہ لینا ہے وہ نہیں چاہیے' عید' شب برات پر بھی کاملہ اور مائرہ آپا حتیٰ کہ صارم کے بھی کپڑے جوتے اماں خود ہی لے آتیں' اور مجھے اماں کی لائی چیز کبھی پسند نہ آتی' سو سو نقص نکالتی جس سے چڑ کر اماں نے میرے لیے خریداری کرنا موقوف کر دی' میں پھوپھو کے ساتھ خود جا کر اپنی پسند سے لیتی' اور اب تو میری فرمائشیں پوری کرنے والوں میں بابا کے علاوہ میری اکلوتی پھپھو کا نور نظر حدید بھی تھا گو کہ وہ مجھ سے بڑا تھا لیکن میں اس کی بڑے پن کو خاطر میں نہ لاتی۔ وہ خود کو میرا دوست کہتا اور میں خود دوستوں سے تکلف کی قائل نہ تھی۔

اسے ٹھیک ٹھاک جیب خرچ ملا کرتا تھا جو وہ آدھے سے زیادہ مجھ پر خرچ کر دیتا' میں بھی خوب حق سمجھ کر وصول کرتی آخر اس کا اور کون تھا بہن بھائی تھا جس کے اس نے لاڈ اٹھانے تھے۔ حدید شروع ہی سے میرا بہت خیال رکھتا تھا میں بھی اپنے بھائی بہنوں سے زیادہ اس کے قریب تھی' اسکول کے قصے' سہیلیوں کی باتیں' ٹیچرز کی شکایتیں سب اس سے کرتی وہ بھی بڑے انہماک سے سنتا۔

وقت کے ساتھ ساتھ میرا احساس کمتری بڑھتا ہی گیا۔ اماں کی بات سچ ہوئی تھی وہ جو پہلے پہل میں بستے اور جوتوں سے متاثر ہوئی تھی تو اب مجھے گھر کا گھر ہی برا لگتا اماں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میں نے اسکول میں بے شمار سہیلیاں بنالی تھیں اور اکثر ان کے گھر بھی چلی جاتی۔ دو چار کے گھر تو ایسے تھے جیسے کہ محل۔

ان کا پہننا اوڑھنا' رہن سہن' کھانا پینا ایسا شاندار تھا کہ وہ سب دیکھ کر مجھے اپنے گھر کی ہر چیز سے نفرت ہونے لگتی۔ کھانا پینا تو انتہائی زہر لگنے لگا" آئے دن وہی سبزی ترکاری' دال اچار' میں سو سو کیڑے نکالنے کی عادی ہوتی گئی۔ جس پر اماں سے خوب باتیں بھی سنتی اور کبھی کبھار تو ایک آدھ تھپڑ بھی کھانا پڑتا۔

بابا کی آمدن تو ٹھیک ٹھاک تھی ہم بھی خوشحال ہو سکتے تھے اگر جو بدقسمتی سے اماں اعلا درجے کی بچت پر مائل نہ ہوتیں' انہیں تو جیسے ایک سو چھ ڈگری کفایت کا بخار تھا بابا کی کمائی کا آدھے سے زیادہ حصہ وہ اپنے پرانے منحوس بکسے میں ڈال دیتیں اور اس کی چابی بھی اللہ جانے کہاں چھپاتی تھیں کہ میری ہزار جاسوسیوں پر بھی کبھی دریافت نہ ہو سکی۔ وہ تو ہمیں ایسا ترسا ترسا کر پال رہی تھیں کہ کیا کوئی یتیم رشتے دار کو پالتا ہو گا اور صد افسوس وہ اپنے اس طریقہ کار پر مطمئن بھی تھیں جبکہ مجھے ان کی انہی حرکتوں سے ازحد چڑ تھی۔

ایک بار تو میں نے بابا کو کہہ بھی دیا کہ وہ اپنی ساری انکم مجھے دیا کریں پھر دیکھیں ہمارا طرز زندگی کیسے بدلتا ہے بابا تو میری بات پر مسکرا دیئے پر اماں نے میرے وہ لتے لیے کہ اللہ کی پناہ' میرے دل میں پلتی ان کے لیے کدورت میں اور اضافہ ہوا۔ ان حالات میں میری پلکوں نے ___ بڑے خوابوں کا بوجھ اٹھانا شروع کر دیا

میں اپنا لائف اسٹائل یکسر بدلنا چاہتی تھی پر افسوس بدل نہ سکی تھی لیکن خوبصورت خواب دیکھنے پر تو کوئی خرچ نہیں آتا تھا اور وہ میں جی بھر کے دیکھتی۔

میرے آس پاس کی حقیقی دنیا نہایت بدصورت تھی مجھے بھی سجائی غیر حقیقی دنیا میں رہنا اچھا لگنے لگا۔ میں بیٹھے بیٹھے آسمان چھوتی' تاروں سے دامن بھرلیتی' اپنے بڑے سے باغ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلا کرتی۔ اپنی کار پر لانگ ڈرائیو کرآتی۔ ایک آراستہ وپیراستہ خواب گاہ کے نرم بستر پر سویا کرتی۔ واؤ کتنا امیزنگ تھا وہ سب۔

اور پھر اپنے یہ رنگ رنگ کے خواب حدید کو بھی سنایا کرتی' اک وہی تو تھا میرے دل کی سننے والا۔ وہ ہر بات سن لیتا چپ چاپ سر جھکائے بنا کوئی تنقید و اعتراض کے۔ اس گھر میں اماں اور صارم ایسی دو ہستیاں تھیں جن کے ساتھ میری کچھ نہ بنی تھی اور میرا خیال تھا کبھی بن پائے گی بھی نہیں۔

ہاں اپنی بہنوں سے میں پیار کرتی ہوں اسی لیے تو جب کاملہ آپا کی شادی کا سلسلہ شروع ہوا تو میں خوش ہونے کی بجائے پریشان ہو گئی تھی۔ اس لیے نہیں کہ ان کی شادی ہو رہی تھی بلکہ اس لیے کہ ان کے لیے آنے والا رشتہ پرفیکٹ نہ تھا تب میں نے کیسے کیسے نہ انہیں بچانے کی کوشش کی تھی۔ پر ہائے میری معصوم سیدھی سادی آپا چپ چاپ بڑوں کے فیصلے پر قربان ہو گئی اور اپنی زندگی کو اپنے لیے ہی آزار بنا بیٹھیں۔

اور انہی دنوں میں حدید نے اک حیران کن فیصلہ کیا بلکہ فیصلہ کیا اس نے تو دھماکہ کیا تھا۔ میں تو حیرت کے ساتھ بے پناہ خوش بھی ہوئی' ہمارے پورے خاندان میں کسی نے آج تک سارا پاکستان تو کیا سارا شہر نہیں دیکھا تھا اور وہ جا رہا تھا امریکہ۔ اف' کتنے حیران کن اور مسرت آمیز تھے وہ لمحے' میں اس ایکسائٹمنٹ کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔

تب اک میں ہی تھی جس نے حدید کو دل کھول کر سراہا باقی سب نے تو اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی سعی کی تھی۔ لیکن میں ہی تھی جو اس بات پر خوشی سے بے حال ہو رہی تھی۔ ہائے کتنا مزا آئے گا جب میں اپنی سب سہیلیوں کو بتاؤں گی۔ (اور وہ کتنی بچکانہ سی خوشی تھی میری)

اور جس دن وہ جا رہا تھا تو اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ گھاٹا تو میرے حصے میں آیا ہے میرا واحد ہمدرد' مخلص' سچا دوست مجھ سے دور جا رہا تھا میں جو اسے تمام دن کی روداد سنائے بغیر سوتی نہ تھی تو اب بھلا کیسے رہوں گی اور تب حدید نے مجھے بے پناہ تسلیاں دیں اور یہ وعدہ کیا کہ وہ ہر روز مجھے خط لکھے گا یہ اور بات کہ وہاں جا کر اس نے وعدہ ایفا نہ کیا لیکن میں اسے ہر ہفتے خط لکھتی تھی مکمل تفصیل کے ساتھ اپنا ہر دکھ ہر سکھ اسے لکھ بھیجتی چھوٹی سے چھوٹی بات' بڑے سے بڑا قصہ' سب اس سے شیئر کرتی' اور ہاں' اگر میں اس سے کچھ شیئر نہ کر سکی تو وہ صرف اس کا ذکر' اور اس کی باتیں تھیں۔ جس نے یونیورسٹی میں پہلے ہی دن میری توجہ کھینچ لی تھی۔

ہاں' یونیورسٹی میری پلکوں پر دھرا ایک خوبصورت' خواب جو پایہ تکمیل تک پہنچا تھا گو کہ مجھے اس کے لیے بہت محنت کرنا پڑی تھی مگر کہا ہے نا کہ لگن سچی ہو تو انسان کسی بھی مقام پر ہار تا نہیں اور میں نے ہارنا تو سیکھا ہی نہیں۔ جیتنا میرا کریز ہے میں سب کچھ جیت لینا چاہتی ہوں' اسے بھی یونیورسٹی میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کے تقریباً" سب ہی لڑکے لڑکیوں سے میری ٹھیک ٹھاک علیک سلیک ہو گئی تھی لیکن اگر نہ بن سکی تو صرف اس سے ہی' جس سے میں بنانا چاہ رہی تھی۔

چھ فٹ سے بھی نکلتے ہوئے قد کے ساتھ بلیو' کبھی بلیک جینز پر رف سی ٹی شرٹس پہنے' گھنگریالے بال بکھیرے کھڑے نین نقش صاف رنگت والا اسمارٹ بوائے حد درجے پڑھاکو ہر وقت کتابوں میں سر دیے رہنا' باقاعدگی سے کلاس اٹینڈ کرنا' سر جھکا کر نوٹس لینا' فارغ وقت میں لائبریری میں جا گھسنا نہ کسی سے سلام نہ کلام' یہ تھا ہمارا کلاس میٹ رافع پیرزادہ اس کی ان ہی حرکتوں پر سب نے اسے "ڈیمک" کا نام دیا ہوا تھا۔

اسے کسی سے غرض نہیں تھی وہ ناک کی سیدھ میں آتا اور ویسے ہی واپس 'اور میں اسے دیکھنے کی کس قدر عادی ہو چکی تھی یہ تو مجھے تب علم ہوا جب وہ اچانک ہی غائب ہو گیا۔ ایک دن' دو دن' حتیٰ کہ پانچ دن۔ میں کس سے پوچھتی کہاں سے اس کا پتا کرتی' اس کی تو کسی سے دوستی بھی نہیں تھی۔ کیا ہوا اسے وہ تو بہت پابندی سے آ رہا تھا۔ کہیں کوئی حادثہ 'اف مجھے خوامخواہ وہم ستاتے رہے۔

پورے سات دن بعد وہ لمحہ' جب میں نے صبح یونیورسٹی میں لان کی درمیانی روش پر اسے مخصوص رف سے حلیے میں کتابیں تھامے آتے دیکھا وہ گردن نیچے کیے چلا آ رہا تھا اک ثانیے کو تو میں تھم سی گئی اگلے پل میں تیر کی سی تیزی سے اس تک پہنچی۔

"تم۔۔۔ تم کہاں تھے تم ٹھیک ہو نا؟

سب خیریت تو تھی؟" میں نے ایک ہی سانس میں تابڑ توڑ سوال کر دیئے وہ سر اٹھائے حیران مجھے دیکھے گیا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر دو روشن آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے وہ بہت تھکا تھکا سا دکھ رہا تھا۔

"آپ؟" وہ سوالیہ ———— نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور اس کی اتنی بے خبری پر میرا دل چاہا میں اپنا سر قریبی درخت سے ٹکرا دوں یعنی اتنے مہینوں کے ساتھ میں وہ اب تک میرا نام ہی نہیں جانتا تھا اور اک میں تھی۔

"میں ادینہ افضال' آپ کی کلاس میٹ آپ کافی دنوں سے آ نہیں رہے تھے میں بہت فکر مند ہو گئی تھی میں نے سوچا۔۔۔۔"

"بٹ وائے۔" میری بات کاٹ کر وہ اتنے سرد سپاٹ لہجے میں گویا ہوا کہ میں اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

"ایکسکیوز می۔" بنا کوئی جواب لیے وہ جا چکا تھا۔

اس نے مجھے اگنور کیا مجھے ادینہ افضال کو۔ اس سنگی بت کے اندر جیسے کوئی چنگاری جل اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور شاید جسے اپنی ذات کے حسن کا ذرا بھی احساس ہو وہ ایسا ہی تو ہوتا ہے وہ بھی جانتا ہو گا کہ اس کی اتنی لاپروائیوں نے بہت سے دلوں کو اپنی جانب کھینچ لیا ہے۔ ڈیپارٹمنٹ کی کئی لڑکیاں اس پر فدا تھیں اور وہ ہر وقت یوں پوز کرتا کہ جیسے اس کی زندگی بس کتابوں تک ہی محدود ہے۔ اسے کسی اور سے کوئی سروکار نہیں۔ یوں بھی اپنی اہمیت بڑھانے کا یہ بہت پرانا طریقہ ہے جو وہ آزما رہا تھا اور میرا ایک اپنا طریقہ تھا جو چیز مجھے اچھی لگتی اسے میں بہت اہمیت دیتی تھی اس کے ساتھ روز سامنا ہونے پر موقع ملتے ہی میں سلام دعا ضرور کرتی' چاہے وہ جواب نہ دیتا۔

اس دن تو مزا ہی آ گیا جب سر ظہیر کی کلاس شروع ہو چکی تھی اور وہ بہت عجلت میں آیا اور جو خالی کرسی ملی اس پر آ بیٹھا میری خوشی کی انتہا نہ رہی اس کے برابر میری کرسی تھی۔ میں اس کے اتنے قریب تھی مگر وہ ویسا ہی ہارڈ اسٹون' اس نے نظر اٹھا کر بھی مجھے نہ دیکھا۔ اس کا پین تیزی سے نوٹ بک پر دوڑ رہا تھا اور میں اس کے بے داغ ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی اس کا انہماک میری نگاہوں کے ارتکاز نے توڑا اس نے سر اٹھا کر مجھے بھرپور خفگی سے گھورا۔ میں اس کی اوا پر بے اختیار مسکرا دی یونہی مجھے شرارت سوجھی۔

"کیسے ہو؟ بہت اچھے لگ رہے ہو۔" میں نے اپنی نوٹ بک پر لائن کھینچی اور اس کے آگے کھسکا دی' جس پر رافع نے چونک کر نظر ڈالی اس کے ماتھے پر موجود بل اور گہرے ہوئے اور میری مسکان۔

"غصہ نہ کیا کرو ذرا اچھا نہیں لگتا تمہارے چہرے پر' تم ہنستے ہوئے کیسے لگتے ہو مجھے بڑی حسرت ہے یہ دیکھنے کی پلیز تھوڑا سا ہنس دو۔" میں نے مزید لکھا جسے پڑھتے ہی وہ یوں کھڑا ہوا جیسے اس کی کرسی میں کرنٹ آ گیا ہو۔

"وٹ ہیپنڈ' مسٹر رافع۔" سر ظہیر فوراً" اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

"سر پنکھے کے شور کی وجہ سے مجھے آپ کی آواز سمجھ نہیں آ رہی اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اپنی چیئر

آپ کے قریب لے آؤں۔"

"وائے ناٹ' آپ ادھر آجائیں۔" سر ظہیر کے اجازت دیتے ہی وہ ادھر چلا گیا میں اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ اور پھر تو یہ معمول ہی بن گیا۔

وہ جتنا مجھ سے برا سلوک کرتا میں اتنا ہی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتی یوں بھی میری فطرت تھی۔ وہ تق لور پیچیدہ کام ہمیشہ سے مجھے اٹریکٹ کرتے تھے۔ میں وہیں پنگا لیتی تھی جہاں سے دوسرے کھسک جانا بہتر خیال کرتے تھے کئی کلاس فیلوز میری صرف اک نظر کرم کے منتظر تھے لیکن مجھے اس کے علاوہ کوئی دکھائی ہی نہ دیتا تھا' شاید مجھے اس سے ضد سی ہو گئی تھی کوئی مجھے اگنور کرے یہ میری برداشت سے باہر تھا۔

فائنل کو فیئر ویل پارٹی دی جارہی تھی کس طرح تمام پروگرامز کو ارینج کیا جائے اور کیا کیا آئٹمز ہوں۔ کلاس میں یہی باتیں ڈسکس ہو رہی تھیں اس معاملے میں سب ہی پرجوش ہو رہے تھے' بس اک رافع ہی تھا جسے حسب عادت کسی بات سے لینا دینا نہیں تھا وہ کتابیں سمیٹ کر کلاس سے باہر نکلا تو اسے جاتا دیکھ کر میں اس کے پیچھے لپکی۔

"اے اے رکو سنو رافع۔ فیئر ویل کے لیے ہم ایک ڈرامہ کر رہے ہیں میں چاہتی ہوں تم اس میں حصہ لو' پلیز دیکھو انکار نہیں کرنا۔"

"سوری بے کار ایونٹس کے لیے میرے پاس فالتو ٹائم نہیں ہے ایسی فضول حرکات آپ لوگوں کو ہی مبارک۔" وہ میری بات پر رکا نہیں تھا چلتا ہی جارہا تھا اور مجھے اس کے ساتھ ساتھ دوڑنا پڑ رہا تھا۔

"کیا بے کار' فضول بات' اف تم اتنے آدم بیزار کیوں ہو رافع کبھی تو کسی بات پر اچھا رسپانس دیا کرو ہر وقت سڑے رہتے ہو۔" مجھے اس کی بات سن کر غصہ ہی آگیا۔

"ہاں ہوں میں آدم بے زار تمہیں اس بات سے مطلب۔" وہ یک لخت رک گیا میں بمشکل اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"مجھے ہی تو مطلب ہے' پر تم سمجھتے ہی نہیں ہو۔"

میرا دل چاہا تھا اسے چڑانے کو' اک ادا سے مسکراتے ہوئے میں بولی اور وہ بری طرح چڑ گیا۔

"جسٹ شٹ اپ آئندہ میرا راستہ روکا تو بہت برا ہو گا انڈر اسٹینڈ۔" وہ غضب ناک لہجے میں بولا اور تیز تیز قدم اٹھاتا راہداری عبور کر گیا۔

"ہونہہ' اسٹوپڈ' ال مینرڈ' پھیکے شلجم جیسی شکل ہے اور جانے کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔ میں ذرا عزت کیا دے دیتی ہوں یہ تو پہاڑی پر ہی چڑھ جاتا ہے۔ مسٹر کریلا نہ ہو تو۔" کئی گردنیں میری جانب گھوم چکی تھیں مارے خفت کے میرا برا حال ہو گیا بڑبڑ کرتی اسے کوستی میں واپس چل دی۔

اس واقعے کے بعد میں اس سے شدید قسم کی ناراض ہو چکی تھی اگر وہ خود کو پرنس آف ویلز خیال کرتا تھا تو کسی سے کم میں بھی نہیں تھی۔ ادینہ افضال نے ہمیشہ اپنے ناز اٹھوائے تھے' اسے کسی کے نخرے سہنے کی عادت نہیں تھی۔ اس نے جو چاہا وہ پایا تھا رافع کا کافی سے زیادہ انسلٹنگ بی ہیویئر بھی اب تک صرف اس لیے برداشت کیا کہ وہ دل کو اچھا لگا تھا مگر ایسا بھی نہ تھا کہ اس کے پیچھے ایڑیاں رگڑتی جاتیں اپنی عزت نفس۔ بہرحال مجھے عزیز تھی اب وہ جہاں نظر آیا اسے بالکل ایسے ہی اگنور کرنا ہے جیسے وہ مجھے کرتا رہا ہے یعنی اسی کا داؤ اس پر۔ میں بھی دیکھتی ہوں کب تک زیر نہیں ہوتا۔ مجھے ہرانا کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے تم بھی پانی بھرتے نظر آؤ گے رافع پیرزادہ' میری خوش فہم فطرت خوا مخواہ کی اڑانیں بھر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک سال کیسے گزرا' پتا ہی نہ چلا' پریویس کا رزلٹ اناؤنس ہوا تو جہاں اپنی کامیابی پر نازاں ہوئی وہیں رافع کے غیر معمولی شاندار مارکس نے انتہائی خوشی دی تمام ٹیچرز اس کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے تو وہی کلاس میٹس جو اس کے پیچھے سو سو باتیں کرتے تھے وہ بھی بڑھ بڑھ کر مبارکبادیں دے رہے تھے۔ میں نے بھی تمام ناراضی بھلا کر اسے وش کیا جسے اس نے ازلی سڑے

انداز سے وصول کیا۔ اتنی بڑی خوشی بھی اس کے چہرے پر مسکان نہ لاسکی تھی۔ "یہ نہیں سدھر سکتا" میں نے افسوس سے سر جھٹکا اور اگلے ہی پل ہمت کر کے اس سے کہا۔

"ایک بات پوچھوں رافع' آخر تم اتنے برے موڈ میں کیوں رہتے ہو' کوئی مسئلہ ہے تمہارے ساتھ تو اسے کسی سے شیئر کرلو۔ تم نے کبھی آئینہ غور سے دیکھا ہے ماتھے پر بل ڈالے رکھنے سے تمہاری پیشانی پر ایک لکیر پڑ گئی ہے۔ پلیز خوش رہا کرو' میرے خیال میں ہنسنے پر ابھی تک حکومت نے کوئی ٹیکس نہیں لگایا دیکھو اس طرح جل جل کر تم اپنا ہی نقصان کر رہے ہو۔ کیوں کرتے ہو ایسے۔" میں بڑے ہی ہلکے پھلکے لہجے میں اس سے کہہ رہی تھی اور وہ مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے میں کوئی بہت ہی غلط بات کر رہی ہوں پھر بولا تو لہجے میں واضح چبھن تھی۔

"بلائے داوے تم مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھتی ہو کیا اور کچھ نہیں ہے تمہارے دیکھنے کے لیے۔" اس کا سوال ایسا تھا کہ ایک لمحے کو تو میں گڑبڑا گئی مگر اگلے ہی پل میرا اعتماد عود آیا۔

"کیونکہ تم ایک اچھے انسان ہو۔"

"تمہیں کیسے علم؟"

"میں جانتی ہوں۔"

"کیسے؟"

"تمہارا چہرہ بتاتا ہے۔"

"کیا لکھا ہے میرے چہرے پر؟"

"افوہ' یہ کیسے فضول سوال کر رہے ہو تم سے کوئی اچھی بات نہیں ہو سکتی۔" میں چڑ گئی اس کسوٹی نما سوالات سے' عجیب انسان تھا وہ بھی۔

"نہیں ہو سکتی مجھ سے اچھی بات' کیونکہ میں اچھا انسان نہیں ہوں۔ تم اپنی بے کار کی علیت اپنے پاس ہی رکھو تم جیسی ماڈ اور ایکسٹرا پراؤڈ لڑکیاں تو ویسے ہی مجھے انتہائی زہر لگتی ہیں خوا مخواہ اگلے کے گلے پڑنے والی اس رائپ فروٹ کی طرح جو از خود زمین کی جھولی میں گرنے کو تیار ہو۔"

"جسٹ شٹ اپ' کیا بکواس کر رہے ہو۔" اس کی حد درجہ واہیات بات نے میرے پرخچے ہی تو اڑا دیے آس پاس کے سب لوگ متوجہ ہو گئے تھے۔

"یو شٹ اپ' بکواس میں نہیں تم کرتی ہو۔ کتنی بار میں نے سمجھایا تمہیں کہ میرے منہ مت لگو لیکن تم باز نہیں آئیں۔ وہی تھرڈ کلاس لڑکیوں والی چیپ حرکتیں کیا چاہتی ہو مجھ سے؟ کیا سمجھتی ہو کہ تمہارے اس حسین چہرے پر فدا ہو کر دوستی کرلوں گا تم سے دم ہلاتا پھروں گا تمہارے پیچھے' پھر تم مجھ سے شادی کی ڈیمانڈ کرو گی' مائے فٹ' بس اتنی ہی اوقات ہوتی ہے تم لڑکیوں کی' جہاں اچھی شکل دیکھی ریجھ گئیں' دعوے وعدے بے شمار لیکن جب نبھانے کا وقت آئے تو وہ قدم نہیں چلا جاتا اتنا بن ٹھن کر یہی کچھ کرنے آتی ہو یہاں' تم جیسی لڑکیوں نے ہی شریف گھرانوں کی لڑکیوں کے تعلیم کے راستے مسدود کر رکھے ہیں درسگاہوں کے تقدس کو پامال کرکے رکھ دیا ہے وہ اور ہی ہوتے ہوں گے جو جھانسے میں آجائیں میں رافع پیرزادہ ہوں تمہاری ان اداؤں پر مرمٹنے والا نہیں جاؤ کہیں اور جاکر اپنے حسن کا جال پھینکو۔"

"اوہ میرے خدا" وہ سرخ انگارہ چہرہ لیے جانے کیا کیا الٹا سیدھا بولتا جارہا تھا میں پوری آنکھیں کھولے حق دق کھڑی تھی۔

میں نے دیکھا کئی چہروں پر تمسخرانہ مسکراہٹ تھی تو کئی چہروں پر ناگواری۔ اتنی ذلت' اتنی تحقیر' بنا کسی قصور کے۔ اف' پہلے میری سماعت سن ہوئی پھر بصارتیں دھندلا گئیں یا اللہ' یہ زمین پھٹ کیوں نہ گئی' آسمان کیوں نہ ٹوٹ پڑا میں ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں بکھر کیوں نہ گئی اب تک۔ قبل اس کے کہ میں حواس کھو کر گر پڑتی چند مہربان ہاتھوں نے مجھے سنبھالا دیا۔

"شٹ اپ رافع' منہ بند کرو اپنا' آخر ایسا کیا کہہ دیا اونہ نے تم سے۔"

"اونہ ایسی نہیں ہے' جس طرح تم بکواس کرتے جارہے ہو۔"

"ارے ارے چھوڑو بھی رافع' جانے دو۔"

"چلے جاؤ یہاں سے۔" مختلف آوازیں، مختلف چہرے، سب گڈمڈ ہو گئے میں جیسے فضا میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

کیوں کیا اس نے میرے ساتھ ایسا؟ آخر ایسا کیا چاہا تھا میں نے اس سے۔ بھلا کون سے عہدو پیمان مانگ لیے تھے۔ کون سے وعدے چاہے تھے۔ کچھ بھی تو نہیں ایسا کچھ بھی تو نہیں۔ بس اک ذرا سی خوشی ہی تو چاہی تھی اس کے چہرے پر، اور وہ جانے کیا سمجھا۔ بدلے میں کیا دیا اس نے مجھے اتنی بڑی سزا، اتنی تضحیک، اس قدر ہتک، کس سے کہوں میں اپنا دکھ، صرف ایک حدید ہی تو ہے۔ جس سے میں نے ہمیشہ اپنے دل کی ہر بات شیئر کی، اور اب نہیں، نہیں بتا پاؤں گی میں اسے کئی دن گزر گئے تھے اس ذلت کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے، اس لیے تو ان کاغذوں کا سہارا لے لیا۔ اب بھی جب بھی سوچتی ہوں دل جیسے نمکین سمندر میں ڈوب جاتا ہے، کیسے کوہ گراں تھے وہ لمحے۔

"بس کرو اونہہ، رو رو کر ہلکان ہو گئی ہو چپ کر جاؤ۔ وہ تو ہے ہی ایسا جاہل گنوار، اجڈ، احساس کمتری اور احساس ذلت کا مارا ہوا اس کا تو وہ حال ہے کہ کھسیانی بلی اب کھمبا نوچتی پھر رہی ہے۔" سنبل میری پشت سہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کیا مطلب؟" سحر نے پوچھا۔

"ارے بھئی شکل اچھی ہونا کوئی اچھا انسان ہونے کی دلیل نہیں اور نہ ہی اچھا نصیب ہونے کی۔ اس بے چارے کا بھی یہی حال ہے اس پر اس کے رویے نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ خود پر تو لفٹ کا بورڈ لگا کر دراصل وہ اپنی خفت چھپاتا پھرتا ہے، سب سے۔ میں نے سنا ہے کہ بچپن میں اس کی ماں بھاگ گئی تھی اس کے باپ کے بزنس پارٹنر کے ساتھ، بیوی تو گئی ہی ساتھ بزنس بھی گیا۔ باپ نے جیسے تیسے کر کے بچے پالے پڑھائے لکھائے اب ابھی کوئی سال بھر پہلے اس کی بہن نے بھی ماں کی تقلید کر لی۔ زمانے بھر کی باتوں

حد درجہ ذلت و شرمساری نے اسے کچھوے کی مانند اپنے خول میں بند ہونے پر مجبور کر ڈالا ہے، بس یہی وجہ ہے اس کے اجڈ پنے کی۔" سنبل کی معلومات نے جہاں مجھے جھٹکا لگایا سحر بھی حیران تھی۔

"تمہیں کیسے پتا؟"

"ارے بھئی ایسی باتیں بھی چھپی رہتی ہیں بھلا۔ مجھے بھی پتا چل ہی گیا کہیں سے۔ بس اب گولی مارو اسے اور اس کی ساری بکواس کو۔"

"اوہ گاڈ تو یہ وجہ ہے اس کے رویے کے پیچھے۔ یہ تو اچھا بھلا سائیکو کیس بن گیا ہے بے چارا وہ اپنی فرسٹریشن تم پر نکال گیا ہے۔ دفع کرو کیا فائدہ ایسے بے چارے انسان کی باتوں پر رونے کا، بھئی پاگل تو پاگل ہی ہوتا ہے اس کی بکواس کو کیا دل پر لینا۔" سحر نے میرا سر کندھے سے لگا لیا، اور پھر میرے آنسو تو خشک ہو گئے مگر وہ اذیت۔

وہ اذیت تو بھلائے نہیں بھولتی اس کے رویے کے پیچھے چاہے کوئی بھی وجہ رہی ہو پر میں بہت بری طرح ہرٹ ہوئی تھی کہ میں اب کسی کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ بھاڑ میں جائیں ایسی خواہشیں ایسے خواب جن کے پیچھے دوڑتے دوڑتے انسان منہ کے بل جا گرے۔ جی تو چاہتا ہے اپنے دل کو کسی اندھے کنویں میں پھینک دوں یہ دل ہی تو تھا جس نے ہمیشہ مجھے نئی نئی سوجھا کر خواری کے تمغے دلوائے سب اپنوں کی نظر میں برا بنوایا۔ کتنی بری ہوں نا میں، جبکہ اماں ہر قدم پر مجھے اچھا برا سمجھاتی رہیں۔ جب میں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تب بھی انہوں نے مجھے نصیحت کی۔

"دیکھو چھوٹی تمہیں پڑھنے کا شوق ہے بے شک تمہیں جتنا پڑھنا ہے پڑھو لیکن ایک بات یاد رکھنا یونیورسٹی میں تیرے ساتھ لڑکے بھی ہوں گے اپنی نظر کو ہمیشہ نیچی رکھنا کوشش کرنا تمہاری نظر کسی غیر محرم کے چہرے پر نہ پڑے۔ یہ آنکھ ہی تو ہے جو بہلا دھوکا دیتی ہے۔ شیطان بہت جلدی ورغلا لیتا ہے اسے اگر آنکھ شر سے محفوظ رہے نا تو دل اور روح بھی ہر غلاظت سے پاک رہتے ہیں۔ اب ہماری عزت تیرے ہاتھ میں ہے

بلکہ میری مان تو عبایا پہن لے آج کل تو نوجوان لڑکیاں بھی بڑے شوق سے پہنتی ہیں اور ماشاء اللہ کیا باوقار لگتی ہیں۔"

"اف اماں آپ رہیں گی وہی دقیانوسی کی دقیانوسی' مجھے مت دیں مشورے۔"

"میں کس بری طرح چڑ گئی تھی اور اب خیال آتا ہے کہ کاش ان کی بات پر ایک بار ہی غور کر لیا ہوتا تو کیا کوئی یوں بیچ چوراہے میں میری عزت نفس کی دھجیاں اڑا سکتا تھا" اف کیا کیا کوتاہیاں یاد کروں اپنی' کس کس بات پر ماتھا پیٹوں' کتنی غلطیاں بھلانے کی کوشش کروں آخر کب یہ دل ہے جو ہلکان ہوا جاتا اچھا ہے نا اسے بھی اپنے کیے کی سزا ملے۔ بھگتو' بھگتو اب اپنا کیا۔ اف خدا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے مزید نہیں لکھ سکتی بس میں ڈائری بند کر رہی ہوں۔

شدید حبس' تیز ترین آندھی' گرد و غبار سے اٹا طوفان' میں چہار جانب سے گھرا ہوا تھا ایسا محسوس ہوا جیسے بیچ سمندر میں میری کشتی گرداب میں جا پھنسی ہے۔ اپنے ہی خیالوں خوابوں سے سجائے گئے کانچ کے محل میں کتنا آسودہ تھا میں اور اب یک لخت ہی کانچ کی دیواریں چٹخ گئی تھیں میرے چاروں اور کرچیاں ہی کرچیاں بکھری تھیں۔ جانے کتنی دیر بیتی۔ کتنے لمحے گزرے میں ساکت و صامت تھا۔ یہ میری بصارتوں سے گزرے الفاظ نہیں زہر میں بجھی وہ چھوٹی چھوٹی سوئیاں تھیں جو سب کی سب میرے جسم میں گڑ گئی تھیں۔

یہ کیسی حقیقت کھلی تھی مجھ پر خواہشوں کے ہنڈولوں میں جھولتا دل دھڑام سے جیسے کسی گہری کھائی میں جا گرا تھا یہ کیسا زہریلا انکشاف ہوا تھا جس نے میری تمناؤں سے بھری روح کو اک پل میں نیل و نیل کر دیا۔ کاش میں آج یہاں نہ آیا ہوتا جو آگر آیا ہی تھا تو میل کی کھلی دراز سے جھانکتی دیتا کی ڈائریوں پر نظر نہ ڈالتا یہ ڈائریاں تو سم قاتل ثابت ہوئی تھیں میرے جذبوں میرے یقین میرے بھرم کے لیے۔ کچھ بھی تو نہ بچا تھا سب کا سب یہ اژدہا نما ڈائریاں ایک لحظہ میں نگل گئیں۔

اوہ او نہ' یہ کیا کر دیا تم نے میرا مان' میرا فخر' میرا غرور سب خاک کر دیا کتنا یقین تھا مجھے خود پر اپنے جذبوں پر کہ بنا کہے ان کی سچائی تمہارے دل کو چھو لے گی مگر یہ کیا ہوا میرے ساتھ۔ کیوں کیا تم نے ایسا کیا نہیں کیا میں نے تمہارے لیے تمہارے اونچے خوابوں کے لیے' خود کو دان کر دیا صرف تمہاری خوشیوں کے لیے اپنی خواہشات کو نثار کر دیا تمہاری ترجیحات پر۔ کیا کیا نہ کیا میں نے تمہارے لیے' پردیس کاٹا اپنوں سے دوری سہی' دن رات محنت کی کبھی ولیمے کا صرف ایک پیالا کھا کر کبھی ایک سینڈوچ تو کبھی جوس کا ایک ٹن پی کر میں جس نے کبھی اپنے کڑکتے کپڑوں پر ایک شکن برداشت نہ کی تھی وہاں گھسے کپڑے پہنتا رہا پائی پائی جوڑی۔

کس کے لیے' اتنا کشٹ اٹھایا صرف تمہارے لیے صرف تمہارے لیے نا اور تم نے کیا صلہ دیا مجھے دھوکا' بے ایمانی' دغا' توہین' ہاں ہاں یہ میرے جذبوں کی توہین ہے' طمانچہ ہے میری مصفا محبت کے منہ پر' توڑ دیا ہے تم نے مجھے مار ڈالا ہے میرے دل کو اور اس قتل ناحق پر میں تمہیں ہرگز معاف نہیں کروں گا۔ یاد رکھنا ادینہ میں اپنے ہی بال نوچتا غم و غصے سے پاگل ہو رہا تھا لگتا تھا دماغ کی رگ پھٹ جائے گی دل چاہ رہا تھا سب کچھ تہس نہس کر دوں ہر چیز کو آگ لگا دوں۔

وہ دغا باز میرے سامنے ہوتی تو میں یقیناً" اس کا نقشہ بگاڑ کر رکھ دیتا ایسا ہی جنون طاری ہو گیا تھا مجھ پر قبل اس کے میرے اندر ابلتا لاوا باہر آتا میں وہاں سے اٹھ آیا۔

لمحے' پل' منٹ' گھنٹے جانے کتنا وقت بیتا میں کھولتے دل و دماغ کے ساتھ سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا رہ رہ کر اپنی حرماں نصیبی پر رونا آ رہا تھا کس کے پیچھے اتنی خجل خواری کاٹی کس پر محبت کے دریا بہا دیے تم نے حد ہی۔ تف ہے تم پر دماغ جھڑک رہا تھا تو دل الگ سسک سسک کے ادھ موا ہو گیا۔

چار سال گزارے میں نے مادر پدر آزاد معاشرے

میں 'ایک سے ایک دل آویز' پریوں کو مات دیتے حسن' دودھ میں کھلے بدن' ہوش ربا چہرے 'نشیلے نین یاقوتی لب 'عنابی عارض' پر کبھی اپنی نظر کو بھٹکنے نہ دیا کہ میں اسے اوینہ کی امانت خیال کرتا تھا جان بوجھ کر تو کیا میں نے کبھی بھول کر بھی خیانت نہ کی اور پھر بھی ہوا کیا میرے ساتھ صریحا" دھوکا' جی تو چاہ رہا تھا گاڑی کہیں ٹکرادوں اور سب اذیت ختم ہوجائے۔

لیکن اس سے کیا ہوگا اذیت تو پھر بھی تمہیں ہی ہوگی نا اور جس نے تمہیں اذیت کے جلتے الاؤ میں ڈال دیا وہ سکون سے رہے' دماغ نے گھرکا نہیں اس سے تو اب میں اپنی زندگی کے ان پر مشقت سالوں کے سارے حساب کتاب کروں گا۔ بمشکل میں نے خود کو کمپوز کیا اور آئس کریم پارلر میں گھس کے خوب ٹھنڈی آئس کریم کھائی شدید غصے کو کم کرنے کا یہ طریقہ میں نے مرہانہ سے سیکھا تھا وہ بھی جب کبھی ہارون کی بدتمیزی پر زچ ہوتی تو زیادہ آئس کریم کھا کر اپنا بی پی کنٹرول کرتی۔ آخر نومبر کے ٹھنڈے ٹھار موسم میں اس نسخے نے سرطور مجھے اس قابل تو کیا کہ میں گھر واپس جاسکتا۔

———

"جو تم نے بات کی تھی اب میں کررہا ہوں اور مجھے یقین ہے میرا بیٹا میری بات رد نہیں کرے گا کیونکہ میں نے کبھی اس کی کوئی بات نہیں ٹالی جو اس نے چاہا وہ کیا اس نے باہر جانے کا کہا میں نے دل پر پتھر رکھ کر اس کا وہ شوق بھی پورا کیا اسے نہیں روکا اب چاہے اپنا کاروبار کرنا چاہتے ہو گھر بنانا چاہتے ہو جو مرضی کرو میری طرف سے اب بھی کوئی روک ٹوک نہیں میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرے گھر میں بھی خوشی اترے رونقیں ہوں' کھلکھلاہٹیں ہوں چہکاریں ہوں' بیمار آدمی ہوں یار زندگی کا کیا بھروسا کب۔"

"اباجی پلیز۔" میرا ہاتھ اب تک ان کے ہاتھ میں تھا میں نے بے اختیار انہیں ٹوکا۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں آخر خوشیوں پر میرا بھی حق ہے' ایک اکلوتی اولاد ہو میری' میری تو ہر خوشی تم سے وابستہ ہے' بس' ہوگیا فیصلہ' بھئی تم آج ہی سے تیاری شروع کردو اور جاکر افضال بھائی سے اور اماں جان سے اگلے چاند کی کوئی بھی تاریخ لے لو۔"

"ارے میں اکیلی آپ بھی چلیں۔"

"چلو ٹھیک ہے شام کو چلتے ہیں۔"

"تم لاؤ میرے کپڑے میں مٹھائی کوئی ہار پھول لے آؤں۔"

"ارے آپ کو تو بہت ہی جلدی ہے۔" امی ہنس رہی تھیں ابا خوش ہورہے تھے۔ اور میں' میں کیا کہتا میرے تو ہونٹ ہی سل گئے تھے۔

☆ ☆ ☆
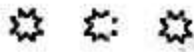
کون جانے اگلا پل آنے والا کل اپنے دامن میں کیا لے کر آنے والا ہے۔ لیکن پھر بھی انسان اپنی عقل پر بھروسہ کرتے ہوئے کیا کچھ پلان نہیں کرتا۔ میں نے بھی اپنی آئندہ زندگی کے لیے بہت سے خواب بنے تھے' ڈھیروں خوشیاں چاہی تھیں۔ سوچا تھا یوں ہوگا' دوں ہوگا مگر ہوا کیا یوں بھی انسان جو چاہتا اگر وہی ہونے لگتا تو پھر کوئی بھی اپنے پیدا کرنے والے رب کی ربوبیت کو کیسے مانتا بے شک اس نے میری ہر چاہ پوری کی تھی سب دیا تھا جو مانگا مل گیا' اور ان سب کے ساتھ بن مانگے اک مسلسل چبھتی کسک بھی' اور ستم تھا مجھے اسے ہنس کر قبول کرنا تھا۔ کہتا بھی تو کس سے اپنا یہ دکھ۔ کون تھا میرے زخم پر مرہم رکھنے والا۔

آگہی کا عذاب کیا ہوتا ہے یہ میں ان لمحات میں بخوبی جان رہا تھا کاش میں بے خبر ہوتا تو منتوں مرادوں سے مانگی ہوئی اپنی زندگی میں آنے والی اس تبدیلی پر ایسے ہی جی بھر کے خوش ہوتا جیسے سب ہورہے تھے۔

تائی اماں میری ادا اس کی بلائیں لیتے نہ تھک رہی تھیں۔ امی ابا یوں شاداں و فرحاں تھے جیسے ہفت اقلیم کی دولت پالی ہو۔ ماما جی کے چہرے پر بھی ایسا ہی اطمینان تھا کلثوم آپا اور مائرہ نے مجھ سے جی بھر کے تنگ لیا ———— بس اپنے سب انہی چاہنے والوں کی خاطر ہی تو میں نے بھی حلق میں اٹکا کانٹا نگلنے کا حوصلہ کرلیا ورنہ تو!———

اتنا ہلا گلا' شور شرابا بے شمار رسمیں جانے کس ہمت سے میں تمام مراحل سے گزرا ہارون اور مریانہ کی شوخیوں بھری چھیڑ چھاڑ اگ جان کلساتی رہی کئی بار جی چاہا ساری مروتیں بالائے طاق رکھتا کہیں دور نکل جاؤں لیکن پھر وہی اپنوں کی مسکراہٹیں ان کی روشن صورتیں پابہ زنجیر ہو جاتیں' کس قدر بزدل تھا نا میں۔

لیکن نہیں اتنا بھی نہیں تھا۔ اسی لیے تو حجلہ عروسی میں اس کے ہوش ربا روپ نے بھی میرے اندر جلتی آگ کم نہ کی۔

"بہت خوش ہو۔" میں سرتاپیر بھڑ بھڑ جل رہا تھا۔

میں نے بے پایاں محبت کی خود کو عشق کے امتحانوں سے گزارا ــــــــ اپنے حوصلوں کو لڑکھڑانے ـــ نہیں دیا۔ خائن نہیں بنا اور ان سب باتوں کے ساتھ ہوں تو مرد۔ جس میں انا اور کینہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے جو ہمیشہ وہ شریک حیات چاہتا ہے جس کی آنکھ نے کوئی دوسرا نہ دیکھا ہو جس کے دل پر وہ پہلا اور آخری احساس بن کر اترا ہو۔ میں بھی انسان تھا فرشتہ تو نہیں اذیت رساں احساسات تھے کہ مارے ڈال رہے تھے میرے اندر کی کڑواہٹ میرے لہجے میں در آئی تھی۔

"کیا آپ نہیں ہیں؟" میری خانہ جنگی سے بے خبر اس نے بھاری خمدار پلکیں اٹھا کر پوچھا۔

"کتنی بری لگ رہی ہو۔" میں اس کے دلکش حسن سے بالکل مرعوب نہیں ہونا چاہتا تھا تڑخ کر بولا اور اگلے ہی پل حیران رہ گیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"جیلس۔ جل گئے نا آج سب ہی میری اتنی تعریف کر رہے تھے۔ اماں نے تو پورے سات دفعہ مجھ پر سے مرچیں واریں۔ مریانہ کہہ رہی تھیں میں چاند سے اتری پری لگ رہی ہوں۔ کاملہ اور رابعہ آپا بھی اتنی تعریفیں کر رہی تھیں کہ ـــــ"

"دماغ خراب ہے سب کا چلو اٹھو۔ اتنا فضول ڈریس لگ رہا ہے تمہارا کس نے مشورہ دیا تھا یہ واہیات کپڑے لینے کا اور اس قدر ڈارک کمبی نیشن میں۔ مجھے تو وحشت ہو رہی ہے دیکھ دیکھ کر۔ جاؤ بدلو یہ کپڑے اور ہاں یہ لو جہاں اتنی رسمیں پوری ہوئیں میں نے سوچا یہ بھی کر دوں۔ کیا کہتے ہیں اسے ہاں منہ دکھائی۔ دراصل تمہارے خوابوں کی تعبیر۔" میں نے وہ لفافے اس کے سامنے پھینکے اور اس کے تاثرات دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ منہ پھیر کر شیروانی کے بٹن کھولتا کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ آخر دسمبر کی ٹھٹھرا دینے والی راتیں تھیں۔ یخ بستہ ہوا کا جھونکا لپک کر اندر آیا تو میں نے جھرجھری لیتے جلدی سے پٹ بند کر دیا وہ بھاری بھرکم لہنگا سنبھالتی واش روم میں جا چکی تھی۔ میں نے شیروانی اتار کر صوفے پر پھینکی بیڈ کی طرف آیا لفافے جوں کے توں پڑے تھے میں نے پکڑ کر سائیڈ ٹیبل پر اچھال دیئے اور تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گیا۔

پندرہ منٹ بعد وہ تولیے سے چہرہ پونچھتی باہر نکلی۔ سادہ کپڑے' دھلا دھلایا چہرہ جو یوں سرخ تھا جیسے قندھاری انار خمدار پلکوں تلے گویا خون چھلک رہا تھا میرے اندر کہیں ایک پن چبھی۔ وہ۔ مجھ سے یقیناً "اس رویہ کی امید نہیں کر رہی ہو گی ایکسپٹ تو میں بھی بہت کچھ نہیں کر رہا تھا مگر ـــــ

"ادھر آکر مجھ پر لحاف ڈالو اور میرے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ سر میں بہت درد ہے میرے۔" اسے کلسانے کو میرے پاس اک نیا حکم نامہ تھا وہ چپ چاپ آئی بیڈ کنارے رکھا لحاف کھول کر میرے اوپر پھیلایا اور کمرے سے نکل گئی۔ ابھی اس سکون آمیز حرارت کو پوری طرح محسوس بھی نہ کر پایا تھا کہ دروازہ کھول کر امی اندر آئیں انہیں دیکھتے ہی میں جھٹ اٹھ بیٹھا۔

"کیا بات ہے حدید طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹا سر میں کیوں درد ہو گیا تمہارے۔" امی حد درجہ گھبرائی ہوئی تھیں میرا ماتھا چھو کر دیکھنے لگیں۔ مجھے اس پر غصہ آیا جو معصوم سی صورت بنائے ان کے پیچھے کھڑی تھی۔

"تم نے جاکر امی کو بتادیا' حد ہوتی ہے بے وقوفی کی' میرا اتنا سا کام نہیں کرسکیں۔"

"ارے ارے یہ کس لہجے میں بات کررہے ہو' تمیز کرو' اسے کیوں ڈانٹ رہے ہو میں تو تمہارے ابا کے لیے پانی گرم کررہی تھی اسے آتے دیکھا تو پریشان ہوگئی پہلی رات کی دلہن ہے کچھ تو خیال کیا ہوتا کم عقل لڑکے گھر میں مہمان بھی ہیں۔ خدا سلامت رکھے ساری زندگی کام ہی کرنے ہیں تمہارے اب اس نے' آج تو بخش دیا ہوتا اگر چائے ہی پینا ہے تو میں بنا کر لادیتی ہوں نہیں تو گرم دودھ تو میں نے پہلے ہی رکھوادیا تھا یہاں وہ دیکھو۔" انہوں نے سینٹر ٹیبل پر رکھے فلاسک کی جانب اشارہ کیا ساتھ سنہری کناروں والے سفید مگ بھی رکھے تھے۔

"نہیں شکریہ' چائے رہنے دیں' میں دودھ پی لوں گا سوری آپ ڈسٹرب ہوئیں آپ جاکر آرام کریں۔"

"چلو اچھی بات ہے' اور ہاں آئندہ خیال رکھنا خبردار جو میری بچی کو کوئی کام کہا تو اکلوتی بہو ہے میری۔ سارے لاڈ اٹھاؤں گی میں اس کے۔ سال بھر تو کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دینا میں نے۔"

"جی ہاں پھر جب آپ کام کہیں گی تو بہو صاحبہ کی عادتیں بگڑ چکی ہوں گی۔" میں جل ہی تو گیا اتنی خاطر داریوں پر۔

"خیر ہے یہ میرا اور میری بیٹی کا معاملہ ہے تم فکر نہ کرو۔ چلو بیٹا تم بھی آرام کرو اور اب اگر یہ کچھ کہے تو مجھے بتانا میں خود ہی کان کھینچ لوں گی اس کے۔ جیتی رہو خوش رہو۔" امی اس کی پیشانی چوم کر کمرے سے نکل گئیں۔

میں نے ایک تیغ صفت نظر اس کے جھکے سر پر ڈالی اور جھٹکے سے لحاف سر تک تان کر لیٹ گیا۔ پھر کب جلتے کلستے میری آنکھ لگی۔ مجھے علم نہیں۔

☼ ☼ ☼

اور نئی صبح گویا میرے لیے شامت اعمال ہی تو لے آئی تھی میں خود تو سوگیا تھا لیکن لوینہ نے وہ ساری رات یقیناً" صوفے پر بیٹھے گزاری تھی۔ نتیجتاً" سویرے وہ بے ہوش بخار میں جل رہی تھی۔ ٹھیک ٹھاک ٹھنڈ لگ گئی تھی اسے۔

"لو جی تمہارے ولیمہ کا پروگرام تو کھٹائی میں ڈال دیا اس نے۔" کاملہ آپا کہہ رہی تھیں۔

"ارے ولیمہ کو چھوڑو یہ رات ہی رات میں اتنا تیز بخار ہوا کیسے؟" امی کی کٹیلی نظریں مجھ پر آٹکیں۔ جیسے سارا قصور میرا ہو۔ (تو کیا نہیں تھا؟)

"کسی کی نظر لگ گئی۔ دلہن بن کر روپ بھی تو اتنا چڑھا تھا میری بچی کو' ارے کسی حاسد کی نظر کام کرگئی' صدقہ دو اس کا۔" اماں کا خیال تھا۔

"ارے تم کھڑے کھڑے منہ کیا تک رہے ہو ہمارا جاؤ کسی ڈاکٹر کو ہی لے آؤ۔" امی کی صرف آنکھیں ہی نہیں لہجہ بھی مجھ پر گرم تھا۔

"جی اچھا۔" میں تابعداری سے سرہلا کر سائڈ ٹیبل سے اپنا والٹ اور گاڑی کی چابی اٹھانے لگا تو نظر اس کے لال بھبھوکا چہرے پر پڑی لرزتی پلکوں کے کناروں سے موٹے موٹے آنسو نکل کر تکیے میں جذب ہوتے جارہے تھے۔

اف یہ آنکھیں جن میں کبھی مجھے ایک آنسو برداشت نہیں ہوتا تھا آج یوں بے دردی سے موتی لٹارہی تھیں۔ چاہے میں اس پر کتنا ہی غصہ کیوں نہ ہول پر مجھے اس سے کوئی عداوت تو نہ تھی شاید انجانے میں' میں کچھ زیادہ ہی روڈلی بی ہیو کر گیا تھا اس کے ساتھ۔

"اب کیا دیکھ رہے ہو جاؤ بھی۔" امی کو تو جانے کتنا غصہ تھا مجھ پر۔ مبادا وہ سب کے سامنے برملا اظہار شروع کردیں میں نے وہاں سے نکل جانے کو ترجیح دی۔

☼ ☼ ☼

"شیم آن یو رونی' حدید بھائی نے ایک چیز کو بھی ابھی تک ہاتھ نہیں لگایا اور تم پانچواں کباب ہڑپ کر رہے ہو۔ تو اسٹاپ اٹ" ریحانہ نے ہارون کو گھورا جو پلیٹ آگے رکھے فرصت سے کباب اڑا رہا تھا۔

"پانچ دن ں ں۔" ہارون نے پانچوں کو لمبا کھینچتے ہوئے آنکھیں پھیلائیں۔

"دیکھ رہے ہو حدید یہ قدر ہے میری' بیویاں تو شوہر کو کھاتے پیتے دیکھ کر خوش ہوتی ہیں کھلا کھلا کر نہیں تھکتیں۔ ایک یہ میری بیگم ہے جسے میرا کھانا ہی گوارا نہیں۔ ٹھیک ہے بھئی تم کھلاؤ اپنے بھائی کو۔ میں مرجاتا ہوں بھوکا۔" اس نے منہ پھلا کر پلیٹ کھسکادی۔

"کیا ہو گیا ہے حدید بھائی۔ آپ کب سے مہمان بننے لگے کچھ نہیں کھایا آپ نے چائے بھی پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی۔ مجھے ایک بات بتائیں ادینہ تو ٹھیک ہے نا۔ آپ اتنے الجھے سے لگ رہے ہیں کہیں لڑتو نہیں پڑے اس کے ساتھ۔" وہ متحیر سی پوچھ رہی تھی۔

"لڑائی اور ادینہ کے ساتھ وہ بھی اس کی۔ توبہ کرو مریانہ' دس دفعہ توبہ کرو ایسا سوچنا بھی مت' یہ اٹلانٹک سکتا ہے سمندر میں چھلانگ لگا سکتا ہے۔ پہاڑی سے کود سکتا ہے پر ادینہ کے ساتھ لڑ نہیں سکتا۔ امپاسبل' پرابلم کوئی اور ہے۔"

"تم یوں کرو فٹافٹ تازہ گرما گرم چائے لے کر آؤ تب تک میں اس کی خبر لیتا ہوں۔"

"اوکے۔" مریانہ سرہلا کر باہر چلی گئی۔

"چل بھئی شروع ہو جا۔ کوئی ہینکی پھینکی نہیں۔ سب ٹو دا پوائنٹ بتا کیا بات ہے۔ تیرے چہرے پر وہ رونق نظر نہیں آرہی۔ جو ہونی چاہیے تھی کہ تو نے جو چاہا وہ پالیا پھر ہے مجنوؤں جیسی شکل کیوں بنا ہوا کیا ہے؟" وہ میرا جگری یار بھلا میں کبھی اس سے چھپا پایا تھا جو اب چھپاتا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی میرے چہرے کے رنگ پہچان گیا تھا لیکن میں کس زبان سے اس کو وہ سچ بتاتا جس نے مجھے رنجور کیا تھا اس میں صرف میری میرے جذبوں کی ہی ہتک نہیں تھی اونہ کا پردہ بھی چاک ہوتا تھا جو مجھے کسی صورت گوارا نہ تھا سو میں نے اس کی الجھن زائل کرنے کی ناکام سی کوشش کی۔

"کچھ نہیں یار سب تیرا وہم ہے۔ بس ذرا بزنس کی ہی ٹینشن ہے۔

"کباب بہت مزے کے ہیں۔" اس کا دھیان ہٹانے کو آخر کار مجھے کباب چکھنا ہی پڑا۔

"ہوں بہت۔ تو بھی بہت مزے کی چیز ہے۔ ہاں بھئی کتنے دن ہو گئے ہیں تیری شادی کو مہینہ بھر تو ہو ہی گیا ہو گا۔ میں اپنی شادی کے تیسرے دن ہنی مون پہ چلا گیا تھا اور تو؟"

میرے خیال میں تو نے جتنا بھی پردیس کاٹا کنجوسیاں کیں وہ سب ادینہ کو خوشیاں دینے کے لیے تو پھر اب یہ کنجوسیاں کیوں؟" وہ اک نیا سوال کر رہا تھا۔ اس کے جواب میں میرے پاس بھی ٹھوس جواز موجود تھا۔

"او یار تمہیں پتا تو ہے وہ بیمار ہو گئی تھی۔"

"چل مان لیا بیمار ہو گئی تھی پر کتنے دن؟ ایک ہفتہ پھر اس کے بعد —— ہنی مون پر لے جاسکتے تھے لیکن تم اسے کہیں اور کہاں لے جاتے تم نے تو میری دعوت قبول نہیں کی کتنی بار میں نے کہا اور تم آئیں بائیں شائیں کر گئے اور مجھے یقین ہے تم اب تک اسے کہیں لنچ یا ڈنر پر بھی نہیں لے کر گئے حد ہوتی ہے بخیلی کی یار۔"

"وہ بخیلی کیسی۔ سب کچھ تو اس کے نام کر دیا ہے اتنا کچھ تو بنا دیا ہے اب اور کیا کروں؟" میں چڑ ہی تو گیا سب کو اس کی فکر تھی اس کا احساس۔ اور میں' میں تو جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔ پتھر سمجھ لیا تھا سب نے مجھے بے جان' بے حس' جذبوں سے عاری۔

"ہاں' تیری محبت کیا چیزوں تک محدود تھی' بن گئیں محبت ختم اور یہ تو بول کیسے رہا ہے کہیں واقعی ادینہ سے ان بن تو نہیں ہو گئی تیری" وہ مشکوک نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور میرا تو کبھی کبھی اگلا سانس لینے کو دل کرتا تھا نہ بولنے کو صرف نفی میں سرہلا دیا۔

"اچھا چل چھوڑ ساری باتیں میں کچھ نہیں جانتا تم

کل ادینہ کو لے کر آرہے ہو جہاں کھو گے شاندار ساڈنر ہماری طرف سے ہوگا۔"

"لیکن یار وہ......"

"خبردار۔ میں یہ جگ مار کر تیرا سر پھاڑ دوں گا جو آج تو نے کوئی لولا لنگڑا بہانہ کیا اتنا اصرار بھی میں صرف اپنی بھابھی کی وجہ سے کر رہا ہوں۔ تجھے تو میں اب امریکہ کے وہ سوکھے سینڈوچ اور برگر بھی نہ ڈالوں جو ہم وہاں رج رج کے کھاتے رہے ہیں۔

روز انکل کے فون پہ فون آرہے ہیں ایک مہینہ تک تو کوئی فلائٹ نہیں مل رہی اس کے بعد جیسے ہی کوئی فلائٹ ملی ہم واپس چلے جائیں گے اور پھر جانے کب آنا ہو کب ملنا ہو۔ تو نے تو اپنی شادی کی خوشی میں کوئی اسپیشل پارٹی نہیں دی میں نے سوچا میں ہی کوئی یادگار موقع ارینج کرلوں۔"

"کب؟ کب جا رہے ہو تم واپس؟" مجھے اس کی ساری باتوں میں ایک ہی بات کی سمجھ آئی تھی۔

"کہا تو ہے جیسے ہی سیٹس ملیں ہم نکل جائیں گے۔"

ہارون کی طرف سے اٹھتے ہوئے میں اک فیصلہ کرچکا تھا جس پر جلد ہی عمل درآمد کا ارادہ تھا۔

☼ ☼ ☼

جب سے مہانہ اور ہارون کو دیکھ کر آیا تھا تب سے اک حشر بپا تھا۔ کاش میری زندگی بھی ایسی ہی خوشگوار ہوتی میں بھی بے فکر اور پرسکون ہوتا کیا قصور تھا میرا کیا غلطی کی تھی جو تشنگی میرا مقدر کردی گئی۔

میرا محبتوں کا مارا دل اپنی کم نصیبی پر گویا کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ رگ رگ میں دوڑتا اضطراب کسی کل چین نہیں لینے دیتا تھا۔ اپنی ذات اور جذبوں پر بھروسا یوں پارہ پارہ ہوا تھا کہ روح تک زخمی ہوگئی تھی۔ ایک کیل تھی جو عین سینے میں گڑ گئی تھی۔

جانے کب تک میں ان الجھنوں میں گم رہتا کہ دروازہ کھلا اور تیز روشنی نے میری آنکھیں چندھیا دیں میں نے بے اختیار آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ دروازہ بند ہوا تو میں نے دیکھا وہ حسب معمول میرے لیے گرم دودھ کا گلاس لے کر آئی تھی اور روز کی طرح میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ ناچار مجھے کہنا پڑا۔

"رکھ دو۔"

"پی لیں ٹھنڈا ہوجائے گا۔" اس کا وہی تابعدارانہ انداز۔ میں سرتاپیر سلگ گیا۔ مہینہ بھر ہوگیا تھا ہماری شادی کو اور اس عرصے میں میری کوشش رہی تھی کہ مجھے اسے مخاطب نہ ہی کرنا پڑے میں کہیں چاہتا تھا کہ کہیں میرے صبروضبط کا پیمانہ لبریز ہو اور میں اپنے اندر کا طوفان اس پر الٹ دوں شاید میں اپنا ضبط آزما رہا تھا۔ حتی الامکان اس سے گریز برتتا۔ یا پھر میں دیکھنا چاہتا تھا مجھ سے اپنی زندگی کی ہر بات شیئر کرنے والی ادینہ مجھ سے یہ سچ کب بولتی ہے۔

میں صرف خود کو ہی نہیں اسے بھی آزما رہا تھا جبکہ وہ میرے اس قدر سرد رویے کے باوجود میری ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ میرے کپڑے میرے جوتے میرا کھانا پینا میرا سونا جاگنا ہر کام پر دھیان بالکل ایسے جیسے کوئی باوقار مشرقی بیوی اپنے محبوب شوہر کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی۔

کمرے میں میرا دم گھٹنے لگا تو میں باہر نکل آیا جاتی سردیوں اور آتی بہار کے پرکیف جھونکوں نے میرے مردہ ہوتے اعصاب کو نئی سانسیں مہیا کیں گہرے گہرے سانس لے کر میں نے ہوا کو اندر اتارا۔ میری تنی رگیں ڈھیلی پڑنے لگیں۔ جسم و جان پرسکون ہونے لگے میں وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا دالان میں بچھی چوکی پر ادینہ نماز پڑھ رہی تھی بڑی سی چادر پیشانی تک اوڑھے وہ مکمل چھپی ہوئی تھی صرف تھوڑا سا چہرہ کھلا تھا اور کیا غضب کا اطمینان تھا کیسا بلا کا سکون عجب سی چمک تھی اس کے چہرے پر میں نے دیکھا تو دیکھتا ہی چلا گیا مجھے بے سکون کرکے خود کس قدر پرسکون تھی یہ لڑکی۔

اس نے سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھادیے۔ کیا مانگتی ہوگی اب یہ۔ اس کے تو بہت سے خواب تھے رنگ برنگے خواب روپہلے خواب، چمکیلے خواب اونچے

خواب' مجھے کئی گزرے لمحے یاد آگئے۔ کھٹ' کھٹ کھٹ ایک کے بعد ایک منظر کیا کیا نہ یاد آگیا تھا مجھے۔

"آپ بھی کبھی نماز پڑھ لیا کریں دل کو بے حد قرار ملتا ہے۔" وہ میرے پاس آکھڑی ہوئی تھی میں بے دھیانی میں پوچھ بیٹھا۔

"آپ کیا مانگتی ہو خدا سے تمہارے تو بہت سے خواب تھے نا۔"

"ہاں بہت سے خواب تھے اور خواب تو پھر خواب ہی ہوتے ہیں' کھلی آنکھوں سے دیکھے جانے والے خواب بہت مہنگے پڑتے ہیں ان کے پیچھے بھاگنا بے وقوفی ہوتی ہے۔ اصل خوبصورتی وہ ہوتی ہے جو حقیقت ہو اور یہ بات میں سمجھ چکی ہوں جیسے میری زندگی میں اب آپ' اب میں صرف آپ کے لیے دعا مانگتی ہوں۔"

"کیوں؟" میں نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا' اس کا مکمل اطمینان اور الفاظ تیر کی طرح لگے تھے۔

"کیونکہ اب آپ ہی میرا سکھ سکون اور خوشی ہیں۔" وہ پنجوں کے بل میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"بکواس کرتی ہو۔" اس کے دھڑلے سے بولے جھوٹ نے مجھے سیخ پا ہی تو کردیا۔ کتنی پارسا بن رہی تھی وہ میرے سامنے۔

"آپ کو میری باتیں بکواس لگتی ہیں۔" اف اس کی معصومیت۔

"تم مجھے سرتاپا بکواس لگتی ہو آئی سمجھ۔" میں اسے ایک ہاتھ سے پرے دھکیلتا کمرے میں آیا اور دھاڑ سے دروازہ بند کرلیا۔

✡ ✡ ✡

ہارون کی تاکید میرے ذہن سے محو ہو چکی تھی وہ تو شام میں اس کا دھمکیوں بھرا فون آیا تو مجھے تمام آوارگیاں ترک کرکے گھر کی جانب لوٹنا پڑا۔ میں نے تو اسے بھی نہیں بتایا تھا اب اچانک وہ تیار ہونے میں جانے کتنا ٹائم لے گی۔

بے مقصد ڈرائیو نے تھکا ڈالا تھا گھر پہنچا تو امی نے

آڑے ہاتھوں لیا رہی سہی کسر انھوں نے پوری کر دی میں سر تھامے بیٹھا تھا۔

"چائے" نہایت دلفریب مہک میرے چہار سو پھیلی تھی میں نے سر گھما کر بائیں جانب دیکھا خوب کلر فل خوبصورت کلدار جالی فراک یا پشواز میں وہ سجی سنوری میرے سامنے چائے رکھ رہی تھی۔ کانوں میں جھولتے آویزوں سے پھوٹتی کرنوں اور سیاہ بالوں کے ہالے میں اس کا دلکش چہرہ یوں دمک رہا تھا جیسے سیپ میں موتی۔ چند ثانیے میں مبہوت ہی رہ گیا۔

اس کا حسن کس قدر دل آویز تھا مجھے لگا جیسے میں ہر فکر بھول گیا ہوں۔ شادی کے بعد غالباً" وہ پہلی بار اتنے اہتمام سے تیار ہوئی تھی یا میں نے ہی آج اتنے قریب سے دیکھا تھا۔

"یہ بے وقت چائے لانا ضروری تھا کیا' پہلے اسے تیار تو ہو لینے دیتیں۔" امی کہہ رہی تھیں میری محویت ان کی آواز سے ٹوٹی میں نے جھٹ نظر چرالی۔

"دو منٹ لگتے ہیں پھوپھو ابھی ہو جاتے ہیں تیار۔ آپ کے لیے چائے لاؤں۔" وہ ان سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں بھئی اب چائے پی لی تو پھر کھانا نہیں کھایا جائے گا اور تم نے دینے کے لیے بھی کچھ منگوایا ہے۔ میاں کے ساتھ پہلی بار جاؤ گی ان کے ہاں خالی ہاتھ جاتے اچھا نہیں لگتا۔" امی کی بات پر میں حیران ہوا۔ آج کی دعوت کا ابھی تک تو میں نے کسی کو بتایا ہی نہیں تھا۔ شاید ہارون نے فون کر دیا ہو مجھے خیال آیا۔

"جی ہاں صارم سے منگوا لیے ہیں کپڑے' ساتھ میں پیسے دے دوں گی' ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں ابھی آپ کو لا کر دکھاتی ہوں اور آپ کا ڈریس بالکل ریڈی ہے۔ پلیز جلدی سے تیار ہو جائیں دو بار فون آچکا ہے تایا کا۔" امی کے بعد وہ مجھ سے یوں مخاطب تھی جیسے ہمارے درمیان بڑے مثالی تعلقات ہوں۔ میں اس کی بات پر حیران ہوا۔

"کیا مطلب تایا کا فون' وہ کیوں۔"

"ہائے لو اسے تو کچھ پتا ہی نہیں ہے تم نے بتایا نہیں تھا کیا' بھول گئے ہوں گے میاں صاحبزادے اب یہی اوقات رہ گئی ہے ہماری کہ تم ہم سے متعلق ہر بات بھول جاؤ۔ ارے بھئی مائرہ کے بیٹے کی سالگرہ ہے دو دن پہلے کارڈ دے کر گئی تھی وہ بہت اصرار کے ساتھ' بتایا ہو گا تمہاری بیوی نے تمہیں۔ مگر تمہاری نام نہاد مصروفیات تمہیں ہماری طرف دیکھنے دیں تو تب نا۔ اب یہ دو گھنٹے سے تیار ہوئی بیٹھی ہے انتظار میں اور تم ہو کہ۔" امی پھر سے اسٹارٹ لے چکی تھیں۔ میں وہاں سے اٹھ آیا' وہ میرے پیچھے ہی آگئی تھی۔

"اگر ایسی کوئی بات تھی تو تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھا امی کے ہاتھوں بے عزتی کروا کے بدلہ لیتی ہو۔" میں اس پر چڑھ دوڑا۔

"نہیں پلیز آپ غلط سمجھ رہے ہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ صبح آپ کے ناشتے کے ساتھ میں کارڈ رکھ گئی تھی آپ میری کوئی بات سنتے ہی کہاں ہیں کہ میں بتاؤں۔" وہ انگلیاں چٹخاتی وضاحت دے رہی تھی' اور ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی میں اسے اتنا حق دے ہی کب رہا تھا۔ مگر میں اس کی کیسے مانتا۔

"بہت خوب یہ اچھا بہانا ہے۔ آج یوں بھی ہم ہارون کی طرف انوائیٹڈ تھے اور سے یہ نئی بیگ اینڈ مائنڈ اٹ تمہارا شوہر میں ہوں امی نہیں کہ تم ان کے کہنے پر تیار ہو گئیں نہ مجھے بتایا نہ مجھ سے پوچھا آئندہ خیال رکھنا مجھے بتائے مجھ سے پوچھے بغیر تم کہیں بھی جانے کی ہامی نہیں بھرو گی ہاں جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو پھر جو مرضی کرتی پھرنا۔" میں اپنا غبار نکال کر ڈریس اپ ہونے کے ارادے سے ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ کچھ ٹائم ادھر سے ہو کر ہارون کے ہاں چلے جاتے۔ آج تو میرا کوئی ایکسکیوز اس نے قبول نہیں کرنا تھا۔ اور بہرحال میں اپنے پیارے دوست کو مزید ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اب تک وہیں کھڑی تھی۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟" میں آئینے کے سامنے بال بنا رہا تھا جب میں نے اس کی سرسراتی آواز سنی۔

"تمہارے کسی سوال کے لیے جوابدہ نہیں ہوں میں۔"

"کیوں؟ کیوں جوابدہ نہیں ہیں آپ۔ ابھی آپ نے کہا آپ میرے شوہر ہیں آپ مجھ پر اپنی مرضی لاگو کرسکتے ہیں تو میں آپ سے ایک سوال نہیں کرسکتی۔" وہ گویا تڑپ اٹھی تھی۔ میں برش رکھ کر ٹائی کی ناٹ باندھنے لگا اس کی بات کا جواب دینا اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔

"بتائیں نا کہاں جارہے ہیں آپ؟" وہ میرے سامنے آکھڑی ہوئی وہ حد درجے گھبرائی ہوئی تھی اور یونہی اس کا اگلا ردعمل دیکھنے کے لیے میرے منہ سے پھسل گیا۔

"امریکہ واپس جہاں زندگی کے چند سال گزارے ہیں۔"

"ہل۔۔۔ لیکن کیوں؟" اس کی آواز لڑکھڑا گئی چہرے کا رنگ واضح طور پر بدلا تھا۔

"میں یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔" اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر میں بیڈ پر جا بیٹھا جھک کر بیچے سے جوتے نکالے۔ چمکتے دمکتے جیسے بالکل نئے۔

"میں سمجھتی ہوں سب سمجھتی ہوں۔ میری وجہ سے صرف میری وجہ سے نا۔ پہلے بھی آپ میرے لیے گئے تھے میرے خوابوں کا بوجھ اٹھا کر اپنے ماں باپ اپنے گھر سے دور ہوئے تھے اب پھر جانا چاہ رہے ہیں میری ہی وجہ سے اور یہ میں ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ ٹھیک ہے آپ کو مجھ سے شکایت ہے تو مجھ پر نکالیں اپنا غصہ کب روکتی ہوں آپ کو۔ اسی قابل ہوں میں مجھے جو چاہیں سزا دیں۔ لیکن آپ کے بوڑھے والدین کا کیا قصور ہے انہیں کس بات کی سزا دے رہے ہیں پہلے ہی انہوں نے اتنے سال اکلوتے بیٹے کی جدائی بھگتی ہے اب پھر وہی طوق ڈالنا چاہتے ہیں ان کے گلے میں کس قدر ظالم ہیں آپ اپنے دل کے آگے ان کی پروا کرنا چھوڑ دیں گے؟ آپ کو کیا پتا دس منٹ بھی لیٹ ہوجائیں تو پھوپھو کیسے جلے پیر کی

بلی کی طرح سارے گھر میں چکراتی پھرتی ہیں دعائیں کر کرکے لب خشک پڑجاتے ہیں ان کے۔ پھوپھا جی سچ

میں جانتی ہوں گناہ گار ہوں میں آپ کی لغزش ہوئی ہے مجھ سے مگر میری خطا کی اتنی بڑی سزا دیں گے یہ مجھے علم نہ تھا۔ اگر جانتی تو آپ کو لاعلم ہی رکھتی آپ کو کون بتاتا۔ میرے غرور میری انا کی تذلیل کا قصہ کہاں سے سنتے مگر نہیں میں لاکھ بری سہی مگر میرے پشیمان دل نے گوارا نہ کیا کہ آپ جیسے اعلا اوصاف انسان کو دھوکہ دوں۔ آپ نے مجھ سے بے انتہا محبت کی اور اس محبت میں میرے لیے کیا کیا نہ کیا تو کیا میں وہی ندامت کے بوجھ تلے سسکتی روح لے کر آپ کی زندگی میں داخل ہوجاتی۔ نہیں اگر ایسا ہوتا تو میں اپنے ضمیر کے ہاتھوں اب تک مر گئی ہوتی۔ پرانی عادت ہے ہمیشہ سے آپ پر بھروسا کرنے کی آپ سے ہربات کہنے کی۔ اسی لیے تو اس دن میں جان بوجھ کر اپنا دروازہ ان لاک کر گئی تھی میں جانتی تھی آپ آئیں گے اور وہ ڈائریاں ضرور پڑھیں گے کیونکہ جس طرح اس دن میں نے آپ سے ڈائری چھینی تھی آپ کو ان کے بارے میں تجسس ضرور ہوگا اور وہی ہوا۔ آپ نے وہ ڈائریاں پڑھ لیں اماں نے مجھے بتایا تھا آپ آئے تھے اور بہت دیر میرے کمرے میں کتابیں پڑھتے رہے پھر اچانک۔۔۔ چلے گئے۔"

وہ کیا کہہ رہی تھی وہ جانتی تھی مجھے اس کے الفاظ نے ششدر کردیا۔

"اور مجھے یہ جرأت بھی آپ کی اس محبت نے عطا کی تھی جس کا اظہار اس شام آپ نے مجھ سے کیا تھا شاید میں اپنی قسمت آزمانا چاہتی تھی دیکھنا چاہتی تھی کہ جس اوینہ کو پہلے ہی خوابوں نے دھوکہ دیا ہے کہیں وہ تقدیر کے ہاتھوں پھر تو دھوکا نہیں کھارہی اور میں نے بہت دن انتظار کیا جب آپ نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا۔ کوئی بازپرس کوئی سوال نہ کیا تو میں ان گنت خوش گمانیوں میں گھر گئی اپنے خوش نصیب ہونے کا یقین ہوگیا جب ہماری شادی ہونے لگی تو میں سمجھی آپ واقعی سچے ہیں۔ سچا محب وہی ہوتا ہے جو محبوب

کی تمام خطائیں بخش دے اس کی ہر کوتاہی درگزر کردے۔ اس کی ناوانیاں بھلا کر اسے پشیمانیوں کی دلدل میں دھنسنے سے بچالے۔ میں بھٹکی ضرور تھی مگر راہ نہیں بھولی تھی ایسا بھی نہ ہوتا اگر آپ جانے سے پہلے مجھے اپنے دل کی بات بتا جاتے۔ مگر میری کم عقلیوں میرے غرور میرے تکبر کو وہ ٹھوکر لگنی ہی تھی۔

آپ سے وفادار ہونے کے لیے آپ کی محبتوں کی قدردان ہونے کے لیے اپنی قسمت پر نازاں ہونے کے لیے جب قدرت نے مجھے آپ کے لیے تخلیق کیا تھا تو پھر میں کسی اور طرف کیسے جاتی۔ کسی اور کی کیسے ہوتی آپ نے ہمیشہ میری بے وقوفیاں جھیلیں' بدتمیزیاں برداشت کیں' حماقتیں سہیں مگر کبھی مجھ سے تنگ نہ ہوئے۔ بس یہی تو مان تھا آپ پر' اور اسی مان کے بھروسے تو سب بھلا کر خود کو اپنی ہر غلطی پر معاف کر کے آپ کی زندگی میں شامل ہوئی تھی میں اس گمان میں تھی کہ آپ بھی مجھے کھلے دل سے قبول کریں گے مگر میں بھول گئی تھی آپ کا دل بے شک محبتوں بھرا ہے مگر ہے تو ایک مرد کا دل' اور مرد ہر بات بھلا سکتا ہے سہہ سکتا ہے مگر بیوی کی اک لغزش معاف نہیں کر سکتا۔ ٹھیک ہے آپ مجھے بالکل معاف نہ کریں میں ہوں ہی اس لائق میں نے آپ کا دل دکھایا ہے آپ مجھے جو بھی سزا دینا چاہیں دیں۔ جتنا غصہ جتنی نفرت آپ کے اندر ہے سب نکال لیں مجھ پر۔ مگر پلیز قطرہ قطرہ کر کے مت ماریں مجھے' ایک ہی بار ماردیں۔ بہت بری لگتی ہوں نا بکواس لگتی ہوں تو چاہے اپنی زندگی سے نکال دیں میں اف نہیں کروں گی چھوڑ دیں مجھے آزاد کردیں۔"

"چٹاخ" وہ بولتی ہی چلی جارہی تھی بے اختیار میرا ہاتھ اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔

"صرف بکواس ہی نہیں' بہت بکواس کرتی ہو۔ دفع ہوجاؤ میرے سامنے سے چلی جاؤ یہاں سے۔" میرا دماغ گھوم گیا تھا وہ منہ پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور اگلا پل مجھے زمین میں دھنسا گیا وہ میرے گھٹنوں پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میں ساکت و صامت اسے روتے دیکھتا رہا مجھ میں تو اتنی ہمت بھی نہیں بچی تھی کہ اس کے آنسو ہی پونچھ دیتا۔ میں تو خود سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا کجا کہ اس کا سامنا اور بہت دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور مجھے دیکھے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ وہ رات میرے لیے احتساب کی رات تھی۔

✲ ✲ ✲

رات کے سر پر تنی شفاف آسمان کی سیاہ چادر پر جابجا ٹنکے ستاروں کے درمیان اجلا چاند یوں مسکرا رہا تھا جیسے اپنے درباریوں میں گھرا کوئی عالی مرتبت بادشاہ اور وہ چہار جانب سے لاپروا پورے دھیان سے اس منظر میں گم تھی میں نہایت آہستگی سے اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دودھیا چاندنی میں' میں نے دیکھا الجھے الجھے بکھرے بالوں اور ستے چہرے کے ساتھ یوں بیٹھی وہ کوئی سودائن لگ رہی تھی اگر اتنے دن مجھے کہیں چین نہ ملا تھا تو پرسکون وہ بھی نہیں رہی ہوگی اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اب بھی بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے میرے دل کو کچھ ہوا۔ ان آنکھوں میں آنسو مجھے کبھی برداشت نہیں ہوتے تھے اور اب کئی دنوں سے وہ دریا بہانے پر مجبور تھیں وہ بھی میرے رویوں پر۔ بس اب اور نہیں جتنے امتحان ہوگئے اتنے ہی بہت ہیں' میں آگے بڑھا۔

"دینا یاد ہے کچھ چند سال پہلے اسی جگہ اسی چھت پر تم نے مجھ سے پوچھا تھا میرا خواب کیا ہے۔" میری آواز پر وہ بے اختیار کرسی سے اچھل کر کھڑی ہوگئی۔

"ڈر گئی ہو" میں ہنس دیا' وہ حق دق مجھے دیکھے گئی۔ میں نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما۔ ٹھنڈا یخ ہاتھ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبالیا۔

"یاد ہے دینا میں نے کہا تھا وہ چمکتا ستارہ میرا خواب ہے' میرا واحد خواب اور اللہ کتنا مہربان ہے۔ تم نے میرے لیے دعا کی تھی نا وہ ستارہ میرا ہے' میرے آنگن

میں اتر آیا ہے۔ اس نے میری سب مرادیں پوری کردی ہیں۔ میں بہت خوش ہوں تم کچھ کہو گی نہیں۔" میں نے اس کی کھلی آنکھوں میں جھانکا جو یک ٹک مجھے دیکھے جارہی تھیں جھٹ پلکیں گرالیں۔

"ناراض ہو؟" میں نے اس کا — چہرہ انگلی سے اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں برسنے کو تیار تھیں۔ سرنفی میں ہل گیا۔

"تمہیں حق ہے ویسا تم مجھ سے ناراض بھی ہوسکتی ہو پر تمہیں کیا پتا تمہارے لیے میرے احساسات کیا ہیں۔ تم نے ابھی محبت کی نہیں اور میں محبت کے جام بھر بھر کے پی چکا ہوں۔ یاد رکھنا محبت کو کبھی آزمانا مت کیونکہ محبت چاہے کتنی ہی وسیع کتنی ہی فراخدل کیوں نہ ہو پر جہاں چوٹ اس کی انا پر پڑے وہاں یہ سارے ادب آداب بھول جاتی ہے۔ سارے قرینے سب ایثار ترک کردیتی ہے اور خصوصاً مجھ جیسے عاشق جو راہ محبت میں اکیلے ہی اتنی دور نکل جائیں کہ ان کے لیے واپسی کا خیال ہی سوہان روح ہوتا ہے اس پر مستزاد ایسی آزمائشیں جو کہیں تصور کے ہزارویں حصے میں بھی نہ ہوں سہنی پڑ جائیں تو سمجھو موت برابر ہوتی ہیں۔ پہاڑ سا حوصلہ چاہیے ہوتا ہے جو کم از کم کسی مرد میں نہیں۔"

میں نے اس کا دوسرا ہاتھ تھا اس کے رخسار تر بتر تھے سر جھکا ہوا۔

"اب بس کرو اور کتنا روؤ گی۔" مجھے اس کے آنسو تکلیف دے رہے تھے۔

"سوری حدید پلیز آئم سوری۔" اس کے آنسوؤں میں مزید روانی آگئی میرے ہونٹوں پر زخم خوردہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ "کتنا آسان ہوتا ہے کسی کو قتل کرکے سوری کہہ دینا۔ یہ تو دنیا کا رواج ہی بن گیا ہے۔ کسی کو مارنے سے پہلے اگر اس کی اذیت کا سوچ لیا جائے تو میرے خیال میں کوئی بھی جرم نہ ہو۔"

"پلیز مجھے اور لفظوں کی مار مت ماریں میں تو پہلے ہی آپ کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں رہی۔ پلیز حدید مجھے معاف کردیں۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے آپ مجھے کچھ بھی نہ دیں مجھے اپنا پیار بھی نہ دیں بس مجھے صرف آپ کا اعتماد چاہیے۔" وہ حد درجے پشیمان تھی اور جب کوئی اپنی غلطی مان لے اور اس پر شرمندہ بھی ہو تو میرے خیال میں اس کے لیے اتنی سزا کافی ہوتی ہے جو وہ اپنے ضمیر کے ہاتھوں جھیل چکا ہے۔ انصاف کا تقاضا تو یہی تھا کہ اب اپنی عدالت سے بھی میں اسے بری کردیتا۔

"میں میرا پیار میرا اعتماد کل بھی تمہارا تھا آج بھی تمہارا ہے۔ تم تمہارے خواب کل بھی میرے تھے آج بھی میرے ہیں میں اس سے ہٹ کر کچھ نہیں جانتا۔ تمہارے چند خواب میں پورے کرچکا ہوں جو ایک ادھورا خواب ہے اسے تم خود پورا کروگی۔" میں نے جیب سے سفید کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ملگجے اجالے میں اس نے دیکھا آنکھوں میں استفسار تھا۔

"تمہارا ایگزامنیشن فارم ہے گو کہ لاسٹ ڈیٹ گزر چکی ہے۔ لیکن کوئی مسئلہ نہیں لیٹ فیس کے ساتھ جمع کروایا جاسکتا ہے۔ تم اسے فل کردو اور ضروری ڈاکومنٹس بھی دے دو۔ کل میرا سب سے پہلا کام یہی ہوگا۔"

"مم.... مگر وہ میں بہت دن ہوگئے کتابیں بند کیے یہ مجھ سے اب نہیں ہوگا۔ یوں بھی خوابوں سے مجھے نفرت ہوگئی ہے اپنی آنکھوں سے سب خواب نوچ پھینکے ہیں میں نے۔" بہت دیر بعد وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔

"او نہوں بری بات' خوابوں سے نفرت نہیں کرتے یہ خواب تو آس ہوتے ہیں امید ہوتے ہیں آگے بڑھنے کی۔ منزل پانے کی لگن دیتے ہیں جستجو کو تحریک دیتے ہیں۔ خواب تو زندگی کی علامت ہوتے ہیں۔ ان سے منہ موڑنا تو مایوسی کا نشان ہے اور مایوسی گناہ' گناہ بزدل اور کمزور لوگ کرتے ہیں۔ بہادر لوگوں کا یہ شیوہ نہیں اور تمہیں میں ہر طرح سے بااعتماد دیکھنا چاہتا ہوں کسی فضول وجہ سے تم اپنی تعلیم کا خواب ادھورا چھوڑ دو یہ مجھے گوارا نہیں میں تمہیں زندگی کے کسی بھی مقام پر بزدل اور کمزور نہیں دیکھنا چاہتا اگر میرا اعتبار چاہتی ہو تو تمہیں یہ سفر کرنا پڑے گا ورنہ میں سمجھوں گا کہ....." اور میرے لفظوں کا خاطر خواہ اثر ہوا اگلے ہی پل فارم اس کے ہاتھوں میں تھا۔

"ورنہ کیا سمجھیں گے آپ؟" اس کا اعتماد بحال ہوا تھا جو مجھے اچھا لگا۔

"یہی کہ میری بیوی بزدل اور کمزور نہیں۔" میں نے بڑے پیار سے اس کے چمکتے چہرے کو دیکھا۔

"وہ تو ہے' جسے آپ جیسا جیون ساتھی مل جائے وہ کسی بھی مقام پر ہارے گی نہیں۔"

"بے شک' بے شک۔" میں نے سراہایا' وہ ہنس رہی تھی میں بھی ہنس دیا۔

"او رووہ دیکھو اس چمکتے ستارے کے آس پاس کتنے پیارے ننھے ننھے ستارے ہیں۔ آؤ آج دونوں مل کر دعا کریں کہ رب ان ستاروں میں سے دس ستارے ہمارے آنگن میں اتار دے۔"

"دس ستارے؟" مارے حیرت کے اس کا منہ کھل گیا یک لخت وہ ملامتی کیفیت سے دوچار ہوئی۔

"آ آپ دس شادیاں اور کریں گے۔" وہ بولی اور میں ہنستا چلا گیا۔

"وہ میری بھولی پری میں دس شادیاں اور نہیں کروں گا۔ میرے لیے تو یہ ایک پیاری سی بیوی ہی کافی ہے۔ میں تو اپنے آنگن میں کھیلتے اچھلتے کودتے شرارتیں کرتے لڈو' گڈو' ٹنکو' پنکی' موتی کی بات کررہا ہوں یہ ان ستاروں کے نک نیم ہوں گے اچھے اچھے بامعنی نام تم رکھ لینا۔" میں نے شرارت سے بھرپور نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

"ج ج جی جی۔" اس کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں اگلے لمحے وہ بگٹٹ دوڑنے کو تھی میں نے بھی ارادہ بھانپتے لپک کر جالیا۔

"وہ وہ اماں آوازیں دے رہی ہیں۔" گلابی رخساروں پر سیاہ پلکیں لرز رہی تھیں۔

"اماں کی آوازیں سن لیں میرے دل کی آواز نہیں سنو گی جواب صرف تمہارے نام کی مالا جپ رہا ہے جو ہر پل تمہارے سنگ رہنا چاہتا ہے اب اس کے لیے تم سے اک لمحے کی دوری بھی ہزار صدیوں پر محیط ہوگی۔ آؤ دیکھا چلیں میرا گھر' میرا کمرہ میری روح' میرا دل ہر شے تم بن تنہا اور اداس ہے۔ فرقت کے جتنے بھی سیاہ دن گزارے انہیں بھول کر اب ہم نئی اور روشن زندگی کا آغاز کریں گے مجھے یقین ہے اس رات کے بعد جو سویرا آئے گا وہ بہت اجلا اور دلفریب ہوگا ہے نا۔" میں نے اس سے تائید چاہی۔

"ان شاء اللہ اب میں بھی آپ کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی آئی لو یو جدید۔" میرے حصار میں قید وہ شرما کر اقرار کررہی تھی۔ میں سرشار ہوگیا۔ سب کلفتیں دور ہوگئی تھیں۔ دل محبت کی تال پر رقص کناں تھے اور پیار لٹاتی آنکھیں پھر سے نئے خواب بننے لگیں ایک نئی امید کے ساتھ۔

اُمِ طیفور

ناولٹ

"ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔! کمرے کی دیوار پر سجے خوب صورت وال کلاک نے آٹھ بجنے کا سندیسہ دیا تھا۔ میں نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ یعنی مجھے ڈیڑھ گھنٹہ بیت گیا تھا۔ یوں تنہائی میں بیٹھے خود سے لڑتے ہوئے اب میں ہمیشہ خود سے ہی مقابلہ کرتا ہوں' کیونکہ مدت ہوئی میری باتوں پر میرے گھر والوں نے کان دھرنے چھوڑ دیے تھے۔ کبھی میری ہر بات میری فیملی کو بھاتی تھی 'مگر اب میری پوری ہستی شاید انہیں ناگوار گزرتی ہے۔ پہلے میں بے وقت اگر پانچ منٹ بھی کمرے میں گزارتا تو میری بیوی پریشان سی میرے سر پر پہنچ جاتی اور ہر ممکن طریقے سے میرا دھیان بٹاتی اور اب وہی شریک زندگی مجھے اپنی زندگی سے بے دخل کیے۔ اپنی زندگی میں مگن سی رہتی۔

بچے۔! میرے بچے! میری کل کائنات! اب مجھ سے عاجز آکر جذباتی طور پر بے حد دور ہو چکے تھے۔

میرے دل میں اک ٹیس سی اٹھی۔ ایک ٹھنڈی سانس سینے سے خارج کرکے میں نے جیسے اپنی دھڑکنوں کا یقین کیا تھا۔ اکیلا بیٹھ کر انسان اپنی سانسیں گننے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس کا تجربہ مجھے تنہا ہونے کے بعد ہوا۔

آج میری بیٹی ریکا آئی ہوئی ہے۔ اس کی شادی کو محض تین ماہ ہوئے ہیں۔ اس کے خوب صورت قہقہوں کی آوازیں مجھے مسلسل اپنے کمرے میں سنائی دے رہی ہیں۔ جو اس کی بے تحاشا خوشی کی غماز ہیں۔

آج رات کے کھانے پہ میری بیوی نے بیٹی اور داماد کو بلوایا تھا۔ وہ دونوں شام پانچ بجے سے ادھر ہیں۔ میں کچھ دیر ان سب کے درمیان بیٹھا تھا۔ مگر مجھے لگا کہ مجھ سے بات چیت کا موڈ میری بیٹی کا ہے اور نہ اس کے شوہر کا۔ سو تھوڑی دیر بعد خاموشی سے اٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔ اب میں سکون سے کھانا لگنے تک اپنے کمرے میں اپنی یادوں سے دل بہلا سکتا ہوں۔

میں شوبز کا آدمی ہوں۔ گوکہ اب میں ٹی وی کے لیے بہت زیادہ کام نہیں کرتا۔ مگر چونکہ میری اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے۔ سو میرا تعلق آج بھی شوبز کے ساتھ قائم ہے اور یہ تعلق ایک ایسی دلدل ہے جس میں 'میں سر تک دھنس چکا ہوں۔ میرا دم گھٹتا ہے' میں اس دلدل میں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہوں 'مگر بے سود۔ میں بااختیار ہوتے ہوئے بھی مکمل بے اختیار ہوں۔ میں چاہ کر بھی اس خونی آکٹوپس کے چنگل سے نکل نہیں پاتا۔ جس نے دھیرے دھیرے میری اخلاقیات 'اقدار اور میرے خونی رشتے نگل لیے۔ میری امی اور ان کی تربیت سب سے پہلا شکار تھی۔

میری ماں کو خون تھکوایا 'میرے اس پیشے نے۔ یا یوں کہیے میری شخصیت میں آنے والے اس پیشے کے بد اثرات نے۔ میں ایک عرصے تک بدمست ہاتھی کی طرح سب کچھ روندتا چلا گیا اور آج جب ہوش آیا ہے تو میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں۔ یہاں تک کہ جن کے سہارے میں اس مقام تک پہنچا' وہ بھی دامن جھٹک' ایک طرف جا کھڑے ہوئے ہیں۔ یعنی میری فیملی!

اور میرے دامن میں بہت سے پچھتاوے کسی ایسے ضدی بچے کی مانند چپکے پڑے ہیں جسے اس کی ماں لاکھ پرے جھٹکے' پر وہ اتنی ہی شدت سے پھر جھولی میں

منہ چھپاتا ہے۔ میرے پچھتاوے بھی جان کا روگ بنتے جارہے ہیں۔ مگر اب وقت کی تتلی میرے ہاتھوں پہ تاسف' دکھ اور پشیمانی کے بدنما رنگ چھوڑ کر اڑ چکی ہے۔ کبھی کبھار میرا دل چاہتا ہے کہ میں خود پہ بے تحاشا ہنسوں اور پھر ہنستے ہنستے اپنا چہرہ نوچ ڈالوں' میرا چہرہ مسخ ہوجائے کہ جب میں آئینے میں خود کو دیکھوں تو مجھے اپنا بدہیئت چہرہ نظر آئے اور میں اپنے خوشنما اور وجیہہ چہرے کے پیچھے چھپے کرب ناک ماضی کو بھول جاؤں۔ وہ ماضی... جو لپک لپک کر مجھ پر آگ کے شرارے برساتا ہے اور میرا رواں رواں جھلس جاتا ہے۔

روز میں کسی بے بس اور لاچار مجرم کی طرح اعمال کے پھانسی گھاٹ تک لے جایا جاتا ہوں اور پھندے پہ لٹکایا جاتا ہوں۔

آج پھر میرا کمرہ ہے۔ میری تنہائی ہے اور میرے ماضی کی پرخار پگڈنڈی ہے 'جہاں میرا ضمیر مجھے کوڑے مارتا لیے جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

میں اپنی امی کا بڑا بیٹا تھا۔ مجھ سے چھوٹی میری ایک بہن اور بھائی تھے۔ میرا بچپن بھی کم و بیش ان بچوں جیسا ہی تھا جو لڑکپن میں یتیم ہو جاتے ہیں۔ میں بھی تیرہ سال کی عمر میں باپ سے محروم ہوا اور ابو کے جانے کے ٹھیک ساڑھے چھ ماہ بعد میرا چھوٹا بھائی ہیضے کا شکار ہو کر مر گیا۔ محض آٹھ سال کی عمر میں وہ بھی امی کو دکھوں کے بوجھ تلے چھوڑ کر ابو سے جا ملا۔ قدرتی طور پر امی کا رجحان میری طرف زیادہ ہوتا گیا۔ ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز و محور میں بن گیا۔

میری چھوٹی بہن سمیعہ جو ابو اور چھوٹے بھائی کے فوت ہونے کے بعد بوکھلائی اور روہانسی ہوئی پھرتی تھی' میری دانستہ کوششوں کی وجہ سے مجھ سے قریب ہوتی چلی گئی۔ میں اپنی ہر ممکنہ کوششوں سے دونوں کے دل بہلائے رکھتا۔ معاشی اعتبار سے بہت خوش حالی نہ سہی تو تنگدستی بھی نہ تھی کہ ابو نے ترکے میں دو دکانیں چھوڑی تھیں اور گھر کا اوپری حصہ کرائے پر چڑھا تھا۔ سب مل ملا کر گزارے لائق کرایہ آجاتا تھا۔ امی کو مشکل گھڑی میں آسرا بھی ہو گیا اور میری اور سمیعہ کی پڑھائی بھی جاری رہی' لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ امی کی بیوگی ان کے لیے آسان ٹاسک تھی۔ بلکہ یہ راہ بے حد کٹھن بھی ثابت ہوئی۔

امی بے حد خوب صورت تھیں۔ جس وقت بیوہ ہوئیں محض انتیس سال کی تھیں۔ میں اکثر امی کو چھیڑتا تھا کہ آپ مجھ سے صرف سولہ سال بڑی ہیں اور ابو آپ سے سولہ سال بڑے تھے۔ کیسی دلچسپ مثلث بنتی ہے۔ پر یہ محض مذاق کی بات تھی اور زندگی امی کے لیے مذاق ہرگز نہیں تھی۔ ابو کے فوت ہونے کے لگ بھگ سال بعد ہی میرے چچا کے ہمارے گھر لگنے والے وقت بے وقت چکر امی کو الجھائے دے رہے تھے۔ وہ ابو کی چھوڑی ہوئی جائیداد کے لیے فکر مند تھیں اور میں بھی ان کو دیکھ دیکھ کر پریشان رہنے لگا۔ کیونکہ نہ میں اتنا بچہ تھا کہ پیسے اور جائیداد کی ضرورت اور اہمیت کو نہ سمجھ سکوں اور نہ ہی اتنا تنومند کہ کسی ناانصافی پر اپنے چچا' تایا لوگوں کے آگے اکڑ کر کھڑا ہو سکوں۔

بس دن رات خوابوں خیال میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا اور انجان سایوں سے بھڑتا اپنی جائیداد بچاتا رہتا۔ مگر زیادہ دیر مجھے تصور میں اپنے ان دیکھے دشمنوں سے لڑنا نہیں پڑا اور بلی تھیلے سے باہر آہی گئی۔ جب میرے چچا نے بے غیرتی دکھاتے ہوئے میری امی کو شادی کا پیغام دیا تھا۔ میں اور سمیعہ بھی اس وقت وہیں موجود تھے اور ششدر رہ گئے۔ میری تو غصے سے حالت خراب ہونے لگی تھی اور شاید جوش میں آکر میں کوئی چیز بھی اٹھا کر چچا کو دے مارتا۔ امی نے موقع کی نزاکت تاڑتے فوراً" مجھے قابو کیا اور چچا کو درشتی سے گھر سے نکل جانے کو کہا اور آئندہ کے لیے ایسی کسی بھی شرمناک حرکت سے باز رہنے کی وارننگ بھی دی۔ چچا کف اڑاتے غصے کی حالت میں دھمکیاں دیتے نکل گئے۔ امی مجھے اور سمیعہ کو بانہوں میں لیے روتی ہوئی وہیں ڈھے گئیں۔

چچا کی دھمکیوں کا خمیازہ ہمیں اس صورت بھگتنا پڑا۔ انہوں نے میرے سارے رشتے داروں کو ہم سے متنفر کرنا شروع کر دیا۔ بشمول میرے ددھیال اور ننھیال کے۔ وہ تمام لوگ جو امی کے کردار کی اجلی چادر کی قسمیں کھاتے تھے۔ اب اسی چادر میں داغ ڈھونڈنے لگے۔ چچا نے خاندان بھر میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ امی نے خود انہیں نکاح کا عندیہ دیا تھا اور انہیں دھمکی بھی دی ہے کہ اگر چچا نے امی سے نکاح نہ کیا تو وہ عنقریب خود ہی کسی سے بھی دو بول پڑھوا لیں گی۔

سننے والوں کے لیے امی کے حوالے سے یہ بہت بڑی اور شرمناک بات تھی' لیکن کوئی بھی تصدیق کرنے ہمارے گھر نہیں آیا' نہ میرے ماموں میں سے اور نہ ہی چچا' تایا لوگوں میں سے۔ ایک خودساختہ

نفرت کی دیوار خود ہی کھڑی کرلی گئی۔ جس کے ایک پار میرے رشتے دار تھے اور دوسری جانب ہم تین نفوس' مگر میری ماں نے ان حالات کا سامنا اس ہمت اور حوصلے سے کیا کہ سب ہی کی زہر اگلتی زبانیں تالو سے جا لگیں اور پھر دھیرے دھیرے امی کے کردار اور ان کے رکھ رکھاؤ نے چچا کے بہتان کا پول کھول دیا۔

سب ہی نے دوبارہ ہم سے میل جول شروع کردیا۔ مگر اس دوری اور قربت میں پانچ' چھ سال کا وقفہ آچکا تھا۔ اب میں کوئی اسکول گوئنگ بچہ نہیں' بلکہ سیکنڈ ایر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ میرا سوکھا سڑا پتلا سا جسم چوڑی اور مضبوط ماٹھی میں تبدیل ہوچکا تھا اور میری ماں دن رات کی تسبیح میں اپنے دکھ پرو پرو کر اپنی خوب صورتی اور جوانی کو گنوا چکی تھی۔ چچا کی الزام تراشیوں کے بعد جب سب کی انگلیاں میری ماں کی طرف اٹھیں تو انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ باقاعدہ پردہ شروع کردیا۔ حالانکہ پہلے امی چادر لیتی تھیں۔ ہر طرح کا رنگ دار کپڑا انہوں نے اپنے اوپر جیسے حرام کرلیا تھا۔ سولہ سنگھار کا تو تصور ہی کیا' ناک کی لونگ تک نکال ڈالی۔ جتنی بھی بہادر بنتیں۔۔۔ تھیں تو اکیلی عورت اور دو نابالغ بچوں کا ساتھ' ان ہی سوچوں نے وقت سے پہلے سر سفید کرنا شروع کیا اور اس سفیدی کا غبار جیسے ان کی ساری ہستی پر چھا سا گیا۔

میری امی بوڑھی سی لگنے لگیں اور جب سب پلٹنے لگے تو جیسے ہم تینوں کو ہی کسی کی حاجت نہ تھی۔ ہم ایک کٹھن وقت گزار چکے تھے اور اب تو امی ہر' ہر کام کے لیے مجھی پر انحصار کرتی تھیں۔ انہوں نے مدت ہوئی مجھے گھر کے سربراہ کی حیثیت دے دی تھی۔ گھر کے سودا سلف سے لے کر' کرائے اکٹھے کرنے تک میں امی نے مجھے یوں طاق کیا کہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے مجھ میں ابو کی روح حلول کرگئی ہو۔ ایک دردمند اور سوکھے کے مصداق ابو کے پرانے کھاتے دار چچا بشیر نے میری بے حد مدد کی۔ مجھے لین دین کے معاملات سمجھنے میں سہولت ان ہی کی وجہ سے ملی۔

اب جبکہ وقت پلوں کے نیچے سے امی کی جوانی اور ہمارا بچپن پانی کی مانند بہا لے جاچکا تھا تو رشتے داروں کی ہمیں ضرورت نہیں رہی تھی' مگر وہ تھے کہ برسات کے کیڑوں کی طرح امڈے چلے آرہے تھے۔ میں اب کالج بوائے تھا۔ خوب صورتی میں امی پر گیا تھا اور کاٹھی میں نے ابو کی لی تھی۔ اپنی عمر سے بڑا دکھتا تھا۔ پھر اکلوتا بیٹا تھا' امی کے رکھ رکھاؤ اور سلیقے نے گھر میں خوش حالی پیدا کی تھی۔ ماموں اور چچا لوگوں کی طرف لڑکیوں کی کثیر تعداد تھی۔ سو ایسے میں ایک آدھ ادھر بھی کھپ جاتی تو اس کی قسمت سنور جاتی۔ لیکن میری اکڑنے اور رکھائی نے سب ہی کی خوش فہمیوں کو دھو ڈالا۔ امی اور سمعیہ کی بھی میں نے ایک حد مقرر کرڈالی کہ اس سے زیادہ کسی سے بھی میل ملاپ کی ضرورت نہیں۔ بس غمی اور خوشی کے موقع پر یاد رکھیں۔ نہ اپنے گھر میں زیادہ بلائیں اور نہ ان کے گھروں میں گھسیں۔۔۔ امی بے چاری مدت ہوئی مجھ سے بحث و تکرار کرنا بھول چکی تھیں۔ ان کے لیے میرا مشورہ ہمیشہ فیصلے کی حیثیت رکھتا تھا۔

میں تھرڈ ایر میں آیا تو میرے مضامین میں انگلش لٹریچر اور سائیکولوجی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس وقت تک میرے سامنے ایک سیدھا سادا راستہ تھا جس پہ چل کر کل کو مجھے ایک سیدھی سادی نوکری کرنا تھی یا پھر بہت ہوا تو لیکچرر شپ کے لیے اپلائی کرنا تھا۔ مگر کچھ عرصے سے جیسے میرے دماغ میں فتور سا آگیا تھا۔ مجھے شدت سے ادراک ہوا کہ میں کوئی معمولی شکل و صورت کا مالک عام سا شخص نہیں' بلکہ مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔ اس کا احساس کو کہ میرے تمام دوست مجھے کافی عرصے سے دلا رہے تھے۔ مگر تھرڈ ایر میں آنے کے بعد میری پرسنالٹی ایسے گرومڈ ہوئی تھی اور مجھ میں مزید نکھار آگیا تھا۔ میری ڈریسنگ اور میرا اسٹائل لڑکے کاپی کرنے لگے تھے۔

میرے یار دوست مجھے ٹی وی پہ آنے کے مشورے دینے لگے کہ میری شخصیت مکمل ہیرو کے سانچے میں ڈھلی تھی۔ لمبا قد' کسرتی جسم' چوڑے شانے' گورا

رنگ، سبز کانچ سی آنکھیں اور ہلکے سنہرے بال میری وجاہت میں کوئی کلام نہیں تھا اور اس احساس نے مجھ میں خود پسندی کا جذبہ ابھارا تھا۔ وہ بھی شدت کے ساتھ۔

میں جس کالج میں زیر تعلیم تھا وہ مخلوط تعلیمی ادارہ تھا۔ لڑکیاں میرے اردگرد بہانے بہانے سے منڈلاتی تھیں۔ مگر یہ اتفاق تھا یا میری تربیت کی دم توڑتی اصل۔ کہ شروع شروع میں مجھے امی کا اور گھر میں موجود چھوٹی بہن کا پاس تھا' مجھے غیرت سی آتی تھی کہ گھر میں بیوہ ماں اور جوان ہوتی بہن کی موجودگی میں' میں کالج کی لڑکیوں سے دوستی کی پینگیں بڑھاؤں۔ مگر اب آکر اس جذبے پہ خود پسندی کے جذبات حاوی ہو چکے تھے اور مجھے کوئی لڑکی بھاتی نہ تھی۔

یہ کیفیت دم توڑ گئی جب فرزانہ عرف جیری نے اپنی زلفوں کے دام میں مجھے الجھالیا۔ فرزانہ فرسٹ ایر سے ہی ہمارے کالج میں تھی' پر مجھ سے علیک سلیک ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ اس سے پہلے چہروں کی حد تک شناسائی ضرور تھی اور بس۔ پھر فرزانہ عرف جیری خود ہی میرے قریب ہوئی تھی اور میں بھی اسے نظرانداز نہیں کرسکا تھا۔ حالانکہ وہ کسی بھی طرح میرے فیملی بیک گراؤنڈ سے اور امی' سمیعہ کی طبیعت سے میچ نہیں کرتی تھی۔ مگر چونکہ خوب صورت اور بے باک تھی۔ لہٰذا مجھے قابو کرنے میں اسے چنداں مشکل نہیں ہوئی تھی۔ فرزانہ درحقیقت بناوٹ اور تصنع کا مرقع تھی۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور رکھ رکھاؤ نام کو نہیں تھا اس کی فیملی میں۔ مگر فرزانہ کی شخصیت اس کی نفی کرتی تھی۔ اس کی ڈریسنگ غضب کی تھی۔ (غضب کی چست بھی تھی) ہلکے اور نفاست سے کیے گئے میک اپ میں وہ بڑی دلکش دکھائی دیتی' پھنسل ہیل کے مستقل استعمال نے چال میں عجب لوچ پیدا کردیا تھا۔ اپنے حلقہ احباب میں جیری کے نام سے جانی جاتی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی کافی عرصے تک اس کے اصل نام کا علم نہیں ہوسکا تھا کہ اس کی عرفیت ہی ہر زبان زدعام تھی۔

ہم دونوں کی دوستی جب محبت کے سانچے میں ڈھلی تو مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ جیری کالج آتے ہوئے مکمل پردے میں ہوتی تھی اور کالج آتے ہی اس کی نقاب والی بڑی سی چادر کسی غلیظ اوڑھنی کی مانند اس کے جسم سے دور ہوجاتی تھی اور یہ روٹین اس کی سال اول سے جاری تھی اور یقیناً" خاصی شرمناک بھی تھی۔ مگر اس کی اس کجی یا خامی کا پتا مجھے اس کی محبت میں گردن گردن ڈوب جانے کے بعد چلا۔ "عشق" کہتا تھا کہ یہ جیری کی شخصیت کا توازن ہے جو اس کی سمجھ بوجھ سے قائم ہے۔ گھر والوں کے سامنے وہ ان ہی کی مرضی کے مطابق رہتی تھی اور کالج میں اپنے دل کے ارمان پورے کرتی تھی۔ عقل پر پتھر پڑنا اسی کو کہتے ہیں یقیناً" ورنہ اپنی ماں کا تصور کرتا تو ایسی لڑکی کی قربت کو ممنوع جانتا۔

اور پھر جیری نے میری زندگی کی گاڑی کو ایک الگ ہی ٹریک دے دیا۔ میرے دن رات اسی کی مرضی کے مطابق گزرنے لگے اور میرے مستقبل کا تعین بھی جیری نے ہی کیا۔ مجھے ٹی وی جوائن کرنا ہے۔ یہ اسی کا فیصلہ تھا۔ قسمت میں لکھا تھا سو راہیں ہموار ہوتی چلی گئیں۔ اس زمانے میں پی ٹی وی ہی تھا اور وہاں انٹری کا سہرا میرے ایک دوست کے سر جاتا ہے۔ مگر شاید میری دوستی سے زیادہ جیری کی اداؤں نے اسے متاثر کیا کہ وہ چند ہی دنوں میں مجھے اپنے بہنوئی کے پاس ملوانے لے گیا۔ جس کی چند نامی گرامی ڈرامہ رائٹرز اور ڈائریکٹرز سے ٹھیک ٹھاک واقفیت تھی۔ میرے دوست کے بہنوئی نے بھی تنگ دلی کا مظاہرہ نہ کیا' بلکہ ایک' دو دن میں ہی مجھے چند ایک سے ملوانے لے گیا۔ قسمت نے یاوری کی' ایک ڈرامے میں چانس مل گیا اور پھر جیسے ڈرامے اولوں کی طرح تڑاتڑ برسنے لگے۔ میری وجاہت اور خوب صورتی نے دھوم مچادی۔ لوگ میرا ڈرامہ دیکھنے کے لیے آٹھ بجنے کا انتظار کرنے لگے۔ پبلک پلیسز پہ میرے اردگرد رش لگنے لگا۔ خاص طور پر صنف نازک کا۔ یہ سب کوئی آٹھ پہر کا

عمل نہیں تھا۔ بلکہ مجھے شہرت اور مقام پانے میں سال لگ گیا۔

میرا کالج درمیان میں ہی رہ گیا۔ جیری کے مشورے سے میں نے بی اے کرکے پرچے پرائیویٹ دیے۔ جو اس تمام عرصے میں میرے تمام سیاہ و سفید کی مالک بن چکی تھی۔ ایک حصار تھا جس میں میں مقید تھا اور اس حصار میں، میں جیری کی مرضی کے مطابق لٹو بنا گھومتا رہتا تھا۔ ایسی ایسی شعلہ جوالہ تھیں جن کے ساتھ میں ڈرامے میں ہیرو بنا سین فلماتا تھا۔ مگر "کٹ" کے ساتھ ہی جیسے میں سب سے کٹ کر جیری سے جڑ جاتا تھا۔ کالج کے بعد جیری میرے شوٹ پر پہنچ جاتی اور پھر میرے ساتھ ہی اس کی واپسی ہوتی۔

میں نہیں جانتا کہ اس کے لیے وہ گھر والوں سے کیا بہانہ کرتی تھی۔ میرے پرانے دوستوں کی جگہ نئے چہروں نے لے لی تھی، جو سب کے سب بے حد ایڈوانس اور کم و بیش نودولتیے تھے۔ وہ تمام بھی جیری کی "صلاحیتوں" سے بے حد متاثر تھے۔ جیری نے اب مجھ پر شادی کے لیے بے تحاشا دباؤ ڈالنا شروع کردیا تھا اور مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر اصل مسئلہ امی کو منانا تھا۔

میں دو دنیاؤں کا باسی تھا۔ گھر سے باہر میرا مقام، حیثیت اور نام تھا، جبکہ گھر میں امی کے لیے میں وہی پرانا شکیل تھا۔ وہی شکیل جس پر میری ماں اپنی ہر خوشی اور مرضی وار دیتی تھی۔ وہی شکیل بھیا جس کی سمیعہ عقیدت مند تھی۔ وہی شکیل جس سے پوچھے بغیر میری امی راشن میں اضافی چیز تک نہیں منگواتی تھیں۔ مگر میرے ٹی وی پر آنے کے بعد اور مشہور ہونے کے بعد امی یک دم بدل گئی تھیں، جو میرے لیے خاصے اچنبھے کی بات تھی۔ اتنی درشتی اور سختی یکدم ان کے رویے میں آئی کہ میں شیطان کے بہکاوے میں آکر ان سے متنفر ہوتا چلا گیا۔ میری ٹی وی پہ آنے اور میرے نئے سیٹ اپ سے وہ بے حد ناخوش تھیں۔ ان کے نزدیک میں نے خاندانی ناموس کو کالک مل دی تھی۔ میری کمائی سے وہ ایک جھاڑو تک منگوانے کی روادار نہیں تھیں۔ ان کے لیے کرائے کی مد میں ملنے والی رقم ضرورت پوری کرنے کے لیے کافی تھی۔ جس سے وہ گھر کا نظام اور سمیعہ کے مستقبل کی بھی تیاری کررہی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ ہم اب ادھر سے شفٹ کر جائیں، مگر امی کسی صورت نہیں مانیں۔ گو کہ یہ اصرار جیری کی طرف سے تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ شادی کے بعد وہ کسی پوش ایریا میں رہے، جبکہ میرا گھر بے شک خوب صورت تھا مگر تھا محلے میں۔ جہاں رہنا اب مجھے بے حد دشوار لگتا کہ میری گاڑی ابھی نکڑ پر ہوتی اور محلے والے مکھیوں کی طرح میری گاڑی کو چمٹ جاتے، جس سے مجھے بے حد کوفت ہوتی۔

مگر امی کسی قیمت پر یہاں سے نکلنے کو تیار نہ تھیں اور جیری کسی قیمت پر یہاں آنے کو راضی نہ تھی۔ امی کو تو میرے جیری سے شادی کرنے پر بھی اعتراض تھا۔ ایک آدھ دفعہ میں امی سے ملوانے اسے لے کر آیا تو وہ انہیں ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ اس کا ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر نخوت سے بیٹھنا اور ہر ہر چیز کو ناقدانہ نظروں سے دیکھ کر بھرپور استحقاق سے رائے اور تنقید سے نوازنا امی اور سمیعہ دونوں کو بڑی بری طرح سے کھلا۔

میں چونکہ جیری کی عقل سے سوچتا تھا اور اسی کی زبان منہ میں فٹ کروا بیٹھا تھا، سو اس کے جانے کے بعد میں امی اور سمیعہ پر ہی الٹ پڑا اور اپنے سجے بنے گھر کے در و دیوار کی جڑوں تک میں سے کیڑے نکال باہر دھر دیے۔ وہ۔۔۔ وہ نقص فرفر سنائے جن سے میں خود بھی عین اسی لمحے واقف ہو رہا تھا۔ جب انہیں جتا رہا تھا۔ میں نے یکسر بھلا ڈالا کہ جیری کس گھرانے کی پروردہ ہے۔ ڈھائی مرلے کے تنگ اور گھٹے ہوئے بوسیدہ مکان میں، جس کی دونوں منزلوں پر اس کے تینوں بھائی اپنے بچوں کے ساتھ ٹھنسے پڑے تھے۔ ایسے گھر کے ایک چھوٹے سے لاؤنج میں فرشی بستر کرکے سونے والی جیری کو میرا ساڑھے دس مرلے کا مکان اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

جیری کے پاس میرا مکمل حساب کتاب رہتا تھا اور وہ

ڈیفنس میں ایک بہترین گھر منتخب کرچکی تھی۔ جہاں مجھے اور اسے شادی کے بعد رہنا تھا۔ پچھلے ایک ڈیڑھ سال میں' میرا جیری کے گھر آنا جانا بڑھ گیا تھا۔ میں اس کے گھر والوں کے مزاج سے بخوبی واقف ہوچکا تھا۔

عجب ہی چلن کے لوگ تھے اب سوچتا ہوں تو خود یہ حیرت ہوتی ہے کہ آخر میں اتنی دیر تک۔۔۔ کئی کئی گھنٹے ان لوگوں میں کیسے گزارتا تھا۔ میرے خاندان کا ہر فرد وقار اور تمکنت سے گندھا تھا۔ جبکہ یہاں صاحب خانہ یعنی جیری کے والد صاحب کو "کھڈے لائن" لگایا جاچکا تھا۔ کرتا دھرتا جیری کی والدہ تھیں اور رہا کیا دھرا اس کے بھائیوں کا ہوتا تھا۔ کمینہ پن ہر ہر انداز سے ہویدہ تھا۔ میں ہر چکر پر طرح طرح کے لوازمات ساتھ لے کر جاتا جن کو دیکھتے ہی جیری کے گھر کے بچے تو بچے۔۔۔ بڑے بھی جھپٹ سے پڑتے۔۔۔ میں اس انداز کو بھی ان کی قدردانی جانتا۔ میرے سامنے ہی فروٹ شاپرز سے نکل نکل کر نکل لیا جاتا اور چھلکے وہیں ارد گرد اچھال دیے جاتے۔ بچے کچھ پھل کھاتے اور بیشتر ضائع کرتے۔ اگر میں غلطی سے بھی بیکری سے کیک لے کر چلا جاتا تو اس کا ایسا المناک انجام ہوتا کہ اگر بیکری والے دیکھ لیتے تو یقیناً" مجھے آئندہ کے لیے اپنا کوئی بھی بیکری آئٹم دینے سے انکار کردیتے۔ کیک کو تپائی پر رکھ کر چھری منگوانے کی زحمت نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ جیری کا کوئی بھائی کرسی کھسکا کر آگے جھکتا اور وہ چابی جس سے چند لمحے پہلے وہ کان کی صفائی فرما رہا ہوتا تھا۔ اسی چابی سے اپنے لیے کیک پیس کاٹ کر گویا حملے کی دعوت دیتا۔ پھر تو جو جیسے بن پڑتا۔ کیک کے بخیے ادھیڑتا چلا جاتا۔

جیری ہنس ہنس کر ان کی حرکتوں کو سادگی اور سادہ لوحی سے تشبیہ دیے جاتی اور میں بھی اسی زور و شور سے تائید کیے جاتا۔

مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آیا کہ میرا جیری کے گھر یوں بے تکلفی سے آنا جانا اور کبھی کبھار جیری کا مجھے اپنے کمرے میں تسلی اور سکون سے بٹھا کر خاطریں کرنا۔۔۔ اور دوسری جانب جیری کا حجاب لے کر کالج آنا اور واپس جانا۔۔۔ مجھے کبھی سمجھ میں نہ آسکا تھا۔ آیا کسی قسم کے احساس کمتری کو اس لبادے میں چھپاتی تھی یا بیچ میں کوئی اور مقصد تھا۔۔۔ واللہ علم! مگر مجھے اس وقت یہ تمام خامیاں' خوبیوں کا پیکر دکھائی دیتیں۔

اپنی ماں اور بہن کا اگر رکھ رکھاؤ دیکھتا تو کبھی پلٹ کر جیری کو نہ دیکھ پاتا۔۔۔ مگر میں تو دیکھتا ہی جیری کو تھا۔ لہٰذا امی اور سمیعہ کیسے دکھتیں۔۔۔ میں نے بالا ہی بالا جیری کی ماں اور بھائیوں کے ساتھ شادی کی بات چیت کرلی تھی۔ امی نے یہاں میرا رشتہ کرنے سے یکسر انکار کردیا تھا' جبکہ میں اور جیری اب تاخیر نہیں چاہتے تھے۔

میں نے گھر میں علم بغاوت بلند کردیا' امی کو صاف صاف کہہ دیا کہ اگر وہ میری شادی میں شریک نہ ہوئیں تو میں ان سے مکمل قطع تعلق کرلوں گا۔ ماں تھیں' بھانپ گئیں کہ بیٹا ایسے دوراہے پہ جا کھڑا ہوا ہے جہاں سے پیچھے پلٹ کر کبھی نہیں دیکھے گا اور یہ سچ بھی تھا' میرا ایک راستہ جیری کی اور جاتا تھا تو دوسرا میرے کیریر کی۔۔۔ جس کے میں عروج پر تھا۔ زر اور زن کی خماری نے ماں اور بہن کو میرے ہر سیٹ اپ سے الگ کردیا تھا۔ اگر امی میری شادی میں شرکت نہ بھی کرتیں تو شاید مجھے فرق نہ پڑتا کہ میرا حلقہ احباب اس قدر وسیع اور لبل تھا کہ امی اور سمیعہ اس سرکل میں ان فٹ تھیں اور یہ کہنا جیری کا تھا۔۔۔ ایسا کہتے وہ اپنی ماں اور بھائی' بھابھیوں کے رکھ رکھاؤ کو بھول گئی تھی جو اطوار میں بڑے بڑے جاہلوں کو مات کرتے تھے۔

میری اور جیری کی شادی نہایت دھوم دھام سے بہت بڑے ہوٹل میں ہوئی۔ اپنے کسی پڑھے لکھے "جاہل" دوست کے مشورے پر میں نے اور جیری نے بارات اور ولیمے کا ریسپشن ایک ہی دن منعقد کیا۔ جس پر امی نے اعتراض بھی کیا کہ ولیمے کا مقصد بغیر رخصتی کے مکمل ہی نہیں ہوتا۔ خیر! مجھے ان شرعی مسائل سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ پتا نہیں میں نے امی کی یہ بات کس طرح مان لی تھی کہ شادی کے بعد میں جیری کو لے کر کچھ عرصے کے لیے پرانے گھر پر قیام

کروں، تاکہ وہ بھی اپنے کچھ ارمان پورے کر سکیں، حالانکہ ہمارا نیا گھر مکمل تیار اور فرنشڈ تھا۔ امی نے وہاں شفٹ ہونے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ ابو کے گھر کو کسی صورت چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ ایسا ہی حال سمیعہ کا بھی تھا۔ وہ دونوں تو میرا نیا بنگلہ دیکھنے بھی نہیں گئی تھیں۔ وہ گئیں نہیں تو میں نے اور جیری نے اصرار بھی نہیں کیا۔

ہم دونوں محض ایک ماہ ہی امی کے ساتھ رہے اور اس دوران انہوں نے اور سمیعہ نے جیری کے چاؤ ناز اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جیری کی نخوت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں تو خیر نئی نئی شادی کے خمار میں جتنا دن رات جیری کے قصیدے پڑھتا تھا۔ اس بات پر بھلا دھیان کیا دے پاتا کہ درحقیقت چھوٹے اور کمینے خاندان سے تعلق رکھنے والی جیری میرے گھر کا کتنا قیمتی سامان ٹھکانے لگا گئی۔ وہ بھی محض ایک ماہ میں' امی کو تو محسوس نہ ہوا کہ پیدا بھی تھا اور وہ ہر ہر کونے کی خبر رکھنے سے لاچار بھی تھیں۔ اگر سمیعہ نے محسوس کیا بھی تو اس میں جرات کی کمی تھی۔ ویسے بھی وہ بہت صلح جو اور کم گو لڑکی تھی۔ پڑھنے کے علاوہ وہ صرف امی کے ساتھ گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹاتی نظر آتی تھی اور بس۔۔۔

میں خود ہی اس نیچ حرکت سے تب واقف ہوا جب وقتاً "فوقتاً" جیری کے گھر لگنے والے چکروں میں مجھے اپنے ہی گھر کا سامان دکھائی دیا۔ ان میں بیڈ شیٹس' صوفے کے کشنوں کے کورز اور تو اور پردے بھی دکھائی دیے۔ اب یاد کروں تو ہنسی آتی ہے۔ اپنی عقل پر اور جیری کی ذہنیت پر۔

ایک دفعہ میں نے جیری کی ماں کو اپنی امی کی وہ کشمیری شال اوڑھے دیکھا جو ابو اپنی زندگی میں امی کے لیے اس وقت لائے تھے جب پہلی اور آخری دفعہ تایا کے ساتھ کاروباری غرض سے کشمیر گئے تھے۔ میرے سرسری سا پوچھنے پر جیری نے لہک لہک کر اپنے ابا اور بھائیوں کے کشمیر آنے جانے کے قصے سنائے تھے اور میرا دھیان بٹانا تو جیری کو خوب آتا تھا۔

ٹھیک ایک ماہ بعد میں اور جیری نئے گھر شفٹ ہو گئے تھے۔ امی کی ترسی ہوئی نگاہیں اور سمیعہ کی حیران آنکھیں بھی مجھے میرے ارادے سے باز نہیں رکھ سکیں۔ ہمارے جانے میں ابھی چند دن تھے جب ایک دن ناشتا کرنے کے دوران میں نے امی کو مخاطب کیا اور کہا۔

"اماں جی۔ چار دن بعد میں اور جیری نئے بنگلے میں شفٹ ہو رہے ہیں۔ آپ کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر آپ چلنے پر راضی ہی نہیں ہوئیں۔ اب میں مزید تاخیر نہیں کر سکتا' میرے کام کا بھی بے حد حرج ہو رہا ہے۔"

میں نے بات مکمل کرنے کے بعد اطمینان سے چائے کی چسکی لینی چاہی تو یک لفظی سرسراہٹ امی کے لبوں سے نکلتی میری سماعت تک پہنچی۔

"اماں جی۔۔۔"

میں چائے کا گھونٹ حلق میں اتار نہ سکا۔ ایک جھٹکا سا لگا تھا مجھے۔ میری نظریں امی کی نظروں سے ملیں تو عجیب سا دکھ ہلکورے لیتا محسوس ہوا۔ چند لمحے یوں ہی بیتے اور پھر امی نے حلق تر کر کے مجھے مخاطب کیا۔

"میں تیری "امی" ہوں شکیل! اماں جی تو مجھے غیر بلاتے ہیں۔ جیسے تو پرائی بڈھیوں کو بلاتا ہے۔ تیری بیوی کے لیے میں غیر ہوں۔ جب ہی اس نے مجھے اول روز سے امی نہیں کہا' بلکہ میرے اصرار کے باوجود اماں جی ہی کہا' پر تو تو نہ کہہ۔۔۔"

امی خاموشی سے اٹھیں اور پژمردہ سی چلتی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں ٹھنڈی ہوتی چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے بیٹھا رہ گیا۔ حیرت تھی کہ میں اس قدر جیری کے رنگ میں رنگا گیا تھا کہ محض پچیس دن میں' میں نے پچیس سالوں کا طرز تخاطب بدل ڈالا تھا۔ جیری نے پہلے دن سے امی کو اماں جی کہہ کر مخاطب کیا تھا اور میں نے بھی اس کو قطعاً" ٹوکا نہیں تھا' یہ جاننے کے باوجود کہ میری ماں کو امی کہلوائے جانا ہی پسند ہے۔ الٹا میں نے دیکھا دیکھی امی کی بجائے اماں جی کہتا

شروع کردیا۔ وہ بھی محض پچیس دن میں۔

میں نے امی سے معذرت تو نہ کی' نہ ہی ان کی دل آزاری پر پشیمانی کا اظہار کیا۔ بس آئندہ ہمیشہ امی ہی کہہ کر پکارا اور میری ماں اتنے ہی میں راضی ہوگئی۔ کمال نا... بے حد وضع دار خاتون تھیں۔ پھر ٹھیک پانچ دن بعد میں اپنی فیملی کے ساتھ نئے بنگلے میں شفٹ ہوچکا تھا۔ مگر میری فیملی میں میری امی اور بہن شامل نہیں تھیں' بلکہ آنے والے وقت میں جیری اور اس کے گھر والے ہی میری فیملی بننے والے تھے۔

☼ ☼ ☼

آنے والے چند سال میری زندگی کو مزید گمراہیوں کی نذر کرگئے۔ میری اور جیری کی زندگی میں ریکا آگئی۔ میری شوبز کی مصروفیات آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ کبھی کبھار بھولے بھٹکے امی کی طرف چکر لگالیتا اور بس۔ وہ بھی میرے گھر نہیں آئی تھیں۔ ریکا کی پیدائش پر بھی ہسپتال سے ہی واپس ہولیں۔ ویسے بھی میرے اور جیری سے متعلقہ معاملات کو جیری کی والدہ ہینڈل کرتی تھیں۔ میری بیٹی کی پیدائش پر بھی میری ماں کی جگہ جیری کی ماں اور گھر والے پیش پیش رہے تھے۔ امی نے کوئی بھی گلہ شکوہ کیے بغیر خاموشی سے جگہ خالی کردی تھی اور اسی خاموشی سے وہ گھلتی چلی جارہی تھیں۔

سمیعہ کی بات طے ہوچکی تھی خالہ کے بیٹے سے۔ میں نے اور جیری نے بڑی مشکل سے وقت نکال کر ایک مہمان کی سی حیثیت سے اس کی منگنی میں شرکت کی تھی۔ میں اب فارغ ہی کب ہوتا تھا۔ شوٹنگز سے جو وقت بچتا تو پارٹیز اور نائٹ کلبز کی نذر ہوجاتا۔ میری اور جیری کی راتیں ان ہی موج مستیوں میں بیت رہی تھیں۔ لطف تو یہ تھا کہ ریکا بھی ہمارے ساتھ ہوتی تھی۔ میں اور جیری ڈانسنگ فلور پر بے خودی سے تھرکتے رہتے اور ہماری بیٹی کیری کاٹ میں قریب ہی مزے سے فلڈ لائٹس انجوائے کرتی اور کبھی کبھار میوزک کے ہنگامے میں ہی نیند میں گم ہوجاتی۔

مرد' عورت کی تفریق کے بغیر ڈانسنگ فلور پر جھومنے والوں کے بچے اسی ماحول کے عادی ہوتے ہیں۔ میں اور جیری ایک دوسرے کے علاوہ بھی کپل بناتے تھے۔ کبھی وہ میرے کسی دوست کے ساتھ ڈانس کرتی۔ انجوائے کرتی تو کبھی میں نے اپنے کسی دوست کی بیوی کے ساتھ کپل بنایا ہوتا۔ یہ ایک الگ ہی رنگین دنیا تھی جس میں ہر طرف شیطان ناچتا تھا اور اردگرد اس کے چیلے۔ میں نے جیری کو کبھی بھی کسی دوسرے کی باہنوں میں تھرکنے سے نہیں ٹوکا تھا کہ مجھے اس میں کوئی مضائقہ ہی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ وقت کے ساتھ جیری کے لباس میں بے حجابی نمایاں نظر آنے لگی تھی اور اس طرح کی ڈریسنگ کو بڑھاوا بھی میں نے دیا تھا۔

پہلی دفعہ جب جیری سلیولیس اور بیک لیس بلاؤز پر ساڑھی زیب تن کرکے میرے سامنے آئی تو میں خوشی کے اظہار کے طور پر اسے گھمانے لے گیا۔ جہاں سے واپسی پر ہم بے شرموں کی طرح جیری کے میکے بھی گئے۔ جیری کی ماں' بھائیوں نے اس کے لباس پر اعتراض کیا کرنا تھا۔ وہ تو ہمارے طور اطوار سے مزید متاثر دکھائی دیے۔ بقول اس کے بڑے بھائی کے کہ "امیروں کی شان ان کے لباس سے ہی چھلکتی ہے۔"

واپسی پر جیری کے گھر کے گیٹ پر اس کے والد کو کھڑے پایا۔ جیری انہیں سلام کہنے کے بعد گاڑی میں جا بیٹھی' جبکہ مجھے انہوں نے پیچھے سے آواز دے کر صرف اتنا کہا۔

"بیٹا... میں نے کہیں پڑھا تھا کہ مرد کی غیرت اس کی بیوی کے پردے سے ظاہر ہوتی ہے۔"

اور یہ وہ چند الفاظ تھے جو میرے سسر نے اس تمام عرصے میں ادا کیے تھے' جب سے میں نے جیری کے گھر آنا شروع کیا تھا۔ میں قدرے بدمزا سا ہوکر بغیر کوئی جواب دیے سلام لے کر گاڑی میں آ بیٹھا۔

بھلا میری نظر میں ایک ایسے شخص کے قول اقوال کی کیا اہمیت ہوسکتی تھی جو خود اپنے گھر والوں کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ زندگی کا انجن ایک دفعہ

گمراہی کی پٹری پکڑ لے تو پیچھے گناہوں کے ڈبے جڑتے چلے جاتے ہیں۔ ایسی زندگی کہنے کو تو ہماری اپنی ہوتی ہے مگر گزارتا اسے شیطان ہے۔ میں نے بھی اپنی باگ ڈور اسی کے حوالے کردی تھی۔

☼ ☼ ☼

وقت اپنے ساتھ کئی سال بڑی تیزی سے گھسیٹ لے گیا۔ ریکا کے بعد میرے اور جیری کے دو بیٹے ہوئے لیکن ہماری حالت میں کوئی سدھار نہ آیا۔ آتا تو تب جب ہم نے کسی خرابی کو محسوس کیا ہوتا۔ میرے گھر کے ہر اندرونی اور بیرونی معاملات میں جیری کے گھر والے چھا چکے تھے۔ کئی کئی ماہ پر مشتمل ان کا قیام آخرکار آزار بنتا جارہا تھا اور اب میں جیری کے سامنے بھی کوفت زدہ ہونے سے رہ نہیں پاتا تھا۔ جس کا حل جیری نے مجھے بڑے طریقے سے بتایا کہ....

چونکہ اس کے گھر والے عرصہ عرصہ قیام کی وجہ سے ہمارے گھر کی آسائشات اور اونچے اسٹینڈرڈ کے عادی ہوچکے ہیں۔ لہٰذا اب وہ پرانے اور بوسیدہ مکان میں جانے اور بسنے سے کتراتے ہیں تو اس صورت میں ان سے جان چھڑانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم کوئی مناسب سا بنگلہ اچھی جگہ پر دیکھ کر ان لوگوں کو وہاں شفٹ کردیں۔ یوں ہماری بھی جان چھوٹ جائے گی اور ان سب کو بھی اچھی زندگی اور بہتر ماحول مل جائے گا۔ جیری کی ہر بات کو مقدم اور مکرم جاننے والا میں.... ہر دفعہ کی طرح اس بار بھی اس کی "سمجھ داری" کا قائل ہوگیا۔ یہ جانے بغیر کہ کس ہوشیاری اور چالاکی سے جیری نے میرے لاکھوں لگوا کر نیا نکور بنگلہ اپنے بھائیوں کے نام لکھوا دیا۔ میں جو بھی سو روپے کا پھل لے کر امی کی طرف چلا جاتا تو وہ اس شاپر کو میرے سامنے ہی کام والی کے حوالے کردیتیں کہ میری کمائی سے انہیں ایک روپیہ بھی گھر میں لگانا گوارہ نہ تھا۔

میری ریکا چودہ برس کی تھی جب امی کا انتقال ہوگیا۔ سمیعہ کی شادی ہوچکی تھی اور وہ اپنے گھر میں بے حد خوش تھی۔ اپنے انتقال سے چند سال پہلے مجھے بتا کر امی نے ابو کا یہ مکان جہاں وہ آخری دم تک رہیں، اسے سمیعہ کے نام کردیا تھا۔ بقایا تمام جائیداد انہوں نے میرے نام کردی تھی۔ حالانکہ "شرعاً" وہاں بھی سمیعہ کا حق نکلتا تھا کیونکہ اس تمام جائیداد کی مالیت کروڑوں میں تھی۔ مگر سمیعہ نے محض ایک مکان لیا تھا۔ بقایا تمام جائیداد سے وہ راضی و خوشی دستبردار ہوگئی تھی۔

سمیعہ نے آخری دم تک امی کی بے حد خدمت کی تھی اور اس میں اسے اپنے شوہر کا بھی بھرپور تعاون حاصل تھا۔ نعیم صحیح معنوں میں امی کا بیٹا ثابت ہوا۔ جو فرائض میرے نبھانے کے تھے وہ داماد ہونے کے باوجود نعیم نے ادا کیے۔ اس دور میں تو میرے پاس پشیمان ہونے کا وقت نہیں تھا۔ میرے اور جیری کے وہی دن اور رات تھے۔ میرے دونوں بیٹے ملازماؤں کے ہاتھوں پلے تھے۔ دینی تربیت تو سرے سے ہو نہ سکی تھی اور دنیا برباد کرنے میں گھر کے ماحول نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ شرمناک حقیقت تو یہ تھی کہ اگر تب میرے بیٹوں سے کوئی کہتا کہ پہلا کلمہ سناؤ تو وہ جواباً" کندھے اچکاتے کہتے "فارگیٹ اٹ" اور جیری ان کے ایسے رد عمل پر شوخی سے بھنویں اچکا دیتی۔

میرے دونوں بیٹوں کو اگر دین کی بنیادی معلومات ملیں تو اس کی وجہ میری بیٹی ریکا تھی۔ یہ بھی میری امی کی دعائیں تھیں جو وہ مرتے دم تک میری بھلائی اور راہ راست پر آنے کے لیے اللہ کے حضور گریہ و زاری کرتی رہی تھیں۔ محض ایک اتفاق کے نتیجے میں میری بیٹی ریکا نے اپنی دادی کے پاس سات سال گزارے تھے اور یہ سات سال میری بچی کا بچپن بدل گئے تھے۔

ریکا جب چھ سال کی تھی تو میرے گھر جڑواں بیٹے ہوئے تھے۔ ان کی پیدائش نے جیری کو خاصا بیمار کردیا تھا۔ بچے تو آیا نے ہی پالے۔ مگر جیری خود کچھ پیچیدگیوں کا شکار ہو کر آئے دن پڑی رہتی تھی۔ ایسے میں ریکا۔ بری طرح نظر انداز ہو رہی تھی۔ میں تو وقت

بے وقت مصروف رہتا تھا۔ تو ریکا کبھی سرونٹ کوارٹرز کی سائیڈ نکل لیتی اور وہاں ان کے بچوں کے ساتھ کھیلتی پائی جاتی۔ اسکولنگ اس کی ڈسٹرب ہو کر رہ گئی تھی۔ پہلے تو جیری نے ارادہ ظاہر کیا کہ ریکا کو اس کی نانی کے گھر کچھ عرصہ کے لیے چھوڑ دیا جائے، مگر پھر مجھے بے حد حیرت ہوئی کہ اس نے خود ہی ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

میں جانتا تھا کہ وہ ذاتی طور پر بھی اپنے میکے کے رکھ رکھاؤ اور ماحول سے قطعاً" مطمئن نہیں تھی۔ مگر میں نے یہ کہہ کر اسے جتایا نہیں۔ چند دن ہی گزرے ہوں گے کہ جیری نے ریکا کا سامان پیک کر کے میرے حوالے کیا اور یہ فیصلہ سنایا کہ اب سے آئندہ کچھ عرصے کے لیے ریکا اپنی دادی کے پاس رہے گی۔ جب تک کہ وہ خود دوبارہ سے گھر کا انتظام سنبھالنے کے قابل نہیں ہو جاتی۔ مدت ہوگی امی کے حوالے سے میرے جذبات و احساسات سرد ہو چکے تھے، پر اس وقت مجھے گوناگوں خوشی کا احساس ہوا تھا۔ جس کا اظہار کرنے سے میں نے پرہیز کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مبادا جیری چڑ نہ جائے۔

ریکا تقریباً" اگلے سات سال تک امی کے پاس رہی اور تیرہ برس کی عمر میں وہ واپس اپنے گھر لوٹی تھی۔ جیری اس کی جانب سے ایسی بے فکر ہوئی تھی کہ مکمل تندرست ہونے کے بعد بھی اس نے مجھ سے ریکا کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میری بیٹی اس عرصے میں ہمارے پاس نہیں آئی تھی، مگر وہ آتی بھی تو خالی ڈھنڈار بنگلہ اس کا منہ چڑا رہا ہوتا کیونکہ میں اور جیری پھر سے پرانی ڈھب پہ آچکے تھے۔ وہی پارٹیز، گیدرنگز اور نائٹ کلبز، ہم دونوں فطرتاً" لاپروا اور ان ڈور آؤٹ ڈور گیمز میں مگن رہتے تھے۔ ویسے بھی دونوں کو ساڑھے تین سال کی عمر میں کانونٹ میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ سو بورڈنگ میں ہونے کی وجہ سے گھر سے تعلق سرسری سا ہی رہ گیا تھا۔ ایسے میں ریکا آتی بھی تو دوسرے دن ہی بور ہو کر واپس ہو لیتی۔ اگر جو کبھی جیری اس عرصے میں ریکا کو تھوڑا وقت دے لیتی تو حتمی طور پر اس کی واپسی منسوخ ہو جاتی، کیونکہ ریکا کے رنگ ڈھنگ میں واضح تبدیلی آچکی تھی۔ امی کی محبت اور تربیت نے اپنا خاطر خواہ رنگ دکھایا تھا۔ اس کی بول چال، اٹھنے بیٹھنے، لباس غرض ہر چیز سے ایک جھجک اور حیا کا تاثر ملتا تھا۔ اسی عرصے میں امی نے اسے قرآن سکھایا۔ نماز اور اس کے مسائل میں طاق کیا۔ چھ کلمے، چھوٹی چھوٹی سورتیں اور دعائیں ریکا کو ازبر تھیں۔

جیری کو تو ہوش نہ تھا، مگر میرا پورا دھیان ان دنوں ریکا کی طرف تھا۔ وہ جب بھی ہم سے ملنے آتی تو میری پوری کوشش ہوتی کہ جیری کا سامنا اس سے کم سے کم ہو۔ میں دانستہ ریکا کو اپنے ساتھ مصروف رکھتا اور ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی اگر یہ ممکن ہو سکا تو محض اس لیے کہ جیری کی صبح بارہ ایک سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ نیند سے بیدار ہونے کے بعد وہ پھر سے روز مرہ کے معمولات میں مگن ہو جاتی۔ ایسے میں چوبیس گھنٹے میں اگر چند منٹ وہ ریکا کے لیے نکال بھی پاتی تو بھی اس کی سطحی نگاہیں بیٹی میں آنے والا بدلاؤ محسوس نہ کر سکیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ قدرت کی طرف سے جیری کی آنکھوں پر پڑنے والا ایسا پردہ تھا جس کی آڑ میں میری بیٹی کی ذات کی کئی کمیاں اور جھول ڈھکتے چلے گئے۔

امی نے میری بیٹی کی شخصیت کی بنیاد نئے سرے سے تعمیر کی تھی اور میں جو ابھی بھی جیری کی ہمراہی میں مست و بے خود زندگی کی رنگینیاں کشید کرتا تھا، یہ واحد بات تھی جو مجھے اندر تک شاد اور مطمئن کیے رکھتی تھی۔ امی کے پاس ریکا کو جس بھی مقصد کے لیے بھیجا گیا ہو، مگر اب میں کسی صورت اس کی اس ماحول میں واپسی نہیں چاہتا تھا۔ کیسا عجیب سا توازن تھا۔ غیرت و حیا کا میرے اندر ایک طرف تو میں جیری کو بے باک اور نیم برہنہ لباس میں لیے لیے پھرتا تھا۔ میرے یار دوست میرے منہ پر جیری کی اداؤں کی تعریف کرتے، جنہیں میں تمغے کی مانند سینے پہ سجاتا اور دوسری طرف بیٹی کے معاملے میں نہ جانے میرے جذبات و

احساسات بدل کر کیوں رہ جاتے تھے۔ میرے اندر کا مرد مجھے اپنی ریکا کو ان آلائشوں سے دور رکھنے پہ اکساتا تھا جن میں 'میں' اور جیری مبتلا تھے۔ عجیب ہی دہرا معیار تھا میرا بھی۔

امی کی وفات کے ساتھ ہی ایک ان دیکھا حفاظتی حصار جو ریکا کو محفوظ کیے ہوئے تھے۔ یک دم معدوم ہو گیا۔ تیرہ سالہ ریکا کراتی اور دادی کو یاد کرتی واپس لوٹ آئی۔ امی کی موت نے چند دن تک مجھے بھی شدید ڈپریشن میں مبتلا کیے رکھا۔ میں اور ریکا گھنٹوں اکٹھے بیٹھے امی کی باتیں کیے جاتے اور ہم دونوں کی آنکھیں بھی رہتیں۔ چند دن جیری نے ہمیں ہمارے حال پہ چھوڑے رکھا' پر آخر کار اس کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے واویلا کرنے کی بجائے بڑے طریقے سے مجھے دوبارہ سے اسی لائف اسٹائل میں دھکیل دیا۔ جس سے چند دن کے لیے ہی سہی کمزور ہو گیا تھا اور کوئی شک نہیں کہ ان دنوں میں بڑی آسودگی اور اطمینان محسوس کرتا تھا۔

مجھے "نارمل" کرنے کے بعد جیری نے ریکا پہ دھیان دیا اور تب ہی اس پہ ادراک ہوا کہ ریکا اس حد تک بدل چکی تھی کہ وہ اس ماحول میں مکمل ان فٹ محسوس ہوتی۔ وہ کہیں سے بھی نہیں لگتی تھی کہ جیری جیسی طرح دار عورت کی بیٹی ہے جو ہر محفل کی جان ہوا کرتی ہے اور جس کے اسٹائلز کو پورے سرکل میں کاپی کیا جاتا ہے۔ تاسف اور صدمے سے اس کا چھوٹا سا منہ کھلا کر رہ گیا۔ اس کے خیال میں جیسے ریکا کی زندگی برباد ہو کر رہ گئی تھی اور وہ سر سے پیر تک گنوار بن کر لوٹی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے جیری آہیں بھرتی یہی فقرہ دہراتی رہتی۔

"آپ نے اچھا نہیں کیا اماں جی!" اور میری مرحومہ ماں کو "ایصال ثواب" کرتی رہتی۔ ہتھیلیاں مسل کر باقاعدہ افسوس کا اظہار کرتی کہ وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جس میں اس نے ریکا کو اماں جی کی سرپرستی میں سونپا تھا اور ایسا کرکے وہ خود کتنی گنوار دکھتی تھی یہ میں اسے جتا نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ میرا تو سب کچھ ہی جیری کے پاس جیسے گروی رکھا تھا۔ حتیٰ کہ سوچیں بھی۔۔۔

مجھ میں ہی تو وہ دم خم نہ تھا۔ جب ہی تو محض اگلے چھ ماہ میں جیری نے اپنی دانست میں کمال کر دکھایا۔ وہ ریکا کو مکمل طور پر نہ سہی لیکن اتنا بدلنے میں کامیاب ضرور ہو گئی کہ دونوں ساتھ کھڑی ماں بیٹی لگتیں۔ ریکا کا لباس ماڈرن ہو گیا۔ بال جو کمر سے نیچے آتے تھے کٹ کر کندھوں پر جھولنے لگے۔ دھیرے دھیرے وہ ماں کے ساتھ پارٹیز میں جانے لگی اور پھر کب وہ پوری کی پوری جیری کے رنگ میں رنگی گئی۔ معلوم بھی نہ ہو سکا۔ امی کی تربیت و ریاضت بال کھولے بین ڈالتی رہ گئی۔ میں نے بتایا نا۔ کہ میرے دونوں بیٹے اگرچہ پہلے اور دوسرے گلے سے دیگر چھوٹی موٹی دعاؤں سے واقف ہوئے تو ریکا کی بدولت یہ ان ہی چھ ماہ میں ممکن ہو سکا تھا۔ جبکہ ریکا ابھی جیری کے ٹرانس میں نہیں آئی تھی۔ ان چھ مہینوں میں دونوں چھٹیوں میں گھر آئے تھے اور ریکا نے بوریت سے بچنے کے لیے ان کے قریب ہونے کی شعوری کوشش کی تھی۔

اب یہ اتفاق تھا یا بہن کی خود سے چھ سال کی بڑائی کا احساس۔ کہ دونوں بھائیوں نے اس کا نہ صرف لحاظ کیا بلکہ جتنے دن بھی وہ گھر پر موجود رہے' مکمل طور پر ریکا کے بتائے ٹائم ٹیبل کو فالو کرتے رہے۔ ریکا نے بھی موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور انہیں کم از کم ایک آدھ کلمے اور آدھی پونی نماز سکھادی اور پھر ان دونوں کی واپسی کے بعد خود ریکا بدل گئی۔ میری بچی اپنی ماں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن گئی۔ جس آخرت کو بچانے کے لیے میری ماں نے اپنی نیندیں اور چین کی قربانی دے کر میری بیٹی کے کردار کی نوک پلک سنوار دی تھی۔ اب وہی آخرت جیری کے ہاتھوں داؤ پر لگ چکی تھی۔ ریکا جو میرا سامنا ہونے پر "فوراً" سر ڈھک لیتی تھی۔ اب مجھے پورے گھر میں جینز اور ٹاپ میں بے دھڑک منڈلاتی نظر آتی تو خوف سے جھرجھری سی لے کر رہ جاتا۔

رخش وقت کے سموں سے اٹھنے والی دھول نے

بہت کچھ درمیان میں دھندلا ڈالا کہ محسوس ہوتا جیسے زندگی ہمیں بری طرح روند کر گزر گئی۔ حسرتیں جوں کی توں رہ گئیں۔ گزشتہ کئی سالوں میں بارہا میں نے ارادہ کیا کہ اپنے گھر کا ماحول بدلنے کے لیے سخت اسٹینڈ لوں۔ جیری کو اور بچوں کو ایسے ڈھب پر لے آؤں کہ گھر گھر لگنے لگے۔ مگر میرے ارادے ہر بار ریت کا ایسا گھروندا ثابت ہوتے جنہیں مسمار کرنے کے لیے محض بے عملی کی ایک موج کی ہی ضرورت ہوتی ہے اور پھر ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا۔

آگے سے آگے جانے کے چکر میں آج میں شوبز کا نامی گرامی انسان ضرور تھا۔ مگر خلا یہ بن تھا کہ بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ اپنی ذاتی اور گھریلو زندگی مجھے بے راہ روی سے عبارت لگتی تھی۔ جہاں اخلاقیات اور شرم و حیا کا کوئی گزر نہ ہو۔ میں اب پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کی صف میں کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ میری ایجنسی بھی بڑی کامیاب جا رہی تھی۔ میں ایسے ایسے شاہکار ڈرامے پروڈیوس کرتا جو معاشرتی ناہمواریوں اور پوشیدہ برائیوں کی بھرپور عکاسی کرتے اور جب اکیلا بیٹھا غور و فکر کرتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے اپنا ہی پیٹ ننگا کر رہا ہوں۔ یوں جیسے ڈرامے میں در حقیقت میرے گھر کے حالات کو پورٹرے کیا گیا ہو۔

میرے دونوں بیٹے اعلا تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ہائی اسٹینڈنس میں موو کرتے تھے۔ لہٰذا اس سطح کی ہر برائی ان میں موجود تھی۔ ڈرنک بھی کرتے تھے، لڑکیوں سے بھی دوستیاں تھیں اور بھی دیگر خرافات میں پیش پیش تھے۔ پشت پہ جیری کی شاباشی اور حوصلہ افزائی تھی۔ ریکا کی شادی کی عمر ہو چکی تھی اور میں فکرمند بھی تھا۔ مگر جیری نے یہ معاملہ یکسر اس کی اپنی پسند پر چھوڑ رکھا تھا اور پھر میں نے محسوس کیا کہ تمام تر کوششوں کے باوجود بھی ریکا کو جیری اس ماحول کی غلاظتوں میں لتھیڑ نہیں پائی تھی۔ جس میں خود اس کا پور پور ڈوبا تھا۔ شروع شروع میں ریکا نے پارٹیز بھی اٹینڈ کیں۔ کمس گیدرنگز کو بھی انجوائے کیا اور کبھی کبھار جیری کے ہمراہ نائٹ کلبز کے بھی مزے لوٹے،

مگر جلد ہی وہ جیسے اکتا سی گئی۔ اس کی ذات عجیب سی کشمکش کا شکار دکھائی دیتی۔ نہ وہ پہلی روش پر قرار رکھ پائی اور نہ ہی دوسری پر چلنے کے لیے پوری طرح آمادہ دکھائی دیتی تھی۔ گو کہ لباس اس نے ہمیشہ وہی پہنا جو جیری نے اس کے لیے منتخب کیا۔ مگر کبھی کبھار ایک دورے کی سی کیفیت ریکا پر طاری ہو جاتی۔ جس میں مبتلا وہ راتوں کو لان میں کتنی کتنی دیر تک ٹہلتی رہتی، جینز اور ٹاپ میں ہی لمبی لمبی نمازیں پڑھتی، قرآن پاک لے کر بیٹھتی تو پڑھتی کم۔ بس روئے چلی جاتی۔

مجھے اس پر ترس آتا تھا کہ اپنے ماں، باپ کی کوتاہیوں اور غلطیوں کا خمیازہ اس اکیلی جان کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ اس کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ ایک ایسے دوراہے پر آ کھڑی ہوئی تھی جہاں سے اسے درست سمت کا تعین کر کے دینے والا کوئی نہیں تھا اور اس فیز سے بھی اس نے اپنے آپ کو خود ہی نکالا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی طبیعت ٹھہری گئی۔ پڑھائی میں مگن ہو کر اس نے دیگر تمام ایکٹیویٹیز سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مگر جیری اس کی ماں تھی اور اس کے شکنجے سے نکلنا ریکا کے لیے اتنا آسان بھی نہ تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ریکا کو اپنی تفریحات میں الجھائے ضرور رکھتی تھی۔ پر اس سب کے باوجود ریکا نے بڑی حد تک اپنی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ جی چاہتا تو جیری کے کہے پر عمل کر لیتی، نہ من کرتا تو کسی کی بھی نہ سنتی۔ ذہنی اور جذباتی طور پر وہ ہم سب سے بہت دور جا چکی تھی یا شاید مجھے محسوس ہوتی تھی۔

اپنی شادی کے لیے لڑکا ریکا نے خود ہی پسند کیا۔ میں اور جیری اس سے ملے تو ہمیں بھی بے حد پسند آیا۔ ریکا کی کلوز فرینڈ کا کزن تھا۔ ہاشم اور اس کی فیملی جب پہلی مرتبہ ہمارے گھر آئی تو مجھے بے حد خوش گوار سی حیرت ہوئی کہ بے حد ویل آف ہونے کے باوجود بھی ہاشم کی ماں اور بہنوں کا رکھ رکھاؤ بے حد سادہ اور بناوٹ سے پاک تھا۔ خوب صورت اور نفیس مشرقی لباس میں وہ ہمارے ڈرائنگ روم میں موجود تھیں۔

جبکہ جیری اور خود ریکا مغربی لباس میں بیٹھیں مجھے اوپری اوپری سی لگیں۔ جیری کو بھرپور اعتراض تھا۔ ان ماں بیٹیوں پر' مگر وہ محض ہاشم کو دیکھ کر خاموش رہ گئی تھی۔ جو نا صرف مغربی انداز و اطوار کا مالک تھا' بلکہ ضرورت سے زیادہ آزاد خیال محسوس ہوتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ پانچ سال یو۔ایس میں گزار کر آیا تھا۔ جو بھی تھا میں ریکا کی خوشی میں خوش تھا اور جیری تو پہلے ہی ریکا کو اس بات کی اجازت دے چکی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے جیون ساتھی کا انتخاب کرے۔ لہٰذا اب یہ اعتراض کی مجاز نہیں تھی۔ ویسے بھی بظاہر ہاشم کی فیملی میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں تھی' بلکہ معاشی اعتبار سے وہ لوگ ہم سے دو ہاتھ آگے ہی تھے۔

ہاشم کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور وسیع پیمانے پہ پھیلے کاروبار کو ہاشم ہی سنبھال رہا تھا۔ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ جن میں سے دو شادی شدہ تھیں اور دو اس سے چھوٹی تھیں اور کالج کی اسٹوڈنٹ تھیں۔ اسی بات پر جیری کی سخت طبیعت ابال کھاتی تھی۔ وہ ریکا کا بالکل الگ سیٹ اپ چاہتی تھی جہاں ساس' نندوں کا کھڑاک نہ ہو اور اس بات کے لیے وہ اسے مسلسل اکسائے بھی رکھتی کہ ہاشم سے بات کرکے اپنے لیے علیحدہ گھر کی ڈیمانڈ کرے۔ مگر ریکا نے ایسا قطعاً" نہیں کیا۔ بلکہ وہ اپنی ساس اور نندوں کے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کرتی۔ ان کا بے حد لحاظ کرتی اور یہی بات جیری کا رواں رواں سلگائے رکھتی۔

جوں جوں شادی کے دن قریب آرہے تھے۔ ریکا کا چہرہ مزید کھلتا جارہا تھا۔ وہ مجھے بے حد خوش دکھائی دیتی۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ وہ ہاشم کے ساتھ آؤٹنگ پر جانے میں اتنی خوش نہیں ہوتی تھی' جتنی وہ اپنی ساس یا نندوں کی ہمراہی میں ایکسائٹڈ دکھائی دیتی۔ اس کے لباس میں ایک دفعہ پھر نمایاں تبدیلی آنی شروع ہوگئی تھی۔ اس نے بڑے اسٹائلش اور جدید تراش خراش کے مشرقی ملبوسات زیب تن کرنے شروع کردیے تھے۔ خاص طور پر جب وہ اپنے سسرال والوں کے ساتھ کہیں جاتی تو کبھی بھی جینز وغیرہ نہیں پہنتی تھی۔

شادی کی تیاریاں دونوں جانب زوروں پر تھیں۔ جیری نے شروع میں تو خاصا ناک بھوں چڑھایا تھا۔ پھر شان دار بری اور بیش قیمت زیورات جو وقتاً" فوقتاً" ریکا کی ساس اور نندیں اسے پسند کروانے کے لیے لاتی تھیں انہیں دیکھ کر جیری کی ساری کلفت دور ہوچکی تھی۔ ریکا کی ساری بری اس کی پسند اور شوق کو مدنظر رکھ کر تیار کی جارہی تھی۔ جیری کے ذریعے یہ پتا ضرور لگا تھا کہ شادی کے تمام دن کی تقریبات میں پہنے جانے والے ملبوسات ہاشم کی پسند کے تھے۔ جو یقیناً" ماڈرن اور بے باک ہی ہوسکتے تھے۔ مگر ظاہر ہے ہمارے ماحول میں قطعاً" معیوب نہیں تھے۔

جیری بے شک ہاشم کی ماں' بہنوں سے خوش نہ ہو' پر وہ ہاشم سے بے حد راضی تھی کہ اس کے خیالات و افکار اپنے گھر والوں سے بے شک مختلف' مگر جیری اور میرے بیٹوں کے خیالات سے مماثلت رکھتے تھے۔ کیسا عجب دور ہے۔ شرم حیا اور غیرت کو داؤ پر چڑھانے والے لوگ یہ دعوا کرتے ہیں کہ اخلاقیات صرف اسی طبقے کی میراث ہیں جو درحقیقت اس سے قطعی نابلد ہیں۔

✡ ✡ ✡

سنگیت کی تقریب زوروں پر تھی۔ ہائی کلاس سوسائٹی میں یہ عجیب رواج چل نکلا ہے۔ سنگیت کے نام پر جو خرافات اس تقریب کا خاصہ ہوتی ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا۔ بے ہنگم ناچ کود' ایک دوسرے سے ٹکراتے جوان بچے اور بچیاں۔ جو عام حالات میں ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ ہوں۔ مگر اس وقت ٹاپ کی کیمسٹری کری ایٹ کیے دوریاں پاٹتے نظر آتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ حال اس وقت ریکا کے سنگیت فنکشن کا تھا۔ ابتدا بڑے سہل انداز میں کی گئی' پھر دھیرے دھیرے سب جامے سے باہر ہوتے چلے گئے۔ شوبز کی پریاں اور بھنوروں کی ایک کثیر تعداد جیری نے

انوائیٹ کر رکھی تھی جن میں سے اکثریت ایسے موقعوں پر ہر لحاظ کو اپنے جوتے کی نوک سے مسل کر رکھ دیتی ہے۔ میرے پیشے سے منسلک میرے یار دوستوں نے مجھے بھی اس ہنگامے میں گھسیٹنے کی بہتری کوشش کی مگر میں طبیعت کی گرانی کا بہانہ کیے ایک اندھیرے گوشے میں بیٹھا خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میری سانسوں کو یہ ماحول بوجھل کیے دے رہا تھا۔ حالانکہ میں اس سب کا عادی تھا۔ مجھے رشک آ رہا تھا۔ ہاشم کی ان بہنوں پر جو ہمارے بے حد اصرار پر بھی اس فنکشن میں شریک نہیں ہوئی تھیں اور بڑے سبھاؤ سے معذرت کر لی تھی۔ محض ہاشم اپنے چند کزنز اور ڈھیروں دوستوں کی پلٹن کے ساتھ آیا تھا اور بے حد انجوائے کر رہا تھا۔ جبکہ میری فیملی.... آہ! میری نظریں مسلسل جیری کا طواف کر رہی تھیں۔ جو سلیولیس اور مہین سی خوب صورت اور بے حد قیمتی ساڑھی میں "چار" مردوں اور دو عورتوں کے نرغے میں مست و بے خود تھرک رہی تھی۔ آج اس کا سنگھار لڑکیوں کو مات کر رہا تھا۔ وہ لڑکی کی ماں کم اور فنکشن میں انوائیٹڈ ماڈل گرل زیادہ لگ رہی تھی۔

ایک وقت تھا کہ میں خود جیری کو لیے مختلف ڈانس اسٹیپس بڑی مہارت سے ادا کرتا تھا اور آج میرا جی کر رہا تھا کہ جیری کو اسی حال میں تیل چھڑک کر آگ لگا دوں۔ اس کا خوب صورت چہرہ اور جسم جھلس کر بے ہنگم لٹکے ہوئے بدبودار لوتھڑے میں تبدیل ہو جائے۔ میں ساری عمر بغیر ماتھے پر شکن لائے ہنس کر اس کے بدصورت چہرے کے ساتھ گزارہ کر لوں گا۔ مگر اب موجودہ جیری کو سہارنا میرے لیے بے حد مشکل امر تھا۔

میں نے ایک نظر اپنے دونوں بیٹوں پر بھی ڈالی تو بے بسی سے سر جھٹک کر رہ گیا۔ ہاتھوں میں گلاس تھامے وہ دونوں بھی نہ جانے کن "غیرت مندوں" کی بیٹیوں کے ساتھ سر سے سر جوڑے ہولے ہولے جھوم رہے تھے۔ نہ باپ کا پاس اور نہ بہن کی حیا۔ کیا کروں میں ایسا کہ یہ سب بدل جائیں۔ بالکل ویسے بن جائیں جیسے امی کے سمعہ اور شکیل تھے یا جیسے.... جیسے.... نہیں.... سمعہ اور شکیل ہی سب سے اچھے تھے۔ کیونکہ میری امی کی تربیت بے حد خالص تھی۔ مگر جیری کا گندا ساتھ امی کی اجلی تربیت کو نگل گیا۔ بالکل ایسے جیسے جیری کی گندی تربیت میرے بچوں کی شخصیت کی معصومیت کو کسی عفریت کی طرح نگلتی جا رہی ہے۔

میں ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ یکدم میری نظر اسٹیج پر بیٹھی ریکا کی نظروں سے ملیں۔ وہ یک ٹک مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں کا تاثر بڑا ناقابل فہم تھا۔ افسوس 'گلہ یا ملامت.... کیا تھا.... میں سمجھ نہیں پایا' بس ہولے سے مسکرا دیا۔ پتا نہیں نیم اندھیرے کی وجہ سے اسے میری مسکراہٹ نظر آئی یا نہیں۔ چند لمحے یوں ہی بیت گئے' پھر جیسے ایک قنوطی کیفیت میں وہ اٹھی اور ہاشم کا ہاتھ پکڑ کر اسے لیے اسٹیج سے اتر آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بھی ہاشم کے ہمراہ ڈانس کرنا شروع کر دیا۔ دولہا اور دلہن کو اپنے بیچ دیکھ کر مہمانوں کا جوش و خروش دوچند ہو گیا۔ سب جیسے پارے کی مانند تھرکنے لگے۔

میں غائب دماغی سے ریکا اور ہاشم کو قدم سے قدم ملاتے دیکھنے لگا۔ وہ دونوں بے حد خوش اور ایک دوسرے میں مگن تھے۔ پھر بھی ایک انتہائی گہری نظر ریکا میرے چہرے پر ڈالتی اور نگاہیں پھیر لیتی۔ اسی اثنا میں ہاشم کے چند دوستوں نے دونوں کو گھیرے میں لیا اور پھر ایک نے بے تکلفی دکھاتے ہوئے چند قدم آگے بڑھ کر ریکا کے ہاتھ تھام لیے۔ ہاشم اپنی جھونک میں جھومے جا رہا تھا۔ اسے محسوس بھی نہ ہو سکا اور وہ کیوں کرتا....

ہمارے ہاں کون سا یہ کچھ انوکھا تھا۔ پر میرے اعصاب میں یکدم کھچاؤ سا پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں سرد نظروں سے ریکا اور ہاشم کے دوست کو تکے جا رہا تھا جو اپنی پرشوق گھٹیا نظریں ریکا پر مرکوز کیے اسے نزاکت سے تھامے گول گھمائے جا رہا تھا۔ پھر

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا اور ریکا کا درمیانی فاصلہ مٹانا چاہا۔ مگر ریکا کے مضبوط قدموں نے ایسا ممکن نہیں ہونے دیا۔ اگر وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ پاتی تو لازمی اس کے سینے سے ٹکرا جاتی۔ ناگواری کی ایک ہلکی سی رمق مجھے ریکا کے چہرے کو دھندلاتی محسوس ہوئی۔ جبکہ مجھے اپنے جسم کا سارا خون دماغ کو چڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔ اتنا بوجھ اور دباؤ سا تھا کہ لگ رہا تھا جیسے آنکھ، کان، ناک اور منہ سے خون فواروں کی مانند پھوٹ پڑے گا۔

اس لڑکے کے ہاتھ کسی لمحے ریکا کے شانوں اور کمر کو چھو جاتے لیکن ہاشم کو مطلق پروا نہیں تھی۔ میری اور جیری کی رنگین جوانی میری اپنی بیٹی اور داماد کی صورت سامنے تھرکتی آئینہ دکھا رہی تھی۔ مگر جیری کی تربیت میں ہی کھوٹ تھا، جب ہی میں بھی اس کے رنگ میں رنگتا چلا گیا، جبکہ میری بیٹی کی تربیت نہ تو کھوٹی ہے اور نہ ہی اس کی رگوں میں ہلکے خاندان کا خون ہے۔ اسی سوچ نے مجھے یک دم اتنی طاقت دی کہ میں جو اس وقت شدید اعصابی توڑ پھوڑ کا شکار تھا۔ بجلی کی سی تیزی سے بڑھا اور ریکا کے قریب پہنچ کر ایک جھٹکے سے اسے اس لڑکے سے الگ کر کے اسٹیج پر لے گیا اور سختی سے تنبیہ کی کہ اب وہ مجھے دوبارہ نیچے اترکر ناچتی نظر نہ آئے۔ جب میں ریکا سے یہ سب کہہ رہا تھا، تب بھی اس کی نگاہیں سرد اور سپاٹ تھیں۔

میں نظریں چرا کر نیچے اترا تو سب ہی ناچنا گانا بھولے میرے رویے پر غور کرتے۔ اپنی اپنی جگہوں پر جمے کھڑے تھے۔ مگر مجھے اس وقت کسی کی بھی پروا نہیں تھی۔ حالانکہ ہاشم کی ناگواری اس کے چہرے سے واضح تھی۔ وہ میرا داماد تھا اور مجھے اس کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ پر اس وقت مجھے اس کے نہیں محض اپنے جذبات و احساسات کا خیال تھا۔ جو ریکا کو ہاشم کے دوستوں کے بیچ گھرا دیکھ زبردست تغیر کا شکار ہوئے تھے۔

جیری نے صورت حال کو فوراً" سنبھالا تھا اور سب کو میری طبیعت کی خرابی کا عذر پیش کیا۔ میں بھی اب منظر سے غائب ہونا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس کے کہنے پہ میں اپنے وسیع و عریض لان سے جہاں پر اس فنکشن کا انتظام تھا۔ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ بہت سے چہروں پر میری اس حرکت سے بے زاری در آئی تھی۔ جن میں سرفہرست میرے بیٹے تھے۔ جبکہ میری نظریں وہاں سے نکلتے نکلتے بھی ریکا کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ جو زرد پھولوں کے ڈھیر میں ان کا عکس چرائے بیٹھی یک ٹک مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔

میں اس وقت اس کی ان نظروں کا مفہوم جاننا نہیں چاہتا تھا، بلکہ اپنی نگاہوں کا پیغام اس تک پہنچانا چاہتا تھا۔ جن میں التجا تھی۔ درد تھا۔ دکھ تھا اور معافی تھی۔ میں شکستہ قدموں سے چلتا اپنے کمرے کی فرنچ ونڈو کے بالکل پاس دھری راکنگ چیئر پر دھم سے بیٹھا تھا اور نظریں پار نظر آتے منظر پر جما دیں، جہاں لان میں زندگی بھرپور رقص کرنے میں مشغول ہو چکی تھی۔ میری آنکھ سے آنسو ایک ایک کر کے میری گردن کو سیراب کرتے میرے سینے میں سلگتی آگ پہ چھینٹے برسانے لگے۔ امی کی یاد اچانک ہی عود کر آئی تھی۔ آنسوؤں میں مزید روانی آئی اور میرا سینہ پچھتاوے کی ان دیکھی زنجیر کے شکنجے میں کسنے لگا۔

☼ ☼ ☼

رات گئے تک لان کی رونق عروج پر رہی۔ دھیرے دھیرے اس تقریب کی "باقیات" میں صرف جیری اور اس کے میکے والے رہ گئے۔ جو ابھی بھی موسم کی خنکی کو انجوائے کرتے ہوئے کافی اور سبز چائے سے شغل کر رہے تھے۔ دونوں بیٹے یقیناً" مدہوش ہوئے نوکروں کے ہاتھوں اپنے کمروں میں منتقل ہو چکے تھے۔

آف یہ تھی میری اولاد۔ مجھے یاد ہے کہ جب تک ابا زندہ تھے میں کبھی بھی ان کے سامنے کرسی یا صوفے پر ٹانگیں چڑھا کر نہیں بیٹھا تھا کہ سخت بدتہذیبی محسوس ہوتی تھی اور آج میرے بیٹے تھے کہ لڑکھڑاتے اور ڈولتے قدموں سے گھر میں داخل ہوتے اور میری نظروں سے اپنی خمار آلود نظریں ٹکراتے جھومتے

جھانتے کمروں کو ہو لیتے۔ ہر بات اور ہر یاد آج میرا دل چیرے دے رہی تھی۔

میں بے حد زرد رنج ہو رہا تھا۔ کوئی کاندھا' کوئی سہارا بھائی نہ دیتا تھا اور دل تھا کہ کرلائے جا رہا تھا۔

اسی دم دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا۔ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ چند لمحوں بعد ریکا میرے سامنے تھی۔ اس نے لباس بدل لیا تھا اور اب وہ سادہ گھریلو کپڑوں میں ملبوس آزردہ سی تھی۔ وہ میرے بالکل سامنے کاؤچ پر ہولے سے آ ٹکی۔ میری آنکھوں میں حیرت در آئی تھی۔ مجھے اس گھڑی اس کے یوں اپنے کمرے میں آنے کی امید نہیں تھی۔ وہ بڑی بے چینی سے اپنی انگلیاں چٹخائے جا رہی تھی۔ یقیناً" مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ چند لمحے یوں ہی سرک گئے اور پھر وہ دھیرے سے مجھ سے مخاطب ہوئی اور اپنی کہتی ہی چلی گئی۔

"پاپا! میں اس وقت آپ سے چند باتیں کرنے آئی ہوں۔ امید ہے آپ میری سنیں گے۔ ویسے ہی جیسے دادی کے مرنے کے بعد آپ گھنٹوں مجھ سے ان کی باتیں سنا کرتے تھے۔ وقت نے آپ کے اور میرے درمیان فاصلے پیدا کر دیے ہیں۔ ان فاصلوں کو مٹانا نہ آپ کے اختیار میں ہے اور نہ میرے بس میں اور سچی بات ہے پاپا۔ کہ اب مجھے ایسی کوئی خواہش بھی نہیں۔ آپ سے یا ماما سے دل کی باتیں کرنے کی حسرت میرے بچپن کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ مگر آج پتا نہیں کیوں میرے قدم بے اختیار آپ کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔

میں نہیں جانتی آج فنکشن کے دوران آپ نے جو کیا۔ اس کا جواز کیا تھا؟ مگر وہ ایسا ہی تھا جیسا میں نے ہمیشہ سے چاہا تھا۔ آج آپ مجھے شوبز کی طمع زدہ شخصیت نہیں' بلکہ مجھے' میرے پاپا لگے۔ ایک ایسا باپ جو اپنی بیٹی کے لیے چھپر چھاؤں ہوتا ہے۔ ایک ایسی مضبوط دیوار جس کے پار کسی کی غلط نظریں یہاں تک کہ گندی سوچ بھی نہ گزر سکے۔ میں محفوظ ہو جاؤں جیسے دادی مجھے ہمیشہ اپنی پناہوں میں لے لیتی

تھیں۔ آج سے پہلے آپ نے مجھے کبھی یہ احساس دلایا ہی نہیں کہ آپ میرے پاپا ہیں۔ دادی جیسی عورت کے بیٹے' جس نے آخری ہچکی لینے سے چند لمحے قبل اپنا سر ڈھکنے کا اشارہ کیا تھا اور پھپھو نے جھٹ آگے بڑھ کر ان کے سر کو دوپٹے کے پلو سے ڈھک دیا تھا اور اسی عالم میں انہوں نے جان دی تھی۔

پر آپ کو تو میں نے ہمیشہ سے ایک ہی روپ میں دیکھا تھا۔ ماما کا لیبل۔ برانڈ مائنڈڈ "لائف پارٹنر" شوبز کا ایک نامی گرامی "شوپیس" بس! میرے نزدیک یہی آپ کی پہچان تھی۔

دادی کے جانے کے بعد میں یہاں نہیں آنا چاہتی تھی۔ مگر مجھے آنا پڑا۔ اور کہاں جاتی بھلا! نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ایسی پناہ گاہ میں آنا پڑا جو میرے لیے محفوظ قطعاً" نہیں تھی۔ ماما نے جب میری تربیت کو اور مجھے آڑے ہاتھوں لینا شروع کیا تو میں نے بارہا امید بھری اور اکثر و بیشتر شکوہ کناں نظروں سے آپ کو دیکھا کہ شاید آپ انہیں کہیں کہ مجھے ویسا ہی رہنے دیں جیسی میں تھی۔ میری تراش خراش کر کے میری شخصیت کو مسخ مت کریں۔ مگر آپ تو ایک بار پھر شوبز کی رنگینیوں میں گم ہو چکے تھے۔

بڑا کم وقت لیا تھا آپ نے دادی کے غم سے نکلنے میں۔ جبکہ میرے دل سے ان کا دکھ کبھی گیا ہی نہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میں ماما کے سانچے میں ڈھلنے سے انکار کروں' مگر میں اتنی جرات نہیں کر سکتی تھی۔ تھک کر میں نے خود کو ماما کے حوالے کر دیا۔ میں ان کے لیے ایک ایسا کورا کاغذ بن گئی' جس پہ جو انہوں نے چاہا' وہ لکھا۔ اس کھینچا تانی نے میری شخصیت کو توڑ کر رکھ دیا۔ مجھے لگتا جیسے میں ذہنی طور پر بیمار ہو چکی ہوں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں دادی کی قبر پر جا بیٹھوں اور اونچی اونچی روؤں۔ میں نے اپنی ڈور ماما کے ہاتھوں میں تھما تو دی تھی' مگر میرا ضمیر مجھے جینے نہیں دیتا تھا۔ مجھے لگتا جیسے دادی میرے آس پاس موجود مجھے ٹوکتی رہتی ہیں۔

"ریکا۔ نماز پڑھ لو۔ اور میں قنوطیت کیفیت

میں جینز اور ٹاپ پر ہی چادر اوڑھ کر بے وضو ہی جائے نماز پر جا کھڑی ہوتی۔ اکثر دادی مجھے تو می رات کے بعد باہر لان میں بے چینی سے ٹہلتی دکھائی دیتیں تو میں جھٹ سردی گرمی کی پروا کیے بغیر باہر نکل جاتی۔ مگر وہاں کوئی بھی نہ ہوتا اور پھر ساری رات میں وہیں بیٹھی دادی کے انتظار میں گزار دیتی۔ کہاں کہاں پر دادی کی پرچھائی "آ" کر مجھ پر غالب آتی۔ ماما کی شخصیت سے ٹکراتی رہی اور کس طرح سے مجھے ماما کے رنگ میں رنگنے سے روکتی رہی۔ میں سوچوں میں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔

اس ٹذ بھیڑ نے مجھے میری ہی فیملی سے نفرت کی راہ پر ڈال دیا۔ مجھے نفرت ہو گئی اپنے باپ سے کہ وہ میرا محافظ نہیں تھا۔ مجھے نفرت ہوگی اپنی ماں سے کہ وہ میری نمائش کی شائق تھی اور بھائی۔۔۔ تو وہ تو سدا سے بے حس اور بے نیاز۔

اور پھر ہاشم سے انڈر اسٹینڈنگ کے نتیجے میں ہم دونوں نے شادی کا فیصلہ کیا اور یہ فیصلہ میں نے ایک ہی جست میں نہیں کیا تھا' بلکہ اس کی فیملی سے ملاقات کے بعد کیا۔ ہاشم کو خود یورپ میں دوران تعلیم وہیں کے رنگ ڈھنگ اپنا چکا تھا۔ مگر اس کی امی اور بہنیں اس سے یکسر مختلف تھیں۔ مگر باپ کی عدم موجودگی اور بیٹے کے کرتا دھرتا ہونے کی وجہ سے اس پر بس نہ تھا۔ وہ فی الحال اسے تو نہیں بدل سکتی تھیں' پر اس کی بیوی کے طور پر وہ ویسی ہی لڑکی کو نہیں بسانا چاہتی تھیں۔ اسی لیے جب ان کی ملاقات مجھ سے ہوئی تو انہیں میرے حوالے سے بہت سے تحفظات تھے۔

میری نیک نیتی تھی اور قسمت نے یاوری کی کہ وہ میری "اصل" کو بھانپ گئیں اور پھر بعد کے مراحل طے ہوتے چلے گئے۔

اور میں بہت خوش ہوں پاپا۔۔۔ بے حد خوش میں' نہیں رہنا چاہتی مزید آپ لوگوں میں' میرا اس ماحول میں دم گھٹتا ہے۔ اس گھر کے طور اطوار سے نفرت ہوتی ہے جہاں نیو ایر اور کرسمس پارٹیز تو دی جاتی ہیں' مگر رمضان غفلت میں اور عید کے دن سو سو کر بے زاری سے گزار دیے جاتے ہیں۔ ساری عمر میں نے آپ کو ایک ڈمی کی طرح ماما کے اشاروں پر ناچتے دیکھا ہے' پر میں ہاشم کو ضرور بدل لوں گی۔ میرا خلوص اور نیک نیتی اسے آپ جیسا نہیں بننے دے گی' یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔

پاپا۔۔۔ بیوی' بیٹیوں کو بے پردہ اور بے حجاب محفلوں میں لے جانا والا شخص "دیوث" کہلاتا ہے۔ دادی کہا کرتی تھیں کہ پردہ "فرائض" میں سے ہے اور ہر مسلمان عورت پر پردہ فرض ہے اور وہ مرد جو اپنی عورتوں کو پردہ نہیں کراتا' ایک حدیث جس کا مفہوم ہے کہ روز قیامت دیوث جنت کی خوشبو تک نہیں پاسکے گا۔ حالانکہ جنت کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے آتی ہے۔

اور پاپا میرا دل بے تحاشا دکھتا ہے جب مجھے خیال آتا ہے کہ میرے پاپا اور بھائی۔۔۔" ریکا کا گلہ رندھ گیا تھا۔ اس نے بڑی دقت سے آنسو پیے اور پھر گویا ہوئی۔

"دادی اکثر مجھے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ قول ضرور سناتی رہتی تھیں۔"

"اس عورت کی نماز قبول نہیں ہوتی جو بلوغت کے بعد پردہ نہ کرے۔"

اور میں نہیں چاہوں گی کہ میری نمازیں میرے منہ پر ماری جائیں' میری عبادات اور مناجات رائیگاں جائیں اور میں یہ بھی نہیں چاہوں گی روز قیامت میں آپ کو جنت سے کوسوں دور دیکھوں۔۔۔ کیونکہ میں آپ سے پیار کرتی ہوں' چاہے آپ لاکھ برے ہوں۔ چاہے آپ نے باپ ہونے کا فرض کبھی ادا نہ کیا ہو۔ چاہے آپ اچھے بیٹے نہ رہے ہوں اور چاہے آپ کی حیثیت میری زندگی میں ایک ایسی چادر کی رہی ہو جس میں سیکڑوں چھید ہوں۔"

کمرے میں روح گھائل کر دینے والی خاموشی تھی۔ گھڑی کی سوئیوں کی تھکی تھکی سی ٹک ٹک بھی اس ماحول کی وحشت کم کرنے میں ناکام تھی۔ ریکا میرے کمرے سے جا چکی تھی اور جاتے جاتے مجھے سرتاپا

جھنجھوڑ گئی تھی۔ جس پٹاری کو میں خوف کے مارے بے حسی کے گھڑے میں دبائے بیٹھا تھا اس پٹاری کو کھول کر میری بیٹی نے میری گود میں لا دھرا تھا اور اب اس میں سے میری کوتاہیوں' گناہوں اور پچھتاووں کے سیکڑوں ناگ کلبلاتے' سر سراتے میرے وجود کو اپنے شکنجے میں جکڑ رہے تھے۔ جس ضمیر کو میں تھپک تھپک کر سلانے کی سعی کرتا رہتا تھا۔ اپنے ہر گناہ اور ناانصافی سے نظر چرائے وقت گزارتا آیا تھا۔ آج میری بیٹی نے ایک ہی بیٹھک میں اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا اور اب میں اپنا احتساب کرنے کے لیے بالکل اکیلا تھا۔ بالکل اکیلا' قبر میں دفن مردے کی طرح۔ میری قبر بھی میرے وجود کے اندر ہی بن گئی تھی جس میں' میں دفن ہو چکا تھا جہاں ہر روز میرے اعمال کا کھاتہ کھلتا اور میرے گناہوں کے بدلے میرا ضمیر ہی مجھے ہمیشگی سزا دیتا رہتا۔ زندگی کی آخری سانس تک۔

☆ ☆ ☆

بارش ندوروں سے برس کر رک چکی تھی۔ باہر خنکی کا احساس بڑھ گیا تھا۔ جبکہ اندر محفل خوب گرم تھی۔ ہر کوئی مگن سا تھا۔ بے فکر اور خوش باش۔

صرف دو نفوس اس وقت بے کلی اور بے چینی کا راگ الاپ رہے تھے۔ دونوں کے دکھ سانجھے تھے۔ بیتے وقت کا دکھ... گمشدہ رشتوں کا دکھ اور ایک دوسرے سے دوری کا دکھ۔

دونوں کا رشتہ باپ' بیٹی کا تھا' مگر اس رشتے کی مخصوص حدت اور اپنائیت ان کے درمیان کبھی پنپ ہی نہیں سکی تھی۔ ریکا اندر سب کو ہنستا بولتا چھوڑ کافی دیر سے لان کے تاریک گوشے میں بیٹھی ٹیرس پہ نظریں جمائے ہوئی تھی۔ جہاں سے پاپا کے کمرے سے روشنی چھن کر باہر آرہی تھی۔

کھڑکی پر پڑے خوب صورت نفیس پردے کے پیچھے بیٹھے پاپا کا ہیولا اسے صاف محسوس ہو رہا تھا۔ شرمندگی اور دکھ کی تیکھی سی کلک اسے اپنے دل پر محسوس ہوئی تھی۔ گزرے ہوئے روز و شب کسی قلم

کی طرح اس کے ذہن کے پردے پر سرسرا رہے تھے اور اس قلم کا سب سے ٹریجک سین اس کے شگفتہ فلیش کا وہ وقت تھا جب وہ نفرت اور غصے سے بھری پاپا کے کمرے میں آئی تھی اور ان کی زندگی کی بے ضابطگیوں اور غیر ذمہ دارانہ رویے کو بڑے استہزا کے ساتھ ان کے سامنے من و عن دہرایا تھا۔ بھلا کس نے حق دیا تھا اسے کہ وہ اپنے باپ سے یوں دوبدو باز پرس کرے۔ کون تھی وہ جو زندگی دینے والے باپ کو اپنی زندگی خراب کرنے کا موجب گردان رہی تھی۔ اس کے باپ کی شرم سے جھکی گردن بھی اس کی آنکھوں میں نرم تاثرات بھرنے سے قاصر تھی۔

اس رات اپنے دل کی مکمل بھڑاس نکال لینے کے بعد وہ تو بڑی مطمئن سی کمرے میں جا کر سو چکی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ اس دن کے بعد سے اس کا باپ ایک رات بھی چین کی نیند نہیں سو سکا تھا اور یہ بات اسے پھپھو کے ذریعے پتا چلی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ان سے رابطے میں تھی۔

رخصتی کے بعد وہ بڑی خوش اور مگن سی نئی زندگی کا آغاز کر چکی تھی۔ جب ان ہی دنوں پھپھو کا فون آیا اور انہوں نے اسے بتایا کہ پاپا کئی دنوں سے مسلسل دادی کے گھر جا رہے تھے جہاں ان کے مرنے کے بعد پھپھو اور ان کی فیملی رہائش پذیر تھی۔ وہاں جا کر وہ سیدھا دادی کے کمرے میں جاتے اور سو جاتے۔ ایک بھرپور نیند لینے کے بعد وہ چند گھنٹے پھپھو اور ان کے بچوں کے ساتھ گزارتے اور دادی کی باتیں کیے جاتے۔ ان دنوں پھپھو کے بقول پاپا نے پابندی سے نماز ادا کرنا شروع کر دی تھیں۔ اپنے "معاش" کی طرف ان کا دھیان کم ہو گیا تھا۔ جینے سے جیسے جی بھر گیا تھا ان کا۔ اگر بیوی' بچوں کو ان کی فکر نہیں تھی تو انہوں نے بھی پروا کرنی چھوڑ دی تھی۔ وہ اچانک سے بے حد اکیلے ہو گئے تھے۔

یہ تمام باتیں جان کر ریکا کے دل کو بے حد ٹھیس لگی تھی۔ جو بھی تھا وہ اس کے باپ تھے اور ان سے محبت ہونا فطری سی بات تھی۔ اسے رہ رہ کر اپنے

رویے کا دکھ ستانے لگا۔ یہ تمام باتیں وہ کسی اور دن کسی اور طریقے سے بھی تو کر سکتی تھی۔ اگر پاپا نے کبھی باپ ہونے کا فرض ادا نہیں کیا تو اس نے بھی بیٹی ہونے کے ناتے کب ان دوریوں کو پاٹنے کی کوشش کی تھی جو ان کے رشتے میں در آئی تھیں۔ پاپا اگر اس سے دور تھے تو وہ قربت اختیار کر لیتی۔ کب اس نے ان کی دلجوئی کی تھی۔ یہاں تک کہ رخصتی کے بعد اس نے ایک دن بھی پاپا سے خود سے رابطہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی ملنے آئی تھی۔ اگر آئی بھی تو ان کی غیر موجودگی میں ماما سے مل کر چلی جاتی۔

مگر آج وہ صرف اور صرف پاپا کے لیے آئی تھی۔ آج وہ ان سے معافی مانگنے آئی تھی۔ اسے رات یہیں رہنا تھا۔ ہاشم کچھ وقت گزار کر ڈنر کے بعد جانے والا تھا اور اسے پتا تھا کہ پاپا ڈنر ان کے ساتھ نہیں کریں گے۔ ماما کے بقول انہوں نے کافی عرصے سے اپنے کمرے میں ناشتا' کھانا منگوانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی بے بس سی سانس فضا کے سپرد کی۔ وہ گزرے لمحات واپس نہیں لا سکتی تھی اور نہ ہی زبان سے نکلے الفاظ کا مداوا اس کے پاس تھا۔ مگر اس کے پاس وقت تھا کہ وہ باپ کے قریب ہو سکے۔ بیٹی ہونے کا فرض ادا کر سکے۔ حقوق و فرائض صرف اس کے پاپا پر ہی تو نہیں لاگو تھے نا۔

اسے اب بے چینی سے ہاشم کے جانے کا انتظار تھا۔ جب وہ فرصت سے اپنے پاپا کے پاس جا سکے ان سے معافی مانگ سکے۔ بے شک وہ بے حد اکیلے ہو چکے تھے اور اگر ان کا ضمیر جاگ چکا تھا تو ضمیر کی مار بے حد کڑی ہوتی ہے تو پھر وہ کون ہوتی ہے منصف بن کر اپنے باپ کو کٹہرے میں کھڑا کرنے والی۔ اگر اس کے باپ کو اللہ نے توبہ کی توفیق دی تھی تو اس کے پاس سزا کا اختیار ہی کب تھا؟؟ اپنا آپ یک دم ہلکا پھلکا سا محسوس کرتے اس نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔

☆ ☆ ☆

انہوں نے بارش کے موٹے موٹے قطروں سے نظر ہٹا کر پردے برابر کیے تھے۔ زور ٹوٹ چکا تھا۔ اب کسی بھی وقت بارش رک سکتی تھی۔ مگر جو بارش ان کے اندر برستی تھی وہ کبھی رکتی ہی نہ تھی۔ پچھتاوے اور دکھ کی بارش۔ اس بارش کی سیلن نے ان کے سارے وجود کو کائی زدہ کر دیا تھا۔

انہوں نے پردے برابر کرنے سے پہلے ریکا کو سج سج چلتے لان میں آتے دیکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ریکا دائیں جانب بنے سنگی بینچ پر گلابوں کی کیاری کے قریب بیٹھے گی۔ یہ شروع سے اس کی من پسند جگہ تھی۔ اسے جب بھی کوئی پریشانی ہوتی تو ہمیشہ اسی جگہ آ بیٹھتی تھی۔ سو ابھی بھی یقیناً" ان کی بیٹی پریشان تھی۔ یہ سوچ ہی انہیں شرمندہ اور دکھی کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ اپنی ماں سے شرمندہ تھے۔ اپنی بہن اور بیٹی کے سامنے ندامت محسوس کرتے تھے اور اپنے رب کے سامنے تو وہ یوں کھڑے ہوتے جیسے فالج زدہ مریض۔ ان کی ہڈیاں تک کڑکڑاتی تھیں اس خوف سے کہ وہ "دیوث" تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی بیوی کی نمائش کسی ایسی قیمتی چیز کی طرح کی تھی جس کو خریدنے کی اوقات ان کی نہیں تھی مگر قسمت کے پھیرے نے اسے ان کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ ماں کی ملامت زدہ نگاہیں ان کے وجود میں کبھی دراڑیں نہ ڈال سکیں۔ ہاں... مگر ان کی بیٹی کے چند جملوں نے ان کی ہستی کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے تھے۔

مذہب کو ہمیشہ انہوں نے ایک "ورثہ" کے طور پر لیا تھا۔ اس کی حقانیت کو کبھی نہیں جانچا تھا۔ وہ دعوے سے کہہ سکتے تھے کہ دین کے معاملے میں ریکا کا علم ان سے ڈھیروں زیادہ تھا۔ موت کا خوف انہیں کبھی یوں نہیں ستایا تھا جیسے کہ اب ان کی رگیں چیرتا تھا۔ یہ اذیت انہیں چین نہیں لینے دیتی تھی کہ اپنی بیٹی کے سوالوں کا جواب تو وہ دے نہیں سکے تو کل اپنے اللہ کے حضور زبان کیسے کھول پائیں گے۔

امی کہا کرتی تھیں کہ "توبہ کا در کبھی بند نہیں ہوتا تو گناہ کیے جا۔۔۔ آخری عمر تک کیے جا' جب تھک جائے اور تجھے لگے کہ اب مزید گناہ کرنے کی تجھ میں سکت نہیں تو پھر توبہ کر لینا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا رب تب بھی تجھے بخش دے گا۔"

اور اب انہیں لگتا تھا کہ وہ مزید گناہوں کی تاب نہیں رکھتے' وہ توبہ کرنا چاہتے ہیں' مگر انہیں یہ یقین نہیں تھا کہ ان کا رب انہیں معاف فرما دے گا یا نہیں۔

تڑاتڑ برستی بوندیں تھم چکی تھیں۔ بارش کا شور یوں ختم ہوا تھا جیسے کبھی برسی ہی نہ تھی۔ کیا کبھی ان کے اندر مچا اودھم تھم سکے گا۔ ہاں۔۔۔ تھم سکتا ہے جب ان کے اندر برستی بارش تھم جائے گی اور جو رب تعالیٰ اپنی قدرت سے موسم کی کثافت اور شدید ترین حبس کو بارش کے چند چھینٹوں سے دور فرما دیتا ہے۔ وہ ان کے اندر کی بارش کو بھی روک سکنے پر قادر ہے۔ ہاں۔۔۔ پہلے ان کے گناہوں کی کثافت و حبس جس نے ان کی روح تک کو گھٹن زدہ کر دیا ہے۔ ان کے اشکوں کے پانی سے دور تو ہو لے۔ ندامت کا یہ پانی ان کے جرموں کی طویل فہرست کو دھو ڈالے۔ پھر یقیناً" یہ بارش بھی تھم جائے گی۔ بے شک توبہ کا در کھلا ہے۔ کیا خبر کس گھڑی ان کی بھی قبول ہو جائے اور یہ ضروری تو نہیں کہ ہمیشہ ماں' باپ ہی اولاد کو انگلی پکڑ کر چلانا سکھائیں' کبھی کبھار اولاد ہی ماں' باپ کو راہ راست پر لانے کا سبب بن جاتی ہے۔

کیا تھا اگر ان کی بیٹی ان سے دور ہو چکی تھی۔ وہ خود اس کے قریب ہو سکتے ہیں۔ ریکا بالکل ان کی ماں کا پرتو تھی۔ اس کے ساتھ میں انہیں ممتا کا مسک آتی تھی۔

دیوار گیر گھڑی نے ٹنگنا کر نو بجنے کا اعلان کیا تھا۔

انہوں نے چونک کر گھڑی پر نظریں جما دیں۔ وقت رکتا نہیں۔ کسی کے لیے بھی نہیں۔ وہ بھی گیا وقت واپس نہیں پھیر سکتے تھے اور نہ ہی گزرتے وقت کی طنابیں کھینچ سکتے تھے۔ ہاں۔۔۔ مگر خود ضرور گزرتی گاڑیوں میں مدغم ہو سکتے تھے۔ ابھی ان کی سانسیں رواں تھیں۔ ابھی زندگی ان کی رگوں میں دوڑتی تھی' ابھی نامہ اعمال لپیٹا نہیں گیا تھا۔ شاید اس کے کچھ پنے باقی ہوں' جس میں ان کے بھی چند ایسے اعمال درج ہو جائیں جو گزشتہ اوراق کی سیاہی کو دھندلا دیں۔

یک دم جیسے ان کے سینے میں سکون سا اتر آیا تھا۔ وہ اپنی رگ رگ میں اترتی مستی کو محسوس کر سکتے تھے اور یہ مستی رب سے آشنائی کی مستی تھی۔ یہ مستی امید کی مستی تھی جو انہیں اللہ سے تھی کہ وہ ضرور انہیں بخش دے گا روز محشر یقیناً" ان کا چہرہ سیاہ نہ ہوگا' بس توبہ کا دامن تھامے رکھنا تھا۔

باہر سے آتی شور اور بے ہنگم قہقہوں کی آوازیں اب انہیں کوفت میں مبتلا نہیں کر رہی تھیں۔ اپنی بیوی اور بیٹوں کے لیے وہ صرف ہدایت کی دعا ہی کر سکتے تھے۔ وقت بڑے بڑوں کے کس بل نکال دیتا ہے۔ سو ان کا معاملہ بھی آنے والے وقت پر چھوڑنا مناسب تھا' جو مقدر میں تھا سو پانا تھا۔

انہیں صرف ریکا کی طرف پیش قدمی کرنا تھی جو ان کی ہدایت کا موجب تھی۔ ان کی ماں کا عکس تھی۔

ایک آسودہ سانس چھوڑ کر وہ عشاء کی نماز کے لیے وضو کرنے واش روم کی طرف بڑھ گئے۔ باہر فضا کی معطر سی خنکی دھیرے دھیرے ان کی کھڑکی کے پٹ سہلانے لگی۔ رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی نئی اور نیک صبح کی نوید تھی اور بے شک رب بڑا مہربان اور بخشنے والا۔

✿ ✿

عفت حیا
کوئی ستارہ آن ملا

"میں انیلا ہاشم خاک کے ذروں جیسی ارزاں' بے قدر' کب' کیسے' کہاں اونی سے اعلا بن گئی پتا ہی نہیں چلا' محبت سے نابلد' نا آشنا' بدگماں محبت کے قدموں میں جب گری تو گویا سجدے کے سوا زندگی میں کوئی عظیم کام یاد ہی نہ رہا۔۔۔ سوچتی رہ گئی محبت اتنی خوب صورت ہے تو محبت بنانے والا کس قدر حسین ہو گا۔۔۔ جب زیاد حسن کے ہاتھ پر محبت کی بیعت لی تو اپنا مسلک کہیں پس پشت ڈال دیا۔" اس نے گاڑی سے باہر جھانکتے ہوئے سوچا۔

"میم آپ انیلا ہاشم ہیں نا۔۔۔ پلیز مجھے ایک آٹو گراف دے دیں میں نے آپ کی تصاویر فیس بک پر دیکھی تھیں۔" ونڈو سے اندر جھانکتی ہوئی لڑکی نے بیگ سے ایک پرچہ نکال کر اس کو۔ دیا اس نے مسکرا کر دو لائن گھسیٹ دیں۔ "فیس بک سے زیادہ اپنی پڑھائی پر توجہ دو لڑکی" اس نے ڈرائیور کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

✡ ✡ ✡

کون تھی وہ' کہاں سے چلی اور کہاں آ گئی وہ جو دو کمروں کے گھٹن زدہ ماحول سے باہر نکلنا ہی نہیں جانتی تھی پڑھائی بھی کی تو ایسے چھپ کر جاتی کہ کوئی الزام نہ عائد کر دے پھر لکھنے کا شوق ہوا تو ایسا جیسے خود پر ہی احسان کر رہی ہو۔ چند سطریں کالی کر کے ابا کو پکڑاتی تو ابا پوچھتے۔

"اب کی بار کتنے پیسے آئیں گے" وہ نفی میں سر ہلا دیتی۔

"کیا پتا؟" اور خاموشی سے جا کر مشین پر جھک جاتی۔

"رات بہت دیر تک لکھا ہے اب سلائی نہ کر" اماں بستر سے آواز لگاتیں "آخری ہے" اس نے سر نہیں اٹھایا۔

جملے مختصر ہو جائیں تو زندگی طویل لگنے لگتی ہے نا۔۔۔ کٹھن' بدصورت ہولناک کیا زندگی کے یہی روپ ہوتے ہیں یا زندگی اس کو ڈرا رہی ہے۔ آنکھوں کے گدازے بھیگے تھے اس نے بے رحمی سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"ادھر آ میرے پاس۔" وہ اماں کو رات کا کھانا کھلا کر پلٹی تو اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں اتنی چپ رہتی ہے؟ ایک پھانس سی دل میں چبھتی ہے لگتا ہے فرض پورا ہی نہیں کر پائی میں۔۔۔ ایک قرض کی طرح بوجھ سینے پر رکھا لگتا ہے نیلم میں جاہل گنوار نہ محبت کی باتیں جانوں نہ گلی لپٹی رکھنا پر میں احسان مند ہوں تیری تو نے وہ کمی پوری کر دی جو ناسور تھی میرے سینے کا پر جانے میں تیرے سینے کا خلا کیوں پر نہیں کر پائی۔۔۔ ماں جیسی بن گئی ماں نہیں بن پائی۔" پیار سے وہ اس کو نیلم ہی کہتیں اس کے ہاتھوں کو لبوں سے لگا کر سسکیں تو وہ تڑپ گئی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں اماں آپ سے تو کوئی شکایت ہے ہی نہیں جو تھا آپ کے پاس وہ آپ نے دیا کبھی ڈانٹا نہیں کبھی ناراض نہیں کیا۔۔۔ اور محبت تو مجھے پتا ہی نہیں کیسی ہوتی ہے ان چاہی اولاد ہونے کے غم نے میری زبان کو چاٹ لیا دل کو کرید دیا۔۔۔ قدرت نے جب کچھ نہیں دیا تھا آگاہی بھی نہیں دیتی اس کے کچوکوں نے سینے کو چھلنی کر دیا۔" وہ رائٹر تھی کہانیوں میں جیتی تھی۔۔۔ لفظوں میں کھوتی تھی۔۔۔ تحریروں کی وحی اس پر اترتی تو جیسے وہ اپنا آپ کہیں کھو دیتی اس کے گرد صرف لفظ ہی لفظ ہوتے اور وہ ہوتی۔

"تو مجھے معاف کر دے اماں میں تو بہت ناقدری نکلی۔" اماں نے اس کو سینے سے دبوچ لیا۔

"نہ دھی تو تو میری رانی ہے رانی۔" دونوں کے آنسو ایک دوسرے کو بھگو رہے تھے۔

✡ ✡ ✡

وہ ٹیبل پر سر ٹکائے پین کو گول گول گھما کر کھیلنے میں مصروف تھی سر کے نیچے ان گنت پیپر پڑے تھے اور کچھ نیچے بھی گر گئے تھے وہ بے پاؤں اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا اور مسکرانے لگا۔

"آپ کو نہیں لگتا کچھ کردار چھپ کر بھی نہیں

چھپ سکتے سورج کی کرن کی طرح کسی نہ کسی جھری سے اپنا رستہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں" اس کی نظروں کا زاویہ نہیں بدلا تھا پھر بھی اس نے کسی وجود کو محسوس کیا تھا۔ آنے والے نے کندھوں سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا تھا۔

"تم کو کیسے پتا چلا میں ہوں۔" زیاد واحد نے آنکھیں سکیڑ لیں۔

"صرف آپ ہی تو ہیں۔۔۔ اور باقی ہے کیا؟" اس کی آنکھیں مسکرائی تھیں۔ زیاد نے اس کے ماتھے کو ایسے چوما تھا جیسے کوئی تبرک کو چومتا ہے۔

"میں تو وہ بد قسمت تھی جو محبت کے جذبے سے انجان تھی آپ۔ میری زندگی کا پارس ہیں جس نے مجھے چھو کر سونا کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں عورتوں کے کردار پاک ہونے چاہئیں میں نے پارسا مرد دیکھا ہے وہ مرد جس نے مجھے اپنی زندگی میں شامل کر کے میری زندگی کو قابل تحسین بنا دیا" وہ ان کے قدموں میں بیٹھی تھی۔

زیاد واحد نے اس کو

سینے میں سمویا تھا۔

"مجھے دیوتا نہ بنایا کرو ہم اس اوپر والے کا بہت ہی کمتر بندہ ہوں میری بساط کیا' میری اوقات کیا۔ احسان ہے اس کا کہ اس نے مجھے آزمائشوں میں نہیں ڈالا۔۔۔ اس لیے نہیں کہ میں بہت نیک ہوں اس لیے کہ وہ مجھے آزمانا چاہتا ہے کہ میں اپنی خوشیوں کے پندار میں اکیلا غوطہ زن رہتا ہوں یا کسی اور کو بھی شریک کر سکتا ہوں کہ میں اپنی خوشیاں کسی کے غم کے مول بانٹ سکتا ہوں کہ نہیں۔"

"نہیں زیاد میں رشک کرتی اگر میرے نبی پاک شریک حیات کو سجدہ کرنے کا حکم دیتے' اعزاز ہوتا یہ میرے لیے کہ میں آپ کے قدموں میں جھکتی۔" پلکیں بھیگی تھیں۔

"مجھے گناہ گار نہ کرو ہم تو اس مالک دو جہاں کے سجدے کے حق کو بھی پورا ادا نہیں کر پاتے انیلا۔۔۔ کتنی کوتاہیاں' کتنی نادانیاں سموئی ہوئی ہیں ہماری عبادتوں میں' ہماری ریاضتوں میں' وہ جس نے ہم کو ہماری زندگی دی۔۔۔ نعمتیں دیں۔۔۔ گن گن کر احسان جتاتے ہیں کہ کتنے عظیم ہیں ہم کہ تیرے صرف اتنے سے احسانوں کے باوجود تجھ کو مان رہے ہیں اس کی محبت کو سمجھ کر بھی نہیں سمجھ پاتے۔"

"میں بھی بہت گناہ گار ہوں۔۔۔ یہ سوچتی رہی کہ کیوں کیا اس نے میرے ساتھ ایسا' کیا دیا مجھے۔۔۔ سمجھ ہی نہیں پائی کچھ بھی۔ آپ نہ ہوتے تو دنیا تو کھوئی تھی آخرت بھی کھو جاتی۔۔۔ اگر اللہ نے میری خطاؤں کو معاف کر کے میرے اعمال سیدھے ہاتھ میں دیے تو میں جھگڑوں گی وہاں بھی آپ کا ہی ساتھ پانے کو" زیاد نے خود سے اس کو الگ کیا تھا۔

"مطلب وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑو گی۔" انہوں نے مصنوعی بے زاری سے کہا تو اس نے نفی میں سر ہلا کر تبسم کیا تھا۔

✡ ✡ ✡

چھ بیٹیوں کے اوپر وہ ساتویں بیٹی تھی جلال اور غریب باپ ماں بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے اور اپنی پھوٹی قسمت کو کوستے۔

"اماں منی مجھے دو" سب سے بڑی لڑکی چھوٹی سے موہنی سی گڑیا کی طرف لپکی تھی۔

"لے مر اداع ہو۔"

"اب کی بار بھی تو یہ حرام صورت ہی لے کر آئی۔" ابا نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"اب ایسا بھی نہ کہہ غلام رسول تیری ہی بیٹی ہے۔" اماں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"ہاں! وہ چھ عدد بھی میری ہی بیٹیاں ہیں۔۔۔ بس تو بیٹیوں کی لائن لگاتی جا۔۔۔ چل اٹھ اب کھانا نکال بھوک سے دم نکل رہا ہے۔"

"کھانا کہاں سے نکالوں۔۔۔ گھر میں راشن ہی نہیں ہے۔۔۔ کچھ نہیں بنا آج۔"

"لے کر لے بات۔۔۔ یہ آگئی تو اب بھوکے بھی مریں گے۔"

"جا کسی سے ادھار لے کر کچھ لے کر آ بچیاں بھی بھوکی ہیں اور میرا بھی کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔" وہ گڑگڑائی تھی۔

"آتا ہوں..." ابا صافہ کندھے پر ڈالتا ٹوٹی چپلیں گھسیٹتا باہر نکل گیا۔ بیٹے کی چاہ میں سات بیٹیاں ان کے آنگن میں آ گئی تھیں۔

"سات بیٹیاں... سات بوجھ۔" اماں کا تو خون خشک ہو جاتا۔

"ارے کلثوم وہ میری خالہ زاد بہن ہے جو کراچی میں رہتی ہے اس کے ہاں اولاد نہیں ہے دے دے اپنی یہ چھوٹی بچی اس کا بھی بھلا ہو جائے گا اور اس بچی کا بھی تم لوگ تو اس کو پڑھاؤ گے نہ ڈھنگ کا کھلاؤ گے ... تم نے تو اپنی قسمت خود ہی پھوڑلی ہے۔" غلام رسول کی دور پرے کی بھابھی نے اس سے ہمدردی کی تھی۔

"پر بھابھی بچی تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔" وہ پریشان ہوئیں۔

"ارے تو چھوٹا بچہ تو آرام سے مل جاتا ہے۔ سوچ لے غلام رسول سے پوچھ لے اور بسم اللہ کر۔" وہ مشورے دے کر چلی گئیں اور اس رات کی سیاہی اس کے ماتھے پر کالے رنگ کا داغ سجا گئی جس کو دیکھ کر دنیا "ان چاہے" کا شور مچاتی جاتی اور اس شور سے اس کی سماعت شل ہو جاتی۔

☆ ☆ ☆

کچھ خود بھی تھے افسردہ سے
کچھ لوگ بھی ہم سے روٹھ گئے
کچھ خود بھی زخم کے عادی تھے
کچھ شیشے ہاتھ میں ٹوٹ گئے
کچھ خود بھی تھے حساس بہت
کچھ اپنے مقدر روٹھ گئے
کچھ خود بھی اتنے محتاط نہ تھے
کچھ لوگ بھی ہم کو لوٹ گئے

کچھ تلخ حقیقتیں تھیں اتنی
کہ خواب ہی سارے ٹوٹ گئے

"اماں" اس نے دھیرے سے آواز دی۔ کوئی جواب نہیں تھا۔

"اماں" اس کی آواز تھوڑی تیز ہوئی تھی ... تیزی سے وہ خود چارپائی کے قریب آئی تھی۔

چہرہ... سفید ہونٹ... سانسیں بھی کیا ہیں نا ہوتے اور نہ ہونے کے درمیاں ربط... منٹوں میں یہاں سے اٹھا کر وہاں پہنچا دیتی ہیں جہاں کسی سے کوئی تعلق نہیں رہتا... کوئی آواز کوئی آہٹ کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔

اماں کے گود میں جب میں آئی تو مجھے کسی کی پہچان نہیں تھی رشتے ناتے... غربت... توجہ... اپنے غیر... کچھ نہیں پتا تھا۔ پتا تھا تو صرف اتنا کہ وہ اس گود کی گرمی میں بڑی ہوئی اور اس صحن میں چلنا شروع کیا۔ اماں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا بلکہ اس کو اس کے گھر والوں سے ملانے اکثر ملتان بھی لے کر جاتیں پر گھر والوں کی بے زاریت اور اس کی آنکھوں کی یاسیت کو دیکھ کر انہوں نے اپنے قدم روک لیے۔

"بس تو میری بچی ہے اور میں تیری ماں" آخری دفعہ ملتان سے آکر انہوں نے اس کو سینے سے بھینچ لیا تھا۔

"ہاں اماں... بس یہی میرا گھر ہے" اس کے بعد سوالوں نے گویا برف کا لبادہ اوڑھ لیا تھا موسم کہیں سینے کے اندر جم گئے تھے... آج موسم پگھلے تھے جب اس نے اماں کے بے شکن ماتھے پر لب رکھے تھے۔

"کس کے؟ کس کے سہارے چھوڑ کر گئی ہو۔" آنسو بے آواز گالوں پر آئے تھے۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا ہے انیلا؟" ابا تیزی سے اماں کی طرف بڑھے تھے پر لب باقی کیا تھا۔ ابا الٹے قدموں باہر نکلے تھے۔

☆ ☆ ☆

"اے ہے اس لڑکی کو پالا تھا نا رضیہ نے۔" پڑوس

کی عورتیں چہ مگوئیوں میں مصروف تھیں۔
"اب یہ لڑکی کیسے رہے گی رحیم صاحب کے ساتھ بھئی۔"
"ہاں کہتی تو ٹھیک ہو چلو گھر میں عورت تھی تو ٹھیک تھا اب اس طرح تنہا۔۔۔"
"ہاں بھئی واپس چلی جائے اپنے گھر تو بہتر ہے۔"
میتوں کے سرہانے باتوں کا بازار گرم کرنا پرانا کاروبار ہے پر کسی کو کیا اس کاروبار سے کسی کا کہاں کہاں نقصان ہوتا ہے۔ دل کے جذبات کوڑیوں کے دام بک جاتے ہیں۔۔۔
سودا کھانے کا ہی ہوتا ہے چاہے باتیں بنانے والا ایک ہو یا ایک سے زیادہ۔۔۔ گھر جلے تو ہاتھ سینکنے والے کیوں آجاتے ہیں۔۔۔ کاش کہ آبلے پڑ جائیں ان ہاتھوں میں اذیت دینے والے کو اذیت ملے بھی تو سہی۔" اس نے سنگ دلی سے سوچا تھا۔ چار کاندھے اماں کو لے جا رہے تھے۔
"بیٹا ماں جا رہی ہے۔" ابا نے اس کے قریب آکر دھیرے سے کہا تھا وہ دبے قدموں ان کے سرہانے چلی آئی "معافی مانگ لو" کسی کی آواز آئی تھی اس نے خاموشی سے ہاتھ جوڑ لیے۔
"ایسے نہیں جانا تھا اماں، مجھے بلایا تھا اپنے پاس تو پھر ساتھ لے کر جاتیں۔" بامشکل اس کے حلق سے آواز نکلی تھی۔
"کلمہ شہادت۔" آواز بلند ہوئی تھی ایک آہ سی نکلی تھی اس کے سینے سے وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

تھی اس قدر عجیب مسافت کہ کچھ نہ پوچھو
آنکھیں ابھی سفر میں تھیں کہ خواب تھک گئے

کلثوم بیگم پھولی سانسوں کے ساتھ تیسرے دن آئی تھیں۔ "کیا کروں آنے کا کرایہ کرنا کچھ آسان ہے اور لڑکیوں کو وہاں اکیلے چھوڑ کر آئی ہوں۔" آتے ہیں رونا شروع ہو گیا تھا۔
"بہت افسوس ہوا جی باجی کا سنا۔۔۔ ہمیں تو پتا ہی نہیں چلا بیمار تھیں کیا؟" مصنوعی درد چہرے پر لا کر انہوں نے ابا سے سوال کیا تھا۔
"جی بس۔۔۔" کیا کہتے ابا۔
"وہ بیٹا غسل خانہ کہاں ہے؟ آنکھوں میں لگتا ہے کچھ پڑ گیا ہے۔" غلام رسول نے اس سے سوال کیا تھا اس نے اٹھ کر اشارہ کیا۔
"ہاں سفر بہت لمبا تھا نا میں نے تو جلدی میں نہ کچھ کھایا نہ کچھ رکھا۔" میت نہیں تھی کاروبار ابھی بھی چل رہا تھا اس نے تاسف سے اپنی سگی ماں کو دیکھا۔
"بیٹا جاؤ امی ابا کے لیے کچھ کھانے کی تیاری کرو۔۔۔ آپ لوگ آرام سے بیٹھیں میں ذرا نماز ادا کر آؤں۔" وہ جانتی تھی ابا اس کو موقع دے رہے ہیں اپنے سگوں سے جڑنے کا۔ وہ بھی خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گئی واپسی میں کھانے کا سامان ٹرے میں سجا تھا۔
"ارے شاباش شاباش۔" اماں نے پچکارا۔
"ارے۔۔۔ تیری بڑی بہنیں بھی اتنی سلیقے والی نہیں ہیں۔"
"تو نے بتایا۔۔۔ دو بہنوں کی شادی ہو گئی اس کی۔"
ابا نے بڑا سا نوالہ بنا کر منہ میں ڈالا تھا۔ اس کے حلق میں کچھ پھنسا تھا۔
"بس اتنی جلدی میں سب ہوا ارے بھائی مجھے تو سب کچھ نپٹانا تھا۔ اس غلام رسول نے تو دھیلا نہ دیا بس میں جانوں کیسے سب کیا۔۔۔ چار کپڑوں میں رخصت کیا میں نے دونوں کو۔" اماں نے خود ہی اپنے لہجے میں اپنے لیے درد بھرا تھا۔ منٹوں میں کھانا صاف تھا ابا نے لمبی ڈکار لی اور چارپائی پر ڈھے گیا۔ اماں اس کے پاس چلی آئیں۔
"اکیلی ہو گئی ہو گی۔" اس کے سر پر ان کا ہاتھ ٹکا تھا
اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔
"اماں!" وہ ان کے سینے سے لگ گئی ۔۔۔ ان کی

کوکھ سے جنمی تھی وہ۔۔۔ عجب سکون تھا اس جاہ پناہ میں۔

"اماں لوگ عجیب باتیں بنا رہے ہیں میں یہاں اکیلی کیسے رہوں مجھے اپنے ساتھ لے چل۔"

"ارے کیسی باتیں۔۔۔ باولی ہوئی ہے کیا۔" اماں نے اس کو خود سے الگ کیا تھا۔

"میرا کوئی رشتہ نہیں ابا سے کہ میں یہاں رہوں 'اماں کے بعد مجھ کو بھی عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔۔۔ مجھے اپنے ساتھ لے چل اماں۔" اس نے اپنی انا کو کچلا تھا ماں کے آگے بلکی تھی۔

"ایسے کیسے لے جاؤں۔۔۔ غلام رسول نے سن لیا تو میرا جینا دوبھر کردے گا وہ تو یہاں آنے کو ہی تیار نہیں تھا میں زبردستی لے کر آئی ہوں۔" اماں نے اس کو چپ کروایا۔

"اماں میں خود اپنا خرچہ اٹھاؤں گی۔۔۔ تیری بھی مدد کروں گی۔" اس نے جیسے لالچ دیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" ابا مسجد سے آگئے تھے اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے۔

"ارے کچھ نہیں بھائی صاحب میں اس سے کہہ رہی تھی شام سے پہلے نکلیں گے ہم واپسی کے لیے وہاں لڑکیوں کو اکیلا چھوڑ کر آئے ہیں نا۔ پہنچتے پہنچتے بھی بہت وقت لگے گا۔"

"ارے میں تو سمجھا آپ رکیں گی 'غلام بھائی کو جانے دیں آپ رک جائیں انیلا بہت اکیلی ہو گئی ہے۔" انہوں نے جیسے اس کی آنکھیں پڑھی تھیں۔

"ارے نہیں بھائی صاحب! ایسا کہاں ہو سکتا ہے۔" انہوں نے بنس کر ان کی بات ٹالی تھی۔

"اماں رک جانا۔" انا ایڑیوں کے نیچے کچلی نیم بسمل پڑی تھی۔ اماں نے ناک سی چڑھائی تھی۔

"کیوں پکی بن رہی ہے۔" دونوں کچن سے باہر آ گئیں۔

"غلام رسول کسی صورت راضی نہیں ہو گا وہ تو سوچتا ہے کہ یہاں سے تھوڑی بہت جائیداد مل جائے گی یہ گھر تو ان کا اپنا ہی ہے تاہم تو کرایہ دے دے کر مر گئے اس کے کانوں میں بات پہنچی تو میری چٹیا کاٹ دے گا تو سمجھتی کیوں نہیں ہے؟" انہوں نے دل کی بات کہہ دی۔

"میرا تحفظ کچھ نہیں ہے۔ میرا دل۔۔۔ میری سوچ۔۔۔ میری چاہ۔۔۔ تو ماں ہے۔۔۔ تجھ سے اچھی تو وہ عورت تھی جس نے مجھے پالا۔" اس کی آنکھوں میں تاسف ابھرا تھا پر وہ زبان سے کچھ نہ بولی۔ جاتے جاتے انہوں نے غلام رسول کا موبائل نمبر ایک چٹ پر لکھ کر اس کی مٹھی میں دبایا تھا۔

"اللہ تیری حفاظت کرے 'ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔" وہ لاچار تھی۔۔۔ مجبور تھی۔۔۔ لالچی یا بے بس وہ سمجھ نہیں پائی بس کتنی ہی دیر کاغذ مٹھی میں دبائے چپ چاپ کھڑی رہ گئی۔

"کواڑ بند کر لے انیلا!" ابا کی آواز میں درد تھا یا اس کو لگا اس نے پلٹ کر دیکھا وہ سر جھکائے وضو کرنے لگے۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ماضی انسان کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا" آنکھ کھولو تو آج 'بند کرو تو بیتا کل۔۔۔ میرا کل بھی مجھے آج جینے نہیں دیتا۔۔۔ خوشیوں کی پازیب پہن کر ذرا رقص شروع ہوا نہیں اور تیز دھار آلہ ترنگ سفر کے سارے پر کلش ڈال دیتا ہے۔۔۔ شہ رگ میں اتار دیتا ہے زہر آلود خنجر۔۔۔ ماضی کی مری سانسیں حال میں دمے کے مریض کی طرح زور زور سے سانسیں کھینچتی ہیں دو پل اور دو لمحے اور پھر کتنی بے چینی رہتی ہے رات بھر۔۔۔ عمر بھر۔"

"کیوں زیادہ ماضی کیوں مور کے پیروں جیسا ہوتا ہے جب انسان ماضی دیکھتا ہے بالکل اسی طرح روتا ہے جیسے مور اپنے پیر دیکھ کر روتا ہے 'خوب صورت حال اس کو اپنی طرف مائل کیوں نہیں کر پاتا۔" آنسوؤں

سے آواز بھرائی تھی چاند کملا کر جیسے کسی درخت کی ٹہنی پر آرکا تھا۔

"ماضی کو آسیب نہ بناؤ نیلم اس کو سبق بناؤ۔۔۔ اسی سے نظریں چرا کر جب جب رقص کرنا چاہو گی وہ تم کو بار بار اپنی بدصورتی کا احساس دلانے کے لیے اپنے طرف متوجہ کرتا رہے گا۔۔۔ جب جب اس سے بھاگو گی وہ کسی کونے کھدرے سے نکل کر تم کو چونکا دے گا' ڈرا دے گا۔۔۔ اس کو اپنی زندگی کا حصہ جان کر آغوش میں سمیٹ لو یہ بھی تمہاری زندگی کا حصہ ہے ہر اندھیرے کے بعد روشنی ہے' ہر سیڑھی کے بعد منزل ہے۔۔۔ ہر غم کے بعد خوشی ہے' ہر آنسو کے بعد ہنسی ہے ہر پریشانی کے پاس آسانی ہے سوچو کہ تمہارے اس ماضی کے بعد حال بھی ویسا ہی ہوتا تو۔۔۔ جو رقص کرنے کو پنکھ نہ ہوتے، جو خوش ہونے کو ہنسی نہ ہوتی۔۔۔"

زیاد نے اس کا ستا چہرہ اپنی طرف موڑا تھا اس کی آنکھوں کو اپنی آنکھوں کے حصار میں لیا تھا۔ اس نے زیاد کی بات ختم ہونے سے پہلے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھا تھا۔

"میں مرجاتی۔" اس نے سر زیاد کے کشادہ سینے سے ٹکایا تھا۔

"محبت کو بانٹو میری جان محبت کے خراج کو نہیں۔"

"ہوں۔" وہ کہاں اس سے جیت پائی تھی۔

✿ ✿ ✿

افسانے وردِ محرومی کو دہرائے نہیں جاتے
کچھ ایسے زخم ہوتے ہیں جو دکھائے نہیں جاتے
تمنا' آرزوئے حسرت' امید وصل اور چاہت
یہ لاشے رکھ لیے جاتے ہیں دفنائے نہیں جاتے

وہ کپڑوں کی سلائی کر رہی تھی سلائی مشین کی گھر گھر بھی اس کی سوچوں کو منتشر نہیں کرپائی تھی جب آہٹ ہوئی تھی وہ دروازے پر کھڑے تھے۔ ہتھیلیوں میں جیسے پسینہ سا آیا تھا اماں کے انتقال کے بعد آج پورے چھ مہینے بعد شاید وہ پہلی مرتبہ اس کے کمرے تک آئے تھے سلائی مشین کی ڈراز سے اس نے مڑا تڑا غلام رسول کا نمبر نکال کر ہتھیلی میں دبایا تھا۔

"انیلا۔۔۔" نام کے بعد خاموشی تھی اس نے تھوک نگلا شک بھی کیا چیز ہوتا ہے نا دیوتا کو گناہ گار بنا دیتا ہے۔

"جی" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ "کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" جانے کیوں ان کی آواز بہت نحیف سی لگی تھی۔

"یا اللہ کب سے نہیں پوچھا' ابا آپ کیسے ہیں؟ طبیعت کیسی ہے؟ اماں کے بعد کیسے جیتے ہیں؟" کیسا خوف تھا جس نے ذہن' دل سب کو اپنے شکنجے میں لیا ہوا تھا۔

"جی" الفاظ جیسے کہیں کھو گئے تھے۔ انہوں نے تپائی قریب کھینچی اور اس پر بیٹھ گئے۔

"لوگوں کی باتیں تم کو بھی پریشان کرتی ہوں گی۔۔۔ مجھے بھی کرتی ہیں۔۔۔ چھوٹی سی گڑیا تھیں جب سینے سے لگا کر لایا تھا۔۔۔ ایک دفعہ بہت بیمار پڑ گئیں آٹھ مہینے کی تھیں ساری ساری رات میں اور تمہاری ماں گود بدل بدل کر جاگتے رہے تمہاری ماں روتی جاتی اور کہتی جاتی کیا جواب دوں گی دنیا کو۔۔۔ دنیا۔۔۔ اونہ۔۔۔ نماز فجر پڑھی تو تم میری گود میں تھیں اللہ سے دعا مانگی کہ جو ذمہ داری اٹھائی ہے اس کے لیے دنیا کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ دے دینا۔۔۔ دنیا۔۔۔ ہا۔۔۔ تم صحیح ہوئیں تو تمہاری اماں نے اپنی کانوں کی بالیاں بیچ کر مسجد میں پیسے بھجوا دیے اللہ کے شکریے کے لیے۔۔۔ چلنا شروع کیا تو ہاتھوں کے گھیرے میں رکھتے چوٹ لگ گئی تو دنیا کو کیا جواب دیں گے۔۔۔ دنیا۔۔۔ تمہاری ماں اکثر رات میں میرے کان میں سرگوشی کرتی رحیم صاحب دعا کرو ہم دونوں کی زندگی میں انیلا رخصت ہو' جب سمجھ نہیں آتا تھا وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر یہ دعا کیوں کرتی تھی۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔ تمہاری ایک ایک کہانی فوٹو کاپی کرواتی اور پھر میری راتیں کالی کرواتی کہ مجھے سنا تو دو میری بیٹی نے کیا لکھا ہے ورنہ دنیا کیا کہے گی جاہل ماں نے اپنی بیٹی کی کہانی نہ سنی۔۔۔ دنیا۔۔۔ میں نے تجھے

گود نہیں لیا تھا اکیلا اپنے صحن کی دیواروں میں آنکھیں اگائی تھیں دنیا کی آنکھیں' ان آنکھوں کے پھن تھے ان میں زہر تھا جب وہ آنکھیں ڈستیں تو ہم دونوں مل کر ڈھال بن جاتے۔۔۔ پر اب میں کمزور ہو گیا۔۔۔ میں تو تیری ڈھال بھی نہیں رہا۔

جانتا ہوں کیوں کمرے میں بند ہو گئی' پیدا نہیں کیا میں نے پر سینے سے لگا کر پالا ہے تجھے کاش تو کہتی ابا کہنے دو دنیا کو جو کہتی ہے میں تو تیری بیٹی ہوں۔۔۔ پر جانتا ہوں تو تو اس غم سے آج تک نہیں نکل پائی کہ یہ تیری اصل جگہ نہیں۔۔۔ تیری ہر کہانی میں یہی دکھ پھیلا ہے کہ ہم تیرے اپنے نہیں۔" ان کی آواز رندھ گئی کتنا چھوٹا لگ رہا تھا اس کو اپنا آپ' اس کو کیا نہیں ملا اس کا بدلا ان لوگوں سے کیوں لیتی رہی ہو وہ' اس نے خود کو کوسا تھا۔

"نہیں ابا ایسے نہ بولیں۔۔۔ میں بہت محبت کرتی ہوں آپ سے اماں سے۔" آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"تیری ماں پیسے جوڑتی رہتی۔۔۔ تیری کہانیوں کا ایک روپیہ حرام تھا۔۔۔ تو جو کپڑے سیتی اس کے پیسوں میں سے کبھی فیس وغیرہ دی تیری یا تیری ضرورت کا سامان' تجھ کو ذمے داری بتا کر لایا تھا۔۔۔ کوشش تو کی کہ اللہ کے آگے نادم نہ ہوں۔" انہوں نے جیسے اس کی بات سنی نہ ہو۔۔۔

"تھوڑا بہت میں نے بھی جیسے تیسے جوڑ لیا اس میں سب جمع پونجی رکھی ہے اور مکان کے پیپر بھی" انہوں نے خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"مجھے گھر سے نکال رہے ہیں ابا" اس نے ہاتھ جوڑے تھے کچھ خطاؤں کی معافی مانگنے کا وقت بھی جا چکا ہوتا ہے نا زندگی نے اس سے وہی خطا کروائی تھی ۔۔۔ ایسی آنکھوں پر پٹی باندھی تھی کہ جل نظر ہی نہ آیا صرف صحرا تھا۔۔۔ پیاس تھی۔

"نہ دھی' تجھ سے ایک گزارش کرنے آیا ہوں۔" وہ ابا کے پاس کھسک آئی۔

"آپ حکم ۔۔۔ دیں" انہوں نے نفی میں گردن ہلائی۔

"میں ایک بچے کو پڑھایا کرتا تھا۔۔۔ بہت عزت کرتا تھا میری وہ۔۔۔ بلکہ کرتا ہے اب تو بڑا آفیسر بن گیا ہے کل اس کے آفس گیا تھا اس سے بھیک مانگی ہے میں نے کہ وہ تجھ کو اپنا لے۔" انہوں نے جیسے اپنی غلطی بتائی ہو سر جھکا ہوا تھا۔

"ابا۔۔۔" اس کو شاک سا لگا۔

"کیسے کہتا تجھے کہ اپنے گھر واپس چلی جا جب کہ ان کو میں جان گیا تھا۔۔۔ آخری فیصلہ کر لیا تیری زندگی کا کوئی وعدہ نہیں مجھ سے کہ تو اس کے ساتھ بہت خوش رہے گی ۔۔۔ پھر بھی بھروسا کیا ہے اور اللہ پر بھی۔۔۔ اگر مجھ سے بھول ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

"آپ پر بھروسا ہے ابا' ویسے ہی اپنی نظروں میں گر گئی ہوں۔۔۔ زندگی بھر رونا بھی پڑا تو اف نہیں کروں گی۔"

"کل آئے گا وہ' دعا کرنا یہ سفر ایسا ہی ہو جیسا تو چاہتی ہے۔۔۔ میری دعا تو سدا تیرے ساتھ ہے" انہوں نے پیار بھری نظر اس پر ڈالی اور باہر نکل گئے اس نے ہاتھ میں پکڑی پرچی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے۔

"صحیح کہتے ہیں پیدا کرنے والے سے بڑھ کر پالنے والا ہوتا ہے۔۔۔ میں نہیں مانتی سگے رشتوں کو۔۔۔ خون کے رشتوں کو' مجھے تو میرے پالنے والوں نے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا اور میں کتنی ناقدری نکلی کن لوگوں کا ماتم مناتی رہی۔" وہ سسک رہی تھی دیواریں جیسے اس کو دلاسا دے رہی تھیں۔

✲ ✲ ✲

دوسرے دن وہ ان کے صحن میں بیٹھا تھا سفید شلوار قمیص بالکل سادہ۔۔۔ بالکل ابا کی طرح۔ ابا کرسی پر بیٹھے دھیرے دھیرے اس سے کچھ بول رہے تھے وہ اثبات میں سر ہلا رہا تھا جانے اس نے ابا کا ہاتھ پکڑ کر کیا کہا ابا نے نفی میں سر ہلایا تھا اور اپنے گالوں کو خشک کیا

تھا اور اٹھ کر کمرے کی طرف آئے تھے۔
"وہ تم سے ملنا چاہتا ہے اندر بھیج دوں۔"
"بابا مجھے آپ کا ہر فیصلہ قبول ہے پھر یہ سب۔۔۔"
وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہوئی۔
"چلو وہ چاہتا ہے۔۔۔ کوئی بات نہیں۔" جانے کیوں ابا نظریں چرا رہے تھے یا اس کو لگا اس نے دوپٹا اچھی طرح اپنے ارد گرد لپیٹا تھا۔
"السلام علیکم۔" آنے والے نے سلام کیا تھا۔
"وعلیکم السلام" کیا سینے کے پنجرے سے آواز باہر آئی تھی اس کو خود نہیں پتا تھا۔
"زیادہ وقت نہیں لوں گا آپ کا ابا نے بتایا آپ زیادہ بولنا پسند نہیں کرتیں بس ایک بات کلیئر کرنا چاہتا تھا کوئی احسان نہیں میرا کسی پر بھی ماسوائے آپ کے ابا کے جنہوں نے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔۔۔ میں کوئی دیوتا نہیں عزت دے کر آپ کو یہاں سے لے کر جاؤں گا میں چاہتا ہوں ابا ہمارے ساتھ چلیں۔۔۔ آپ بھی ان کو منانے کی کوشش کیجیے گا۔۔۔ جو روکھی سوکھی کھاتا ہوں ہم سب مل بانٹ کر کھالیں گے۔" وہ ہنسے تھے۔
"شکریہ" انیلا کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ اٹکا تھا۔
"My pleasure۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں ہنستے تھے دوبارہ اس نے نظریں اٹھا کر ان کے چہرے پر ڈالیں۔۔۔ پر سکون چہرہ بولتی آنکھیں محبت بھرا لہجہ اس کی زندگی میں دو مرد آئے اور دونوں ہی یکساں وہ بھی ہلکی پھلکی ہو کر مسکرا دی وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔
کتنی باتیں سوچ کر رکھی تھیں اس نے کہ منتیں کر لے گی اس سے بولے گی کہ گھر کے کسی کونے میں پڑی رہے گی بس ابا کو ساتھ لے چلیں ساری عمر خدمت کرے گی اس کی کوئی شکوہ نہیں کرے گی پر جیسے کسی بات کی ضرورت ہی نہ پڑی ہو۔ "کیا معجزے ایسے ہوتے ہیں۔" وہ اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہاں معجزے اس ہی دنیا میں ہوتے ہیں ابا کو یقین تھا میں خوش رہوں گی ابا میرے لیے دل سے دعا کرتے تھے میں بے یقین تھی پر میں نے ان بوڑھے کندھوں کو بھروسے سے تنے دیکھا تھا۔

میں جتنی تنگ دل تھی وہ اتنے ہی کشادہ دل تھے ۔۔۔ہاں میں ان کی اولاد نہیں تھی کچھ اثر خون کا بھی تو ہوتا ہے نا میں تنگ دل، بے یقین ماں باپ کی بیٹی تھی جس نے اپنی آدھی زندگی شکوے شکایتوں میں گزار دی۔ اماں کو خوش کر پائی نہ ابا کو سہارا دے پائی۔۔۔ پر ان دونوں کی دعائیں میری ڈھال بنی رہیں دنیا کی زہریلی نظروں سے بچایا مجھے بس یہ قلق ساری زندگی کھاتا اگر زیاد مجھے اپنی زندگی کا حصہ نہ بنا لیتے۔" جب بھی میں اپنی غلطیوں پر نادم ہوتی میرے ماتھے پر دھیرے سے اپنے لب رکھ دیتے۔

"اللہ بڑا بادشاہ ہے توبہ کرلو تو سب معاف ہو جاتا ہے اور ابا اماں تو تم سے ناخوش ہی نہیں تھے ان کے لیے تو یہی بہت تھا کہ تم نے ان کی سونی زندگی میں رونق کر دی۔ ان کے لیے دعائیں کیا کرو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنو، چلو کل اماں ابا کی قبر پر چلیں گے اور ان کے لیے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کریں گے۔" میں ان کی آنکھوں میں دیکھتی رہتی اور پھر سینے میں سر چھپا کر زار زار روتی وہ چپ نہیں کراتے تھے میرے سینے میں جمع یہ ناسور نکل جانے دیتے بس بالوں کو سہلائے جاتے اور بوسہ دیے جاتے یہاں تک کہ ساری کدورت بہہ جاتی۔

"ابا میرے ساتھ آنا نہیں چاہتے تھے نا۔" میں آنکھیں صاف کر کے ان کی طرف دیکھتی۔

"وہ مطمئن ہو گئے تھے۔۔۔ شاید انہوں نے تمہارا مستقبل دیکھ لیا تھا۔۔۔ کیا تم خوش نہیں؟" وہ سوال کرتے تو میں اپنے سر کو اثبات میں ہلا کر آنکھیں موند لیتی۔

☆ ☆ ☆

دوسرے دن زیاد چند لوگوں کے ساتھ آئے تھے۔

"بولو بیٹا قبول ہے۔" اس نے نظریں گھما کر ابا کو ڈھونڈا تھا ابا آگے بڑھ آئے۔

"بولو بیٹا۔"

"ابا آپ ساتھ چلیں گے نا" اس نے منت کی رات بھر اس نے ابا سے ایک ہی سوال کیا تھا پر وہ نہ مانے تھے کہ۔

"یہاں سے تمہاری اماں کی خوشبو آتی ہے اس نے ساری زندگی اس نے میرے ساتھ وفا کی میں اس سے بے وفائی کیسے کر سکتا ہوں۔"

"قبول ہے بولو انیلا۔" انہوں نے جیسے حکم دیا زندگی کا پہلا حکم۔

"قبول ہے۔" اس نے نکاح نامے پر دستخط کیا اس گھر سے وداع ہوتے ہوئے ابا کی نظروں اور اس چھوٹے سے آنگن کے در و دیوار سے جیسے آواز سی آ رہی تھی۔

"تم ایسا کرنا
کوئی جگنو
کوئی ستارہ سنبھال رکھنا!
میرے اندھیروں کی فکر چھوڑو
بس اپنے گھر کا خیال رکھنا!
ہماری آنکھوں نے جو مل کے دیکھے
وہ سارے سپنے سنبھال رکھنا!
نہ رنگ آنکھوں کا لال رکھنا
نہ ویران ویران سا حال رکھنا!
یہ جدائی اپنی تو عارضی ہے
نہ دل میں اس کا ملال رکھنا!
تمہاری سانسیں
تمہاری دھڑکن
سنو!
ہماری امانتیں ہیں
ہماری خاطر ہی جان جاناں۔۔۔!
ہمیشہ۔۔۔
اپنا خیال رکھنا۔۔۔

"پاپا چلیں نا۔" اس نے جاتے جاتے کہا تھا۔

"وعدہ کل چلوں گا۔" انہوں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا پر غضب کیا جو تیرے وعدے پر اعتبار کیا وہ کل کبھی نہیں آئی۔ رات ہی ابا کے ایک دوست کا فون آگیا جو کہ پڑوسی بھی تھے کہ ابا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے جلدی آجاؤ اور وہ جب تک آئی ابا پرسکون نیند سو چکے تھے ابا پرسکون سے چارپائی پر لیٹے تھے وہ ان کے قریب چلی آئی ایسا لگا کہ انہوں نے دیواروں میں لگی ساری نظموں کے پھن کاٹ ڈالے تھے ساری نظریں پھوڑ ڈالی تھیں۔

"یہ وعدہ خلافی ٹھیک نہیں ابا۔" وہ ان کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

"یہ وعدہ خلافی ٹھیک نہیں۔" زیاد نے اس کو سنبھال لیا تھا ابا کو اس ہی بات پر یقین تھا جبھی انہوں نے اتنی آسانی سے قضا کی آواز پر لبیک کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہم کل گھر جا رہے ہیں۔" زیاد نے شیشے میں کھڑے ہو کر بال بنائے اور پھر کنگھا اس کی طرف اچھالا تھا وہ کاغذ کالے کرنے میں مصروف تھی۔

"گھر؟" نظموں نے سوال کیا تھا اس نے پین بند کیا تھا۔ "کس کے گھر؟"

"تمہارے گھر۔ کل تو گئے تھے ابھی رنگ وغیرہ ختم ہوا ہے۔" اس نے سوال کیا۔

"انیلا تمہارے ماں باپ کے یہاں۔" وہ اس کے آگے آکر بیٹھے تھے۔

"میرے اماں ابا اب نہیں ہیں زیاد۔" وہ جان کے بھی انجان بنی۔

"چلو پھر میرے ساس سسر کے گھر چلی چلو۔" وہ ہنس دیے۔

"یہ سب آپ کے لیے مذاق ہے زیاد۔"

"نہیں یہ سب میرے لیے حقیقت ہے جن سے تم نظریں چرا رہی ہو۔"

"نظریں میں نہیں' نظریں انہوں نے چرائیں۔"

اس کی آواز بہت دھیمی ہوئی تھی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

"وہ نظریں نہیں چراتے تو آج آپ مسز زیاد نہ ہوتیں۔ اللہ کے کام وہ ہی جانے تم گناہ ثواب کا موازنہ نہ کرو۔ بہرحال میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں روز قیامت اس ماں کے نام سے اٹھائی جاؤ گی ایسا نہ ہو' تمہارے حساب بھی کوئی غلطی نکل آئے۔"

"ڈرا رہے ہیں۔"

"یہی سمجھ لو' میں تو جاؤں گا ان کی مدد ہمارا فرض ہے' تم جانو تمہارا کام جانے۔" اس نے انتہا سے زیادہ لاپروائی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"کب جانا ہے۔" انیلا نے پیچھے سے ان کا ہاتھ پکڑا تھا۔

"میری اچھی بیوی۔" انہوں نے انیلا کی چھوٹی سی ناک پکڑی "کل۔"

"ٹھیک ہے۔"

"اور ہاں تین دن بعد کوئی میگزین والے تمہارا انٹرویو لینے آنے کا کہہ رہے ہیں میں نے ڈائری میں لکھ دیا ہے سب۔"

"مجھے نہیں دینا کوئی انٹرویو۔" وہ قلم ایک طرف پھینک کر بستر پر اوندھی لیٹ گئی تھی اور فضا میں زیاد کی ہنسی کی جھنکار تھی۔

☼ ☼

مکمل ناول

دوسری اور آخری قسط

وقت کا کام ہے گزرنا اور وہ اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا ہی رہتا ہے۔ علیزے آج کل بری طرح اپنے فائنل ایگزام میں مصروف تھی اور ہمیشہ ہی سے اسے پڑھائی کے وقت اپنے اردگرد کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ بس کتابیں، یونیورسٹی اور اپنے کمرے تک ہی اس کی دنیا محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اوپر سے حمزہ کے پاپا نے جلدی مچا رکھی تھی کہ بس بہت ہو گیا اب وہ اپنی بہو کو جلد از جلد اپنے گھر میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے سب ہی کو یہ کہلا دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ علیزے کے ایگزام ختم ہونے کے اگلے ہفتے ہی شادی کے دن رکھ دیے جائیں۔ اب وہ مزید انتظار نہیں کر سکتے اور ویسے بھی ان کے نکاح کو تقریباً" سال بھر سے بھی اوپر ہو چکا تھا مگر علیزے نے چپکے سے ماما سے کہہ دیا تھا کہ ایگزام کے کم از کم ایک دو مہینے تک وہ ایسا نہیں چاہتی۔

"ماما' پلیز' کچھ دن مجھے پڑھائی کی تھکن تو اتارنے دیں۔"

وہ روہانسی ہوئی تو ماما بھی مان گئی تھیں۔ وہ خود بھی اتنی جلدی نہیں چاہ رہی تھیں۔ اس کی جدائی کے خیال سے ابھی سے ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں ہمیشہ ہی سے علیزے اپنی پڑھائی میں اس قدر مصروف رہی تھی کہ وہ ڈھنگ سے کبھی بھی کسی بات میں دلچسپی ہی نہیں لے پائی تھی اور اب جبکہ وہ پڑھائی سے فارغ ہوئی تو تھوڑا وقت اطمینان سے گھر والوں کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی اور ماما بھی ایسا ہی چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ ابھی دو مہینے تک ایسا نہیں چاہتی ہیں اور پھر تیاری میں بھی تو کچھ وقت لگنا ہی تھا نہ۔ جواب میں حمزہ کا ملنے والا مسیج۔

"پلیز مان جاؤ نا۔" پڑھ کر وہ دیر تک مسکراتی رہی تھی۔

"بس صرف دو مہینے پلیز۔" علیزے کے جواب سے وہ آسانی سے مان بھی گیا تھا۔

کیونکہ جانتا تھا کہ بہرحال آنا تو اسے میرے پاس ہی ہے۔

پھر جس دن اس کا لاسٹ پریکٹیکل تھا اس رات کو ہی ماما نے اسے کہہ دیا تھا کہ کل وہ ان کے ساتھ بازار جائے گی اور اپنی پسند سے شاپنگ کرے گی۔ ورنہ وہ خود ہی اپنی مرضی سے سب کچھ خرید لیں گی۔ پھر تم شکایت مت کرنا کہ مجھے یہ پسند نہیں آرہا اور یہ اچھا نہیں ہے۔

"او کے ماما چلیں گے۔" کہنے کے بعد وہ کمبل منہ تک تان کر سو گئی تھی اور اگلا ایک ہفتہ اچھی طرح تھکن اتارنے کے بعد وہ آج صبح ماما کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی تھی۔ آج موسم بھی بہت اچھا تھا۔ صبح سے ہی بادلوں کا آنا جانا لگا تھا۔ دھوپ کبھی تیز ہو جاتی تھی اور کبھی بالکل مدھم پڑ جاتی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ معاذ بھی آج آفس کے کام سے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اسے شام تک آنا تھا اور بابا بھی آج

لنچ کے لیے نہیں آنے والے تھے انہیں کوئی ضروری
کام تھا۔ اس لیے وہ دونوں اطمینان سے شاپنگ کرنے
نکلی تھیں۔ اگلے ہفتے ماما کے رشتے داروں میں کوئی
شادی تھی۔ ماما کو ان کے لیے گفٹ لینا تھا۔ ماما کوئی
سوٹ وغیرہ لینا چاہ رہی تھیں گفٹ میں دینے کے لیے
اس لیے وہ کپڑوں کی شاپ پہ آگئی تھیں۔ واپسی پہ
انہیں جیولر کے پاس جانا تھا۔ وہیں ایک دو دکانیں
چھوڑ کر ٹیلر کی شاپ تھی۔ علیزے نے سوچا کہ ٹیلر
سے اپنے کپڑے لے لے۔

"ماما آپ جب تک سوٹ پسند کریں میں ذرا ٹیلر
سے اپنے کپڑوں کا پتا کر آؤں۔" ماما کو کوئی سوٹ پسند
ہی نہیں آرہا تھا۔ اس نے سوچا کہ جب تک ماما اپنا کام
کریں گی وہ اپنا کام کر آئے گی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ دھیان سے جانا۔"

ماما اسے تاکید کرکے پھر سے دکاندار کی طرف متوجہ
ہوگئیں تو وہ دکان سے باہر نکل آئی تھی۔ ٹیلر کا وہی
ہمیشہ والا جواب تھا۔

"باجی بس آپ کے کپڑوں میں تھوڑا سا کام رہتا
ہے۔ اگر آپ آدھا گھنٹہ انتظار کریں تو میں سارے
دے دیتا ہوں آپ کو۔ بس آدھا گھنٹہ۔" وہ خوشامدانہ
انداز میں بولا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ سارے کپڑے تیار کرکے رکھیں
میں آدھے گھنٹے بعد آکے لیتی ہوں۔" وہ جانتی تھی کہ
آدھا گھنٹہ تو ماما کو لگ ہی جائے گا اور واپسی پہ وہ کپڑے
لیتی جائے گی۔

علیزے باہر نکل آئی تھی۔ اس نے آسمان پہ ایک
نگاہ ڈالی بادل پھر سے دھیرے دھیرے جمع ہو رہے تھے۔

"لگتا ہے آج بارش ضرور ہوگی۔"

یہی سوچتے ہوئے ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھی
تھی کہ ایک گاڑی بالکل اس کے قریب آکے رکی تھی
اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتی گاڑی کا دروازہ کھلا اور
کسی نے تیزی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے گاڑی کے
اندر دھکیل دیا تھا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ
اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس کے منہ پر
رکھے رومال سے عجیب سی مہک آرہی تھی۔

"کام ہو گیا ہے سر۔" ہوش سے بیگانہ ہونے
سے پہلے اس نے جو آخری بات سنی وہ یہی تھی۔

✿ ✿ ✿

لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو اس جگہ جمع ہو چکا تھا۔
جہاں سے ابھی دن دہاڑے ایک لڑکی کا اغوا ہوا تھا مگر
کوئی کچھ کر نہیں رہا تھا۔ سب بس اپنی اپنی ہانک رہے
تھے۔

"یا اللہ خیر کرنا پتا نہیں کیا ہوا ہے۔" آصفہ بھی
دوکان سے باہر نکل آئیں۔

"جانے علیزے کہاں رہ گئی۔" ان کے وہم
و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کیا ہو چکا ہے۔ وہ سمجھیں
شاید کوئی ایکسیڈنٹ وغیرہ ہوا ہے اور علیزے تو ٹیلر
کے پاس گئی تھی۔

"کیا ہوا ہے بھائی۔" انہوں نے پاس سے گزرتے
ایک آدمی سے پوچھا تھا۔ وہ اس ہجوم سے گزرنے کا
راستہ دیکھ رہی تھیں تاکہ وہ ٹیلر کی دوکان تک علیزے
کے پاس پہنچ سکیں۔ وہ پریشان ہو رہی ہوگی۔

"اللہ معاف کرے۔ بہن کیسے دن آگئے ہیں۔
جانے کون لوگ تھے ایک بچی کو اٹھا کرلے گئے ہیں۔"
وہ باریش سا آدمی بتا کر آگے بڑھ گیا اور جانے کیوں
آصفہ کے دل کی دھڑکن یکدم ہی تیز ہو گئی تھی۔

"بچی! یا اللہ رحم کرنا۔" بے ساختہ ہی ان کے لبوں
سے نکلا تھا اور بے تحاشا تیزی سے ہجوم کے اندر گھستی
چلی گئیں۔

"جانے کون تھی بے چاری لڑکی بڑا ظلم ہوا۔"
جس آدمی نے یہ کہا تھا آصفہ کی نگاہیں اس آدمی
کے ہاتھ میں موجود براؤن لیدر کے شولڈر بیگ پہ
تھیں۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔

"یہ۔۔۔ یہ کس کا ہے۔" ان کی آواز واضح کانپ
رہی تھی۔

"فرش پہ پڑا تھا جی شاید اس لڑکی کا ہے۔ جسے اٹھا
کرلے گئے ہیں۔" آصفہ نے تیزی سے اس کے

ہاتھ سے وہ بیگ جھپٹ لیا تھا۔

"کون تھی وہ آپ جانتی ہیں۔"

آصفہ نے سنا ضرور تھا پر یہ نہیں دیکھا کہ یہ کس نے کہا تھا وہ تو بس اس بیگ کو دیکھ رہی تھیں اور ان کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اتھاہ گہرائی میں۔ آنکھوں کے آگے دھند کی چادر تن گئی تھی۔

"ہاں جانتی ہوں میں کون تھی وہ۔ کوئی اور نہیں میری بیٹی تھی وہ" وہ دھیرے سے بڑبڑائیں۔

اور پھر مجمع سے مختلف آوازیں آنے لگیں۔ مگر کوئی کچھ کر نہیں رہا تھا۔ سب ایک ماں کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ جو ویران آنکھوں سے اس بیگ کو دیکھ رہی تھی جو نہیں جانتی تھی کہ اس کی معصوم بیٹی کس جرم کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ عجیب بے حس ہو چکے ہیں ہم لوگ۔ جب خود پہ گزرے تو بہت تکلیف ہوتی ہے اور کسی دوسرے کی بے بسی کا تماشا ہم بہت آسانی سے دیکھ لیتے ہیں اور پھر آصفہ نہیں جانتی تھیں کہ کس طرح انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے علیزے کے بیگ سے اس کا سیل فون نکال کر شہاب زیدی کو اطلاع دی تھی انہیں صرف یاد تھا تو اتنا کہ شہاب زیدی نے آکر ان کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ ان کی بانہوں میں ڈھے گئیں۔

☆ ☆ ☆

شہاب زیدی کس طرح آصفہ کو لے کر گھر پہنچے تھے یہ صرف ان کا دل جانتا تھا۔ کانپتے اور بے تحاشا دھڑکتے دل کے ساتھ وہ صرف یہ سوچ رہے تھے کہ یہ ان کے ساتھ کیا ہو گیا تھا اور کیوں ہوا ہے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ انہوں نے خود ہی تو آفس پہنچنے کے بعد گاڑی اور ڈرائیور کو بھیجا تھا کہ ڈرائیور انہیں بازار چھوڑ آئے۔ ڈرائیور ان دونوں کو بازار چھوڑنے کے بعد واپس ان کے پاس آفس آگیا تھا کیونکہ انہیں ایک ضروری میٹنگ میں جانا تھا۔ واپسی پہ انہیں خود ہی گھر جانا تھا۔

گاڑی سے ہی شہاب زیدی نے معاذ کو کال کی تھی اور اسے جلد از جلد ایمرجنسی میں گھر پہنچنے کو کہا تھا وہ آفس کے فیلڈ ورک کے لیے شہر سے باہر تھا۔ وہ پوچھتا ہی رہا کہ کیا ہوا ہے۔ مگر انہوں نے اسے فون پہ کچھ نہیں بتایا۔ انہوں نے بمشکل آصفہ کو لاؤنج میں ایک طرف رکھے صوفے پہ لٹایا اور خود بے چینی سے ادھر ادھر چکراتے ہوئے معاذ کا انتظار کرنے لگے تھے۔

انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔

"پانی' پانی۔" آصفہ کی آواز دھیرے سے ان تک پہنچی تھی۔

"علیزے آگئی کیا شہاب۔" پانی پیتے ہی جو ذرا سے حواس بحال ہوئے تو انہوں نے پہلا سوال یہی کیا تھا وہ سر جھکائے نڈھال سے بیٹھے تھے وہاں بھرے مجمع میں اسے اٹھا کر لے گئے ورنہ کم از کم اسے جا کر کہیں ڈھونڈ ہی لیتے۔

"کچھ کریں' میری بیٹی مجھے واپس لا دیں پلیز۔ وہ کون لوگ تھے اسے کیوں لے گئے وہ تو بہت معصوم ہے۔ ہائے میں نے اسے کیوں جانے دیا تھا اپنے پاس سے کچھ کریں پلیز میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ پلیز اسے لے آئیں۔"

"آصفہ' حوصلہ کریں اسے کچھ نہیں ہو گا بہت جلد ہماری بیٹی ہمارے پاس ہو گی تم فکر مت کرو۔" انہوں نے روتی ہوئی بیوی کا سر تھپکا تھا۔ حالانکہ ان کا اپنا دل بے بسی کے مارے خون کے آنسو رو رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے بابا؟ سب خیریت تو ہے۔"

ڈیڑھ گھنٹے کا سفر جتنی تیزی سے وہ مختصر طے کرتا ہوا گھر تک پہنچا تھا یہ صرف اس کا دل جانتا تھا۔ کتنی ہی بار ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ بابا تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آئے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں بابا آپ۔"

بابا کے منہ سے نکلنے والی بات نے اس کے حواس گم کر دیے تھے۔

"کچھ کرو بیٹا بہن کو واپس لاؤ۔ یا اللہ یہ کیا ہو گیا ہمارے ساتھ۔ یا اللہ رحم کر۔"

"بابا حوصلہ کریں میں آگیا ہوں نا۔ سب ٹھیک

ہو جائے گا۔ آپ پلیز روئیں مت۔"

وہ بابا کو چھوڑ کر ماما کے پاس آگیا تھا۔ ان کے آنسو پونچھ کر انہیں سینے میں بھینچ لیا تھا کتنے ہی لمحے خاموشی کی نذر ہوئے تھے۔

"بابا میرا خیال ہے ہم پولیس کو انفارم کرتے ہیں۔"

چند لمحوں بعد معاذ کی آواز نے خاموشی کو توڑا تھا۔

"نہیں معاذ ایسا سوچنا بھی مت بات اگر پولیس تک پہنچی تو اسے پورے شہر میں پھیلتے دیر نہیں لگے گی۔" بابا نے یکدم ہی اسے روک دیا تھا۔

"تو اور کیا کریں بابا اور کوئی طریقہ بھی تو نہیں ٹریس کرنے کا۔ میرا ایک دوست ہے وہ انٹیلی جنس میں ہے۔ میں اسے کال کرتا ہوں۔ وہ اپنے طریقے سے سب ہینڈل کرے گا۔" معاذ فوراً" ہی موبائل نکال کر نمبر پریس کرنے لگا تھا۔

"ٹھہرو معاذ" بابا کے ٹوکنے پر وہ نمبر پریس کرنا روک کر انہیں خاموشی سے دیکھنے لگا تھا۔

"صبر کرو۔ کچھ وقت گزرنے دو۔ ہوسکتا ہے وہ لوگ خود ہم سے رابطہ کریں۔ کہ وہ کیا چاہتے ہیں کچھ دیر صبر کرو بیٹا۔ بات ابھی گھر میں ہے اگر گھر سے نکل گئی تو بہت بڑھ جائے گی۔ میری بیٹی کی زندگی کا سوال ہے۔ ایسے معاملات جلد بازی سے نہیں سمجھداری سے حل کرنے چاہییں۔" پل بھر میں ان کی ساری توانائی نچڑ کر رہ گئی تھی۔ وہ نڈھال سے بیٹھے تھے۔

"ٹھیک ہے بابا۔ تھوڑی دیر دیکھ لیتے ہیں۔ آپ حوصلہ رکھیں' ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ دونوں کو ہی سنبھالے بیٹھا تھا۔ یہ بیٹھے بٹھائے کسی قیامت ٹوٹ پڑی تھی ان پہ کہ وہ کسی سے فریاد بھی نہیں کرسکتے تھے۔

☆ ☆ ☆

علیزے نے بہت مشکل سے اپنی بوجھل آنکھوں کو کھولا تھا۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا تھا۔ وہ ایک دم ہی اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کا سر بھاری ہو کر چکرا رہا تھا۔ وہ کتنے ہی لمحے چکراتے سر کو تھامے بیٹھی رہی تھی۔ ارد گرد نگاہ دوڑانے پہ چند لمحوں تک وہ تو سمجھ ہی نہیں پائی کہ وہ کہاں ہے۔ پھر یکدم ہی دل میں کسی انہونی کا احساس جاگا تھا اور جب ذرا نگاہیں کمرے کے اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو اسے احساس ہوا کہ یہ کمرا اس کا نہیں ہے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکا اور پھر اسی پل اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور نگاہوں میں صبح کا واقعہ کسی فلم کی طرح گھوم گیا تھا۔ وہ فوراً" ہی بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال بکھر گئے تھے اور دوپٹہ بے ترتیب تھا۔ اس نے سرعت سے دوپٹے کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔

"ماما' ماما بھی تو میرے ساتھ تھیں۔" اس کے ذہن میں ابھرنے والی پہلی سوچ یہی تھی کمرے کی کھڑکیاں' دروازہ سب بند تھے۔ وہ تیزی سے دروازے تک پہنچی تھی۔

"یا اللہ یہ میں کہاں آگئی۔ یا اللہ میری مدد کر!"

"کھولو پلیز دروازہ کھولو۔ کوئی ہے۔ پلیز دروازہ کھولو۔"

اس نے پوری قوت سے دروازہ کھٹکھٹایا تھا مگر دوسری طرف صرف سناٹا تھا وہ بھاگ کر دیوار گیر کھڑکی کی طرف آئی تھی مگر کتنی ہی کوششوں کے باوجود وہ کھڑکی کھلی ہی نہیں تھی۔ وہ تھک ہار کر پھر سے دروازہ پیٹنے لگی تھی۔

"دروازہ کھولو پلیز۔ مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہو۔ پلیز مجھے جانے دو۔ کوئی ہے۔ پلیز کوئی تو جواب دو۔"

آنسو ایک تواتر سے بہہ رہے تھے پیاس سے جیسے حلق میں کانٹے سے اگ آئے تھے۔ لیکن دوسری طرف ہنوز خاموشی تھی۔ وہ کتنے ہی لمحے چیخنے کے بعد وہیں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھتی چلی گئی تھی۔ اس کے رونے میں شدت آگئی تھی۔

"یا اللہ کسی طرح مجھے یہاں سے نکال دے میرے مالک۔ میرے گھر پہنچادے۔ میرے ماما' بابا میرے

بھائی کے پاس۔ وہ لوگ کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے۔ کیا کروں کیسے نکلوں یہاں سے۔ میں نے تو کبھی کسی کے ساتھ بھول کر بھی کچھ برا نہیں کیا۔ کبھی بھی کس کا برا نہیں چاہا پھر میرے ساتھ یہ کیوں......"

وہ گھٹنوں میں سر دیئے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ کلائی پہ بندھی گھڑی شام کے چار بجا رہی تھی اور وہ صبح گیارہ بجے کی گھر سے نکلی تھی۔

ایسے بیٹھے ہوئے جانے کتنی دیر گزری تھی کہ دروازے کے دوسری جانب کھٹکا سا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا تھا' علیزے کے پورے وجود میں کپکپاہٹ سی اتر آئی تھی۔ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔

"تو تمہیں ہوش آگیا۔" دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی سکڑی سمٹی سی علیزے پہ ایک نگاہ ڈال کر بولا تھا۔

"ک...... کون ہو تم۔" اس کی آواز بمشکل نکلی تھی۔

آنے والے کا چہرہ مکمل طور پر نقاب میں چھپا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں اور ان آنکھوں سے علیزے کو دہشت ہو رہی تھی۔ وہ بنا اسے کوئی بھی جواب دیئے موبائل پہ کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا تھا۔

"ہاں ہوش آگیا ہے اسے۔ اب بتاؤ کیا کرنا ہے۔"

دوسری طرف کال پک ہوئی تو اس نے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہے اور کچھ۔" دوسری طرف سے جانے کیا ہدایت ہوئی تھی۔

"پھر اپنے پاس رکھنے کا فائدہ۔ ویسے مال ہے بہت قیمتی۔"

اس نے ایک بھرپور نگاہ علیزے پہ ڈالی تھی' جو سر جھکائے کھڑی تھی۔

"او کے ٹھیک ہے۔ جیسا تم کہو ویسا ہی ہوگا۔ ویسے بھی میرا اس سے کوئی لینا دینا نہیں ہے آپ خوش تو ہم خوش۔"

دوسری طرف سے شاید اسے سختی سے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانا۔

"دیکھو مجھے جانے دو پلیز' میرا قصور کیا ہے' مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔ میرے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ تمہیں جو بھی چاہیے میرے بابا سے لے لو مگر مجھے جانے دو۔ میں تو تمہیں جانتی بھی نہیں ہوں۔"

وہ فون بند کر کے جب اس کے پاس آیا تو علیزے نے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

"دیکھو لڑکی۔ ویسے جی تو نہیں چاہتا کہ تمہیں ایسے ہی جانے دوں مگر تم بے فکر رہو۔ ہمیں سختی سے آرڈر ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا ہے۔ تو جب ہمارا کام ہو جائے گا تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے اور یاد رکھو جتنی جلدی ہمارا کام ہوگا۔ ہم اتنی جلدی تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیں گے اور جتنی دیر ہمارے کام میں لگے گی تمہیں اتنی ہی دیر یہاں لگے گی اور اب بار بار دروازہ مت بجانا' کوئی نہیں بار بار کھولے گا سمجھیں۔"

اس نے پستول کی نال اس کی پیشانی پر رکھ کر اسے وارن کیا تھا اور باہر نکل کر دروازہ لاک کر دیا تھا۔ بے بسی کے مارے اس کی آنکھیں پھر سے چھلک گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"بس بابا اب مجھ سے اور انتظار نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے اب ہمیں پولیس کو انفارم کر دینا چاہیے۔ شام ہونے والی ہے اور کچھ اتا پتا نہیں ہے اور نہ ہی ان کا کوئی فون وغیرہ آیا ہے۔ ہم کب تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔"

کب سے خاموش بیٹھے معاذ کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"آپ لوگ کب تک ایسے بیٹھے رہیں گے کچھ کرتے کیوں نہیں ہیں۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ جانے کس حال میں ہوگی میری بیٹی" آصفہ قدرے غصے سے

بول کر پھر سے رونے لگی تھیں جوں جوں وقت گزر رہا تھا ان کے جسم سے جیسے جان نکلتی جارہی تھی۔

"بابا آپ نے احتشام انکل کو بتایا۔" معاذ کو اچانک ہی ان کا خیال آیا تھا۔

"نہیں بیٹا۔" وہ سر جھکائے خاموشی سے بیٹھے تھے۔

"ہمیں انہیں بتادینا چاہیے بابا۔"

"نہیں بیٹے مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ میں کیسے اپنے منہ سے۔۔۔" بے بسی کے مارے انہوں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا تھا۔

"ہاں معاذ انہیں ابھی کچھ مت بتانا۔ کیا جانے وہ کیا سوچیں۔ ابھی انہیں کچھ مت بتانا۔ ابھی کسی کو کچھ مت بتانا۔ ورنہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی میری بیٹی قصوار کہلائے گی۔"

کہتے کہتے آصفہ کی آواز رندھ گئی تھی۔ تیزی سے ملتے لبوں پہ اب اللہ کے کلام کے ساتھ بیٹی کی سلامتی کی دعائیں بھی گردش کررہی تھیں۔

"بابا میں رضا کو فون کرنے لگا ہوں۔" معاذ نے ٹیبل سے فون اٹھایا تھا۔ رضا اس کا وہی دوست جو انٹیلی جنس میں تھا۔

"نہیں بیٹا ابھی کچھ دیر رکو کچھ دیر اور۔ میرا دل نہیں مانتا میں کیسے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو بدنامی کے گہرے کنوئیں میں دھکیل دوں۔ میں جانتا ہوں اس وقت ہم سب جس اذیت سے گزر رہے ہیں مگر بیٹا ہم لوگ بہت مجبور ہوگئے ہیں۔ بہت مجبور۔۔۔"

گھر کی دیواریں جیسے ان پہ گرنے کو تھیں پل بھر میں جھک سے گئے تھے۔

"مگر بابا کب تک ہم۔۔۔"

معاذ کی بات ابھی ادھوری تھی کہ گھر کے دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ اتنی دیر سے کسی کو ہوش ہی نہیں تھا کہ اٹھ کر کوئی دروازہ بند کرلیتا اور پھر جانے کس آس پہ دروازہ کھلا رکھا تھا۔ کھلے دروازے سے آنے والے کو دیکھ کر وہ تینوں ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ جس لمحے سے بچنے کے لیے وہ تینوں چھپے بیٹھے تھے۔ وہ لمحہ آن پہنچا تھا۔

احتشام انکل وہیں سے کچھ کہتے ہوئے ان تک آئے تھے۔

"انکل آپ۔۔۔" معاذ ہی ان کی طرف بڑھا تھا۔ وہ دونوں گنگ سے کھڑے تھے۔

"کیا بات ہے شہاب کیا ہوا ہے اور علیزے کہاں ہے۔"

ان کے دل کو کسی انہونی کا فوراً" احساس ہوا تھا اور شہاب زیدی جو کب سے خاموش ضبط کیے کھڑے تھے۔ ان سے لپٹ کر انہیں ساری بات بتاگئے تھے۔ کیونکہ اب کچھ بھی چھپانا بے کار تھا۔

"کیا۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو تم ہوش میں تو ہو۔" وہ بوکھلا کر انہیں دیکھ رہے تھے۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ایک قیامت ہے جو بن بلائے بنا کسی قصور کے ہم پہ ٹوٹ پڑی ہے۔" ان تینوں کی نڈھال حالت دیکھ کر انہیں بالآخر یقین کرنا ہی پڑا تھا۔

"اور تم نے مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔ یہ تو مجھے تم سے کچھ کام تھا۔ اس لیے میں آفس سے سیدھا یہاں آگیا۔ اگر میں نہ آتا تو مجھے تم کچھ نہ بتاتے۔ حد ہوتی ہے غیریت کی۔ صبح سے شام ہوگئی ہے۔"

انہوں نے بوکھلاہٹ میں سارا غصہ ان پر نکال دیا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ وہیں بیٹھ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"بس کردیں منیجر صاحب اور کتنے سائن کروانے ہیں۔"

حمزہ نے مسکراتے ہوئے منیجر صاحب سے کہا تھا۔ جو کوئی تیسری بار اس سے پیپرز سائن کروانے آئے تھے۔

"بس سر یہ لاسٹ ٹائم ہے۔ یہ بہت ضروری کاغذات ہیں ارجنٹ جمع کروانے تھے۔ بڑے صاحب آج جلدی چلے گئے تو ان کی غیر موجودگی میں بار بار آپ

کو تنگ کرنا پڑا۔" وہ ہنستے ہوئے بولے تھے۔ حمزہ نے سر ہلا کر مطلوبہ جگہ پہ سائن کرنے کے بعد فائل انہیں تھمائی اور ان کے جانے کے بعد کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر پلکیں موند لی تھیں۔ بابا آج جلدی آفس سے چلے گئے تھے کیونکہ انہیں کسی ضروری کام کے لیے شہاب انکل سے ملنے جانا تھا۔ وہ آفس سے سیدھے وہیں جانے والے تھے۔

"پتا نہیں علیزے کیسی ہو گی کیا کر رہی ہو گی؟ یقیناً" وہ اس وقت بابا کو ڈھیر سارے لوازمات کے ساتھ چائے پلا رہی ہو گی۔"

آنکھوں میں اس کا سراپا لہرایا تو لبوں پہ آپ ہی دلکش مسکراہٹ در آئی تھی۔

"کتنے دنوں سے اس سے بات نہیں ہوئی اور نہ ہی کوئی ملاقات۔ میں بھی بابا کے ساتھ چلا جاتا تو کم از کم اسے دیکھ ہی لیتا۔" دل نے بھی اس کے خیالات کی بھرپور تائید کی تھی۔ وہ دونوں نہ تو روز ملتے تھے اور نہ ہی دیوانوں کی طرح روز آدھی رات تک باتیں کرتے تھے۔ بس کبھی کبھار مختصر سی کال یا میسج۔ لیکن وہ نکاح جیسے مضبوط بندھن میں بندھ چکے تھے۔ اس سے خود بخود ہی ان دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے چاہت مزید گہری ہو گئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ علیزے کو کال کرے۔

اس نے ٹیبل پہ رکھا اپنا فون اٹھایا اور اس سے پہلے کہ وہ نمبر پریس کرتا موبائل کی اسکرین روشن ہوئی تھی اور آنے والا کوئی اجنبی نمبر تھا۔ وہ کافی عرصے سے اجنبی نمبرز سے آنے والی کالز کو اگنور کرتا رہا تھا اور وجہ تھی علینہ وقار مگر اس وقت جانے کیوں اس نے کال پک کی تھی۔

"ہیلو" حمزہ نے بہت احتیاط سے کہا کیونکہ خدشہ تھا کہ دوسری طرف وہی ہو گی اور اس وقت وہ اس سے بات کر کے اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"حمزہ احتشام بات کر رہے ہو۔" دوسری طرف سے آنے والی مردانہ آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

"جی ہاں آپ کون؟" اس نے پوچھنا ضروری سمجھا کیونکہ آواز اس کے لیے قطعی اجنبی تھی۔

"اس بات کو چھوڑو کہ میں کون ہوں، یہ سنو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔" جانے کیوں اس لمحے حمزہ کا دل دھڑکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا دوسری طرف سے کی جانے والی بات سن کر وہ سناٹے میں رہ گیا تھا۔

"تمہاری بیوی ہمارے قبضے میں ہے اور اب جو ہم کہتے ہیں تمہیں وہی کرنا ہو گا۔"

"کیا کہا تم نے۔" وہ تیزی سے بولا تھا۔ اس کے ماتھے کی رگیں تن گئی تھیں۔

"کیوں کم سنتے ہو کیا علیزے شہاب تمہاری بیوی ہے نا۔" جیسے اس کا مذاق اڑایا گیا تھا۔

"ہاں مگر تم کون ہو اور۔۔۔"

"تو بس میری بات غور سے سنو۔ وہ ہمارے پاس ہے اور اپنے گھر واپس صرف اسی صورت میں جا سکتی ہے۔ جب تم اسے چھوڑ دو یعنی طلاق دے دو۔ ورنہ نتائج کے ذمہ دار تم خود ہو گے!"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم۔" وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"اب تم اسے بکواس کہو یا پیار بھری دھمکی۔ شاید تم جانتے ہو گے کہ جب کسی کو اغوا کیا جاتا ہے تو بدلے میں تاوان بھی لیا جاتا ہے اور تمہارا تاوان یہی ہے۔ تم اسے طلاق دے دو تو ہم بنا ایک بھی پل ضائع کیے اسے گھر چھوڑ آئیں گے۔"

"میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا تم ہو کون؟ شرافت سے اسے چھوڑ دو ورنہ تم مجھے جانتے نہیں ہو میں ایک پل میں تم تک پہنچ سکتا ہوں۔" اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ غصے سے چیخ پڑا تھا۔

"زیادہ بک بک نہ کرو۔ جتنی دیر تم ہم تک پہنچنے میں لگاؤ گے اتنی دیر میں تم سمجھتے ہو کہ ہم اس کے ساتھ کیا کچھ کر سکتے ہیں اور ویسے بھی وہ بے حد حسین۔ اس لیے ٹائم برباد مت کرو۔ جو کہا ہے بس اتنا کرو۔ شاید تمہیں معاملے کی سنگینی کا احساس نہیں ہے۔ جانتے نہیں ہو ہم کون ہیں اور کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ کچھ بھی کرنے سے پہلے بس اتنا یاد رکھنا کہ تمہارا

ایک انکار اس کی پوری زندگی برباد کردے گا۔ اچھی طرح سوچ لو آدھے گھنٹے بعد پھر فون کرتا ہوں اتنا ضرور یاد رکھنا کہ تمہاری ایک نا ساری زندگی کا پچھتاوا نا بن جائے۔" کہتے ہی لائن کاٹ دی گئی تھی۔

"سنو' سنو ہیلو میری بات سنو۔ تم ایسا کچھ نہیں کرسکتے۔ ہیلو ہیلو میری بات سنو۔"

جواباً" وہ کتنے ہی لمحے پکارتا رہا تھا۔ اس نے نمبر چیک کیا تو وہ کسی پی سی او کا تھا اور یہ نمبر ٹریس کرنا اس کے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ مگر جانے کسی مصلحت کے تحت وہ رک گیا تھا۔ وہ کتنے ہی لمحے ساکت سا وہاں بیٹھا رہا تھا۔ اس کا وجود جیسے برف بن گیا تھا۔

"کون ہو سکتا ہے۔ کون کرسکتا ہے ایسی گھٹیا حرکت۔"

سوچتے ہوئے وہ نڈھال سا بیٹھا تھا کہ جیسے اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا تھا۔

"کہیں یہ سب...."

خیال آتے ہی اس نے تیزی سے موبائل اٹھایا اور علینہ وقار کے نمبر پریس کرنے لگا تھا۔ وہ آج پہلی بار اس کو فون کررہا تھا۔ مگر دوسری طرف کتنی ہی بیلز کے بعد خود ہی لائن کٹ گئی تھی اور کسی نے ریسیو ہی نہیں کیا تھا جبکہ دوسری طرف علینہ موبائل ہاتھ میں تھامے مسکرا رہی تھی۔ جس کی اسکرین پہ بہت واضح حمزہ کالنگ چمک رہا تھا۔ شاید اگر کوئی اور موقع ہو تا تو وہ خوشی سے پاگل ہو جاتی مگر اس وقت وہ صرف تماشا دیکھ رہی تھی حمزہ مسلسل ری ڈائل کررہا تھا اور پھر کتنی ہی کوشش کے بعد اس نے کال ریسیو کی تھی۔

"او ہائے حمزہ۔" ایک ادا سے کہا گیا تھا۔

"یہ سب تم نے کروایا ہے۔" وہ چھوٹتے ہی بولا تھا۔

"کیا؟" تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ ... تھی بھولپن کی۔

"میں جانتا ہوں یہ سب تم نے کیا ہے۔ سیدھی طرح بتادو علیزے کہاں ہے ورنہ...." اس کا دماغ کھول رہا تھا۔ اگر وہ سامنے ہوتی تو جانے کیا کر ڈالتا۔

"تم کیسی باتیں کررہے ہو حمزہ۔ میں سمجھ نہیں پائی۔ کیا ہوا ہے علیزے کو۔" وہ واقعی نہیں سمجھی تھی یا بن رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔

"دیکھو تم یہ بہت غلط کررہی ہو تمہیں اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ان سب میں علیزے کا کیا قصور ہے۔" وہ اس وقت خود کو بے بسی کی انتہا پہ محسوس کررہا تھا۔

"قصور ہے حمزہ۔ اس کا قصور یہ ہے کہ تم اسے چاہتے ہو۔ تم ہمیشہ مجھے چھوڑ کر اس کے پاس گئے۔ اس کی خاطر تم نے مجھے ریجیکٹ کیا۔ ہاں میں نے کیا ہے سب کچھ۔ بولو کیا کرو گے تم جس طرح تم آج تڑپ رہے ہو۔ اسی طرح میں بھی تڑپ رہی ہوں۔ اب تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں چاہوں گی۔"

ایک آگ تھی اس کے لہجے میں' اس کے وجود میں' جو اس وقت سب کو جھلسا رہی تھی۔

"پر میں کبھی تمہارا تھا ہی نہیں علینہ۔ میں تو ہمیشہ سے ہی اس کا ہوں۔ اس سے اول روز سے محبت کرتا ہوں۔ تم زبردستی مجھے خود سے محبت کرنے پر کیسے مجبور کرسکتی ہو۔ میں ویسی ہی زندگی گزاروں گا جیسی میں چاہتا ہوں۔ میں کٹھ پتلی نہیں ہوں جو تمہارے اشاروں پر چلتا رہوں گا۔ ختم کرو یہ تماشا اور سیدھی طرح شرافت سے اسے گھر پہنچاؤ۔" حمزہ نے سختی سے کہا تھا۔

"کرو گے حمزہ' تم وہی کرو گے جو میں چاہوں گی اور اب وہ ایک ہی شرط پہ اپنے گھر واپس جاسکتی ہے جب تم اسے چھوڑو گے' ورنہ تم اچھی طرح جانتے ہوئے کہ لڑکی کی گھر سے باہر گزری ایک رات کس طرح اس کی پوری زندگی کو بدل دیتی ہے۔ تم جتنی دیر لگاؤ گے بدنامی اسی تیزی سے اس کی طرف بڑھے گی اور پھر میں گارنٹی نہیں دے سکتی کہ جن لوگوں نے اسے اٹھایا ہے وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔" وہ اپنی ضد اور انا میں ہر حد پار کرنے کو تیار تھی۔ وہ سن سا کھڑا تھا۔

"اور ہاں زیادہ چالاکی مت دکھانا ورنہ' بھی اس کے گھر پہنچ سکتی ہے۔"

کہنے کے ساتھ ہی اس نے کال بند کی بلکہ موبائل ہی آف کردیا تھا۔ وہ کتنی دیر خاموشی سے وہیں کھڑا رہا تھا اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی زندگی بس چند قدموں کے فاصلے پہ تھی لیکن وہ کتنا بے بس، کس قدر مجبور تھا کہ ہاتھ بڑھا کر اسے تھام نہیں سکتا تھا۔

"یا خدا میں کیا کروں۔"

"یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ ان حالات میں اب کون میرا یقین کرے گا کہ میں نے کبھی علینہ سے fairness شو نہیں کی اور شاید بابا بھی نہیں۔"

"بابا، بابا بھی تو وہیں ہیں۔ وہاں اس وقت سب کا کیا حال ہوگا۔ مجھے وہاں جانا چاہیے مگر۔۔۔"

وہ کتنے ہی لمحے خود ہی سوچتا اور خود ہی اپنے خیالات کو رد کرتا رہا تھا۔ بجتے ہوئے موبائل نے یکدم ہی اس کی توجہ اپنی طرف دلائی تھی۔ بابا کا نمبر دیکھ کر اس نے فوراً" ہی کال پک کی تھی حمزہ کو اس وقت ان کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

"ہیلو بابا۔" وہ بے تابی سے بولا تھا اور جواباً" بابا نے اسے جلدی سے وہاں پہنچنے کی تاکید کرتے ہوئے فون بند کردیا تھا۔ وہ بدحواس سا گاڑی کی چابیاں اور موبائل اٹھاتا تیزی سے باہر بھاگا تھا اسے اس وقت کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شہوز اسے یوں بدحواس بھاگتا ہوا دیکھ کر پکارتا اس کے پیچھے آیا تھا لیکن اس نے سنا ہی نہیں۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرکے تیزی سے بیک کی اور دس منٹ بعد وہ انتہائی رف ڈرائیونگ کرتا ہوا بابا کے سامنے تھا وہاں سب کی حالت دیکھ کر وہ خود کو مجرم محسوس کررہا تھا اسی اثنا میں معاذ اندر داخل ہوا تھا۔

"کیا ہوا کچھ پتا چلا۔" سب نے امید بھری نگاہوں سے اسے دیکھا وہ مایوسی سے نفی میں سر ہلا کر وہیں بیٹھ گیا تھا۔

احتشام انکل کے آتے ہی وہ باہر نکل گیا تھا اور اب جانے کہاں کہاں کی خاک چھان کر آرہا تھا۔ راستے میں ایک پل کو اس نے گاڑی پولیس اسٹیشن کے سامنے روکی تھی۔ مگر پھر بابا کا خیال آتے ہی اس نے گاڑی واپس موڑی تھی۔ حمزہ نے روتی ہوئی ماما کو بازو میں بھر لیا تھا اور خاموشی سے ان کے آنسو پونچھے تھے۔ کہنے کو تو اب اس کے پاس کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

"میری بیٹی بے قصور ہے حمزہ۔ تم تو اسے جانتے ہو نا۔ ضرور ان لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہوگی۔"

ماما کی بات کے جواب میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کا دل کٹ گیا تھا۔

"آپ کو کیسے بتاؤں ماما میں کہ وہ مجھ سے محبت کی سزا کاٹ رہی ہے۔" اس خاموشی میں اس کے بجتے موبائل نے سب کو اس کی طرف متوجہ کردیا تھا۔ آنے والا نمبر پھر سے اجنبی تھا۔ حمزہ کا دل دھڑکا گویا فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی اور یہاں ماما اور شہاب انکل کی حالت دیکھ کر بھی ایک پل لگا تھا اسے فیصلہ کرنے میں وہ ایکسکیوز کرتا باہر نکل آیا تھا۔

"ہیلو۔" اس نے واضح طور پہ اپنے ہاتھوں میں کپکپاہٹ محسوس کی تھی۔

"پھر کیا سوچا تم نے۔" آواز وہی کچھ دیر پہلے والی تھی۔

"میں۔۔۔" وہ کچھ بولتے بولتے رکا تھا۔ اس کی آواز بہت مدھم تھی۔

"سیدھے سیدھے بولو ہاں یا نہ زیادہ اگر مگر مت کرو۔" بے زاری سے کہا گیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ مجھے تمہاری بات منظور ہے تم اسے چھوڑ دو۔ تم جیسا کہتے ہو میں ویسا ہی کروں گا۔"

دل پہ پتھر رکھنا کسے کہتے ہیں یہ آج حمزہ کو سمجھ آیا تھا۔

"واہ بڑی جلدی مان گئے۔ ٹھیک ہے۔ ایک گھنٹے تک وہ گھر پہنچ جائے گی۔"

"سنو میری بات سنو مجھے بتاؤ کیا تم کہاں سے بول رہے ہو۔ میں خود اسے لینے آؤں گا۔"

حمزہ نے تیزی سے اس سے کہا تھا۔ مبادا وہ فون بند کردے۔

"زیادہ ہوشیاری مت دکھاؤ میں تمہیں بتا جاؤں ناکہ تم پولیس کو ساتھ لے آؤ۔ وہ پہنچ جائے گی اور سنو آگے سے کوئی چالاکی مت دکھانا۔ کیونکہ جب ہم بھرے بازار سے اسے اٹھا سکتے ہیں تو گھر میں گھس کر اسے مار بھی سکتے ہیں۔ سمجھے۔ اب بند کرو فون اور ہاں ایک ہفتے بعد فون کروں گا۔ یہ پتا کرنے کے لیے کہ تم نے اسے وعدے کے مطابق طلاق دی یا نہیں۔"

لائن کٹ گئی تھی یا نہیں وہ کتنی ہی دیر یوں ہی موبائل کان سے لگائے کھڑا رہا تھا۔ اس پل اس کے دل نے دھڑکنا بند کر دیا تھا۔ اس کی سانس جیسے رک رہی تھی۔ اس کے لیے وقت جیسے تھم سا گیا تھا ساکت ہو گیا تھا۔ اس پل بارش کے کتنے ہی قطرے اس پہ ٹھہر گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کہاں لے جا رہے ہو مجھے چھوڑو مجھے" صبح سے چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں پہ پٹی باندھ کر اسے کسی نے گاڑی میں دھکیل دیا تھا اور اب وہ گاڑی اسے نجانے کہاں لے جا رہی تھی۔

"چپ کرو۔ تم چلا چلا کے تھکتی نہیں ہو۔"

اس کے برابر بیٹھا آدمی زور سے بولا تھا وہ ڈر کر خاموش ہو گئی تھی۔

"خاموشی سے بیٹھو، تمہیں تمہارے گھر چھوڑنے جا رہے ہیں۔ اب اگر ذرا سی بھی آواز نکالی تو۔۔۔" برابر بیٹھے آدمی نے پستول کی نال زور سے اس کی کنپٹی میں چبھوئی تھی۔ وہ ڈر کر سہم کر خاموش ہو گئی تھی۔ مگر وہ اندر ہی اندر بہت ڈری ہوئی تھی، بے یقین تھی کہ کیا واقعی وہ اسے اس کے گھر چھوڑنے جا رہے ہیں۔ اس کے ماں باپ، بھائی کے پاس، وہ اسے یہاں کیوں لائے تھے، کون تھے وہ جان نہیں پائی تھی اور اگر جان جاتی تو شاید یہیں مر جاتی۔

گھر سے کافی دور مین روڈ پہ ان لوگوں نے اسے گاڑی سے اتار دیا تھا اور گاڑی سے اترنے سے پہلے اسے صرف اتنا کہا تھا کہ اسے ایک غلط فہمی کی بنا پر غلطی سے اٹھایا گیا تھا جبکہ اٹھانا کسی اور کو تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر ابھی پوری طرح سنبھلی بھی نہیں تھی کہ وہ لوگ تیزی سے گاڑی بھگا لے گئے تھے۔ آنکھوں سے پٹی کھولتے ہی اس کی آنکھیں چندھیا سی گئی تھیں مگر یہ دیکھ کر کہ یہ سیدھا راستہ اس کے گھر کو ہی تو جاتا ہے وہ خوشی سے بے حال ہو گئی تھی۔ وہ تیزی سے چلنے لگی تھی حالانکہ اس کے قدم تھک رہے تھے۔ بھوک اور پیاس سے اس کا برا حال تھا لیکن اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔

اس کا دل ابھی تک بے یقین تھا کہ وہ اتنی آسانی سے اپنے گھر پہنچ گئی ہے اور پھر گھر پہنچنے تک ہلکی ہلکی پڑنے والی پھوار نے اسے زیادہ نہیں تو تھوڑا تو بھگو ہی دیا تھا۔ گھر کا گیٹ سامنے تھا جو پورا بند نہیں تھا نیم وا سا تھا شاید اسی کے انتظار میں، وہ لڑکھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ اس بیچ میں جانے کتنی صدیاں گزر گئی ہیں۔ بمشکل وہ لان کراس کر کے لاؤنج کے دروازے تک آئی تھی۔

"علیزے۔" سب سے پہلے ماما کی نظر اس پر پڑی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف آئی تھیں اور پھر ان کے پیچھے سب ہی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ سب اس تک پہنچتے اس نے اپنے چکراتے سر کو بمشکل تھاما اس سے پہلے کہ وہ گر پڑتی حمزہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا تھا اور شاید یہ آخری سہارا تھا۔ جو اس نے حق سے علیزے کو دیا تھا۔ اس کے بعد تو شاید۔۔۔ حمزہ کا وجود اس پل جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کے ارد گرد ہی گر رہا تھا اور ان ٹکڑوں میں دل کے کروڑوں ٹکڑے تھے۔

"معاذ ڈاکٹر کو فون کرو فوراً" معاذ تیزی سے ڈاکٹر کو فون کرنے بھاگا تھا۔ شہاب انکل اور ماما نے ہی اسے سہارا دے کر اس کے کمرے تک پہنچایا تھا۔ حمزہ وہیں دور کھڑا دیکھتا رہا تھا جب دور ہی جانا ہی تو ابھی سے کیوں نہیں۔

"یہ کسی شدید شاک کے زیر اثر ہیں۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے۔ ان شاء اللہ صبح تک ٹھیک

ہو جائیں گی۔ اور ہاں جب تک یہ خود نہ جاگیں۔ انہیں ڈسٹرب مت کیجئے گا۔"

ڈاکٹر نے چند میڈیسن کاغذ پہ لکھنے کے ساتھ ساتھ انہیں ہدایت کی تھی۔

"اوکے ڈاکٹر۔" معاذ اور شباب انکل ڈاکٹر کے ساتھ ہی باہر نکل گئے تو ماما اس کی پیشانی پہ ماتھا ٹکائے رو پڑی تھیں۔

"حوصلہ کریں بھابھی خدا نے کرم کر دیا ہے ان شاء اللہ صبح تک ہماری بیٹی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

احتشام احمد نے انہیں تسلی دی تھی سب ہی شکر گزار تھے کہ وہ خیریت سے گھر پہنچ گئی ہے اور باقی تفصیلات تو اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہی پتا چلنی تھیں۔ حمزہ نے اس پل بہت غور سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی بڑی بڑی خمدار پلکوں والی آنکھیں جو اسے بہت پسند تھیں۔ اس وقت بند تھیں۔ چہرے پہ زردی کھنڈی تھی۔ جب اس کا چہرہ نگاہوں کے سامنے دھندلانے لگا تو وہ چپکے سے ' خاموشی سے وہاں سے باہر نکل آیا تھا اور شاید ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے بھی کیونکہ اس میں سب کی بھلائی تھی اور خاص کر علیزے کی۔ کیونکہ وہ کسی طور نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس سے وابستہ رہ کر زندگی بھر کے لیے خوشی اور سکون سے محروم رہ جائے۔

"یا اللہ مجھ میں اس سے جدائی کی سکت نہیں ہے۔" اس نے ایک نگاہ برستے آسمان پہ ڈالی تھی۔ بارش اب قدرے تیز ہو چکی تھی۔ کتنے ہی خوشگوار لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے تھے۔ وہ سست روی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح جب علیزے کی آنکھ کھلی تو ماما اس کے سرہانے بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں اور وقفے وقفے سے اس پہ دم بھی کر رہی تھیں۔ اس کے جاگتے دیکھا تو ایک اطمینان بھرا سانس لیا اور چند لمحے تلاوت کے بعد تلاوت ختم کر کے قرآن پاک بند کر کے اپنی جگہ پہ رکھا اور اس کے پاس آ گئیں۔

"اب کیسی طبیعت ہے میری بیٹی کی؟" انہوں نے محبت سے اس کا ماتھا چوما۔

"ٹھیک ہوں ماما۔" اس کا دل و دماغ ابھی تک ایک انجانے سے خوف میں مبتلا تھے۔

"علیزے تم ٹھیک ہو نا بیٹا۔ میرا مطلب ہے۔" وہ کچھ پوچھتے پوچھتے رک گئی تھیں۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں ماما۔"

اس لمحے کیا تھا ماما کی نگاہوں میں وہ ان کا مطلب سمجھ کر نگاہ پھیر گئی تھی۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

انہوں نے بے ساختہ ہی اس مالک کا شکر ادا کیا تھا۔ جس نے ان کی دعائیں سن لی تھیں۔

"ارے اٹھ گئیں بیٹا میں یہی دیکھنے آیا تھا۔"

اس لمحے بابا نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور اسے جاگتا پا کر اندر چلے آئے تھے علیزے بابا کو دیکھ کر اٹھ بیٹھی تھی۔ وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئے تھے۔

"آپ آفس نہیں جا رہے کیا۔" آصفہ نے انہیں رات والے کپڑوں میں دیکھ کر کہا تھا۔

"نہیں میں آج اپنی بیٹی کے پاس ہوں اور آپ ہم دونوں کا ناشتا یہیں لے آئے۔" وہ مزید اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولے تھے۔

"اچھا میں لے آتی ہوں۔"

"بابا۔" ماما کے باہر جانے کے بعد علیزے نے انہیں پکارا تھا۔

"جی میری جان۔" بابا نے اسے بازو میں بھر لیا تھا۔

"بابا میں ان لوگوں کو نہیں جانتی تھی وہ کون تھے کیا چاہتے تھے مجھے نہیں معلوم انہوں نے کہا کہ انہیں غلط فہمی ہوئی تھی وہ غلطی سے مجھے لے گئے تھے میرا کوئی قصور نہیں تھا۔"

وہ جیسے ہی ان کے کندھے سے لگی آنسو خود بخود ہی اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے جانے کس خدشے کے تحت وہ بابا سے یہ سب کہہ گئی تھی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ اس کے والدین اس پر کتنا اعتبار کرتے ہیں۔

"ہش بے وقوف، تمہیں اپنے بابا سے یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنی بیٹی پہ پورا بھروسا ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اب تم اپنے دماغ پر زور مت دو۔ پہلے ہی تمہاری طبیعت خراب ہے۔ جو کچھ ہوا اسے ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھلا دو بیٹا!"

وہ دھیرے دھیرے اس کا سر تھپک کر اسے تسلی دے رہے تھے۔ اس لمحے معاذ اندر داخل ہوا تھا۔

"ارے علیزے کیسی ہو۔ واہ بھئی خوب لاڈ ہو رہا ہے۔ میرے لیے بھی تھوڑی جگہ چھوڑ دو۔"

دل پہ دھرا بوجھ یکدم ہی سرک گیا تھا کہ اس کے گھر والے ابھی بھی اسے ویسا ہی سمجھتے ہیں ویسے ہی اعتبار کرتے ہیں۔ ان سب میں سے کسی نے بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ کون لوگ تھے، کہاں لے گئے تھے صرف اس خیال سے کہ اسے تکلیف ہو گی۔

"اچھا بابا میں آفس جا رہا ہوں۔ کل بھی کسی کو بتائے بغیر بھاگ آیا تھا اب جا کے دیکھوں کہ نوکری بچی ہے کہ گئی۔" وہ جتنی تیزی سے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے جانے کو مڑا تھا۔

"ناشتا تو کر لو۔" بابا نے پیچھے سے کہا۔

"کر لیا بابا ماما کچن میں بنا رہی ہیں۔ ان کے پاس کھڑے کھڑے ہی کر لیا تھا۔ اللہ حافظ" وہ بولتے بولتے باہر نکل گیا تھا۔ تو بابا ہنس پڑے تھے۔

"یہ لڑکا کبھی نہیں سدھرے گا۔"

جانتے تھے کل کا پورا دن اس نے بہن کے لیے کس اذیت میں گزارا ہے اور اب بھی جلدی کے باوجود بس ایک نظر اسے دیکھنے آیا تھا اور پھر ناشتے کے دوران ہی ماما نے اسے بتایا کہ احتشام انکل کی کال آئی تھی۔ اس کی طبیعت پوچھ رہے تھے اور اس کے بنا پوچھے ہی ماما نے اسے بتا دیا تھا کہ حمزہ بھی کل کس قدر پریشان رہا ہے اور رات گئے تک یہیں موجود تھا اور ابھی احتشام بھائی بتا رہے تھے کہ پوری رات اس کے کمرے کی لائٹ جلتی رہی ہے۔

ماما کے جانے کے بعد اس نے کتنی بار اپنا موبائل اٹھا کر دیکھا تھا مگر وہاں کوئی میسج کوئی کال نہیں تھی۔ حالانکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی جب وہ گرنے کو تھی تو اسے حمزہ نے ہی بڑھ کر سنبھالا تھا۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے۔ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ وہ پوری قوت سے ان خیالات کو جھٹک کر آنکھیں موند کر لیٹ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس دن کے بعد حمزہ نے کتنے سارے دن ایک اذیت میں گزارے تھے۔ کسی کو کچھ بھی بتائے بنا وہ اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا۔ اس نے علیزے کو نہ تو کوئی کال کی تھی اور نہ ہی اس سے ملنے گیا تھا وہ علیزے کو یہی باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ اس کے اغوا کے بعد سے اس سے بدگمان ہو چکا ہے۔ وہ اسے مزید تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے وابستگی علیزے کو نقصان پہنچائے گی۔ اس لیے وہ دھیرے دھیرے اسے خود سے دور کر رہا تھا شہروز کئی دن سے اس کی پریشانی کو محسوس کر رہا تھا اور آج اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ حمزہ سے بات کرے گا اور اب وہ زبردستی اسے کھینچ کر ایک ریسٹورنٹ میں لے آیا تھا اور شہروز کے بہت پوچھنے پر حمزہ نے اسے جو کچھ بتایا وہ سب سن کر شہروز کے حواس گم ہو گئے تھے وہ کتنی ہی دیر خاموشی سے بیٹھا رہا تھا۔

"اب کیا کرو گے تم؟" کتنے لمحے بعد شہروز نے اس سے پوچھا تھا۔

"وہی جو وہ لوگ چاہتے ہیں۔" عجیب مایوس سا انداز تھا اس کا ہارا ہوا۔

"پاگل ہو تم ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" شہروز نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

"تو میں اور کیا کروں کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے نا۔ اگر میں اس کے ساتھ رہا نا تو اس کو کوئی بھی نقصان ہو سکتا ہے اور میں ایسا نہیں چاہتا۔ تم خود سوچو شہروز

اگر اسے کچھ ہو جاتا ہے تو میں کیسے خود کو معاف کروں گی۔ میں کیسے سب کا سامنا کرتا اور پتا ہے شہاب انکل کہہ رہے تھے کہ انہوں نے چند دنوں سے اپنے محلے میں عجیب سے لوگ دیکھے ہیں۔ اب میں انہیں کیسے بتاؤں کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔ اب بس اس کا یہی حل ہے۔"
وہ ازحد پریشان تھا۔
اس کا وجود مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ کھوکھلا ہو چکا تھا۔
"یہ ٹھیک نہیں ہے حمزہ اس طرح تم دونوں کی زندگی خراب ہو جائے گی۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اسے چھوڑ دو گے تو وہ خوش رہے گی۔ اطمینان بھری زندگی گزارے گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ وہ مر جائے گی حمزہ اور تم خوش بھی نہیں رہ پاؤ گے اور پھر انکل کیا وہ تمہیں یہ سب کرنے دیں گے۔" شہوز نے اس لمحے اس کے دکھ کو اپنے اندر محسوس کیا تھا۔
"یہی تو اصل مسئلہ ہے نا بابا کبھی مجھے ایسا نہیں کرنے دیں گے۔" ان دونوں کے سامنے رکھی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اور دونوں کو ہی اسے پینے کا خیال نہیں آیا تھا۔
"میں چاہوں تو اس مسئلے کو لمحوں میں حل کر سکتا ہوں۔ کورٹ میں ان کے خلاف کیس کر سکتا ہوں لیکن اس سے ہم سب کی کس قدر بدنامی ہو گی اور پورے شہر میں بات کس قدر اچھلے گی اور پھر آج کل سب کچھ اتنا فاسٹ ہو چکا ہے کہ کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ بس یہ سب سوچ کر ہی میں خاموش ہوں۔"
شہوز سے بات کر کے اس کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہوا تھا۔
"ہاں کہتے تو تم بھی ٹھیک ہو۔ آج کل تو لمحوں میں بات پورے شہر میں پھیل جاتی ہے اور انسان نا چاہتے ہوئے بھی بس تماشا دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ویسے ایک بات ہے حمزہ مجھے اس لڑکی سے اس قدر گھٹیا پن کی امید نہیں تھی۔"
شہوز کا دل چاہا کہ اسے اتنی سنائے کہ آئندہ وہ محبت کے نام سے توبہ کرے۔

"حمزہ تم یہ ساری باتیں انکل کو بتا کر انہیں اعتماد میں لے کر ہی اب کوئی فیصلہ کرنا اور اگر تم نے انہیں نہ بتایا تو میں انہیں بتا دوں گا۔" شہوز نے ہمیشہ کی طرح اسے یہی مشورہ دیا تھا۔
"نہیں شہوز بابا کو ابھی کچھ مت بتانا۔ میں کوئی مناسب سا وقت دیکھ کر انہیں خود ہی سب کچھ بتا دوں گا وعدہ کرو تم انہیں کچھ نہیں بتاؤ گے۔" حمزہ نے فوراً ہی اسے روک دیا تھا۔
"او کے میں تو تمہاری پریشانی کے خیال سے کہہ رہا تھا۔ جیسا تم چاہو۔"
شہوز نے ایک نگاہ اس کے تھکے تھکے سے چہرے پہ ڈالی اور مزید بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی پل حمزہ کا موبائل بجا تھا تو وہ اس طرف متوجہ ہو گیا اور شہوز کو گاڑی کی چابی دے کر کہا کہ وہ پارکنگ سے گاڑی نکالے۔
"میں ابھی کال سن کر آتا ہوں۔" شہوز ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا تھا۔ حمزہ نے کال سننے کے بعد بل پے کیا اور جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔
"کیسے ہو حمزہ۔"
پیچھے سے آئی آواز پہ حمزہ کا دل چاہا کہ اتنی زور کا تھپڑ اس کے منہ پہ مارے کہ اس کی عقل ٹھکانے آجائے۔ مگر پبلک پلیس کا خیال کر کے اس نے خود کو سنبھال لیا اور وہ جانے کو بڑھا۔
"کہاں جا رہے ہیں میری بات تو سن لیں۔" وہ یکدم ہی اس کے سامنے آئی تھی۔
"میرے آگے سے ہٹو۔" اس کے لہجے میں سختی تھی۔ مگر وہ بدستور وہیں کھڑی تھی۔
"اب کیا چاہتی ہو تم۔" اس کی قدرے بلند آواز پہ اردگرد بیٹھے کتنے ہی لوگوں نے اسے مڑ کر دیکھا تھا۔
"میں تو ہمیشہ سے بس تمہیں ہی چاہتی ہوں پر تم یہ بات سمجھتے ہی نہیں ہو۔"
انتہا تھی بدتمیزی اور ڈھٹائی کی۔
"تم نے جو گھٹیا چال چلی ہے اس میں تم کسی حد تک کامیاب ہو چکی ہو۔ اب میرے راستے میں آنا

چھوڑو۔" حمزہ نے دبے دبے لفظوں میں اسے بہت کچھ باور کرانے کی کوشش کی تھی۔

"مگر میں کیا کروں میرا ہر راستہ تم تک ہی آتا ہے۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھونا چاہا تھا۔ وہ یکدم ہی چند قدم پیچھے ہٹا تھا۔

"بس کرو اور کتنا گراؤ گی خود کو۔ میرے دل میں دبی نفرت کو ہوا مت دو ایسا نہ ہو کہ میں یہ بھول کر کہ تم ایک لڑکی ہو ہر حد سے گزر جاؤں اور رہاں یاد رکھنا میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں نا۔ وہ صرف اور صرف علیزے اور اس کی زندگی کے لیے کر رہا ہوں۔ اس میں تمہاری کوئی کامیابی نہیں ہے۔ میں آج بھی اس سے محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے وابستہ میرے عزیزوں کو تم جیسے گھٹیا لوگوں کی وجہ سے کوئی دکھ اٹھانا پڑے۔ اور اس بات کو اپنے دل و دماغ سے نکال دینا میں کبھی تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرلوں گا۔ مجھے نفرت ہے تم سے شدید نفرت' گھن آتی ہے مجھے تم سے تمہارے وجود سے تمہاری خوشبو سے آئندہ کبھی میرے سامنے مت آنا۔ ورنہ میں خود کو روک نہیں پاؤں گا اور سچ میں تمہیں شوٹ کردوں گا۔"

حمزہ نے کئی دنوں سے اپنی دل میں دبی بھڑاس کو ایک پل میں نکالا تھا۔ اسے بازو سے پکڑ کر سامنے سے ہٹایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔ علینہ کتنی ہی دیر وہاں کھڑی رہی تھی۔

"تم کیا جانو حمزہ میرے دل سے تمہاری محبت تو اسی دن ختم ہو گئی تھی۔ جس دن تم نے علیزے سے نکاح کیا اب تو میرا مقصد تمہیں برباد کرنا ہے تم سے تو اپنی توہین کا بدلہ لینا ہے تم دونوں سے تمہاری خوشیاں چھیننا ہے اور اس میں' میں بہت جلد کامیاب ہونے والی ہوں۔"

وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آنے والے دنوں میں بارہا اسے فون کالز اور میسجز کے ذریعے بار بار یہ یاد دلایا گیا تھا کہ اس نے ابھی کام مکمل نہیں کیا ہے اور اسے جلد از جلد یہ کام کرلینا چاہیے ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔ وہ ایک اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ وہ کچھ کر سکے۔ اس کا دل قطعی راضی نہیں تھا وہ کیسے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے دل کا خون کر دیتا بنا کسی وجہ کے کیسے زندگی برباد کر دیتا۔ مگر اسے کرنا تھا علیزے کی خاطر۔ ان گزرے دنوں میں بابا بارہا اسے کہہ چکے تھے کہ اب وہ چاہتے ہیں کہ علیزے رخصت ہو کر اس گھر میں آجائے۔ اس طرح وہ دونوں ہی اس واقعہ کو بھلا سکیں گے۔ کیونکہ وہ محسوس کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ حمزہ اس واقعے کے بعد سے بہت اپ سیٹ اور الجھا الجھا سا ہے۔ مگر حمزہ ہر بار ہی انہیں ٹال دیتا تھا' خاموش ہو جاتا تھا۔

ان گزرتے دنوں میں علیزے نے ہر لمحہ' ہر پل حمزہ کا انتظار کیا تھا۔ اس ساری سچویشن میں اسے سب کے ساتھ ساتھ حمزہ کی بھی بہت ضرورت تھی۔ اس کے اعتبار کی ضرورت تھی۔ اس کی تسلی کا ایک لفظ ہی اسے حیات نو بخش دیتا۔ مگر وہ جانے کہاں تھا ایسا کیوں کر رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سب گھر والے اب کیا چاہ رہے ہیں مگر ایسے میں حمزہ کی خاموشی نے سب کو بہت پریشان کر دیا تھا اور اس دن احتشام انکل نے بابا کے بات کرنے پہ انہیں بتایا کہ حمزہ نہیں مان رہا وہ چاہتا ہے کہ ابھی کچھ دن رک جائیں تو وہ کتنے ہی لمحے سن سی کھڑی رہی تھی۔ تو وہی ہوا حمزہ احتشام جس کا مجھے ڈر تھا۔

تم نے مجھ پر سے اپنا اعتبار کھو دیا پر ایک بار مجھ سے کچھ پوچھا تو ہوتا' کچھ تو کہا ہوتا۔ کچھ تو سنا ہوتا کہ میرے اوپر کیا بیتی۔ تم تو یوں لاتعلق ہو گئے جیسے ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ حالانکہ ہمارا رشتہ اتنا کمزور تو نہیں تھا کہ وہ یوں پل میں ٹوٹ جاتا۔ ہمارے اندر تو محبت نے بہت گہری جڑیں پھیلا رکھی تھیں پھر کیوں حمزہ کیوں۔۔۔ وہ دھیرے دھیرے حمزہ پہ اپنا اعتبار' مان'

محبت کھوتی جارہی تھی۔ اس کی خمار آلود پلکیں سرعت سے بھیگتی جارہی تھیں۔ کاش کہ وہ جان پاتی کہ وہ پیارا شخص اس وقت کس اذیت کا شکار ہے۔ اس کا دل کیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرا ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کوئی بھی نہیں۔

☼ ☼ ☼

"حمزہ کیا بات ہے بیٹا کھانا کیوں نہیں کھا رہے۔"

بابا کافی دیر سے اس کی بے توجہی نوٹ کر رہے تھے۔

"کچھ نہیں بابا کھا رہا ہوں۔"

اسے بالکل بھوک نہیں تھی۔ وہ صرف بابا کی خاطر آکے بیٹھا تھا اور اب پلیٹ میں ذرا سے چاول نکالے انہیں چمچے سے ادھر ادھر کرتا جانے کس سوچ میں گم تھا۔

"کیا بات ہے بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے۔ میں کوئی دنوں سے نوٹ کر رہا ہوں۔ تم بہت خاموش الجھے الجھے سے ہو کیا ہوا ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گے۔"

بابا نے ٹیبل پہ رکھے اس کے ہاتھ پہ اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھا تو حمزہ کے دل کو بہت ڈھارس ہوتی تھی۔

"کچھ بھی نہیں بابا۔ مجھے کیا ہونا ہے۔ ٹھیک ہوں میں۔ آپ تو یوں ہی پریشان ہو جاتے ہیں۔"

وہ مسکرایا تھا اور اس لمحے اسے اپنی ہی مسکراہٹ اجنبی لگنے لگی تھی۔

"چلو تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔ ویسے آصفہ بھابھی بھی شکایت کر رہی تھیں کہ تم کتنے دنوں سے ان سے ملنے نہیں گئے تھے۔"

کہتے ہوئے بابا نے اس کی پلیٹ میں مزید کھانا نکالا تو وہ خواہش نہ ہونے کے باوجود کھانے لگا تھا۔

"بس ایسے ہی بابا دل نہیں کر رہا تھا اور پھر ٹائم بھی نہیں ملا۔"

چند نوالے لینے کے بعد ہی اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور پانی کا گلاس لبوں سے لگا لیا تھا۔

"اور یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ دل کیوں نہیں کر رہا تھا میرے بیٹے کا۔" بابا نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

"میرا دل نہیں کر رہا تھا تو کیا زبردستی چلا جاتا۔"

اس نے یکدم ہی زور سے پلیٹ پیچھے کرنے کے ساتھ قدرے بلند آواز میں کہا تھا۔ وہ اس وقت بے پناہ فرسٹریشن کا شکار ہو رہا تھا۔

"حمزہ ٹھیک ہو بیٹا کیا ہوا ہے۔"

"سوری بابا۔" بابا نے جس طرح اس کی بدتمیزی کو نظر انداز کیا تھا وہ بے حد شرمندہ ہوا تھا آج وہ پہلی بار بابا سے اس قدر بلند آواز میں بولا تھا۔

"اٹس اوکے بیٹا ہو جاتا ہے۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ میں شہاب کو شادی کی کیا ڈیٹ دوں وہ آس لگائے بیٹھے ہیں بیٹا۔ میں کب سے انہیں ٹال رہا ہوں۔ پہلے تو میں نے ہی جلدی مچا رکھی تھی اور اب ہم ہی لوگ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔"

بابا کے انداز سے اسے لگ رہا تھا کہ وہ اس سے پوچھ نہیں رہے بلکہ بتا رہے ہیں کہ وہ جلد ہی یہ سب فائنل کریں گے اور وہ ایسا قطعی نہیں چاہتا تھا۔

"میں ابھی یہ سب نہیں چاہتا بابا۔" وہ اتنا دھیرے سے بولا تھا کہ اپنی آواز ہی بمشکل سن پایا تھا تو بابا نے کیا سنا ہوگا لیکن وہ سن چکے تھے۔

"لیکن بیٹا! پچھلے کتنے دنوں سے تم یہی کہہ رہے ہو۔ تمہاری مرضی سے ہی تو یہ سب ہوا ہے تو پھر اب انکار کیوں۔ بس میں نے کہہ دیا۔ میں کوئی قریبی ڈیٹ فکس کر رہا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں سننا ہے اور یہ جو تم بلاوجہ اداس اداس پھرتے ہو نا پھر خوشی سے کھل جاؤ گے ٹھیک ہے۔"

وہ کھانا کھا چکے تھے۔ اس لیے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"بابا میں یہ شادی نہیں کر سکتا اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ پلیز ایسا کچھ مت کیجیے گا۔ میں جلد ہی وکیل سے مل کر اس سارے معاملے کو ختم کر دوں گا۔"

اپنے پیچھے انہیں حمزہ کی مدھم سی فیصلہ کن آواز سنائی دی تو وہ سرعت سے پلٹے تھے۔

"کیا کہا تم نے۔ تم ہوش میں تو ہو دماغ تو خراب

نہیں ہو گیا تمہارا۔ کیا ہوا ہے تمہیں سچ سچ بتاؤ مجھے حمزہ۔ کیا وجہ ہے اس انکار کے پیچھے۔"

بابا کا رد عمل بالکل ویسا ہی تھا جیسا حمزہ کو توقع تھی۔ وہ بہت مشکل سے اپنا غصہ کنٹرول کر رہے تھے۔

"وجہ آپ جانتے ہیں بابا۔" وہ نگاہیں جھکائے کھڑا تھا۔

جانتا تھا کہ وہ نگاہیں ملا کر کبھی بھی بابا سے اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول پائے گا۔

"کیا مطلب۔۔۔" وہ چند لمحوں کو الجھے تھے۔

"او مائی گاڈ تم اس واقعے کو لے کر اتنا بڑا قدم اٹھا رہے ہو۔ حالانکہ تم جانتے ہو۔ وہ سب ایک غلط فہمی کی بنا پر ہوا تھا۔ جب وہ سب ہوا تھا وہ آصفہ بھابھی کے ساتھ تھی اور اپنی شادی کی شاپنگ کرنے نکلی تھی اور جب وہ واپس آئی تو تم وہاں موجود تھے۔ ہم سب وہاں موجود تھے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے بیٹا جیسا تم سمجھ رہے ہو۔ وہ تمہاری بیوی ہے تمہیں اس پہ اعتبار ہونا چاہیے۔"

وہ اس کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ جانتے تھے کہ وہ ہمیشہ کی طرح اسے سمجھا لیں گے۔

"لیکن بیچ کے چند گھنٹے جو گزرے ان میں کیا ہوا یہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا اور میں ساری زندگی اس گلٹ کے ساتھ نہیں گزار سکتا۔" یہ اس کے الفاظ تھے مگر اس پل اس کا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ مجھے اس پہ اعتبار ہے بابا۔ خود سے بڑھ کر ہے۔ مگر میں ہار گیا ہوں۔ اس کی زندگی، اس کی عزت کے آگے۔

"اپنی بکواس بند کرو۔ تمہیں شرم آنی چاہیے ایک معصوم لڑکی پہ اتنا بڑا الزام لگاتے ہوئے اور لڑکی بھی وہ جو تمہاری بیوی ہے اور جسے تم نے خود چنا ہے۔ یہی سکھایا ہے میں نے تمہیں۔ یہی تربیت کی ہے تمہاری میں نے کہ تم ایسی سوچ رکھو۔ کان کھول کر سن لو حمزہ میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا اور اگر تم نے ایسا کچھ کیا یا کرنے کا سوچا بھی تو بہت برا ہو گا۔" حمزہ کی بات سن کر انہیں اس قدر دکھ نے گھیر لیا کہ وہ خود پر سے ضبط کھو بیٹھے تھے۔ انہیں حمزہ سے اس طرح کی بات کی امید نہیں تھی۔ آج سمجھ میں آیا کہ وہ اس رات اتنی خاموشی سے وہاں سے چلا کیوں آیا تھا۔

"جو بھی ہے بابا میں یہ شادی نہیں کروں گا میں کل ہی۔۔۔"

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا۔ بابا کا ہاتھ اس کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا تھا۔ وہ کتنے ہی لمحے ساکت سا وہاں کھڑا رہ گیا تھا۔ کاش وہ انہیں بتا پاتا کہ میں بے قصور ہوں بابا۔ خدا گواہ ہے میں نے کبھی علیزے کی ذات پہ کوئی شک نہیں کیا کاش وہ بتا پاتا۔

"جاؤ چلے جاؤ میرے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔ میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ علیزے جیسی لڑکی سے تمہاری شادی ہو چلے جاؤ یہاں سے۔"

وہ تیزی سے اسے اپنے سامنے سے ہٹاتے کمرے میں چلے گئے تھے اور حمزہ اپنا بے جان وجود لیے وہیں کھڑا تھا۔

بچپن سے لے کر آج تک اسے یاد نہیں تھا کہ کبھی بھی بابا نے اس پہ ہاتھ اٹھایا ہو۔ آج پہلی بار بابا نے اس پر ہاتھ اٹھایا۔ اس لمحے اس کا دل رک رک کر دھڑک رہا تھا۔ اس نے تیزی سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور باہر نکل آیا اور گیرج سے گاڑی نکالتے ہی اس نے گاڑی فل اسپیڈ پہ چھوڑ دی تھی۔ بابا نے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے اسے جاتا دیکھا تو پریشان ہو گئے تھے۔ وہ ان کا بہت لاڈلا بیٹا تھا اور آج انہوں نے اس پر ہاتھ اٹھایا۔ وہ کتنے ہی لمحے اپنے ہاتھ کو دیکھتے رہے تھے جو اس پہ اٹھا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک وہ کبھی اسے ڈانٹتے بھی تھے تو انہیں خود کو اتنا برا لگتا تھا۔ تکلیف ہوتی تھی کجا کہ آج انہوں نے اسے مارا۔

"کوئی وجہ تو ضرور ہو گی جو وہ اس طرح کر رہا ہے۔ ورنہ میرا حمزہ ایسا نہیں ہے۔ اس کی سوچ ایسی نہیں ہو سکتی۔ وہ تو بہت پاکیزہ سوچ کا مالک ہے اور پھر علیزے تو اس کی محبت ہے۔ پھر ایسا کیا ہوا ہے۔ یا اللہ کہاں گیا ہو گا وہ۔"

وہ کتنے ہی لمحے پریشانی سے ٹہلتے رہے تھے۔ پھر

تھک کر بیٹھ گئے۔

گاڑی فل اسپیڈ سے چل رہی تھی۔ دکھ 'اذیت' تکلیف ایسے کون کون سے احساسات تھے جن سے اس وقت اس کا دل پھٹ رہا تھا۔

"آپ نے ٹھیک کہا بابا میں واقعی اس قابل نہیں ہوں کہ مجھے علیزے ملتی اپنی محبت ملتی۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں بابا کہ میری محبت اس کے لیے سزا بن جائے گی اور خدا گواہ ہے بابا میں نے کبھی اس پہ کوئی شک نہیں کیا۔وہ سب تو اسے میری خاطر ہی جھیلنا پڑا تھا۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں بابا کہ میں آپ سب لوگوں کو رسوا نہیں کرنا چاہتا۔ میں اپنی خوشی کی خاطر اس کی زندگی میں کانٹے نہیں بچھا سکتا۔ آئی ایم سوری بابا۔ میں نے آپ کا دل دکھایا۔ پلیز مجھے معاف کر دیجیے۔ آئی ایم سوری علیزے میں تمہیں وہ تحفظ بھری زندگی نہیں دے سکتا جو تمہارا حق ہے۔" اس کا دل پھٹ رہا تھا۔

قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔

سوچتے سوچتے اس کے دماغ کی رگیں تن گئی تھیں ایسے لگا اس کی آنکھوں کے آگے دھند سی چھا رہی تھی۔ اس نے تیزی سے پلکوں کو جھپکا تھا پر وہ دھند پھر سے چھا رہی تھی اس لمحے ڈیش بورڈ پہ رکھا موبائل بجا تھا اور بابا کالنگ اسے دور سے ہی چمکتا نظر آرہا تھا۔ پھر موبائل اٹھاتے ہوئے بس ایک لمحے کو اسٹیئرنگ پہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تھی کہ ایک دم سے گاڑی لڑکھڑائی اور ایک زوردار دھماکا ہوا تھا۔ پل کے پل میں ہی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا اور اس کا ذہن جیسے تاریکی میں ڈوب گیا تھا اور بس ایک احساس اس کے پورے وجود پہ حاوی تھا۔ شدید تکلیف کا احساس۔۔۔

☼ ☼ ☼

بابا کتنی ہی دیر سے حمزہ کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کا فون بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آبیٹھے۔ یوں ہی بیٹھے جانے کتنی ہی دیر بیتی تھی۔

ان کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

"بڑے صاحب آپ کا فون ہے۔" ملازم نے کارڈلیس لاکر انہیں تھمایا تھا۔

"ہیلو۔" جانے کیوں دل کی دھڑکن معمول سے کہیں زیادہ تھی۔

"کیا۔۔۔ کب۔۔۔ وہ ٹھیک تو ہے۔" دوسری طرف کی بات سن کر وہ ایکدم ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ جہاں سے انہیں بتایا جا رہا تھا کہ حمزہ کا بہت خطرناک اور شدید ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور اس کی حالت بہت سیریس ہے۔ اس کی گاڑی ایک ٹرالر کی زد میں آکر بری طرح کچلی گئی تھی۔ وہ بدحواس سے فون وہیں پھینک کر باہر بھاگے تھے۔

"کیا ہوا ہے بڑے صاحب کچھ بتائیں تو سہی۔" بوا فوراً" ہی ان کے پیچھے بھاگی تھیں۔

"کچھ نہیں ہوگا دعا کریں بوا کچھ نہ ہو۔"

جانے کیسے وہ بوا کو آدھی ادھوری بات بتا کر باہر کی جانب بھاگے تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر ہی انہوں نے پہلے شہوز کو اور پھر شہاب زیدی کو فون کیا تھا۔

"کیا" کچن میں بابا اور معاذ کے لیے چائے بناتی علیزے کے ہاتھ سے کپ ایک چھناکے سے گر کر ٹوٹا تھا۔

"یہ کیا ہو گیا یا اللہ سب ٹھیک کرنا وہ خیریت سے ہوں۔"

وہ کتنی ہی دیر کچن سلیب سے ٹیک لگائے خود پہ قابو پانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

"ڈرائیور پلیز تیز چلو۔" جانے کتنی بار وہ ڈرائیور سے یہی بات کہہ چکے تھے۔ لیکن فاصلہ تھا کہ کٹ ہی نہیں رہا تھا اور جب اسپتال کے سامنے گاڑی رکی تو وہ جتنی تیزی سے چل سکتے تھے اتنی تیزی سے اندر پہنچے تھے۔ شہوزان سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔

"کیا ہوا بیٹا کچھ پتا چلا۔" وہ فوراً" ہی اس کے پاس آئے تھے۔

"نہیں انکل ابھی کچھ پتا نہیں ہے وہ آپریشن تھیٹر

میں ہے۔ بہت زیادہ انجرڈ ہے آپ حوصلہ رکھیں انکل سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ۔" شہوز نے انہیں بتانے کے ساتھ انہیں تسلی بھی دی تھی۔ وہ ایک طرف رکھی چیئرز میں سے ایک پہ بیٹھ گئے تھے۔ ابھی سے جیسے ان کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

"یا اللہ اسے کچھ نہ ہو اسے میری زندگی بھی دے دے میرے مالک۔"

وہ نڈھال سے سر دیوار سے لگائے بیٹھے تھے جبھی سامنے سے شہاب زیدی آتے دکھائی دیے۔ ملا، معاذ اور علیزے بھی ان کے ساتھ تھے۔

"شہاب، میرا حمزہ۔" شہاب زیدی نے ان کے پاس بیٹھ کر جب ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ اپنا ضبط کھو بیٹھے تھے۔

"حوصلہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیا کہتے ہیں ڈاکٹرز؟"

دل تو ان کا بھی بہت پریشان تھا لیکن اس وقت انہیں تسلی دینا زیادہ ضروری تھا۔

"ابھی کچھ پتا نہیں ہے دعا کرو شہاب میرا بیٹا ٹھیک ہو جائے۔ اگر اسے کچھ ہوا تا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔ آج میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اتنا ڈانٹا یہاں تک کہ اس پہ ہاتھ بھی اٹھا لیا۔ کتنی خاموشی سے اس نے مجھے دیکھا تھا اور پھر اور پھر۔ یہ سب ہو گیا۔" انکل کی بات سن کر علیزے چور سی بن گئی تھی۔

جانے کیوں اس پل اسے لگا کہ شاید اس سب کی ذمہ دار کہیں نہ کہیں اس پہ عائد ہوتی ہے۔ ساری بھاگ دوڑ شہوز اور معاذ ہی کر رہے تھے۔ وہ تو نڈھال سے بیٹھے۔ ملا کوریڈور کے ایک کونے میں جائے نماز بچھائے سربسجود تھیں۔ علیزے خاموشی سے سر جھکائے بابا کے برابر والی چیئر پہ بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے قطار در قطار آنسو مسلسل گر رہے تھے اور اس کے دوپٹے میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی لب مسلسل ہل رہے تھے۔ دھڑکنوں کی بس ایک ہی دعا تھی اس کی سلامتی کی۔ اسی کیفیت میں کتنے ہی گھنٹے گزرے تھے کچھ خبر نہیں تھی کہ اندر آپریشن تھیٹر میں وہ کس حال میں ہے۔ جبھی آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ان سب کے ہی دل لرز رہے تھے۔

"کیا ہوا ڈاکٹر کیسا ہے میرا بیٹا۔" سب سے پہلے بابا ہی ان کی طرف بڑھے۔

"ابھی اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ دراصل اس کے سر میں گہری چوٹ لگی ہے اور بیک بون بھی اس حادثے میں شدید متاثر ہوئی ہے۔ ایک بازو بھی فریکچر ہے۔ اگلے اڑتالیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔ ہم اسے ICU میں شفٹ کر رہے ہیں اور جب تک اسے ہوش نہیں آ جاتا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آپ لوگ دعا کریں۔ دعا میں بہت طاقت ہوتی ہے۔" ڈاکٹر نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی تھی۔

"ہم اسے دیکھ سکتے ہیں ڈاکٹر۔" شہوز نے بڑھ کر ان سے پوچھا تھا۔

"نہیں ابھی نہیں کچھ دیر انتظار کریں۔ ابھی ہم انہیں ICU میں شفٹ کر دیں گے پھر آپ انہیں صرف باہر سے دیکھ سکتے ہیں لیکن مل نہیں سکتے۔ دراصل حادثہ بہت شدید تھا۔ اس میں اس کا بچ جانا ہی معجزہ ہے۔ ان شاء اللہ آگے بھی اللہ کرم کرے گا۔"

ڈاکٹر انہیں کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ ان سب کے دل اس وقت بہت تیز دھڑک رہے تھے اور لبوں پہ بس ایک ہی دعا تھی کہ یا خدا اسے کچھ نہ ہو۔ اسے نئی زندگی بخش دے میرے مالک اور بے شک وہ دعائیں سننے والا غفور و رحیم ہے۔

☼ ☼ ☼

اڑتالیس گھنٹوں کا وہ جان لیوا انتظار۔ سب کی جان جیسے سولی پہ ٹنگی تھی۔ مسلسل اڑتالیس گھنٹوں سے وہ سب وہاں ہی موجود تھے۔ ایک لمحے کے لیے بھی کوئی وہاں سے نہیں ہلا تھا۔ ایک ایک لمحہ سب پہ بھاری تھا۔ ICU کے گلاس ڈور سے باری باری سب

ہی اسے دیکھ آئے تھے اس کا پورا جسم سفید پٹیوں، تاروں اور ڈریس میں جکڑا تھا۔ بنا کوئی حرکت کیے بس وہ صرف سانس لے رہا تھا۔ اس کی زندگی سے بھرپور آنکھیں بند تھیں چہرے پہ زردی سی کھنڈی تھی۔ ہونٹ سفید پڑ گئے تھے۔ علیزے سے اس دلربا شخص کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ بس ایک نظر ہی اسے دیکھ سکی تھی۔ اسے لگا کہ وہ اگر مزید چند منٹ بھی اور یہاں کھڑی رہی تو گر پڑے گی۔

وہ وہاں سے ہٹ کر ملاکے پاس آبیٹھی تھی۔ جو مسلسل اس کی زندگی اور صحت کے لیے دعا گو تھیں کچھ ہی عرصے میں وہ ان سب کو بہت زیادہ عزیز ہو گیا تھا۔ شہوز وہیں سر تھامے بیٹھا تھا کبھی احتشام انکل کو تسلی دیتا اور کبھی خود کو۔ حمزہ اس کے بچپن کا بہت پیارا اور عزیز دوست تھا اور اس کی پریشانی سے بھی ایک وہی تو واقف تھا اور شہوز کو کچھ کچھ اندازہ تھا کہ یہ ایکسیڈنٹ اسی ٹینشن کے باعث ہوا ہے۔ پھر ٹھیک اکلوتے گھنٹوں بعد ڈاکٹر نے آکر انہیں یہ خوشخبری دی تھی کہ اب وہ خطرے سے باہر ہے تو وہ کھل اٹھے تھے۔ لیکن وہ ہنوز بے ہوش تھا۔ اور ڈاکٹر کا خیال تھا کہ ایسی سیریس کنڈیشن کے بعد یہ بے ہوشی لازمی ہے۔

"ان شاء اللہ جلد ہی ہوش آجائے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں اور ہاں اگر آپ لوگ چاہیں تو انہیں اندر جاکے دیکھ سکتے ہیں لیکن یاد رہے ایک وقت میں ایک ہی آدمی اندر جائے اور بنا کوئی شور کیے واپس آجائیں۔" ڈاکٹر کی اجازت ملتے ہی بابا اس کے پاس چلے آئے تھے۔

"حمزہ میری جان" وہ پٹیوں میں جکڑے اس کے ماتھے پہ سر رکھ کر سسک اٹھے تھے۔

"مجھے معاف کر دو بیٹا۔ میں تمہاری پریشانی سمجھ ہی نہیں سکا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بچپن سے لے کر آج تک تم میری پریشانی کے خیال سے اپنی پریشانی پرابلم مجھ سے شیئر کرنے سے کتراتے ہو اور آج میں یہ بات بھول گیا اور تم پہ ہاتھ اٹھالیا۔ آئی ایم سوری بیٹا جانے کیسے میں یہ بات بھول گیا۔ بس اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ میں بہت پریشان ہو گیا ہوں اور دیکھو تو سب تمہارے لیے کتنے فکر مند ہیں۔"

وہ کتنے ہی لمحے اس کے سرہانے بیٹھے اس سے بے آواز باتیں کرتے رہے تھے اور پھر ان کے باہر آنے کے بعد سب نے ہی باری باری جاکر اسے دیکھا تھا۔ سوائے علیزے کے۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹرز کی مسلسل کوشش اور سب کی دعاؤں سے اس نے پانچویں روز مکمل طور پر آنکھیں کھول دی تھیں۔ سب نے اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ ورنہ ڈاکٹرز کو خدشہ تھا کہ کہیں اس کی یہ طویل بے ہوشی کوما کی صورت نہ اختیار کر لے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ طویل بے ہوشی کسی شدید ذہنی دباؤ کا نتیجہ ہے۔ مگر اب خطرہ مکمل طور پر ٹل چکا تھا۔ آنکھیں کھولتے ہی اس کی نظر سب سے پہلے جس چہرے پہ پڑی وہ بابا کا چہرہ تھا۔ طمانیت سے مسکراتا ہوا۔ اپنی طرف دیکھتا پاکر بابا فوراً ہی اس کی طرف آئے تھے اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئے تھے۔

"اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ تو نے میرے بیٹے کو نئی زندگی بخش دی۔ کیسے ہو میری جان۔" انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی چومی تھی۔ اس نے ہولے سے سرہلایا تھا۔ کتنے ہی لمحے وہ سب کو دیکھتا رہا تھا۔ مگر وہ ایک چہرہ جسے وہ دیکھنا چاہتا تھا وہ کہیں نہیں تھا ہر بار اس کی نگاہیں مایوس ہی لوٹ آئی تھیں۔ وجود میں تکلیف کا احساس اچانک ہی بڑھ گیا تھا تو اس نے مایوس ہو کر بابا کے سینے میں منہ چھپا لیا تھا۔ علیزے نے دن رات اس کی سلامتی کی دعائیں مانگی تھیں۔ وہ سارا وقت یہیں موجود رہی تھی۔ مگر اب جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ خاموشی سے باہر نکل آئی تھی۔ کیونکہ کہیں نہ کہیں وہ خود کو اس حادثے کا ذمہ دار سمجھتی تھی۔ کیونکہ پچھلے دنوں حمزہ کا رویہ اسے یہی باور کراتا رہا تھا لیکن کاش کہ وہ جان پاتی کہ حمزہ کتنی شدت سے اس کا منتظر ہے تو وہ

کبھی اس سے دور جانے کا فیصلہ نہ کرتی۔ سب ہی اپنے طور پہ اس کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔

بابا ہر لحہ سائے کی طرح اس کے ساتھ تھے۔ آفس کا سارا کام شہوز نے ہی سنبھال رکھا تھا پھر بھی وہ دن میں کئی چکر لگاتا تھا۔ صبح بوا کے آجانے سے بابا تھوڑی دیر کو آفس ہو آئے تھے اور پھر باقی کا تمام وقت وہ حمزہ کے ساتھ ہی گزارتے تھے۔ شہاب انکل اور رملا شام کو روز ہی اس کے پاس آتے تھے۔ رات کا کھانا بھی وہی اپنے ساتھ لاتی تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ حمزہ کو ان کے ہاتھ کا بنا کھانا کس قدر پسند ہے۔ معاذ بھی آفس سے واپسی پہ سیدھا اس کے پاس ہی آتا تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی علیزے سے علیحدگی والی بات کو لے کر اس سے ذرا بھی سرد مہری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ بس صرف علیزے اس دن کے بعد سے دوبارا نہیں آئی تھی اور حمزہ کی آنکھیں ہمہ وقت اس کی منتظر تھیں مگر وہ اسے کسی حد تک حق بجانب بھی سمجھتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"علینہ کدھر ہو یار، نظر ہی نہیں آتی ہو۔"

جاذب بنا ناک کیے ہی اس کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ بیڈ پہ نیم دراز ٹی وی دیکھنے میں مگن تھی۔ اس کی اتنی بے تکلفی پہ خاصی ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ کون سا طریقہ ہے کسی کے کمرے میں آنے کا؟ دروازہ ناک نہیں کر سکتے تھے۔"

وہ فوراً" ہی اپنی ناگواری کا اظہار کر دیا کرتی تھی۔ سو اب بھی یہی کیا تھا۔

"سو واٹ یار کیا فرق پڑتا ہے تمہیں ایک نیوز دینی تھی۔" جاذب نے اس کی بات کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔

"کیا۔" وہ ریموٹ سے ٹی وی آف کرتی اٹھ بیٹھی تھی۔ بلیک ٹراؤزر اور شارٹ شرٹ میں خاصی جاذب نظر لگ رہی تھی۔

"حمزہ کا بہت سیریس ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ سنا ہے اسے بہت چوٹیں آئی ہیں۔"

جاذب نے سامنے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اسے بتایا تھا۔ علیزے والے واقعے کے بعد وہ ہمہ وقت حمزہ پہ چیک رکھتا تھا اور اسے یہ اطلاع کل ہی ملی تھی لیکن وہ اپنی مصروفیت میں اسے بتانا بھول گیا تھا۔ اب یاد آیا تو اسے بتانے چلا آیا۔

"تو میں کیا کروں۔" علینہ نے لاپروائی سے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا۔

"کیا مطلب۔ اسے دیکھنے جاؤ بھئی۔ آخر کو تم اس سے محبت کرتی ہو اتنا کچھ کیا ہے تم نے اس کے لیے۔" جاذب نے جیسے اسے یاد دلایا تھا۔

"محبت مائی فٹ! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ آج تک علینہ وقار نے اپنے علاوہ کسی سے محبت نہیں کی ہے۔ ہاں ایک وقت میں اس سے دوستی ضرور کرنی چاہی تھی۔ مگر اب وہ میرے دل سے اتر چکا ہے اور ویسے بھی اب یہ ٹوٹا پھوٹا حمزہ اس علیزے کو ہی مبارک ہو۔ مجھے اس کی نرسنگ کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اور تم اچھی طرح جانتے ہو۔ جیسے میں علینہ وقار خود بالکل پرفیکٹ ہوں ایسے ہی مجھے اپنی سب چیزوں میں مکمل perfection چاہیے ہوتی ہے۔ چاہے وہ کوئی انسان ہی کیوں نہ ہو۔"

وہ اپنی ازلی خود پسندی سے بولی تھی۔ اس وقت وہ بھول چکی تھی کہ مکمل صرف خدا کی ذات ہوتی ہے اور کچھ نہیں اور وہ چاہے تو پل میں سب بدل دے۔ بس اس کے ایک کن کہنے کی دیر ہوتی ہے۔

"لیکن ہو نہ ہو اس سارے قصے کی ذمہ داری کہیں نہ کہیں ہم پہ بھی عائد ہوتی ہے۔"

جاذب ذرا ڈرا ہوا تھا کہ اگر حمزہ کو کچھ ہو گیا تو ان کا نام بھی آسکتا ہے اور وہ لوگ ایسے معمولی بھی نہیں تھے۔

"تو اب کیا کریں۔ پاؤں پڑ جائیں جا کے اس کے بھول جاؤ جو ہوا۔ ویسے میں اگلے ہفتے ماما پاپا کے پاس سٹڈی جا رہی ہوں۔" وہ لاپروائی سے کہتی اپنے موبائل پہ بزی ہو چکی تھی۔

"تم چلو گے میرے ساتھ" علینہ نے ایک دم ہی

اس سے پوچھا تھا۔
وہ چند لمحوں کو اس کی خوشنما آنکھوں میں ڈوب گیا تھا۔
"تمہارے ساتھ تو میں کہیں بھی جانے کو تیار ہوں۔ پھر یہ تو حسین شہر سٹی ہے۔ ضرور چلوں گا۔"
جاذب کو اور کیا چاہیے تھا حسین کمپنی کے ساتھ حسین ملک کی سیر۔
"لیکن ابھی تو تم ایسا کرو تیار ہو جاؤ۔" وہ اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا تھا۔
"کیوں کہاں جانا ہے۔ میرا بالکل بھی موڈ نہیں ہے کہیں جانے کا۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے بولی تھی۔
"کہیں نہیں جانا ہے۔ دراصل میں نے اپنے فرینڈز کو گھر بلایا ہے۔ ماما پاپا بھی نہیں ہیں۔ اچھا موقع ہے ذرا فن رہے گا۔ انجوائے کریں گے۔ تو تم بھی ہمیں جوائن کرلو۔"
وہ اس کے پیچھے ہی آکھڑا ہوا تھا اور اب بہت غور سے شیشے میں نظر آتے اس کے سراپے کو دیکھ رہا تھا۔
"میں نہیں آرہی تمہارے دوستوں کے ساتھ۔ بہت عجیب سے لگتے ہیں مجھے تمہارے سارے دوست۔" وہ بالوں میں برش پھیر رہی تھی۔
"ارے کیوں بھئی۔ وہ سب تمہیں اتنا پسند کرتے ہیں اور تم ان کے لیے ایسے کہہ رہی ہو۔ میں کچھ نہیں سنوں گا پلیز میری خاطر۔" جاذب نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر ریکویسٹ کی تھی۔
"او کے بابا ٹھیک ہے تم جاؤ میں تیار ہو کے آتی ہوں۔"
وہ جاذب کے بارے میں کچھ اور ہی سوچ بیٹھی تھی۔ اس لیے اس کی بات خلاف توقع جلدی مان لی تھی۔ وہ وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی تو جاذب چند لمحے وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا تھا۔ پھر کمرے سے باہر نکل آیا۔

☼ ☼ ☼

"بس کریں ماما۔ مجھ سے اب اور نہیں پیا جا رہا۔" حمزہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے سوپ کا باؤل ہاتھ سے دور ہٹایا تھا۔
"توبہ حمزہ کتنے نخرے کرتے ہو تم۔ بالکل بچوں کی طرح ابھی تم نے یہ پورا ختم کرنا ہے یو شاباش۔"
ماما نے اسے بالکل بچوں کی طرح ہی چمکارا اور اسے پھر سے سوپ پلانا چاہا۔
"بالکل نہیں ماما اور نہیں پلیز۔" اسے بچپن سے ہی یہ سوپ جیسی چیزیں بالکل پسند نہیں تھیں مگر آج جب ماما نے بتایا کہ یہ سوپ علیزے نے بنایا ہے تو وہ ناچاہتے ہوئے بھی کافی سارا پی گیا تھا اور ماما ابھی اسے مزید پلانے پہ مصر تھیں۔ بابا اور شہاب انکل وہیں دروازے کے پاس رکھے صوفے پہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور شہوز اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔
"شہوز یہ پھول تم لائے تھے" حمزہ نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھے پھولوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"ہاں کیوں اچھے نہیں لگے۔" شہوز نے سرسری سا بتایا تھا۔
"نہیں بہت اچھے ہیں ایسے ہی پوچھا تھا۔" شہوز کے کہنے پہ وہ کچھ کہتے کہتے رکا تھا۔ اگر یہ پھول شہوز لایا تھا تو ان پھولوں کی خوشبو اتنی جانی پہچانی سی کیوں تھی۔ آج اس کا بہت دل چاہا کہ وہ ایک بار ماما سے پوچھے کہ ماما علیزے کیوں نہیں آئی۔ لیکن پھر وہ خاموش ہو گیا یہ سوچ کر کہ جانے ماما کیا خیال کریں کہ تم کون سا اس کے پاس روز آتے تھے جب اسے تمہاری سب سے زیادہ ضرورت تھی جو وہ آتی حالانکہ وہ جانتا تھا کہ ماما ایسا کچھ نہیں سمجھیں گی مگر پھر بھی وہ نہیں کہہ پایا۔
"ہیلو ینگ مین کیا حال ہیں؟" شہوز اسے دوا دینے کے بعد آرام سے لیٹنے میں مدد دے رہا تھا کیونکہ کمر کی تکلیف کی وجہ سے اس سے زیادہ دیر بیٹھا نہیں جاتا تھا۔ تبھی ڈاکٹر راؤنڈ پہ چلے آئے تھے۔
"ٹھیک ہوں ڈاکٹر" وہ دھیمے سے مسکرایا وہ اس کا چیک اپ کرنے لگے۔
"ڈاکٹر میں گھر جانا چاہتا ہوں۔" "ایک ہفتے سے وہ

اسپتال میں رہتے رہتے تنگ آگیا تھا۔

"ابھی نہیں بیٹا۔ ابھی چند دن اور آپ کو یہاں رہنا پڑے گا۔ کچھ ٹیسٹ ہونے ہیں ان کی رپورٹس آنے تک پھر آپ گھر جاسکیں گے۔" ڈاکٹر نے اپنا اسٹیتھسکوپ گلے میں لٹکاتے ہوئے اسے کہا تھا۔ اور اس کا چارٹ اٹھا کر دیکھنے لگے تھے۔

"احتشام صاحب پلیز آپ میرے آفس میں آئے گا۔"

جاتے جاتے وہ بابا سے کہہ گئے تو وہ ان کے پیچھے ہی چلے گئے تھے۔

"جی ڈاکٹر آپ نے بلایا تھا۔"

"جی پلیز بیٹھیں۔" ڈاکٹر کے کہنے پہ وہ ان کے سامنے رکھی چیئر پہ بیٹھ گئے تھے۔

"دراصل بات یہ ہے احتشام صاحب کہ میں حمزہ کی کنڈیشن سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔"

ڈاکٹر نے پین بند کر کے فائل پہ رکھا اور مکمل طور پر ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"کیا مطلب ڈاکٹر سب ٹھیک تو ہے نا۔" وہ ایک دم ہی پریشان ہوئے تھے۔

"ہاں باقی تو سب ٹھیک ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے سر کا زخم بھی تیزی سے بھر رہا ہے اور پلاسٹر بھی ایک ہفتے بعد اتر جائے گا۔ مگر اصل چیز ہے اس کی بیک بون جو اس حادثے میں شدید متاثر ہوئی ہے اول تو اس کی گاڑی جس بری طرح پچکی گئی ہے اس میں اس کی جان بچ جانی ہی معجزہ ہے۔ کیونکہ گاڑی کی وہی سائیڈ زیادہ ڈیمج ہوئی جہاں ڈرائیونگ سیٹ پہ وہ تھا۔ اس لیے وہ اس قدر انجرڈ تھا اور اسی لیے اس کی بیک بون بھی متاثر ہوئی۔"

"تو اب کیا کرنا ہو گا ڈاکٹر۔" ڈاکٹر کی اس قدر تمہید سے وہ گھبرا گئے تھے۔

"میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ جلد از جلد اس کا آپریشن کروائیں۔ ورنہ خدانخواستہ کوئی پرابلم بھی ہو سکتی ہے اور تکلیف بڑھ بھی سکتی ہے۔" ڈاکٹر نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔

"ہاں وہ بھی تکلیف کی شکایت کر رہا تھا تو ڈاکٹر آپ علاج شروع کیجیے نا۔ وہ ٹھیک تو ہو جائے گا نا۔" بابا کا دل ابھی سے دہل گیا تھا یہ سوچ کر کہ جانے کیا ہو گا۔

"مکمل علاج سے وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا لیکن احتشام صاحب یہاں کسی بھی ادارے میں ایسے آپریشن بہت رسکی ہوتے ہیں اور میں آپ کو یہ رسک لینے کا مشورہ قطعی نہیں دوں گا۔ بہتر یہی ہو گا کہ آپ حمزہ کو علاج کے لیے بیرون ملک بھیج دیں۔ اگر آپ چاہیں تو سنگاپور میں ہمارے اسپتال کی برانچ ہے اور وہاں کئی ایسے کیسز کامیابی سے ہینڈل کیے گئے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں کل ہی اس کی ساری رپورٹس وہاں بھیج دیتا ہوں۔"

ڈاکٹر کا خلوص دل سے دیا گیا مشورہ انہیں بھی اچھا لگا تھا۔ انہیں بھی بس حمزہ کی سلامتی چاہیے تھی۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر۔ آپ اس کی تمام رپورٹس وہاں بھیج دیجیے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں بس وہ جلد از جلد ٹھیک ہو جائے۔" بابا نے فوراً" ہی کہا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر آپ بے فکر ہو جائیں۔ ان شاء اللہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ کل ہم اس کے کچھ اور ٹیسٹ کے بعد اس کی تمام رپورٹس وہاں بھیج دیں گے اور پھر جو جواب ملا میں آپ کو بتا دوں گا آپ پریشان نہ ہوں۔" ڈاکٹر اس کی ینگ ایج کو دیکھتے ہوئے کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھے۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے ان کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا کر دیا۔ وہ شکریہ ادا کر کے وہاں سے چلے آئے تھے۔

☆ ☆ ☆

آج بھی روز کی طرح بابا ہی اس کے پاس تھے اور اب سب کے جانے کے بعد اس کے پاس آبیٹھے تھے۔

"بابا علیزے آج بھی نہیں آئی ہے۔" وہ جانے کون سی بات کر رہے تھے اور وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ ایک دم اس کے پوچھنے پہ بابا خاموش ہو کے اسے

دیکھنے لگے تھے۔

"ہاں بیٹا۔" اب وہ اور کیا کہتے۔

"وہ مجھ سے بہت ناراض ہے بابا۔" وہ اب بھی صرف اسے ہی سوچ رہا تھا۔

"نہیں بیٹا ناراض کیوں ہوگی مصروف ہوگی ورنہ پہلے تو جب تم بے ہوش تھے وہ سارا وقت یہیں رہتی تھی۔" جانے کیوں بابا نے اس کا دھیان بٹانا چاہا تھا اب اس کو یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ جب تم اسے چھوڑنے کا سوچ بیٹھے ہو تو وہ کیونکر آئے گی۔

"حمزہ' بیٹے ایک بات پوچھوں۔" بابا کو ایک دم اچانک ہی کوئی خیال آیا تھا۔ اس نے اثبات میں سرہلایا۔

"تم اسے کیوں چھوڑنا چاہتے تھے۔ میں جانتا ہوں وجہ وہ نہیں جو تم نے مجھے بتائی تھی۔ وجہ کچھ اور ہے اور وہ وجہ کیا ہے بیٹا میں جاننا چاہتا ہوں۔ ایسا کیا ہو گیا ہے میری جان کیا اپنے بابا کو بھی نہیں بتاؤ گے۔" بابا نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ پھر اس رات اس نے بابا کے سینے پہ سر رکھ کر انہیں وہ ہر بات بتادی تھی جو اس علیحدگی کا سبب بنی تھی۔ وہ سب بتادیا تھا۔ جو وہ آج تک ان سے چھپاتا آیا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے سن رہے تھے۔

"حمزہ' تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے کیوں چھپائی بیٹا۔ اکیلے ہی اتنی پریشانی سہہ لی اور ایک لفظ بھی نہیں کہا۔" بابا نے پوری بات سننے کے بعد کہا تھا۔

"بابا میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں نہیں جانتا تھا کہ بات اتنی بڑھ جائے گی۔ میں نے سوچا تھا کہ یونیورسٹی ختم ہونے کے بعد سب خود بخود ہی سیٹ ہو جائے گا۔ لیکن بات ختم ہونے کے بجائے بات بڑھتی گئی اور یہاں تک آن پہنچی۔" حمزہ کے دل پہ کب سے دھرا بوجھ آج اتر گیا تھا۔

"اور تم اسی ٹینشن میں اس دن گھر سے نکلے تھے نا۔" بابا کا اشارہ اس کے ایکسیڈنٹ والی رات کی طرف تھا۔ وہ دھیرے سے سرہلا گیا تھا۔

"اور مجھے دیکھو ذرا میں سمجھ ہی نہیں پایا کہ کچھ تو ایسا ہوگا جس کی وجہ سے تم اتنا بڑا قدم اٹھانے جارہے ہو اور میں نے تمہیں ہی الزام دیا۔ تم پہ ہاتھ اٹھایا۔ آئی ایم سوری بیٹا۔"

وہ خود کو موردالزام ٹھہرا رہے تھے۔

"نہیں پلیز بابا ایسا نہ کہیں۔ غلطی میری ہے مجھے پہلے ہی آپ کو سب کچھ بتادینا چاہیے تھا۔ حالانکہ شہوز نے مجھ سے کئی بار آپ کو بتانے کو کہا تھا مگر جانے کیوں میں آپ کو بتا ہی نہیں پایا۔ لیکن خدا گواہ ہے بابا۔ میں نے کبھی علیزے پہ کسی قسم کا شک نہیں کیا۔ وہ میرے لیے آج بھی وہی ہے۔ ویسی ہی خاص بس میں ڈر گیا تھا کہ میرا ساتھ کہیں اسے رسوا نہ کردے۔ اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے' بس اس دن مجھ سے ماما اور انکل کی حالت دیکھی نہیں گئی اور علیزے وہ کس قدر سہم گئی تھی۔ اسی لیے میں نے یہ سوچا اور یہ فیصلہ میں نے کس دل سے کیا تھا یہ صرف میں جانتا ہوں بابا۔"

وہ دھیرے دھیرے اپنے دل کی تمام باتیں ہمیشہ کی طرح ان سے شیئر کر رہا تھا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں بیٹا تم کس اذیت سے گزرے ہوگے۔ لیکن اب تم بالکل فکر مت کرو۔ میں اب سب سنبھال لوں گا۔ دیکھتا ہوں کیا کرتے ہیں وہ لوگ بس تم خوش رہو اور اب ایسی کوئی احمقانہ سوچ اپنے ذہن میں مت لانا۔ بس اب تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔"

بابا نے محبت سے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اسے تسلی دی تھی۔ وہ ہلکا پھلکا سا ہو کر مسکرا دیا تھا۔

"میں جانتا ہوں بابا' آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔ آئی لو یو بابا۔"

اس کی نگاہوں میں بابا کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

"آئی لو یو ٹو میری جان۔ بس اب تم بے فکر ہو کر سو جاؤ اور ہاں اس گدھے شہوز کے تو میں صبح کان کھینچتا ہوں۔ تمہارے کہنے پہ وہ ہمیشہ مجھ سے سب باتیں چھپا جاتا ہے۔" وہ قدرے خفگی سے بولے تھے۔

"نہیں بابا وہ بہت اچھا ہے اسے میں نے ہی منع کر دیا تھا۔" وہ دوست کی طرف داری کر رہا تھا۔

"جانتا ہوں چلو اب تم سو جاؤ۔ میں یہیں ہوں تمہارے پاس۔"

بابا کے کہنے پہ اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں تھیں۔ وہ کتنے ہی لمحے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے رہے تھے۔ جب تک وہ پرسکون گہری نیند نہیں سو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

حمزہ دوا کے زیر اثر سو رہا تھا ابھی نرس نے اسے انجکشن دیا تھا۔ امید تھی کہ آج اسے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ ڈاکٹرز کی سنگاپور برانچ میں مکمل بات چیت ہو چکی تھی اور ایک ماہ بعد اس کا آپریشن تھا اور یہ ایک ماہ اسے مکمل طور پر صرف ریسٹ کرنا تھا۔ اسے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ نہ وہ زیادہ دیر بیٹھ سکتا تھا نہ زیادہ تیز چل سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ میں آپ کو ایک شرط پہ گھر جانے کی اجازت دے سکتا ہوں کہ اگر آپ وعدہ کریں کہ مکمل ریسٹ کریں گے ورنہ خدانخواستہ تکلیف بڑھ بھی سکتی ہے اور پھر انشاء اللہ ایک ماہ بعد آپ مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں گے اور پہلے کی طرح سب کچھ کر سکیں گے اور حمزہ نے چپ چاپ ان کی سب ہدایتوں کے جواب میں سر ہلا دیا تھا کیونکہ پچھلے بیس روز سے وہ اسپتال میں رہتے رہتے بیزار ہو چکا تھا اور اب بس گھر جانا چاہتا تھا۔

شہوز اس کے پاس ہی بیٹھا تھا بابا اسی سلسلے میں ڈاکٹر سے بات کرنے گئے تھے۔ جب ہی شہوز کے موبائل پہ کال آئی تو میگزین کی ورق گردانی کرتا شہوز' حمزہ کی ڈسٹربنس کے خیال سے وہ فون سننے کمرے سے باہر چلا آیا تھا۔ چند سیکنڈز موبائل پہ مصروف رہنے کے بعد وہ پلٹا تو سامنے سے آتی علمینہ وقار کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اس کی اتنی ہمت کہ یہ یہاں آن پہنچی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ حمزہ کے روم تک پہنچتی وہ تیزی سے اس کے سامنے آیا تھا۔

"یہاں کیوں آئی ہو تم اب کیا باقی رہ گیا ہے۔"

وہ سر جھکائے خاموشی سے چلتی نجانے کس سوچ میں تھی۔ شہوز کی آواز پہ حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔ شہوز نے پہلی دفعہ اسے شلوار قمیص میں ملبوس دیکھا تھا۔

"وہ مجھے حمزہ سے ملنا ہے۔" اس قدر نرمی' یہ علمینہ وقار تو ہرگز نہ تھی۔

"کیوں اب ایسی کونسی تکلیف ہے جو اسے دینا باقی ہے۔ تمہیں ذرا احساس نہیں ہے۔ کیسی لڑکی ہو تم؟ آج وہ اس حال کو پہنچا ہے تو صرف تمہاری وجہ سے۔ یہ بھی خدشہ ہے کہ کہیں خدانخواستہ ساری عمر کی معذوری اس کا مقدر نہ بن جائے اور ان تمام باتوں کی ذمہ دار صرف تم ہو اور پھر بھی تم کس قدر ڈھٹائی سے یہاں چلی آئی ہو۔ محبت تو محبوب کی خوشی مانگتی ہے۔ علمینہ تمہاری یہ کیسی محبت ہے کہ تم نے اسے بے بس اور اذیت میں دھکیل دیا۔ میں تمہیں اس سے ملنے کی اجازت نہیں دے سکتا تم چلی جاؤ یہاں سے۔" شہوز نے کتنے دنوں کی بھڑاس نکالی تھی۔

وہ سر جھکائے خاموشی سے سن رہی تھی۔ شہوز کو لگا وہ رو رہی ہے۔

"آئی ایم ویری سوری شہوز پلیز ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ میں جانتی ہوں۔ میں نے بہت غلط کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پلیز تم حمزہ سے کہنا مجھے معاف کر دے اور علیزے سے بھی۔"

علمینہ وقار اور اپنی غلطی اتنی آسانی سے تسلیم کر رہی ہے شہوز حیران تھا۔ کہیں یہ بھی اس کی کوئی چال تو نہیں۔ وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔

"پلیز آپ یہ حمزہ کو دے دیتا۔ دے دیں گے نا۔" وہ ایک لفافہ اس کی طرف بڑھائے ہوئے تھی۔ جانے کیا سوچ کر وہ شہوز نے تھام لیا تھا اور پھر بنا کچھ کہے پلٹی اور چلی گئی تھی۔ شہوز اس کے رویے کے بارے میں سوچتے ہوئے اندر روم میں چلا آیا تھا جہاں حمزہ ابھی تک سو رہا تھا۔ پھر حمزہ کے گھر آنے تک اسے موقع ہی

نہیں ملا کہ وہ' وہ لفافہ حمزہ کو دے پاتا۔ گھر میں داخل
ہوتے ہی پوا نے اس کا صدقہ اتارا تھا۔ آج کتنے دنوں
بعد وہ اپنے گھر میں قدم رکھ رہا تھا۔ اسے ہر چیز بہت نئی
نئی لگ رہی تھی۔ شہوز کے سہارے دھیرے دھیرے
قدم اٹھاتا وہ اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ پاپا بھی اس
کے ساتھ تھے۔ ماما کا فون آیا تھا وہ ابھی تھوڑی دیر تک
آرہی تھیں۔ اتنا سا چلنے سے ہی اس کی کمر میں درد
ہونے لگا تھا۔ وہ تکیوں کے سہارے اپنے بیڈ پہ نیم
دراز ہو گیا تھا۔ اس کے بازو کا پلاسٹر اتر چکا تھا البتہ سر پہ
ابھی بینڈیج باقی تھی۔

"حمزہ آج شام جب تم سو رہے تھے۔ تب اسپتال
میں علینہ آئی تھی۔" پاپا جب کمرے سے باہر گئے تو
شہوز نے بتایا تھا۔

"اچھا کیوں۔" اس نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں مجھے تو اس کا رویہ بہت عجیب سے لگا یار
بہت الگ سی لگی وہ جانے کیوں۔ یہ تمہارے لیے
دے گئی ہے۔" شہوز نے پاکٹ سے لفافہ نکال کر
اسے دیا تھا۔

"یہ کیا ہے۔" حمزہ نے الٹ پلٹ کر دیکھا تھا۔

"معلوم نہیں میں نے دیکھا نہیں ہے۔ تم خود دیکھ
لو۔"

"اوکے۔" حمزہ نے لفافہ تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا یہ
سوچ کر کہ بعد میں دیکھ لوں گا اور بعد میں ماما اور شہاب
انکل کے آجانے سے اور رات گئے سونے تک وہ اس
لفافے کو یکسر بھول چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"علیزے' تمہارے ماموں کا اسلام آباد سے فون
آیا تھا۔ وہ تمہیں بلا رہے ہیں کیوں؟؟"

رات کے لیے کھانا بناتے وقت ماما نے اچانک ہی
اس سے پوچھا تھا۔

"دراصل ماموں کا اسکول جو لڑکی سنبھال رہی
تھی۔ اس کی شادی ہو گئی ہے تو ماموں چاہتے ہیں کہ
میں ان کا اسکول سنبھال لوں۔" اس نے روٹی بیلتے
ہوئے سرسری سا کہا تھا۔

"وہ خود بھی تو سنبھال سکتے ہیں نا یا پھر گھر کا کوئی اور
فرد تم ہی کیوں؟؟"

ماما' سلاد کاٹنا چھوڑ کر مکمل طور پر اس کی طرف
متوجہ ہوئی تھیں۔

"پتا نہیں ماما۔" اس نے روٹیاں رومال میں لپیٹ کر
ہاٹ پاٹ میں رکھیں اور اب رخ موڑ کے سنک میں ہاتھ
دھو رہی تھی۔ ماما سمجھ گئیں کہ وہ ان سے کچھ چھپا رہی
ہے۔

"تم نے انہیں ایسا کرنے کو کہا تھا۔" وہ اٹھ کر اس
کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔

"نہیں ماما میں بھلا یوں کہوں گی۔ وہ تو خود ماموں
نے کہا تو میں نے کہا ٹھیک ہے ویسے بھی میں آج کل
فارغ ہی ہوں۔" وہ بدستور رخ موڑے ہوئے تھی اور
یہ اس کی بچپن کی عادت تھی کہ اول تو وہ جھوٹ بولتی
نہیں تھی اور اگر کبھی بولنا پڑ جائے تو کبھی بھی مقابل
سے نگاہیں ملا کر ڈھٹائی سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی
اور آج بھی وہ اپنی اسی عادت کی وجہ سے پکڑی گئی
تھی۔

"علیزے' ادھر میری طرف دیکھو۔ اپنی ماما سے
چھپاؤ گی۔ کیا بات ہے بتاؤ مجھے۔"

ماما نے بازو سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا تھا
اور اس کی بھیگتی پلکیں تیزی سے ان کی نگاہ میں آئی
تھیں۔

"یہاں سے دور جانا چاہتی ہو حمزہ کی وجہ
سے؟"

ماما کے کہنے پہ اس نے اثبات میں سر ہلا کر بمشکل
آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا تھا۔

"دیکھو بیٹا جلد بازی مت کرو۔ میں نہیں جانتی کہ
حمزہ کے اس رویے کے پیچھے کیا وجہ تھی۔ لیکن بیٹا اتنا
ضرور کہوں گی کہ کچھ ایسا ضرور تھا جو وہ ہم سے کہہ
نہیں پا رہا تھا جیسے کوئی بات ہے جو اسے مجبور کر رہی
ہے اس فیصلہ پر کیونکہ جتنا اسے میں نے جانا ہے نا بیٹا'
وہ ایسا نہیں ہے۔ میں نے اس کی نگاہوں میں تمہارے

لیے آج بھی وہی عزت وہی محبت دیکھی ہے۔ جو پہلے دن دیکھی تھی جانتی ہو جب بھی میں اس کے پاس جاتی ہوں وہ شدت سے تمہارا منتظر رہتا ہے اور تمہیں میرے ساتھ نہ پا کر وہ جس طرح مایوس ہوتا ہے وہ میں بہت اچھی طرح محسوس کرتی ہوں۔ پر کچھ ایسا ہے جو اسے تمہارے پاس آنے سے روک رہا ہے۔" ملا نے اتنے دنوں میں جو محسوس کیا وہ سب اسے کہہ دیا تھا۔

"نہیں ماما میں بہت اچھی طرح جان چکی ہوں۔ وہ اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ اس وقت جب مجھے ان کے اعتبار کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ تب انہوں نے میرا اعتبار نہیں کیا اور مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ کیسی محبت ہے ماما یہ کیسا اعتبار تھا۔"

اتنے دنوں میں پہلی بار اس نے ملا کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"مجھے جانے کی اجازت دے دیں ماما۔ ہاں میں نے خود ماموں سے کہا تھا کہ میں وہاں آنا چاہتی ہوں۔ پلیز پلیز ماما چاہے تھوڑے عرصے کے لیے سہی۔ مگر میں یہاں سے دور جانا چاہتی ہوں۔ اس طرح شاید ہم دونوں کو ہی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی پلیز ماما۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا میں کیا کہہ رہی ہوں۔ آپ بابا سے بات کریں گی نا۔" وہ ان کے ہاتھ تھامے ملتجی سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

اور جانے کیوں ماما نے اسے خود سے لگاتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ کس خوشی سے انہوں نے دونوں کا نکاح کیا تھا اور اب یہ کیا ہو گیا تھا۔ انہوں نے روتی ہوئی علیزے کو دیکھا تھا۔ ناسمجھی میں اٹھائے ہوئے ایک قدم نے کتنی زندگیاں برباد کر دی تھیں۔ وہ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی ایک گلٹ میں مبتلا ہو گئی تھی۔ تبھی اس نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن ماما قطعی نہیں چاہتی تھیں کہ علیزے وہاں جائے اس طرح فاصلہ اور بڑھ جائے گا۔ غلط فہمی اور پختہ ہو جائے گی۔ اس لیے انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ حمزہ سے ایک بار بات ضرور کریں گی۔

☆ ☆ ☆

"سمجھ نہیں آتا آپ کو کیسے مخاطب کروں۔ کیونکہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کو مخاطب کر سکوں۔ اس لیے بنا مخاطب کیے ہی بات شروع کر رہی ہوں۔ حمزہ میں نے جو کچھ کیا وہ غلط تھا۔ ضد تھی' ناسمجھی تھی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر بچپن سے لے کر آج تک اپنی ہر من پسند چیز چٹکیوں میں حاصل کرنے کی ایسی عادت پڑ چکی تھی کہ میں نے آپ کو بھی انسان کی بجائے ایک بے جان چیز سمجھا اور سوچا کہ میں چٹکی بجاتے ہی آپ کو بھی حاصل کر لوں گی۔ مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ میرے دل میں دور دور تک آپ کی محبت کا کوئی نشان ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملا۔ وہ تو بس صرف ضد اور انا میں اٹھایا جانے والا قدم تھا۔ صرف ایک حسد کہ علیزے میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں۔ اپنی تذلیل کا احساس مجھے ہر برا قدم اٹھانے پہ مجبور کر گیا اور مجھے کوئی روکنے والا بھی نہیں تھا۔ پر آج سمجھ نہیں آتا کہ کن الفاظ میں آپ سے معافی مانگوں کیونکہ آج تو میں آپ سے معافی مانگنے کے بھی قابل نہیں رہی۔ آج میں سوچ رہی ہوں کہ ہمیشہ خود کو سمجھانے پہ علیزے کا مذاق اڑاتی تھی۔ اسے اپنے جیسا بنانے کی کوشش کرتی تھی۔ پر آج شدت سے مجھے اس بات کا احساس ہے کہ کاش میں علیزے جیسی بن جاتی کیونکہ لڑکیاں تو ایسی ہی اچھی لگتی ہیں نا اپنی حفاظت کرنے والی۔ شرم و حیا سے مزین پروقار سی نہ کہ میرے جیسی ہر ایک کے سامنے اپنا آپ طشتری میں سجانے والی۔

ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ہی علیزے کو اپنے کزن جاذب اور اس کے دوستوں کے ساتھ مل کر کڈنیپ کروایا تھا۔ تاکہ آپ کو مجبور کر سکوں آپ اسے چھوڑ دو۔ مگر آپ کی محبت کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ آپ اسے چھوڑنے کا فیصلہ کرنے سے پہلے ہی خود موت کی دہلیز چھو آئے۔ جب مجھے تمہارے ایکسیڈنٹ کا پتا چلا تو جانتے ہو میں نے کیا کہا۔ میں

نے کہا اب اس ٹوٹے ہوئے شخص کا میں کیا کروں گی۔ وہ علیزے کو ہی مبارک ہو۔ کیونکہ میرا ارادہ کبھی بھی تم سے شادی کرنے کا نہیں تھا۔ مجھے تو اپنی ہر چیز بالکل پرفیکٹ چاہیے تھی اپنی طرح اور تم تو پہلے ہی علیزے کے شوہر تھے اور اس کی محبت میں گرفتار تو میں کیسے تمہیں اپنی زندگی میں شامل کر سکتی تھی۔ لیکن جانے کیوں یہ سب سوچتے ہوئے میں یہ کیوں بھول گئی کہ پرفیکٹ صرف خدا کی ذات ہوتی ہے اور اگر اس نے مجھے ہر دولت سے مالا مال کیا ہے۔ ایک مکمل' خوبصورت انسان بنایا ہے تو یہ اس کا مجھ پہ احسان ہے۔ لیکن میں مغرور ہو گئی خود پسند ہو گئی۔ بھول گئی اس پاک ذات کو۔ جو ہمارے پل پل کا مالک ہے۔

مگر آج میرا غرور مٹی میں مل گیا۔ میں چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکیں کیونکہ یہی میری سزا تھی۔ میں کتنا روئی' کتنا چلائی لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ اس رات پارٹی میں جاذب نے اپنے دوستوں کے ساتھ نشے کی حالت میں میری ذات کا غرور مٹی میں ملا دیا اور میں کچھ نہیں کر سکی اور جانتے ہو جب میں نے اسے کہا کہ وہ مجھ سے شادی کر لے تو اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا کہ تمہارے جیسی لڑکیاں گھر بسانے کے لیے نہیں ہوتیں صرف استعمال کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ شاید وہ سچ کہتا ہے اور یہ سب مجھے شاید تم دونوں کے ساتھ کیے جانے والی زیادتیوں کی سزا ملی ہے۔ علیزے کو کڈنیپ کرواتے وقت جانے کیوں میں ایک پل کو یہ بھول گئی تھی کہ میں بھی ایک لڑکی ہوں اور مجھے ایک لڑکی کے ساتھ یہ سب نہیں کرنا چاہیے۔ پلیز ہو سکے تو تم دونوں مجھے معاف کر دینا اور ہاں حمزہ' علیزے جیسی ہمارے پاس آئی تھی بالکل ویسے ہی آج بھی ہے کیونکہ میں نے ہی جاذب کو کہا تھا کہ وہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچائے ورنہ تم ہماری بات نہیں مانو گے اور جانتے ہو بدلے میں اس نے تب ہی مجھ سے علینہ وقار کو مانگا تھا اور میں کچھ ہی نہیں پائی۔

مگر آج میں بہت گندی ہو گئی ہوں۔ بہت ناپاک' مجھے گھن آتی ہے اپنے وجود سے۔ آج میں نے جان لیا کہ زندگی میں اتنی غلطیاں نہیں کرنی چاہیے کہ تلافی کی گنجائش ہی نہ رہے۔ میں نے آج تک خدا سے کچھ نہیں مانگا کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی بنا مانگے ہی سب کچھ ملتا رہا مگر آج مانگتی ہوں۔ اپنے لیے موت اور تم دونوں کے لیے ڈھیر ساری خوشیاں۔ تم علیزے کو کبھی مت چھوڑنا حمزہ وہ بہت اچھی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہو تب ہی تو میری تدبیریں بیکار ہو گئیں۔ دعا کرنا کہ خدا میری دونوں دعائیں جلد سن لے۔" "تمہاری معافی کی طلب گار علینہ وقار" وہ جوں جوں خط پڑھتا گیا اس کے تاثرات بدلتے رہے تھے اور اب مکمل پڑھ لینے کے بعد وہ سن سا بیٹھا تھا۔

"یا خدا یہ اس لڑکی نے اپنے ساتھ کیا کر لیا۔" وہ اپنی کیفیت کو سمجھ نہیں پایا تھا۔

کسی اور کے لیے کھودے جانے والے گڑھے میں وہ خود ہی گر پڑی تھی' کتنی ہی دیر وہ خط تھامے خاموش بیٹھا رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تھا یا بڑھ گیا تھا۔ کل جب شہوز نے اسے یہ لیٹر دیا۔ تو وہ رکھ کر بھول گیا تھا اور آج جب وہ سونے لیٹا تو تکیے درست کر کے رکھتے وقت یہ لیٹر ہاتھ میں آ گیا' اس نے سوچتے ہوئے لیٹر کھول لیا کہ علینہ کو مجھے لیٹر لکھنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ لیکن جوں جوں وہ پڑھتا گیا اس کی کیفیت عجیب سی ہو گئی تھی۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی ہمیشہ اس لیے خاموش ہو جاتا تھا کہ وہ ایک لڑکی ہے اور وہ مرد ہو کر اس سے کیا ٹکرائے۔ مگر خدا گواہ تھا کہ ان دونوں میں سے ہی اسے کسی نے کبھی کوئی بددعا نہیں دی تھی۔ علیزے تو شاید جانتی بھی نہیں تھی کہ ان سب کے پیچھے کون ہے۔ مگر کسی کے ساتھ مسلسل برا کرتے کرتے ہم جانے کیوں یہ بھول جاتے ہیں کہ کسی کے ساتھ اچھا یا برا کرنے کا حق ہمیں نہیں ہے۔ وہ خالق کائنات جو آسمان پر براجمان ہے بلکہ ہر جگہ موجود ہے۔ صرف یہ

حق اسے ہی حاصل ہے۔ بس اس کے ایک اشارے کی دیر ہوتی ہے اور پل میں سب بدل جاتا ہے اور اب بھی یہی ہوا تھا۔ ناحق کسی کو ستانا گناہ ہے اور علینہ نے تو پرفیکٹ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ حمزہ دل سے اسے معاف کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے دکھی بھی تھا۔

اگلے دن جب وہ ناشتے کے بعد بوریت سے بچنے کے لیے نیوز پیپر دیکھ رہا تھا حالانکہ وہ نیوز پیپر نہیں پڑھتا تھا لیکن کبھی کبھار سرسری سی نگاہ ڈال لی اور بس۔ پاپا ہی پڑھتے تھے لیکن آج اتفاقاً" ہی بوریت سے بچنے کے لیے اٹھالیا تھا۔ کیونکہ پاپا آفس جاچکے تھے اور ربوا کچن میں تھیں، تبھی اس کی نظر اندرونی صفحے کی ایک چھوٹی سی ہیڈ لائن پہ جم گئی تھی۔

"مشہور انڈسٹریلسٹ وقار بیگ کی اکلوتی صاحبزادہ علینہ وقار نے خودکشی کرلی۔ والدین کا وجہ بتانے سے انکار باخبر ذرائع سے پتا چلا ہے کہ علینہ وقار کو ان کے کزن جاذب صدیقی نے اپنے دوستوں کے ساتھ نشے کی حالت میں اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا تھا اور بعد میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ روپوش ہوگیا اور تاحال روپوش ہے اور یہی سبب ہے علینہ وقار کی خودکشی کا۔ تاہم اس کے گھر والے یہ وجہ ماننے سے انکاری ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ علینہ وقار، جاذب صدیقی کے خاصے قریب تھیں اور ان کی ہر سرگرمی میں ان کے ساتھ دکھائی دیتی تھیں اور اپنے والدین کی غیر موجودگی میں وہ جاذب صدیقی کی والدہ یعنی اپنی خالہ کے گھر رہائش پذیر تھیں ان کے والدین کسی بھی قسم کی کارروائی کرنے سے انکاری ہیں۔" آگے بھی اور جانے کیا کچھ لکھا تھا۔ لیکن اس سے پڑھا ہی نہیں گیا تھا۔

"او مائی گاڈ۔" وہ کتنی ہی دیر ساکت بیٹھا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"چھوٹے مالک۔ آپ کا فون ہے۔" ملازم نے کارڈلیس لاکر حمزہ کو تھمایا تھا۔

وہ اس وقت لاؤنج میں صوفے پہ کشنز کے سہارے نیم دراز تھا۔ اب وہ خود کو کافی بہتر محسوس کررہا تھا۔ لیکن پھر بھی کافی احتیاط سے کام لیتا تھا اور پاپا بھی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ پاپا ابھی آفس سے آئے نہیں تھے۔ وہ ان کا ہی انتظار کررہا تھا۔ تبھی ملازم نے اس کو فون تھمایا تھا۔ اپنا موبائل وہ شاید کمرے میں بھول آیا تھا۔

"ہیلو۔" اس نے ریموٹ سے ٹی وی کا والیوم کم کیا تھا۔

"ہیلو حمزہ کیسے ہو بیٹا۔" دوسری طرف ماما تھیں۔

"ماما السلام علیکم۔ کیسی ہیں آپ؟" وہ کتنے دنوں سے انہیں یاد کررہا تھا۔

کیونکہ جب سے وہ اسپتال سے گھر شفٹ ہوا تھا۔ وہ بمشکل دو یا تین بار آئی تھیں۔

"وعلیکم السلام بیٹا میں تو ٹھیک ہوں تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟" ان کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

"میں اب ٹھیک ہوں ماما پہلے سے کافی بہتر۔ آپ اتنے دنوں سے آئیں ہی نہیں بھول گئیں نا اپنے بیٹے کو۔

میں آپ کو بہت مس کررہا تھا۔" اس نے فوراً" ہی شکوہ کر ڈالا تھا۔

"بس بیٹا آنا ہی نہیں ہوا۔ حمزہ تم سے ایک بات کرنا تھی بیٹا۔"

"جی کہیں ماما کیا بات ہے؟" ماما کے لہجے سے اسے لگا کہ جیسے کوئی خاص بات ہے۔

"حمزہ، علیزے اسلام آباد جارہی ہے بیٹا اپنے ماموں کے پاس۔ ہم سب اسے کتنا روک رہے ہیں لیکن وہ مان ہی نہیں رہی۔ تم اسے روک لو بیٹا۔ وہ تمہاری بات ضرور مان لے گی۔"

ماما کا لہجہ بھیگا بھیگا سا تھا۔ انہوں نے اس موضوع کو لے کر کبھی حمزہ سے بات نہیں کی تھی۔ لیکن آج کر رہی تھیں۔

"لیکن وہ کیوں جارہی ہے ماما۔" وہ خود پچھلے کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ وہ علیزے سے بات کرنے

اور اسے سب بتانے خود اس کے پاس جائے گا۔ مگر ابھی ماما کی کال سے وہ پریشان ہو گیا تھا اور جواب میں ماما نے اسے پوری بات بتادی تھی۔

"بیٹا ہم نہیں چاہتے کہ وہ یہاں سے جائے۔ لیکن وہ مان نہیں رہی۔ ہم سب نے اسے کتنا سمجھایا ہے مگر پہلی بار وہ اتنی ضدی بن گئی ہے بیٹا۔ تم بات کرو گے نا اس سے؟" ماما نے ایک مان سے اس سے پوچھا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں ماما میں اس سے بات کروں گا۔ میں خود ہی بات کروں گا اس سے۔ ایسے کیسے وہ چلی جائے گی اور ہم اسے جانے دیں گے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں وہ کہیں نہیں جائے گی کب جا رہی ہے وہ؟" حمزہ نے ماما کو بھرپور تسلی دی تھی۔

"آج شام سات بجے اس کی فلائٹ ہے۔" اس نے ماما کو تسلی دینے کے ساتھ فون بند کر دیا تھا۔

ماما نے اسے کہا تھا کہ وہ علیزے کو نہ بتائے کہ انہوں نے اسے فون کیا تھا۔ کیونکہ اس نے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ حمزہ سے کسی بھی قسم کا کوئی رابطہ نہیں چاہتی ہے۔

"حمزہ کیا ہوا بیٹا کیا سوچ رہے ہو۔" بابا کب آکر اس کے پاس بیٹھے اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

"بابا وہ ابھی ماما کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ۔۔۔۔"

"علیزے جا رہی ہے۔" بابا نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا تھا۔

"جی آپ جانتے ہیں۔" حمزہ نے ایک نگاہ انہیں دیکھا تھا۔

"ہاں۔ کئی دن پہلے سے مگر یہ بات اتنی اہم نہیں ہے۔ جتنی یہ بات اہم ہے کہ تم کیا چاہتے ہو۔ کیونکہ اب تو کوئی پرابلم نہیں ہے نا۔ تو کیا اب بھی تم اسے جانے دو گے؟"

بابا کو وہ علینہ کے لیٹر وغیرہ کے بارے میں سب بتا چکا تھا۔

"نہیں بابا۔" وہ بے اختیار ہی نفی میں سر ہلا گیا تھا۔

"تو بے وقوف لڑکے۔ جاؤ اور اسے روکو وہ تمہاری بیوی ہے اور تم سے ناراض ہو کر جا رہی ہے۔ اب مزید دیر مت کرنا۔" بابا نے فوراً ہی اسے کہا تھا۔

"لیکن بابا۔ کیا وہ مان جائے گی۔ وہ بہت زیادہ ناراض ہے۔" جانے کیوں وہ ڈر رہا تھا۔

اس کے جانے کا سن کر ہی اسے عجیب سا احساس ہو رہا تھا کہاں اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا سوچ بیٹھا تھا۔

"کیوں نہیں مانے گی دیکھو حمزہ صرف تم ہی ہو جو اسے روک سکتے ہو۔ کیونکہ اسے تم سے شکایت ہے اور تم ہی اس کا کھویا اعتبار اسے واپس لوٹا سکتے ہو۔ اس کی تمام شکایات دور کر سکتے ہو۔ جاؤ اسے روک لو کیونکہ اس سے الگ ہونے کی ہمت تو تم میں بھی نہیں ہے۔ جاؤ مناؤ اسے یقیناً" وہ بھی تمہاری منتظر ہوگی۔"

بابا نے اس کے کندھے پہ بازو پھیلا کر اسے خود سے قریب کرتے ہوئے سمجھایا تھا۔ وہ بے اختیار ہی سر اثبات میں ہلا گیا تھا کیوں کہ اس سے دوری کا تصور ہی سوہان روح تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو یار مجھے تو پل میں منا لیتے ہو اور اسے منانے میں اتنی دقت۔"

بابا نے اس کی سوچ میں ڈوبے چہرے پہ ایک نگاہ ڈالی تھی۔

"آپ کی بات الگ ہے بابا" وہ جھینپ کر مسکرا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایئرپورٹ کے گیٹ سے حمزہ کی گاڑی اندر داخل ہوئی تو اس نے بے اختیار ہی رسٹ واچ پہ ایک نظر ڈالی تھی۔ جہاں ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ صبح سے پڑنے والی ہلکی ہلکی پھوار سے گاڑی کے شیشے بھیگ رہے تھے۔ گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے ڈرائیور نے اسے اترنے میں مدد دی تھی۔ اور اندر آنے تک ڈرائیور مسلسل اس کے ساتھ تھا دھیمے دھیمے قدموں سے ادھر ادھر دیکھتا وہ اندر جا رہا تھا کیونکہ ابھی بھی نہ وہ

بہت تیز چل سکتا تھا اور نہ ہی دوڑ سکتا تھا۔

"ارے حمزہ آپ ادھر۔" پاس سے گزرتے معاذ نے اسے بازو سے تھام کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

"ہاں میں علیزے سے ملنے آیا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟" حمزہ نے فوراً" ہی اس سے پوچھا تھا۔

"ہاں میں اسے چھوڑنے آیا تھا۔ چھوڑ کر واپس جارہا تھا تو پتا چلا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے فلائٹ آدھا گھنٹہ لیٹ ہے اسی لیے واپس اس کے پاس جارہا تھا کہ آدھا گھنٹہ وہ اکیلی کیا کرے گی۔"

معاذ کے بتانے پہ حمزہ نے ایک اطمینان بھری سانس لی تھی کہ اب وہ اس سے آسانی سے بات کرپائے گا۔

"معاذ میں اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ضرور۔ وہ وہیں سامنے ویٹنگ لاؤنج میں ہے۔ آپ جائیے۔"

معاذ نے فوراً" ہی اسے بتایا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ صرف حمزہ ہی ہے جو اسے روک سکتا ہے ورنہ وہ تو سب ہی سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے حمزہ کو اس طرف بھیج کر معاذ ایئرپورٹ سے باہر آگیا تھا۔ جانتا تھا کہ وہ یقیناً" اسے روک لے گا۔ حمزہ اس طرف آیا تو لوگوں کے ہجوم میں کتنی ہی دیر اس کی نگاہیں اسے کھوجتی رہی تھیں تبھی ایک فیروزی اور بلیک آنچل نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ دھیمی چال چلتا وہیں آگیا تھا۔ سب سے قدرے ہٹ کر بیٹھی سر جھکائے جانے کس سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ علیزے ہی تھی۔

اس کا سامان اس کے پاس ہی رکھا تھا اور وہ اردگرد سے بے نیاز خاموشی سے بیٹھی تھی۔ تب ہی اسے احساس ہوا کہ اس کے برابر والی چیئر پہ کوئی بیٹھا ہے مگر وہ پھر بھی اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔

"مجھے چھوڑ کر جارہی ہو۔" قریب سے آتی آواز پہ اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

اپنے قریب بیٹھے حمزہ کو حیرانی سے چند لمحے دیکھنے کے بعد وہ منہ پھیر گئی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو مگر اتنی ناراض ہوجاؤ گی کہ مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی یہ میں نہیں جانتا تھا کیونکہ باوجود کوشش کے تم سے علیحدگی کے لیے صرف سوچنا ہی میرے لیے سوہان روح ہے اور تم مجھے چھوڑ کر جارہی ہو مگر سچ پوچھو تو اس میں میرا بھی اتنا قصور نہیں تھا۔ کیونکہ میں اس قدر مجبور کردیا گیا تھا اور اتنا بے بس ہوگیا تھا کہ اس کے سوائے اس کے میرے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں بچا تھا۔ تمہاری بدگمانی اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن باخدا میں کبھی تم سے دور رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

حمزہ نے اسے یقین دلانا چاہا تھا۔

"ایسی بھی کیا مجبوری تھی۔ جو آپ نے مجھے یوں بے اعتبار کردیا۔ میرا مان توڑ دیا۔ میں سارے زمانے کی بے اعتباری سہہ سکتی تھی لیکن آپ....."

آنکھوں میں تیزی سے جمع ہونے والے آنسوؤں نے اسے اپنی بات مکمل کرنے نہیں دی تھی۔

"تمہاری سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ لیکن اگر تم ایک بار میری بات پوری سن لوگی۔ تو شاید تمہیں کوئی بھی فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ لیکن خدا گواہ ہے علیزے میں نے کبھی تم پہ کوئی شک نہیں کیا اور میں کبھی ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم آج بھی میرے لیے ویسی ہی پاکیزہ ویسی ہی خاص ہو جیسے پہلے دن تھیں اور ہمیشہ سے ہو۔ مجھے تم سے دور کردینے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن جو رشتہ خدا کے حکم سے جڑا تھا۔ وہ بھلا کوئی کیسے توڑ سکتا تھا۔"

حمزہ نے اس کی گود میں رکھے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تھی۔

"میں کیسے مان لوں۔ اب آپ کی ان ساری باتوں کو۔ کیونکہ جب مجھے سب سے زیادہ آپ کی ضرورت تھی آپ ایک بار بھی میرے پاس نہیں آئے۔ میری سینت سینت کر رکھی گئی زندگی کے لیے وہ دن ایک امتحان تھا۔ بہت بڑا امتحان اور میں جب اس امتحان سے اس مشکل وقت سے گزر گئی تو آپ نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ تو اب ان سب باتوں کا مطلب۔"

وہ تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑاتی خفگی سے شکوہ کرتی

اس لیے حمزہ کو بہت اچھی لگی تھی۔

"تم یہ دونوں چیزیں دیکھ لو۔ تمہیں مطلب خود ہی سمجھ میں آجائے گا۔" حمزہ نے وہ خط اور اخبار دونوں ہی چیزیں اپنے جیکٹ کی جیب سے نکال کر اسے تھمائی تھیں مگر وہ ہنوز رخ پھیرے ہوئے تھی۔

"علیزے پلیز بس ایک بار۔"

حمزہ کے التجائیہ لہجے پہ چند لمحے بعد اس نے وہ دونوں چیزیں تھام لی تھیں۔ جیسے جیسے وہ خط پڑھتی گئی۔ اس کے تاثرات بدلتے جارہے تھے۔ جیسے بے یقینی کی کیفیت ہو۔ حمزہ کتنے ہی لمحے سے اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔ آج بھی ہمیشہ کی طرح کتنی ہی لٹیں اس کے چہرے کا حصار کیے ہوئے تھیں۔

"علینہ کو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

اس کی دھیمے لہجے میں کی جانے والی بڑبڑاہٹ حمزہ نے واضح سنی تھی۔ وہ ابھی تک بے یقین تھی پھر حمزہ نے دھیرے دھیرے اسے سب ہی کچھ بتادیا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی تھی۔

"اتنی بڑی بات آپ نے مجھ سے چھپائے رکھی کیوں حمزہ کیوں؟ حالانکہ میں اس سارے قصے میں پوری طرح انوالو تھی۔ پھر کیوں؟ میں آپ سے الگ تو نہیں تھی پھر بھی آپ کو مجھے اذیت دینا منظور تھا۔ لیکن سچائی بتانا نہیں۔" دونوں چیزیں واپس اس کی گود میں پھینکتے ہوئے وہ چلائی تھی۔

"میں بہت ڈر گیا تھا علیزے۔"

"مگر محبت ڈرنا نہیں سکھاتی حمزہ۔" وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ گئی تھی۔

"میں مانتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے تم سے سب کچھ کہہ دینا چاہیے تھا۔ مگر جانے کیوں تمہاری محبت نے مجھے بزدل بنادیا تھا۔ میں تمہیں کھونے سے ڈرنے لگا تھا۔ میرا مقصد تمہیں تکلیف دینا نہیں بلکہ تکلیف سے بچانا تھا۔ اس نے دن تمہاری غیر موجودگی میں میں انکل اور ماما کی حالت دیکھ کر خود کو مجرم سمجھنے لگا تھا۔ مجھ سے ان کی حالت دیکھی نہیں گئی تھی اور جب تم واپس آئیں تو سب کتنا خوش تھے۔ لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ تمہیں واپس لانے کے لیے مجھے کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ میں نہیں بتاپایا تھا سب کو کہ مجھ سے وابستگی تمہارے لیے جرم بن گئی ہے اور اسی رات' اسی پل میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں تم سے دور چلا جاؤں گا صرف تمہیں مزید کسی حادثے سے بچانے کے لیے میں نے تمہیں یہ محسوس کرایا کہ میں اس واقعے کے بعد سے تم سے الگ ہونا چاہتا ہوں۔ مگر میں ایسا کر نہیں پایا اور اس رات بابا کو اپنا آخری فیصلہ سنانے کے بعد جب میں گھر سے نکلا تو میں نے جان بوجھ کر گاڑی فل اسپیڈ پہ چھوڑ دی تھی کہ میری برداشت ختم ہوتی جارہی تھی اور رہی بات کہ علینہ نے ایسا کیوں کیا تو میں تمہیں بتاؤں کہ وہ بہت پہلے سے تمہاری جگہ لینا چاہتی تھی اور ہر بار میرے دھتکارنے پہ اس نے یہ قدم اٹھایا۔ اب میں مزید اس کے بارے میں اور کیا کہوں کہ خدا نے اس کا فیصلہ کردیا ہے۔ اس کو اس کے غرور اور خودپسندی کی سزا حرام موت کی صورت میں ملی۔ مگر اب میں تم سے دور نہیں رہنا چاہتا۔ جب مجھے پتہ چلا کہ تم جارہی ہو تو فوراً" یہاں چلا آیا۔ پلیز علیزے رک جاؤ مت جاؤ اب تو سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔"

حمزہ نے دھیرے سے اس کا رخ اپنی طرف پھیرنے کی کوشش کی تھی۔

"آپ کی محبت اتنی کمزور کیسے ہوگئی تھی حمزہ کہ ان کے کہنے پر مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا مجھ تو بتایا ہوتا ایک بار تو مجھ کہا ہوتا اور اگر یہ سب اس طرح نہ ہوتا تو آپ مجھے چھوڑ دیتے۔ میں کیسے یقین کرلوں کہ آپ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ میں آپ کی بیوی ہوں حمزہ اور آپ نے مجھے ہی بے اعتبار کرڈالا۔ ہمارا محبت سے باندھا گیا یہ رشتہ' اس قدر کمزور تھا' اس قدر کچا تھا کہ پل بھر میں ٹوٹ جاتا۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے مگر پھر بھی آپ نے ایسا سوچا۔ میرے لیے تو یہ سوچنا بھی موت ہے۔ اگر آپ منع کردیتے ڈٹ جاتے تو کوئی کیا کرسکتا تھا۔ آپ کی

محبت مجھے رسوا کیسے کر سکتی تھی۔ میں اپنی جان دے دیتی لیکن آپ کی محبت کو کبھی رسوا نہ کرتی۔"

وہ روتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی کچھ وقت سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"سوری' میں نہیں رک سکتی۔ میں جا رہی ہوں۔ کیونکہ میں جانے کا فیصلہ کر چکی ہوں اور پتا نہیں کہ میں واپس آؤں گی بھی یا نہیں۔ مگر میں نہیں رک سکتی۔"

اس نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنے آنسو پونچھے۔ بکھرے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا اور جھک کر سامان اٹھانے لگی تھی۔

"علیزے' پلیز آئی ایم سوری۔" حمزہ نے اس کا بازو تھام کر اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔

"سوری حمزہ' میرا دل نہیں مانتا۔" وہ اس سے حد درجہ جذباتی تھی۔

وہ بازو چھڑا کر جانے کو مڑی تھی کہ بار بار اس کے نام کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی فلائٹ کا ٹائم ہو چکا تھا۔

"علیزے۔" وہ جتنی تیز چل سکتا تھا چلا تھا۔ کئی بار اسے پکارا بھی۔ لیکن کمر میں اٹھنے والی درد کی شدید لہر نے اسے مزید قدم بڑھانے سے روک دیا تھا وہ کتنے ہی لمحے وہاں کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔ شاید کہ وہ پلٹ آئے۔ لیکن چلتے چلتے بالآخر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

حمزہ بہت مایوس سا ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل آیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ علیزے کو روک لے گا لیکن وہ نہیں روک پایا۔ بارش یک دم ہی کچھ تیز ہونے لگی تھی۔ اسے لگا اس کی آنکھوں میں دھند سی چھا رہی ہے۔ پارکنگ تک آتے آتے وہ اچھا خاصا بھیگ چکا تھا۔ ڈرائیور اس کے انتظار میں گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ اپنی ہی سوچوں میں گم وہ مکمل طور پہ اردگرد سے بے نیاز تھا۔

"آپ مجھے پھر سے چھوڑ کر جا رہے ہیں حمزہ۔"

پیچھے سے آتی آواز پہ وہ سرعت سے پلٹا تھا اور حیرت سے کتنے ہی لمحے اسے دیکھتا رہا تھا۔ وہ واقعی آ گئی تھی یا یہ اس کا وہم تھا وہ سمجھ نہیں پایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچتا وہ تیز قدموں سے اس کے پاس آن پہنچی تھی۔ کتنے ہی لمحے وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"آئی ایم سوری حمزہ مجھے غصہ آ گیا تھا اور غصے میں' میں نے نجانے کیا کچھ بول دیا۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری۔" اس کے بازو پہ ہاتھ رکھے شرمندگی سے بولتی وہ واقعی وہاں موجود تھی۔ اسے یقین کرنا پڑا تھا۔

"مجھے سمجھنا چاہیے تھا کہ آپ نے میری وجہ سے کتنی تکلیف اٹھائی۔ آپ کس اذیت سے گزرے ہوں گے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے۔ مجھے آپ پر اور آپ کی محبت پہ پورا بھروسہ ہے میں کہیں نہیں جا رہی۔ میں واپس آ گئی ہوں حمزہ۔ کبھی نہ جانے کے لیے۔ پلیز کچھ تو بولیں نا۔ خاموش کیوں ہیں۔"

بولتے بولتے وہ رک کر اسے دیکھنے لگی تھی جو خاموش کھڑا بس اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم بولو نا میں سن رہا ہوں۔" اسے سننا اچھا لگ رہا تھا۔

"بس مجھے غصہ آ گیا تھا یہ سوچ کر کہ آپ نے مجھے چھوڑنے کا سوچا بھی کیسے۔ آپ نے اپنی پریشانی مجھ سے شیئر نہیں کی۔ حالانکہ اس ڈنر والی رات مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ آپ ہیں انڈر سٹڈ ہے لیکن پھر بھی میں نے آپ کی بات کا یقین نہیں کیا۔ آئی ایم ویری سوری۔ لیکن مجھے فخر ہے آپ پر کہ آپ نے میری خاطر اتنی تکلیف سہی اور افسوس بھی ہے کہ آپ کو میری وجہ سے اتنا کچھ سہنا پڑا۔ مگر میں بھی اگر آپ کی جگہ ہوتی نا تو شاید یہی فیصلہ کرتی تو اس پل آپ نے کیا۔"

بولتے بولتے اس کی آنکھیں بھر آئیں تو وہ سر جھکا گئی تھی۔

"ششش خاموش 'بس اب رونا مت' کبھی بھی اور کچھ مت کہو۔"

حمزہ نے روتی ہوئی علیزے کا چھوٹا دونوں ہاتھوں

میں تھام لیا تھا۔

جو ہوا وہ برا خواب تھا آزمائش تھی جو گزر گئی اور جاتے جاتے ہمیں بہت اچھی طرح یہ سمجھا گئی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بنا بالکل ادھورے ہیں نامکمل۔ سو اب نہ تم کہیں جاؤ گی اور نہ میں اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ میں نے ہمیشہ' ہر لمحہ' ہر پل صرف تمہیں سوچا ہے صرف تمہیں چاہا ہے۔ اب تم آگئی ہو نا تو میری یہ سب تکلیفیں ختم ہو جائیں گی۔" پلکیں جھکائے وہ اسے سن رہی تھی۔ محسوس کر رہی تھی۔ جو دھیرے دھیرے اسے داستان محبت سنا رہا تھا۔ بارش نے پھر سے پھوار کی شکل اختیار کر لی تھی۔ پاس سے گزرتے کتنے ہی لوگوں نے ان دیوانوں کو رشک سے دیکھا تھا۔ جو جانے کون سے راز و نیاز میں مصروف تھے۔

"حمزہ پلیز۔" علیزے کو ماحول کا احساس ہوا تو اسے احساس دلایا تھا۔ وہ جو محبت سے اس کا چہرہ تھامے والہانہ اسے تک رہا تھا۔ شرمندگی سے دور ہٹ گیا تھا۔

"اب اگر کبھی مجھ سے دور جانے کا سوچا یا مجھ سے کوئی بات چھپائی تو بہت برا ہوگا۔"

وہ اپنی خفت مٹانے کو بولی تو وہ ہنس دیا تھا۔

"اب ایسا کبھی نہیں ہوگا اب گھر چلیں سب انتظار کر رہے ہوں گے اور میں زیادہ دیر کھڑا بھی نہیں رہ سکتا۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا تو وہ اثبات میں سر ہلا گئی تھی۔

"جانتی ہو میں نے اسپتال میں کتنی شدت سے تمہارا انتظار کیا تھا۔" وہ اس کے سنگ چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تو مجھے بلایا کیوں نہیں۔" وہ رک کر پوچھنے لگی تھی۔

"کئی بار سوچا پھر ہمت ہی نہیں ہوئی۔ سوچا جب اس وقت میں' میں تمہارے ساتھ نہیں تھا تو تمہیں کیسے بلاؤں۔" اس نے وہی کہا جو محسوس کیا تھا سوچا تھا۔

"ضروری تو نہیں کہ میں ویسا ہی کرتی اور نہ میں نے کیا۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
مسکراتے ہوئے وہ ہمیشہ ہی اتنی خوبصورت لگتی تھی یا آج لگ رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔
"کیا مطلب۔" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔
"بس ایک خاموش سا معاہدہ تھا شہوز بھائی کے ساتھ کہ دن میں جب بھی آپ سو رہے ہوتے تو وہ مجھے میسج کر دیتے اور میں آجاتی تھی۔ باہر سے ہی آپ کو ایک نظر دیکھنے کے بعد واپس چلی جاتی۔ کیوں آپ کو اپنے سرہانے رکھے پھولوں نے بھی احساس نہیں دلایا میری موجودگی کا؟ ان سے بھی میری محبت کی، میری خوشبو نہیں آئی؟" بلاشبہ اس کی محبت خوشبو بن کر ہی اس لمحے حمزہ کے چاروں طرف پھیلی تھی اور اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔
"تو وہ پھول روزانہ تم لاتی تھیں اور وہ شہوز مجھے کہتا تھا کہ وہ میرے لیے لے کر آتا ہے۔ میں بھی کہوں کہ یہ شہوز کب سے اتنا باذوق ہو گیا کہ بلاناغہ میرے لیے پھول لانے لگا۔ اس سے تو میں اچھی طرح پوچھوں گا۔ میرا دوست اور مجھ سے غداری۔ بٹ تھینک یو سوچ علیزے۔ میری زندگی کو مکمل کرنے کے لیے۔" ہاتھ بڑھا کر دھیرے سے اس کی لٹ کو چھوا تھا وہ اس لمحے اتنا اچھا محسوس کر رہا تھا کہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔
بارش ان دونوں پہ خوشی بن کر، محبت بن کر برس رہی تھی اور پھر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے حمزہ نے سب سے پہلے ماما کو فون کیا تھا کہ وہ لاڈلی کو لے کر آرہا ہے۔ سب لوگ بے تحاشا خوش ہو گئے تھے وہ سب یہی تو چاہتے تھے اور اس رات گھر پہنچتے ہی اس نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہی تھا کہ پاپا کو کہا کہ وہ جلد از جلد علیزے کو اپنی زندگی میں دیکھنا چاہتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جب وہ علاج کے لیے سنگاپور جائے تو پاپا کے ساتھ ساتھ علیزے بھی اس کے ساتھ ہو۔ اس نے پھر اس قدر جلدی مچائی کہ ٹھیک پندرہ روز بعد وہ رخصت ہو کر اس کے گھر کی رونق بڑھانے چلی آئی تھی اور اگلے ہی روز ان لوگوں کی سنگاپور کی فلائٹ تھی جہاں حمزہ کا آپریشن ہونا تھا۔ پاپا بھی ان کے ساتھ تھے اور سب نے ڈھیر ساری دعاؤں میں انہیں رخصت کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ارے آپ آگئے۔ السلام علیکم!"
ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے بالوں میں برش کرتی علیزے رک کر کمرے میں داخل ہوتے حمزہ کو دیکھ کر بولی۔
"وعلیکم السلام!" حمزہ نے ایک نگاہ اسے دیکھا تو اپنا بیگ وہیں ٹیبل پہ رکھ کر بیڈ پہ بیٹھ گیا تھا۔
"کیسی لگ رہی ہوں۔" مکمل طور پر سجی سنوری وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔
"ہوں اچھی لگ رہی ہو ہمیشہ کی طرح۔" دھیمے سے کہہ کر وہ جوتے اتارنے لگا تھا۔
پھر بنا کپڑے بدلے ہی وہیں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔
"کیا بات ہے حمزہ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ پریشانی سے پیشانی مسلتے حمزہ کو دیکھنے لگی تھی۔
"نہیں بس سر میں کچھ درد ہے۔ تھوڑی دیر ریسٹ کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تم کہیں جا رہی ہو۔" سرسری سا بتاتے اسے اس نے ایک بھرپور نگاہ اس پہ ڈالی تھی۔
"ہاں لاریب کے گھر، اس کی بہن کی آج شادی ہے وہیں جانا تھا۔ سوچا تھا آپ آجائیں تو ساتھ ہی چلیں گے مگر۔ خیر کوئی بات نہیں آپ ریسٹ کریں۔ میں آپ کے لیے چائے بنا لاتی ہوں۔ آپ تب تک چینج کریں۔"
اس کا کوٹ بیڈ سے اٹھا کر ہینگر میں لٹکایا اور باہر چلی آئی تاکہ اس کے لیے چائے لا سکے۔
"ابھی چند ہفتے قبل ہی وہ دونوں سنگاپور سے لوٹے تھے۔ جہاں حمزہ کا کامیاب آپریشن ہوا تھا اور اب وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا تھا۔ پاپا ان سے پہلے ہی لوٹ آئے تھے۔ کیونکہ حمزہ کو ڈاکٹر نے آپریشن کے

کچھ عرصے تک سفر کرنے سے منع کیا تھا اور یہاں ان دونوں کی غیر موجودگی میں شہوز نے سنبھال رکھا تھا تمام کام، اور کام کا کافی حرج ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں ہی نہیں تھے۔ اس لیے بابا جلدی لوٹ آئے تھے اور پھر وہاں علیزے اس کے ساتھ تھی تو کیا پرابلم تھی اور پھر چند ہفتے قبل وہ دونوں بھی لوٹ آئے تھے اور حمزہ نے ابھی چند دن ہوئے آفس جانا شروع کیا تھا ان تمام دنوں میں وہ سوائے ماما کے اور کہیں نہیں گئی تھی۔ آج لاریب کی بہن کی شادی تھی۔ وہ اسپیشلی گھر آکر انوائیٹ کرکے گئی تھی۔ سو اب جانا لازمی تھا۔ ورنہ وہ ناراض ہو جاتی۔

وہ چائے بنا کر لائی تو وہ تب تک چینج کر چکا تھا اور اب بیڈ پہ نیم دراز تھا۔

چائے پینے کے دوران ہی حمزہ نے پاس بیٹھی بنی سنوری علیزے کا مکمل جائزہ لیا تھا۔ اسٹائلش سوٹ میں کھلے بالوں کے ساتھ وہ اس لمحے بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ نازک سی جیولری پہنے ایک ہاتھ میں وہی کڑے تھے جو حمزہ نے شادی کی رات اسے پہنائے تھے اور دوسرے ہاتھ میں نازک کانچ کی چوڑیاں تھیں کہ کانچ کی چوڑیاں اس کی کلائی میں حمزہ کو پسند تھیں سو وہ ہمہ وقت ہی پہنے رہتی تھی۔ بالوں کی کتنی لٹیں اس کے چہرے کے گرد ہمیشہ کی طرح بکھری ہوئی تھیں۔ شادی کے بعد اس نے حمزہ کی خواہش پہ بال بڑھائے تھے جو اب بڑھ کر کمر کو چھو رہے تھے۔ وہ مکمل طور پہ اس کی پسند میں ڈھلی اس وقت اسے بے ایمان کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے طبیعت زیادہ خراب ہے میں سر دبا دوں۔"

اس کی خاموشی کو اس کی طبیعت کی خرابی سمجھ کر وہ پریشان سے بولی تھی۔

"ہاں دبا دو پلیز۔" وہ کپ سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر لیٹ گیا تو وہ دوسری طرف سے اس کے پاس آ بیٹھی تھی۔ اس وقت وہ کہیں بھی جانا یکسر فراموش کر چکی تھی۔ وہ پاس آکر بیٹھی تو اس کے وجود سے پھوٹتی خوشبو نے تیزی سے حمزہ کو اپنے حصار میں لیا تھا۔

"کیسا فیل ہو رہا ہے اب درد کچھ کم ہوا۔" چند لمحوں بعد اس نے پوچھا تھا۔

"بہت اچھا۔" وہ دھیمے سے بڑبڑایا تھا۔ لبوں پہ دبی سی مسکراہٹ تھی۔

"کیا مطلب۔" بڑبڑاہٹ تو وہ ٹھیک سے نہیں سن پائی تھی یا نہیں البتہ اس کے لبوں کی دبی مسکراہٹ فوراً" ہی اس کی گرفت میں آئی تھی۔

"کیا ہوا؟ دیا تو نارک کیوں گئیں۔" اس نے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں۔

"کچھ نہیں آپ ریسٹ کریں۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

علیزے نے وہم سمجھ کر ذہن کو جھٹکا تھا ورنہ وہ چونکتا کیوں۔

"کہاں جا رہی ہو یار ابھی تو میں نے تمہیں ٹھیک طرح سے دیکھا بھی نہیں ہے۔"

حمزہ نے اپس سے اٹھتی علیزے کا دوپٹہ تھام کر اسے روک لیا تھا۔

"تو آپ بہانہ بنا رہے تھے۔" وہ خفگی سے بولی اور قریب رکھا کشن اسے کھینچ مارا تھا۔

"کیا بہانہ۔" کشن پکڑتے ہوئے وہ انجان بن گیا تھا۔

"حمزہ آپ بہت بڑے ایکٹر ہیں۔ چھوڑیں۔" وہ اپنا دوپٹہ چھڑانے لگی تھی۔

"لڑکی تم اپنے معصوم شوہر پہ الزام لگا رہی ہو۔" وہ اس الزام پہ چیخ اٹھا تھا۔

"اور معصوم شوہر جب بہانے بہانے سے بیوی کو روکنے کی کوشش کریں گے تو میں یہی کہوں گی نا۔"

وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ گئی تھی۔

"کیا ہے یار اتنی مشکلوں سے ملی ہو پھر کیوں دور جاتی ہو۔ میں ہر لمحہ' ہر پل صرف تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ ان لمحوں کو قید کرلینا چاہتا ہوں۔"

حمزہ نے اس کے چہرے پہ آتے بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹا تھا۔ علیزے کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ اتنی قربت سے وہ پگھل رہی تھی۔

"مجھے ساری زندگی کے لیے' یہ قید منظور ہے لیکن ابھی مجھے چند منٹوں کے لیے اس قید سے رہائی چاہیے۔"

وہ بمشکل دھڑکتے دل کو سنبھال کر بولی تھی۔

"نہیں مل سکتی۔" حمزہ نے اس کا بازو تھام کر اسے خود سے قریب کرلیا تھا۔

"حمزہ' میرا فون بج رہا ہے۔" علیزے نے دور ڈریسنگ ٹیبل پر بجتے موبائل کو دیکھا تھا۔

"بجنے دو۔" محبت کی قید مضبوط تھی۔ محبت نے دھیرے سے اس کی پیشانی کو چھوا تھا۔

"لاریب خفا ہو جائے گی۔" وہ لجاجت سے بولی تھی۔

"ہونے دو۔ اس کی ناراضی کی فکر ہے اور اگر میں خفا ہو گیا تو۔" حمزہ نے اس کی خمار پلکوں کو چھوا تھا۔ وہ سمٹی تھی۔

"آپ کو منانا آتا ہے مجھے۔" وہ ادا سے مسکائی تھی۔

"اچھا کیسے" وہ مسکرایا اور دھیمے سے بالوں کی خوشبو کو محسوس کیا تھا۔

"ایسے" علیزے نے دھیرے سے محبوب شوہر کی حسین آنکھوں کو چھوا تھا۔ وہ نہال ہو گیا تھا۔

"آپ کی ان ہی اداؤں نے تو ہمیں سحر زدہ کردیا ہے۔ اول روز سے جکڑ رکھا ہے۔"

حصار مضبوط سے مضبوط ہو رہا تھا۔ اس لمحے کمرہ اندھیرے میں نہا گیا تھا۔

"میں کینڈل جلاتی ہوں۔" وہ سرعت سے دور ہٹنے لگی تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے محبت کی روشنی ہی کافی ہے۔" محبت نے پھر سے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ علیزے نے اس کے سینے پہ سر رکھ کر آنکھیں موند لی تھیں کہ بھلا اب اس محبت کو چھوڑ کر جانے کو کس کا دل کرتا ہے۔ وہ بھی ہمیشہ ان ہی پناہوں میں رہنا چاہتی تھی اس کے سنگ۔

محبت اور نفرت کی یہ جنگ ازل سے چلی آرہی ہے اور شاید ابد تک رہے گی۔ اس میں کبھی جیت محبت کی ہوتی ہے تو کبھی نفرت کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ لیکن اس بار محبت نے ثابت کردیا تھا کہ وہ زیادہ طاقتور ہے۔ اور نفرت کو اس نے منوں مٹی تلے سلا دیا تھا کہ نفرت کرنے والے کبھی جیتتے نہیں کہ نفرت دلوں کا میل ہے اور ہار بھی ان کا مقدر بنتی ہے اور خوشیاں ہمیشہ محبت کرنے والوں کے ہی حصے میں آتی ہیں کیونکہ خدا محبت کو اور محبت کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

☆ ☆

فرحینا اظفر

سوہا اور رما یا دونوں بہنیں اپنی ماں کے ساتھ گھر کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہی ہوگئی تھی۔

گھر کی نچلی منزل میں ان کے تایا اور تائی اپنی دو بیٹیوں عفت اور نائلہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ تایا اکثر بیمار رہتے ہیں۔

حدید 'انس' عفت اور نائلہ کے خالہ زاد ہیں۔ نائلہ انس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر انس 'سوہا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنی خالہ اور سوہا کی تائی کے سامنے کردیتا ہے۔ خالہ کو بے پناہ دکھ کا احساس ہوتا ہے مگر بظاہر راضی خوشی اس کا رشتہ لے کر اپنی دیورانی کے پاس جاتی ہیں۔ سوہا کی والدہ یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کرلیتی ہیں۔

نائلہ باقاعدگی سے اپنے والد کو اسپتال لے کر جاتی ہے۔ وہاں اسپتال کے کلرک شبیر حسین عرف شبو سے روابط بڑھ جاتے ہیں کہ اچھے برے کی تمیز کو بھول جاتی ہے۔

سوہا اور انس کی شادی کی تقریبات بہت اچھے طریقے سے انجام پاتی ہیں اور سوہا رخصت ہو کر انس کے گھر آجاتی ہے۔

حدید کسی کو ڈراپ کرنے جاتا ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

(اب آگے پڑھئے)

تیسری قسط

☼ ☼ ☼

سرِ ھیول کے اوپری اختتام پر کھڑی خاتون اجنبی سہی مگر بہت متاثر کن شخصیت کی مالک تھیں۔ سہا انہیں پہچان نہ سکنے کے باوجود چیئر پر سے کھڑی ہو گئی۔ ماہا ان سے سلام دعا کر کے انہیں وہیں لا رہی تھی۔

"میں انس کے دوست حسیب کی بڑی بہن ہوں۔" اتنا تعارف ہی جان پہچان بنانے کے لیے کافی تھا۔

امی انہیں اپنے کمرے میں لے جانے لگیں جو خاص مہمانوں کی آمد پر از خود ڈرائنگ روم کا اعزاز حاصل کر لیتا تھا مگر وہ بے تکلفی سے وہیں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئیں۔

"یہیں ٹھیک ہے آنٹی۔ اچھا لگ رہا ہے کھلی فضا میں بیٹھنا۔" ان کا انداز گفتگو تھا یا کیا کہ ذرا سی دیر میں خواتین آپس میں بے تکلف ہو چکی تھیں۔ امی انہیں حدید کے ایکسیڈنٹ کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگیں۔ ماہا چائے بنانے چلی گئی۔ سہا کافی دیر سے منہ بند کیے بیٹھی تھی۔

"آپ ہمیشہ سے اتنی ہی کم گو ہو یا انس نے کوئی پابندی لگا رکھی ہے۔" امی مغرب کی نماز کے لیے اٹھیں تو انہوں نے ایک دم ہی سہا کو مخاطب کر لیا۔ وہ کافی دیر سے اس کی بے توجہی ملاحظہ کر رہی تھیں۔ ماہا نے چائے لاتے ہوئے ان کی بات سنی۔

"نہیں دراصل بات یہ ہے کہ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔" اس نے جلدی سے چائے کے کپ کے ساتھ صفائی پیش کی۔ سہا نے بھی سنبھل کر ایک پھیکی مسکراہٹ لبوں پر سجا لی۔ خاتون کافی فرصت سے بیٹھیں باتیں دلچسپ کر رہی تھیں۔ اس لیے ماہا سے خوب گپ شپ لگی۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھیں۔ اس لیے جب رخصت لے رہی تھیں تو اس کی جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش سے لے کر تعلیم اور مشاغل تک سب ہی کچھ معلوم کر چکی تھیں۔

"کتنا بول رہی تھیں۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ کسی کے گھر پہلی بار آئی ہیں۔" ماہا انہیں دروازے تک چھوڑ کر پلٹی تو سہا بے زاری سے بولی۔ ماہا تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

آلو پالک اور میتھی کی بھجیا بھننے کی خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوئی تھی وہ بے دھیانی سے چمچہ چلا رہی تھی۔ ذہن میں لاتعداد سوچیں گڈمڈ ہو رہی تھیں اور ارتکاز بار بار ایک نقطے پر ٹھہر جاتا تھا۔

نائلہ نے کل رات انس اور ماہا کی جو گفتگو سنی تھی صبح من و عن عفت کے سامنے بیان کر دی تھی۔ اس کی خود غرض خوشی ہر انداز سے اپنے کمینے پن کا پتا دے رہی تھی۔ عفت نے اس سے کچھ بھی کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ فضول ہی تھا پتا نہیں کیا سوچ بیٹھی تھی وہ جو یوں ایک معمولی بات کو اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہوئے کوئی مقصد پا لینے کی چمک اس کے چہرے پر تھی۔ اوپر سے انس کے دوست کی بہن کی اس قدر اچانک آمد۔ وہ ان لوگوں کے پاس زیادہ دیر نہیں بیٹھیں۔ جلد ہی اوپر چلی گئی تھیں مگر پھر بھی نائلہ مشکوک تھی کہ وہ صرف حدید کی عیادت کے لیے نہیں بلکہ کسی اور مقصد سے آئی تھیں۔ وہ تو ان کے ساتھ ہی اوپر جانے کے چکر میں تھی۔ بڑی مشکل سے عفت نے روکا تھا مگر کھد بد تو خود اسے بھی لگ رہی تھی! ڈر پھر اوپر ان کا اتنی دیر تک رکنا۔ باتوں اور ہنسی کی آوازیں اس کا دھیان پھر کھٹک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے امید نہیں تھی سہا اتنی بگڑ جائے گی۔ آج ان کی شادی کو ساتواں دن تھا اور اس کے یہ تیور۔

فون پر وہ دونوں یہاں سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی اور ساتھ آنے کو بھی تیار نہیں تھی۔ حدید کا اسپتال میں ہونا بھی ایک مضبوط بہانہ تھا۔ دل کی لاکھ حمایت پر بھی وہ ناگواری کے اس احساس کو دبا نہیں پا رہا تھا جو اس کا لہجہ اور انداز یاد کر کے ابھرتا تھا۔

"مجھے پتا تھا یہی ہو گا۔" صارم نے سنا تو سر پیٹ لیا۔
"کیوں۔ کیوں ہو گا۔ میں کسی اور کے ساتھ گلچھرے تو نہیں اڑا رہا تھا۔"
"اس قدر جہالت کی باتیں مت کرو۔ جوان جہان پڑھے لکھے سمجھ دار مرد ہو تم۔" صارم نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔
"اب جاؤ جا کر مناؤ انہیں اور جب تک وہ ہنسی خوشی گھر نہ آ جائیں۔ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔" صارم نے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔
"حدید اب بہت بہتر ہے۔ ہو سکتا ہے کل پرسوں تک چھٹی بھی مل جائے۔" اس نے چلتے چلتے خوش خبری بھی سنا دی۔

☆ ☆ ☆

اس بار وہ پندرہ دن کے بجائے ہفتہ دس دن میں ہی چلی آئی تھی۔ کچھ تو ابا کی السر کی تکلیف بڑھ گئی تھی اور کچھ پچھلے دنوں گھر میں ہونے والی ٹینشن (انس کی شادی اس کے لیے ٹینشن سے کم نہیں تھی) حدید کا ایکسیڈنٹ اور گھر بھر پہ چھائی سوگواریت۔ اس کا اعصاب ٹھیک ٹھاک جھنجھنا گئے تھے۔
انس کا اسے چھوڑ کر اس کی کزن کو پسند کر لینا وہ زخم تھا جو طویل عرصہ حیات تک ہرا ہی رہتا تھا بلکہ شاید زندگی بھر۔ اس پر کھرنڈ آ بھی جاتا تو پانی میں جمی کائی کی طرح جو ذرا سا کھرچنے پر اپنی جگہ چھوڑ دیتی ہے اور ہوتی بھی سبز ہے۔
بجھے ہوئے دل کو بہلانے کا ایک ہی راستہ شبو کی صورت اس نے اپنی زندگی میں خود ہی ڈھونڈا تھا۔
بعض اوقات انسان اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے کسی بھی ایسے راستے کا از خود انتخاب کر لیتا ہے۔ جس کی انتہا کسی سراب کی سچائی سے زیادہ نہیں ہوتی اور سراب کی سچائی ' مایوسی اور ناامیدی کی سرحدوں سے جا کے ملتی ہے۔ یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔
مگر وہ بھول گئی تھی۔
شبیر حسن عرف شبو کی عمر' اس کی شخصیت ' جس میں سب کچھ نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا نکلا ہوا پیٹ بھی مگر' اس کی ہوس بھری آنکھیں اس نے کس طرح نظر انداز کی تھیں۔ یہ وہ خود ہی جانتی تھی یا پھر یہی خود فریبی۔ مرد کی نظریں ایک نظر میں پہچان لینے والی خالص نسوانی حس رکھنے کے باوجود بھی۔
اس کا اس سے کیا رشتہ تھا جو' وہ ابا کو دکھانے کے بہانے اس سے ملنے چلی آتی تھی۔ اس تعلق کو کوئی شریف آدمی کیا نام دیتا۔ دنیا والے اس کا قصہ زبان زد عام ہو جانے کے بعد اسے کن نظروں سے دیکھتے یا اسپتال کا وہ اسٹاف۔ جو شبو اور اس کے تعلق سے واقف ہے۔ اسے کن نظروں سے دیکھتا ہے۔ اسے ان سب باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسے تو یہ بھی یاد نہ تھا کہ بیمار باپ کی بیماری کو بہانہ بنا کر وہ کتنی گری ہوئی حرکت کر رہی ہے۔ یاد تھا تو

صرف اتنا کہ وہ اس کا انتظار کرتا ہے اسے سراہتا ہے اور اہمیت دیتا ہے۔ بس۔

پیشانی سے پسینہ صاف کر کے اس نے کوریڈور کی سمت قدم بڑھادیے۔
آج کاؤنٹر پر کوئی اور بیٹھا تھا۔ بے حد مصروف 'جلدی جلدی مریضوں کے نام اور نمبر لکھ کر ٹوکن پکڑاتا۔ وہ متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی لائن میں لگ گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کس سے پوچھے اور کیسے باری آنے پر اس نے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا۔ "وہ...وہ جو صاحب یہاں بیٹھے ہوتے ہیں۔" تھوک نگل کر اس نے خشک حلق کو تر کیا۔
"وہ ایک ہفتے کے لیے شہر سے باہر گئے ہیں۔"
"اوہ۔" اس پر اوس سی گر گئی۔ باقی کا سارا وقت ایک غیر معمولی خاموشی اور اداسی اس کے وجود پر چھائی رہی۔

✡ ✡ ✡

"سوہا یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم نے۔" امی کا لہجہ بہت سخت تھا۔ ایک لمحے کو تو وہ گھبرا ہی گئی۔
"کیا امی!"
"مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو۔ میں خوب سمجھ رہی ہوں تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی۔ سارے خاندان میں تماشا بن رہا ہے۔"
"کیوں خاندان والوں کو اور کوئی کام نہیں ہے کیا۔" وہ ناگواری سے بولی۔
"بکواس مت کرو۔ پہلے دن انس رکنے کے لیے آیا۔ تم نے اسے رکنے نہیں دیا اس وقت تو میں چپ رہی' لیکن اب پورا ہفتہ گزر چکا ہے تم آخر جاتی کیوں نہیں اس کے ساتھ۔"
"وہ آئیں گے تو میں جاؤں گی نا۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔
"تم بلاؤ گی تو وہ آئے گا نا۔" سوہا چپ رہی۔ اسے ماں سے رو بدو اتنے سوال جواب کرنے کی عادت نہیں تھی۔
"ماہا۔ فون لاؤ اپنا۔" انہوں نے کڑک دار آواز میں ماہا کو آواز دی۔ وہ فون لے کر دوڑی دوڑی آئی۔
"تو ابھی فون کرو اور بلاؤ اسے۔"
"میں نہیں بلاؤں گی۔" اس کے شانت لہجے میں انگارے سلگنے لگے۔ امی فون اس کی طرف بڑھائے کھڑی تھیں۔ وہ پلٹ کر باہر نکل گئی۔
"سوہا۔" امی نے غصے سے اسے پکارا' مگر وہ رکی نہیں۔ ماہا کے پیروں سے جان نکلنے لگی۔ کیوں کہ امی بہت تیزی سے اس کے پیچھے جا رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

وہ حدید کے پاس بیڈ پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔
"کب چلنا ہے ہمیں۔" حدید نے دوبارہ اس سے پوچھا۔
اس کی آواز میں نقاہت تھی اور چہرے پر زردی۔ ایک ٹانگ پر پلستر چڑھا تھا چہرے پر خراش' سر اور ہاتھ پر پٹیاں' مگر اب اتنا ہو گیا تھا کہ وہ بغیر سہارے کے اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے کھانے پینے لگا تھا۔
عفت' نائلہ' خالہ جان' ماہا اور انس کی ساس کئی بار اس کی خیریت پوچھنے آچکی تھیں۔ یہاں اس نے سوہا کو کبھی اسپتال میں نہیں دیکھا تھا' مگر اسے کوئی تعجب نہیں تھا۔ بہت ممکن تھا وہ اپنے الہڑ پن کی وجہ سے شرماتی ہو' لیکن آج انس جس سنجیدگی سے سوچ میں ڈوبا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا جب سے وہ حدید کے پاس آیا تھا مستقل کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ کسی بھی بات کا ہوں ہاں سے زیادہ جواب نہیں دیا تھا اور اب وہ دوبار اس سے پوچھ چکا تھا کہ کب ڈسچارج ہونا ہے' مگر وہ ہنوز سوچ میں گم تھا۔

"انس!" اس کی پکار اس نے نادانستہ ذرا زور سے پکارا تھا، سو چونک گیا۔
"تم پریشان ہو۔" یہی چوڑی تمہید باندھنا فضول ہی تھا۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہ تھی۔
"نہیں۔" جواب اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔
"اچھا! لگ تو رہے ہو۔"
"ہاں وہ گھر خالی پڑا ہے تو۔"
"سوہا کہاں ہے۔"
"اپنے گھر چلی گئی ہے۔" انس کچھ بھی سمیٹے اٹھ گیا۔ اندازہ کر رہا تھا وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ حدید سمجھ کر خاموش ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

ماہا امی کو سوہا کے پیچھے جاتے دیکھ کر ڈر سی گئی۔ اس نے دوڑ کر کمرے کے دروازے پر ہی امی کو جالیا۔
"امی! امی کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ کیوں اس سے ضد لگا رہی ہیں۔"
"میں ضد لگا رہی ہوں۔ میں؟ اور یہ جو بے ہودہ حرکتیں کرتی پھر رہی ہے۔" امی کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ سوہا کے کانوں تک پہنچ گئی۔ برابر والے کمرے میں سوہا زور زور سے رونے لگی تھی۔
"مجھے نہیں جانا اس ویران گھر میں اکیلے مرنے کے لیے جس کو جانا ہے شوق سے جائے۔" ماہا نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اسے اپنا دماغ ماؤف ہوتا ہوا لگ رہا تھا۔
"پاگل ہو گئی ہے کیا یہ۔" امی پلٹ کر واپس بستر پر آبیٹھیں۔
"ہاں پاگل ہو گئی ہوں۔ جس طرح میں نے تین دن مسلسل کسی قید کی طرح کاٹے ہیں وہاں۔ میری جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو اب تک پاگل ہو چکی ہوتی۔" وہ اب بھی وہیں سے زور سے بول رہی تھی۔ امی نے ناسمجھی سے ماہا کو دیکھا، سو بے چارگی سے گہرا سانس بھر کر رہ گئی۔
"ہم لوگوں نے آپ سے ایک بات چھپائی ہے امی!" اب بتانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔
"حدید بھائی کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے اور سب کی طرح سوہا بھی بہت اپ سیٹ ہے۔ دراصل شادی والی رات انس بھائی، حدید بھائی کے پاس ہی رک گئے تھے۔ وہ سوہا کے پاس آئے ہی نہیں۔"
"جب تو خیر حدید بھائی کی حالت بہت نازک تھی مگر وہ دوسری رات اور دوسرا پورا دن اسپتال میں رہے اور سوہا اکیلی گھر پر۔ اسی نے تیسرے دن جب فون کر کے صبح مجھے گھر پر بلایا تھا تو وہ اس وقت تک تنہائی اور اکیلے پن سے بہت گھبرا گئی تھی۔" ماہا نے بات مکمل کر کے سر جھکا لیا۔
"تو یہ اس بات کی ناراضی ہے۔" امی کی پرسوچ آواز بہت دیر میں گونجی تھی۔

☆ ☆ ☆

حدید کو گھر آئے چند گھنٹے ہی گزرے تھے جب حسیب اپنی بڑی بہن کے ہمراہ اسے دیکھنے چلا آیا۔ مقصد یقیناً حدید کی احوال پرسی ہی تھا۔ حسیب کی بہن انس کی بیگم اور سسرال والوں سے مل چکی تھیں وہ سوہا اور باقی گھر والوں کی تعریف کرنے لگیں۔
"بھئی میں تو بہت خوش ہوئی سب سے مل کر ماشاء اللہ بہت اچھی فیملی ہے۔"
"شکریہ مجھے بھی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"
"حدید کی عیادت کے لیے تو آنا ہی تھا۔ میں دراصل ایک اور کام کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔" انس ان کے غیر

معمولی لہجے پر چونک سا گیا۔ حسیب کوئی کال اٹینڈ کرنے ابھی ابھی باہر نکلا تھا۔ صارم اپنے گھر جا چکا تھا۔ ڈرائنگ روم میں فی الحال صرف وہی دونوں تھے۔

"جی جی آپ کہیں۔ مجھے خوشی ہو گی اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں۔" انس اور کہتا بھی کیا۔

"دیکھیے میرے لیے تو آپ اور حسیب ایک جیسے ہی ہیں۔" انہوں نے بہت سبھاؤ سے بات شروع کی تھی۔

☆ ☆ ☆

انس کا فون آیا تھا۔ وہ سہا کے ساتھ عفت کو بھی لینے آرہا تھا۔ نائلہ بہت چبھتی ہوئی نظروں سے عفت کو اپنا سوٹ پریس کرتے دیکھتی رہی۔ اصل میں تو انس نے اسی کو آنے کے لیے کہا تھا لیکن اس نے کسی کام کا بہانہ بنا کر انکار کر دیا۔ نتیجتاً عفت کو ہامی بھرنی پڑی۔

عفت خوش تو تھی۔ اسے ایک طرح سے حدید کی قربت میسر آرہی تھی مگر دل میں کہیں نائلہ کی بات کے زیر اثر ہلکا سا افسوس بھی تھا۔

"شاید نائلہ ٹھیک کہتی ہے کہ وہ دونوں بھائی ہمیں کام کے وقت ہی یاد کرتے ہیں۔" دل میں اٹھتے خیال کو وہ جان کر بھی دبا نہیں پا رہی تھی۔

"کیا اتنا ضروری ہے تمہارا وہاں جانا۔ ماہا بھی تو ہے۔" نائلہ جھنجلا کر بولی۔

"اس کے اسکول کا مسئلہ ہے۔ چھٹیاں نہیں مل سکتیں۔" وہ رسانیت سے بولی۔

"تو وہیں سے چلی جاتی اسکول۔"

"اسکول جائے گی یا گھر دیکھے گی۔ خیر اماں نے بول دیا ہے اب تو۔"

"یہ اماں بھی نا۔ مجال ہے جو بیٹیوں کی قدر کروانی آجائے ذرا بھی۔" عفت دھیرے سے ہنس دی۔

"انسان کی قدر اس کے کاموں سے ہی ہوتی ہے۔"

"جب ہی تمہیں نیک پروین بننے کا اتنا شوق ہے مگر یاد رکھنا یہ خدمتیں کام نہیں آئیں گی جنہیں جیتنا ہوتا ہے وہ اور ہی چکر چلاتے ہیں۔ سب سے بالا ہی بالا۔" نائلہ اٹھ کے چلی گئی مگر اس کے لیے سوچ کے نئے در وا کر گئی۔

☆ ☆ ☆

انس نے آکر سب سے پہلی بات ماہا کے لیے حسیب کے رشتے کی کی تھی اور امی نے سہا کو ساتھ لے جانے کی۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں آنٹی۔ سہا جب چاہے ساتھ چلے۔"

"نہیں وہ چاہے یا نہ چاہے۔ تم شوہر ہو اب اس کے۔ زبردستی لے جاؤ۔" امی کا انداز قطعی تھا۔ انس ہنس دیا۔

"زبردستی تو میں کبھی کسی کے ساتھ نہیں کرتا آنٹی۔"

"اچھی بات ہے کرنی بھی نہیں چاہیے مگر کچھ جگہوں پر بغیر زبردستی بات نہیں بنتی۔"

"چلیں اچھا۔ پھر بتائیں میں مزنہ باجی سے کیا کہوں؟"

"میں کیا بتاؤں۔ لڑکا تمہارا دوست ہے دیکھا بھالا ہے۔ اگر نیک شریف ہے تو۔۔۔"

"صرف نیک شریف ہی نہیں خاندانی بھی ہے اور بہت تمیزدار اور مہذب بھی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ پھر کہہ دو انہیں۔ ہمیں اعتراض نہیں۔ ان کا اپنا گھر ہے۔ جب جی چاہے آجائیں۔" ملازمہ نے چائے لاکر انس کے سامنے رکھی۔ اس نے شرارت سے ایک چپت اس کے سر پر لگا دی۔ وہ جھینپ کر باہر نکل گئی۔

"اچھا تو اس لیے اس دن اتنا گھور رہے تھے۔"
کچن میں جا کر اس نے سہا کی شادی سے ایک دن پہلے کا منظر یاد کیا۔ جب اور اس نے ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھا تھا اور پھر حسیب نے بار بار دیکھا تھا۔ اسے بلا وجہ ہنسی آنے لگی۔
"دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک ہی تھے موصوف۔"
خیال کی ڈور مزید لمبی ہوتی مگر باہر سے انس کی آواز آئی۔ اس نے کچن سے جھانکا۔ سہا بھی منہ پھلائے ساتھ جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔
بابا نے جا کے اسے گلے سے لگا لیا۔ سیڑھیاں اترتے وقت اس نے غور سے سہا کے چہرے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔
"پاگل ہے بالکل ہی۔" وہ امی کو دیکھ کر مسکرا دی۔
فی الحال صرف انس اور سہا ہی گھر جا رہے تھے کیونکہ فی الحال عفت نے ساتھ جانے سے معذرت کر لی۔ ابا کو معمولی سا بخار تھا۔ اس بات کو وجہ بنا کر نائلہ نے عفت کو روکا تھا۔ گاڑی میں جو انس عفت کو لانے کی وجہ سے دوست سے مانگ کر لایا تھا مکمل خاموشی تھی۔ انس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے اپنے ناخن کھرچتی رہی۔
گاڑی میں انس کے لگائے ہوئے پرفیوم کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ سہا کے حواس بار بار نہ چاہتے ہوئے بھی مخمور ہو جاتے تھے۔ گاڑی سگنل پر رکی تو انس نے گجرے خرید کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ اس نے بھی بلا حیل و حجت لے کر ہاتھ میں ڈال لیے۔
"میرا خیال ہے۔ تمہاری طرف کا ڈور ٹھیک سے بند نہیں ہے۔" وہ آگے جھک کر اس کی طرف کا دروازہ کھول کر دوبارہ سے لاک کر رہا تھا۔ چند لمحوں کی اس قربت نے سہا کو سمٹا سا دیا تھا۔ وہ جھجکی جھجکی نظروں سے انس کو دیکھ کر رہ گئی۔
بظاہر وہ جتنی بھی ناراضی اور غصہ دکھاتی مگر دل نے تو ابھی ابھی محبت کی نوخیز داستان پر دھڑکنا سیکھا تھا۔ دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ مہک مہک کر اس کے سراپے میں الجھ رہا تھا۔ اس کے سلیقے سے جمے ہوئے بال گھرے رو میں والی سنہری کلائیاں اور مضبوط ہاتھوں کی انگلیوں کا معمولی سا ردھم۔
کوئی ایک بھی چیز تو نظر انداز کیے جانے کے قابل نہ تھی۔ گھر آ چکا تھا۔ انس نے گاڑی روک دی۔ وہ سامنے ہی دیکھتا رہا۔ سہا کے چہرے اندازمیں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔
"پوسٹ مارٹ کر لیا ہو تو گھر کے اندر چلے چلیں۔" سوچوں کا تسلسل ٹوٹا اور وہ خجل سی ہو کر گاڑی سے اتر آئی۔

حدید سو چکا تھا۔
وہ سیدھی کمرے میں چلی آئی۔ کھانا امی کے یہاں ہی کھا لیا تھا لہٰذا فی الحال کوئی کام نہیں تھا۔ کمرے کی سجاوٹ کے لیے لگائے پھول صاف کر دیے گئے تھے۔ کمرہ کھلا اور روشن لگ رہا تھا۔ انس بھی اس کے پیچھے ہی آیا تھا۔
"آج امی کے یہاں پتا ہے کیا بات ہوئی۔" سہا کو دیکھا ویسی وہ بھی ساس کو امی کہنے لگا تھا۔
"نہیں۔" وہ چینج کر کے ریلیکس ہو چکی تھی۔ تب اس نے بات چھیڑی۔
"میرا ایک دوست ہے حسیب ماہا کے لیے پرپوزل دیا ہے اس نے۔"
"اچھا۔" خوش لگتے اس کے ہاتھ ذرا کی ذرا تھم گئے۔
"یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔"
"ایک خوش خبری اور بھی ہے۔"

اس نے سوالیہ نظروں سے انس کو دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سہا نے ترنت نگاہیں پھیریں۔ اسے اپنی خود ساختہ ناراضی کا پہاڑ زمین بوس ہوتا لگ رہا تھا۔

"میری پروموشن ہونے والی ہے۔"

"یہ بھی اچھی خبر ہے۔" وہ میرے سے ہنس دی۔ انس تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گیا۔

"ایک خوش خبری اور بھی ہے۔"

سہا ایکسائٹمنٹ کے مارے کھڑی ہو کر بے ساختہ اس کی جانب مڑی۔

"وہ کیا؟"

"پہلے یہاں آؤ میرے پاس پھر بتاؤں گا۔"

اس کی آواز دھیمی اور گمبھیر ہو گئی اور کمرے کا ماحول بھی۔ سہا کی پلکیں بھی بوجھل ہو گئیں اور قدم بھی۔ وہ گومگو سی کھڑی تھی۔ انس نے کوئی کپڑا اس کی طرف اچھالا۔ اس نے بوکھلا کر جلدی سے سنبھالا۔ وہ اس کی شرٹ تھی۔ جس میں سے پرفیوم کی مسحور کن خوشبو پھوٹ رہی تھی۔

"اسے ہینگ کر دو۔" وہ کہنی کے بل ذرا سا اٹھ کر پرشوق نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سہا کو لگا وہ زندگی بھر اس سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔

☆ ☆ ☆

صبح صبح عفت آچکی تھی۔ آتے ہی اس نے پورے گھر کی صفائی کی۔ انس اور سہا ابھی سو رہے تھے۔ حدید اٹھ چکا تھا۔ اس نے اسے ناشتا بنا کر دیا۔ پھر دونوں کے کئی دن کے میلے کپڑے جمع کر کے مشین لگالی۔

"انس کو جگا دو آج اسے آفس جانا ہے۔" اس نے کسی کام سے حدید کے کمرے کا چکر لگایا تو وہ بولا۔

انہیں اٹھانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ جب عفت آئی تھی تو انس نے ہی سوتے میں سے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا اور واپس اوپر چلا گیا تھا۔

"حدید نے کہا ہے کہ آپ کو آفس جانا ہے آج۔"

"ہوں۔ آتا ہوں۔" وہ لمبی سی جمائی لے کر بولا۔

"میں ناشتا لگا رہی ہوں۔" وہ مسکرا کر کہتی ہوئی پلٹ گئی۔

سہا نہا کر نکلی تو انس بیڈ پر لیٹا اسی کا منتظر تھا۔ وہ ایک نظر اس پر ڈال کر گیلے بال سلجھانے لگی۔

"سہا!" اس نے تکیے میں منہ گھسیٹر کر اسے آواز دی۔

"جی۔" سہا نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ منہ دوسری طرف موڑے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلا رہا تھا۔

"اٹھ جائیں۔ آفس سے دیر ہو جائے گی۔" اس کا ہاتھ بے جان انداز میں بیڈ پر گر گیا۔ سہا کی ہنسی نکل گئی۔

انس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر خود بھی مسکرا دیا۔

ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا لگائے عفت ان دونوں کے ہی انتظار میں تھی۔ آج اس نے ناشتے میں اہتمام کر لیا تھا۔ آملیٹ اور پراٹھے تو گھر پر بنائے ہی تھے مگر حدید سے ضد کر کے زبردستی خود جا کر قریبی مارکیٹ سے حلوہ پوری بھی لے آئی تھی۔

وہ دونوں سیڑھیوں سے ہنستے مسکراتے اترے۔ عفت نے دیکھا۔ کتنا مکمل اور بھرپور منظر تھا۔

یہ منظر یونہی اسی طرح پیش ہوتا تھا مگر درمیان میں چند پریشان کن دن آجانے کی وجہ سے یہ منظر تھوڑا لیٹ ہو گیا تھا مگر خدا کا شکر تھا کہ وہ دن بھی گزر گئے۔ اس نے دل ہی دل میں دونوں کی نظر اتاری۔

"آہا۔ حلوہ پوری کون لے آیا۔" انس ناشتا دیکھ کر خوش ہو گیا۔

"میں خود لائی ہوں۔" عفت نے فخریہ انداز میں بتایا۔

"چلو خیر آج تو لے آئیں، مگر آئندہ یہ تکلیف مت کرنا۔ خاص طور پر حلوہ پوری کے لیے۔" انس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"کیوں۔ کیا بات ہو گئی۔"

"حلوہ پوری پر مردوں کا رش ہوتا ہے۔ اس لیے کہہ رہا ہے۔" جواب انس کے بجائے حدید کی طرف سے آیا تھا۔

"او اچھا۔ میں تو کبھی پتا نہیں کیا ہو گیا۔ یہ تو خیر مجھے بھی پتا ہے، مگر آج وہاں بالکل رش نہیں تھا۔ آج چھٹی نہیں ہے نا اس لیے۔ سہام یہ ترکاری لونا۔" وہ بہت محبت اور بے فکری سے ان دونوں کو ناشتا کروا رہی تھی۔ حدید دیکھ کر مسکرا دیا۔

☆ ☆ ☆

آج صبح ہی صبح وہ دوا لے کر ابا کے سر پر کھڑی تھی۔

"خیر تو ہے اس وقت دوا کی کیا ضرورت۔"

"وہ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کھلا کر لانا تو کوئی ٹیسٹ وغیرہ کریں گے شاید۔" اس کا لہجہ ایک دم چور سا تھا۔ ابا کو زیادہ حجت کی عادت نہیں تھی۔ اماں اور عفت کچن میں تھیں۔ اس نے بہت آرام سے اپنا مقصد حاصل کیا اور اس کی خواہش کے عین مطابق جب وہ لوگ اسپتال پہنچے تو ابا نیند سے میں جھوم رہے تھے۔ سنگی بینچ کی ٹھنڈک ملتے ہی بیٹھنے کے بجائے لیٹ گئے۔

"پتا نہیں آج کیوں اس قدر نیند آ رہی ہے۔" ابا کو خود بھی تعجب تھا۔ ان کے چہرے کو غور سے دیکھتی نائلہ گڑبڑا سی گئی۔

"سونا نہیں ابا میں نمبر لے کر ابھی آتی ہوں۔" وہ جلدی سے کہہ کر راہداری کی طرف مڑ گئی۔

شبیر حسین عرف شبو نے دور سے ہی اسے آتا دیکھا اور اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کہاں چلے شبو بھائی۔ آج بڑی جلدی اٹھ رہے ہو۔" اس نے مڑ کر ساتھ بیٹھے بندے کی طرف دیکھا اور خباثت سے مسکرا دیا۔

"آج ذرا اسپیشل ملاقات ہے یار۔" اس نے قمیص کی داہنی طرف والی جیب سے پان کا بیڑا نکال کر کلے میں دبایا اور بالوں سے انگلیاں پونچھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ نائلہ نے دور سے ہی اسے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

"ابا کدھر ہے؟" قریب جا کر سلام دعا کے بعد اس نے ذرا احتیاط سے پوچھا۔

"او دھر بینچ پر۔" نائلہ بے زاری سے اس کے پان سے رنگے دانتوں کو دیکھ رہی تھی۔

"دوا کھلا دی تھی۔"

"ہوں۔ پر تم نے دوا دی کیوں تھی۔" موسم میں حدت بڑھ رہی تھی۔ نائلہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شبو کو بے اختیار اس پر پیار آیا۔ اس نے کسی کمینی خواہش کو دل میں بمشکل دبایا۔

"چل میرے ساتھ۔ ابھی بتا دوں کیا سب۔" وہ بڑی اپنائیت اور محبت بھرے انداز میں اس کا ہاتھ تھام ہاسپٹل کے بڑے سارے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ نائلہ کو گویا کھینچی چلی جا رہی تھی۔

یہ ایک قدرے گمنام سا ریسٹورنٹ تھا۔ لیکن کی کالی چادر کا نقاب چہرے پر ڈالے وہ شبو کے ہاتھ میں ہاتھ دیے اس اندھیرے غار جیسے ہال کمرے میں آئی تھی۔ جہاں دور دور کہیں پر دیومالائی کہانیوں کے دیوتاؤں کے مسکن جیسی شعلوں کی مانند زیرو پاور کے بلب روشن تھے۔ جن سے اتنی ہی روشنی نکل رہی تھی کہ بس آتے جاتے لوگوں کے سائے محسوس کر کے ان سے ٹکرانے سے بچا جائے۔ باہر دن کی تیز روشنی کے بعد اندر آنے کی وجہ سے اسے

کچھ سجھائی نہیں دیا۔ اس نے گھبرا کر دوسرے ہاتھ سے شبو کا بازو ٹٹولا۔ شبو نے اپنے ہاتھ کی گرفت میں اس کا نرم ہاتھ دبا لیا۔

"تو میں ہی ہوں یہ۔ گھبرا کیوں رہی ہو۔" اسے ان کی آواز سن کر تسلی ہوئی۔ ذرا دیر کے بعد وہ اسے تین اطراف سے بند ایک کیبن میں لا کے بٹھا چکا تھا۔

نائلہ نے فوراً نقاب اتار کر دو تین گہرے سانس لے کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرے۔ اندر کے ماحول میں باہر کی نسبت کافی خنکی سی تھی۔ باتیں کرنے کی معمول کی بھنبھناہٹ اور چمچوں اور کانچ کی پلیٹوں کا مدھم سا ترنم۔ کیبن کے اندر ایک ہی سیٹ تھی جس میں دو افراد کے آرام سے بیٹھنے کے بعد تیسرے کی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ سامنے میز تھی اور بس۔ اتنا چوزے کے ڈربے جیسا نیم روشن' بند کیبن دیکھ کر نائلہ کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوا۔

"یہ کہاں لے آئے ہو تم مجھے۔"

"کیوں کیا ہوا۔" وہ بہت آرام سے نائلہ سے جڑ کر بیٹھ گیا۔ نائلہ نے پرے کھسکنے کی کوشش میں ناکام ہوتے ہوئے سخت بے بسی محسوس کی۔

"دیکھو کتنی سکون کی جگہ ہے۔ وہ محبت کرنے والوں کے لیے۔" اس نے سترکی دہائی کا گھسا پٹا ڈائیلاگ بولا' مگر نائلہ سن کر ٹھٹک گئی۔

"محبت کرنے والوں کے لیے۔ تو کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

"لے تو کیا ایویں تجھے لے کے آیا ہوں ادھر۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔

"سچ بول رہے ہو۔" اس کی آواز میں عجیب سا احساس تھا۔

"نہیں جھوٹ۔ تجھے ہوا کیا ہے۔" اس نے بڑے بھونڈے انداز میں اپنائیت جتائی۔

"جھلی نہ ہو تو۔ چل بول کیا کھائے گی۔" اس نے مینو نکال کر دو کڑکتے نوٹ برآمد کیے۔

"جو دل چاہے منگوا لو۔ میں کوئی کھانے پینے نہیں آئی ہوں ادھر۔" وہ اپنے دھیان میں کہہ گئی۔ پھر شبو کے چہرے پر نظر پڑی تو جھجک سی گئی۔

"اشکے بھئی اشکے۔ کتنے ملتے جلتے خیالات ہیں ہمارے۔ میں بھی یہاں کھانے پینے نہیں آیا۔" وہ نائلہ سے کچھ اور چپک گیا۔ اس کے منہ سے اٹھتا پان کی ناگوار بو کا بھبکا نائلہ کے لیے بہت ناقابل برداشت تھا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔

"کہا بھی ہے کہ مجھ سے ملنے آؤ تو پان کی لت چھوڑ کر آیا کرو۔"

"لت اگر چھوڑی جا سکتی تو لت کیوں کہلاتی جیسے تیری لت لگ گئی ہے مجھے اتنی آسانی سے کہاں چھوٹے گی۔" وہ بڑی محبت سے نائلہ کے گرد اپنا جال بن رہا تھا۔ نائلہ اس کی قربت سے محسوس ہوتے جھجک اور ناگواری کے احساس کو دبا کر اس کی محبتوں کی شدتیں سننے لگی۔

✲ ✲ ✲

عفت نے گھر کا انتظام بخوبی سنبھال لیا تھا۔ وہ بہت تیزی اور سہولت سے دن بھر کے کام نمٹا کر کبھی حدید کے کمرے میں تو کبھی لاؤنج میں ٹی وی کے آگے وقت گزارتی۔ سوہا بھی اس کے ساتھ ہی ہوتی تھی مگر عفت اسے فی الحال کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دے رہی تھی۔ بقول اس کے۔ "یہی چند دن آرام اور چین سکون کے ہوتے ہیں۔ انس کے ساتھ گھومو پھرو۔ آرام کرو۔ پھر گھر ہستی تو ساری زندگی سنبھالنی ہی ہے۔"

گھومنے پھرنے والی بات پر سہا کبھی تو ہنس دیتی اور کبھی ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاتی۔ انس کے پروموشن کے سلسلے میں اسے لگاتار اور زیادہ محنت سے کام کرنا پڑ رہا تھا۔ آفس سے لی گئی شادی کی چھٹیاں بھی حدید کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے نکل گئیں اور اس نے چھٹیاں لی بھی کم ہی تھیں۔ اب نہ تو اتنی جلدی دوبارہ مل سکتی تھیں۔ نہ وہ یوں ہی بغیر جائے آفس سے چھٹی کر سکتا تھا۔

شادی کے شروع کے دن بہت جلدی روز مرہ کے معمولات میں ڈھل چکے تھے۔ بس ایک عفت ہی تھی جس نے سہا کو ابھی تک دلہناپے سے باہر نکلنے نہیں دیا تھا۔ ورنہ اگر وہ نہ آئی ہوتی تو شاید سہا اپنا نیا نویلا روپ چھوڑ کر گھر کے کاموں میں خود کو مصروف کر چکی ہوتی۔

وہ خود بھی دل ہی دل میں اس سب کے لیے عفت کی شکر گزار تھی مگر کب تک۔ عفت کو بھی چند دن گزار کر گھر واپس جانا ہی تھا اور اس کی واپسی شاید سب سے زیادہ حدید پر اثر انداز ہونے والی تھی۔ جس روز عفت کی واپسی تھی۔ اسی روز حدید ہی کی خواہش پر وہ تینوں اسے چھوڑنے گھر گئے۔

عفت اس اہمیت اور محبت پر نہال ہوتی رہی۔ اس روز عفت کی موجودگی میں سہا نے بریانی اور کھیر بنائی اور گھر روانہ ہوتے سے وہ بڑے دیکچے بھی ان کے ہمراہ تھے۔ امی، چچی جان، ماما، تائلہ اور وہ چاروں۔ محفل کا رنگ خوب ہی جما۔ ڈھیر ساری باتیں، ہنسی مذاق اور سہا کے ہاتھ کا مزے دار کھانا۔ گو کہ اہتمام ماما نے بھی کر رکھا تھا مگر سہا نے چونکہ شادی کے بعد پہلی بار پکایا تھا۔ اس لیے اسے بطور خاص سب ہی نے اہمیت دی۔

سہا کے لبوں سے ہنسی پھوٹ پڑتی تھی۔ امی دل ہی دل میں اس کی بلائیں لیتی رہیں۔

☆ ☆ ☆
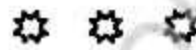
ایک بھرپور شام گزار کر وہ کمرے کی تنہائی کے روبرو تھا۔ اس کمرے میں اس نے زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا تھا۔ طرح طرح کا فرنیچر اور سیٹنگ دیکھی تھی۔ متعدد بار ہنسا تھا، رویا تھا۔ ناچا تھا۔ لڑکھڑایا اور گرا بھی تھا۔

یہ کمرہ ہی اس کی یادوں کا بہترین مسکن تھا۔ اس سے پہلے یہ کمرہ امی ابو کے پاس تھا۔ اس لیے ان کے انتقال کے بعد اس نے خاص طور پر یہ کمرہ اپنے لیے سیٹ کروایا تھا۔ آج سے پہلے اس نے اس کمرے کے بارے میں کبھی ایسے نہیں سوچا تھا، مگر آج شاید کچھ خاص بات تھی۔ کچھ ہٹ کے۔ یہ کمرہ اور اس کی تنہائی۔ آج کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے بستر پر لیٹے لیٹے بے چینی محسوس کر کے دھیرے سے کروٹ لی۔ شاید اپنی بے بسی کے احساس نے شدید ہو کر ان سوچوں کو جنم دیا تھا۔ بہت دیر تک وہ شام میں ہونے والی باتیں یاد کرتا رہا۔ سہا، ماما، انس کا ہنسی مذاق اور عفت کی باتیں۔

"ہاں عفت!" وہ کسی گہرے دھیان سے چونکا۔ "کیا میں عفت کو مس کر رہا ہوں۔"

سوال عجیب تھا۔ اسے خود سے یہ سوال کرتے ہوئے حیرانی ہوئی اور جواب اور حیران کن تھا۔

"کیا واقعی۔" اس نے ایک بار پھر خود سے پوچھا۔

"ہاں شاید مجھے اس کمرے میں تنہا رہنے کی عادت نہیں رہی۔" اس کی نظروں کے سامنے کسی کا وجود چلنے پھرنے لگا۔ کھڑکی کے پاس ڈسٹنگ کرتے ہوئے کمرے کا نیم وا دروازہ اور اس سے نمودار ہوتا ایک مسکان بھرا پرخلوص چہرہ وہ گفتگو کرتی ہوئی خاموشی۔ اس کے پھیلے ہوئے بازو کے نیچے کسی کے شانوں کے لمس اور پھر۔ کانچ کی چوڑیوں کی بہت دھیمی مدھم کھنک۔ اس نے تیزی سے کروٹ بدلنی چاہی۔ زخم کھائے ہوئے پیر میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی۔

"اف!" وہ بے اختیار کراہا۔ خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کرنے کی ناکام کوشش سے ہار کر اس نے خالی سائیڈ

نمیل کو دیکھا۔ انس اور سہا آتے ہی سیدھے کمرے میں چلے گئے تھے۔ اسے خود پانی رکھنا یاد نہیں رہا تھا اور اب وہ اتنی ہمت خود میں نہیں پا تا تھا کہ اٹھ کر کچن تک جاتا۔ کسی مہربان چہرے کی غیر موجودگی نے اس کے تھکن میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ خشک لبوں سے ٹوٹ کر ایک نام نکلا تھا۔

"عفت!"

✡ ✡ ✡

امی نے انس کی معلومات اور اطمینان پر بھروسہ کر کے حسیب کی بڑی بہن کو ہاں کہلوا دی تھی۔ مزنہ باجی اور امی کا مشترکہ خیال تھا کہ ولیمے کی تقریب میں ہی ان کی منگنی کی رسم بھی ادا کر دی جائے تاکہ تمام خاندان کو پتا بھی چل جائے۔

یوں سہا اور انس کا ولیمہ اپنی مقررہ تاریخ سے دور نکل جانے کے باوجود بہت خاص ہو گیا۔ انس نے دوبارہ سے عفت، نائلہ اور سہا کو شاپنگ کروائی۔ سہا کے ولیمے کا سوٹ بری میں لیا جا چکا تھا۔ لیکن انس کا پورا ہفتہ بے حد مصروف اور بھاگ دوڑ میں گزرا۔ حدید ایکسیڈنٹ کی وجہ سے بستر کا ہو کر رہ گیا تھا اور ہر کام اور ارینجمنٹ کے لیے انس کو بھاگنا پڑا۔

صارم نے بھی حدید کے ہاسپٹلائز ہونے کی وجہ سے آفس سے چھٹیاں لی تھیں۔ سو اسے بھی مزید چھٹیاں نہ مل سکیں۔ انس کبھی دیر سے آفس جاتا کبھی ہاف ڈے کرتا تو کبھی شارٹ لیوز کے ہوئے کام نمٹاتا۔ اتنی افرا تفری اور ہنگامہ خیز صورت حال کے باوجود تھکن اور بے زاری کا نام و نشان تک نہ تھا۔

حدید رات کے کھانے پر ان دونوں کے ساتھ ہوتا۔ انس پابندی سے اسے دن بھر کی تفصیلات سے آگاہ کرتا رہتا۔ اور وہ مسکراتے ہوئے سنے جاتا۔ جتنے کام اور انویٹیشن سیل فون سے نمٹائے جا سکتے تھے وہ سب حدید کے ذمے تھے۔ اب وہ خود سے اٹھ کر تھوڑا چل پھر بھی لیتا تھا حالانکہ سب ہی اسے احتیاط کرنے کو کہتے تھے مگر وہ کب تک کسی کے آسرے پر رہتا۔ کبھی نہ کبھی تو خود سے کرنا ہی تھا۔

ایسے ہی ایک دن جب وہ رات کا کھانا کھا کر اٹھے ہی تھے۔ سہا کچن میں کھڑی چائے بنا رہی تھی اور ساتھ ساتھ کچن بھی صاف کر رہی تھی کہ امی کا فون آ گیا۔ رسمی سلام دعا اور خیر خیریت سے فارغ ہو کے انہوں نے انس سے بات کرنے کے لیے کہا۔ سہا نے انس کو فون دے دیا مگر خود الجھ سی گئی۔ امی کی آواز اور لہجہ غیر معمولی سنجیدہ لگ رہا تھا۔ انس فون لے کر کچن سے باہر جا چکا تھا۔ وہ سن نہیں سکی کہ اس نے کیا بات کی۔

✡ ✡ ✡

وہ اپنے بال بکھرائے بڑی دلجمعی سے تیل رگڑنے میں مگن تھی۔ اس نے دو تین بار عفت پر نظر ڈال کر کچھ کہنا چاہا مگر وہ کوئی فضول سی کتاب سامنے رکھے جانے کس جہان کی سیر کو نکلی ہوئی تھی۔

"عفت واپس آ جاؤ اب۔" اس نے اپنے بال سمیٹے۔

"ہوں۔ کہاں سے واپس آ جاؤں۔" وہ چونک کر سنبھلی۔

"جہاں سے ابھی تک واپس نہیں آئیں یا شاید خود تو آ گئی ہو مگر دل و دماغ وہیں رہ گیا ہے۔" عفت بات سمجھ کر دھیرے سے ہنس دی۔ اس نے چٹلی کے بل کس کے ربڑ بینڈ چڑھایا اس کے سامنے آ گئی۔

"نائلہ تم نہیں سدھرو گی۔ اچھا ایک بات تو بتاؤ۔" معاً اسے کچھ خیال آیا۔

"آج شام کی چائے پر اتنا اہتمام کس لیے تھا۔" نائلہ نے سر جھٹکا۔

"جن کے لیے بھی تھا۔ فضول ہی تھا۔"

"پھر بھی پتا تو چلے۔" وہ ایک بار پھر ہوشیار ہو کے بیٹھ گئی۔ شام میں اسے کسی کام سے بازار جانا پڑا۔ واپسی پر کچن میں رکھے برتنوں کو دیکھ کر وہ نائلہ سے پوچھنے کا سوچ کر خاموش ہو گئی تھی۔ اور نائلہ کے انداز بتا رہے تھے کہ بات کچھ خاص تھی۔

"وہ کونسی والی آنٹی ہیں نا۔ نسیم جہاں۔" نائلہ نے ایک ادا سے ان کا نام لیا۔

"رشتہ لائی تھیں اپنے بھائی کا میرے لیے۔" نائلہ چوٹی کو کمر پر پھینک کر پٹاخہ چھوڑا۔ عفت کا منہ کھل گیا۔

"اور تم یہ بات مجھے اب بتا رہی ہو۔" وہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔

"تو کون سا بہت خاص بات تھی۔"

"خاص تو تھی۔ تمہارے لیے رشتہ آیا بلکہ ہم دونوں بہنوں میں سے کسی کے لیے بھی۔ یہ کوئی عام بات تو نہیں۔" اس کی بات کسی حد تک درست تھی۔

"کوئی خاص بات بھی نہیں۔ وہ بھی اس رشتے میں۔ رنڈوا ہے ان کا بھائی۔ چالیس سال عمر ہے۔ ایک بیوی مر چکی ہے۔ ایک بچی بھی ہے۔" نائلہ کے حلق تک میں کڑواہٹ گھل گئی۔

"اماں نے کیا کہا۔"

"یہی تو ساری بات ہے نحوست کی۔ صاف صاف منہ پر انکار مارنے کے بجائے سوچنے کے لیے وقت مانگ لیا۔" طنطنے سے بات کرتی نائلہ کی آواز آخر میں رندھ سی گئی۔

"کیا ہو گیا ہے اماں کو۔" عفت کو بھی برا لگا۔

"ایسی بھی کون سی عمر نکل گئی ہے تمہاری۔"

"ہاں اور نہیں تو کیا۔ سارے جہاں کے رنڈوے اور بوڑھے جو ہمارے لیے ہی رہ گئے ہیں۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کمرے کی خاموش فضا میں پنکھے کی گھرر گھرر تک ایک اداسی کی لپیٹ میں آ گئی۔ عفت تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

لاکھ اس کی بہن زبان کی تیکھی سہی، لیکن اتنی گئی گزری بھی نہ تھی۔ رنگ گندمی گورا تھا جسامت قد، شکل صورت سب ہی کچھ "قبول" کے حاشیے میں آسانی سے لکھا جا سکتا تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔

"کیوں کیا اماں نے ایسا؟" وہ نیند سے پلکیں بوجھل ہونے تک یہی سوچ گئی۔

☆ ☆ ☆

نم ہتھیلیوں کو رگڑ کر اس نے سامنے دیکھا۔ شبو تیز تیز قدم اٹھاتا اسی کی طرف آ رہا تھا۔

"ابا کدھر ہے۔"

"گھر پر ہی ہے آج تو۔"

"تو تم کیا کہہ کر آئی ہو۔"

"کہنا کیا تھا۔ وہی ایک جیسی دوائیں اور معمول کا معائنہ۔ میں نے ابا سے کہہ دیا میں کیفیت بتا کر دوا لے لوں گی۔ ہر بار تمہارا ساتھ جانا ضروری نہیں۔" وہ بات کے اختتام تک ہنس پڑی۔ شبو نے اس کا ساتھ دیا۔

"بڑی تیز ہوتی جا رہی ہے میری بلبل۔ اپنے ابا کا ہی پتا صاف کر دیا تو نے۔ شاباش ہے بھئی۔" دونوں باتیں کرتے ہوئے یوں باہر نکلے جیسے یہ ان کا روز کا معمول ہو۔

شبو کے ذہن میں پچھلی ملاقات گھوم گئی۔ جب بہت اصرار کے باوجود نائلہ نے اسے ایک ہاتھ پکڑانے کے علاوہ کسی گستاخی کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ دل ہی دل میں چڑ کر رہ گیا تھا مگر ماتھے پر ایک شکن نہیں آنے دی

تھی۔
"اب یہ کہاں لے آئے مجھے۔ روز روز نئی جگہوں سے پتا ہے دل گھبرا جاتا ہے میرا۔" وہ سامنے کھڑی فلیٹس کی ویران عمارت کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔
"ضروری کام ہے۔ چلو تم بھی چلو۔" وہ بڑے سرسری لہجے میں کہنے لگا۔ پھر اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر کہنے لگا۔
"اعتبار نہیں ہے میرے پر۔ اکیلے کھڑی ہو جاؤ گی ادھر۔" اس نے مجبوراً قدم بڑھائے اب تو بات اعتبار کی تھی اور کچھ بھی تھا شبو نے آج تک بے اعتباری والی کوئی حرکت کی بھی تو نہ تھی۔
"تم تو کہہ رہے تھے کہ کوئی کام ہے۔" ایک لاک فلیٹ میں چابی گھماتے دیکھ کر وہ پھر مشکوک ہوئی۔
"تو بند فلیٹ میں کام نہیں ہو سکتا کیا۔" وہ دروازہ کھول کر اس کی طرف مڑا۔
"دل کرے تو اندر آنا۔ ورنہ ادھر ہی انتظار کر۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر اندر بڑھ گیا۔ نائلہ گہری سانس لے کر وہیں کھڑی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

حبیب منگنی کے بجائے ماہا سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ امی نے یہی بات کرنے کے لیے انس کو فون کیا تھا سوہا نے سنا تو سوچ میں پڑ گئی۔
"اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے اپنی سوچ کو انس کے سامنے زبان دی۔
"میرا خیال ہے اس میں کوئی برائی تو نہیں۔"
"کوئی ایسی اچھائی بھی نہیں۔"
"میرا بہت پرانا دیکھا بھالا دوست ہے۔ تم کسی فکر میں مت پڑو۔" انس کا لہجہ لاپروا سا تھا۔ سوہا کو کھل گیا۔
"کیسے نہ پڑوں فکر میں۔ دیکھا بھالا آپ کا پاکستان میں، دبئی میں اس کا۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
"دبئی میں اس کا کیا کاروبار ہے۔ جو وہ بتاتا ہے آپ صرف اسی پر یقین کرتے ہیں نا۔ یا آپ نے خود دیکھا ہے جا کر۔"
"پتا کروالیا ہے سب میں نے۔ میرے وہاں اور بھی جاننے والے ہیں۔"
"جو حبیب کے بھی جاننے والے ہیں۔"
"نہیں جو صرف میرے جاننے والے ہیں۔ اور صرف میرے خیر خواہ بھی۔ ٹھیک ٹھاک صاف ستھرا لیدر گڈز کا کاروبار ہے۔"
"صاف ستھرا کاروبار..... اور کردار؟" انس نے جیسے زچ کر اس کی طرف دیکھا۔
"کیا کہنا چاہ رہی ہو تم سوہا۔ وہاں اس کی ایک اور فیملی ہوگی۔ بیوی بچے وغیرہ۔"
"نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ دھیمی پڑ گئی۔
"تو پھر کیا مطلب تھا۔ دیکھو اگر تم نیک اور شریف آدمی سے یہ مطلب لیتی ہو کہ وہ نظر اٹھا کر کسی عورت کی طرف دیکھتا تک نہ ہو گا تو سوری 'اتنا نیک شریف' تو میں بھی نہیں ہوں۔" اس نے بات ختم کر کے شرارت سے سوہا کی طرف دیکھا۔
"اچھا۔" اس نے دھیرے سے ایک مکا انس کے شانے پر جڑ دیا۔
"میں نے امی سے بھی یہی کہا ہے۔ ماہا کے لیے حبیب سے بہتر نہیں ملے گا۔ اور اللہ سے اچھی امید رکھو

سب اچھا ہو گا۔ ان شاء اللہ۔" وہ سنجیدگی سے اسے یقین دلا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اماں دروازے کی چوکھٹ سے لگی کھڑی تھیں۔
"کیا ہوا۔" اس نے ٹھٹک کر انہیں دیکھا۔
"ہونا کیا ہے۔ اکیلے بھیج تو دیا تمہیں۔ مگر جب سے نکلی ہو دل میں پنکھے سے لگے ہوئے ہیں۔"
"کیوں۔ میں کوئی پہلی بار گئی تھی کیا۔" اس نے بے زاری سے چادر اتار کر ایک طرف ڈالی۔ پھر بیگ سے دوائیں نکال کر اماں کو تھما دیں۔
"پھر بھی۔ یوں اکیلی تو پہلی بار ہی..." اماں بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔
"کیا ہوا اماں۔" اس نے بوکھلا کر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔
"منہ کیسا لال انگارہ ہو رہا ہے تیرا۔ کیا بہت گرمی تھی باہر۔" اماں کے لہجے میں محسوس کی جانے والی محبت تھی۔ اس کی آنکھیں بلاوجہ نم سی ہو گئیں۔ عفت کمرے میں آئی تو اس کے ہاتھ میں لال شربت کا گلاس تھا۔ گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے دل میں ایک سوئی سی چبھی۔
"سگے رشتوں کو دھوکا دے کر کیا مل رہا ہے تجھے۔"
"چند لمحوں کی مختصر مگر بڑی سرور آمیز سچی خوشی۔" ایک شیطانی سوچ نے پر مدلل جواب دیا۔ وہ مطمئن ہو کر پورا گلاس چڑھا گئی۔ خوشی کے اصل مفہوم سے آشنا مگر دانستہ اختیار کی گئی چشم پوشی۔
دوسرے دن شام میں سوہا کا ولیمہ تھا۔ اسی میں ہما کا نکاح بھی ہو جانا تھا۔ اور اماں نے آج ایک نیا شوشہ چھوڑ دیا۔
"نسیم آئی تھی نا اس دن بھائی کے لیے کہنے۔ اسے کیا جواب دوں۔" اماں بڑے چاؤ سے اس سے پوچھنے لگیں۔ اسے شربت پیتے میں اچھو لگ گیا۔
"کیا مطلب کیا جواب دوں۔ آپ نے اسی وقت انکار کیوں نہیں کر دیا۔" وہ ایک دم تلخ ہو گئی۔ سگے رشتوں کے لیے دل میں چند لمحے پہلے امڈنے والی محبت اچانک ہی منہ چھپا کر غائب ہو گئی۔
"تو کیسے کرتی انکار۔ کوئی برائی بھی تو ہو۔ گھر آئے رشتوں کو ٹھکرانا کفران نعمت ہے۔"
"کفران نعمت" نعمتوں کو ٹھکرانے سے ہوتا ہے۔ رنڈوؤں کے رشتوں کو ٹھکرانے سے نہیں۔" عفت کو اس کی بات سن کر زور کی ہنسی آئی۔ مگر اماں کی شکل دیکھ کر ضبط کر لی۔
"رنڈوا ہے تو کیا ہوا۔ یہ تو دیکھو اچھا کھاتا پیتا آدمی ہے۔"
"صرف کھاتا پیتا دیکھا آپ نے اماں۔ مجھے لڑکا چاہیے۔ آدمی نہیں۔"
"باؤلی ہوئی ہے۔" اماں ذرا کی ذرا تیز ہوئیں۔
"ہاں ہاں باؤلی ہو گئی ہوں میں مگر پلیز اماں۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ اس کی اور میری عمروں میں فرق دیکھیں ذرا آپ۔" وہ بے حد غصے میں کہتی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ آج کی ملاقات کا سارا نشہ اماں نے ایک جھٹکے میں ہرن کر دیا تھا۔
"بس میں فوراً "شبیر" سے بات کروں گی مگر..." وہ بھی تو ایک آدمی تھا۔ پینتیس سے اوپر نکلتا ہوا آدمی "تائلہ کی سوچیں اس نکتے پر آ کر رک سی گئیں۔
"مگر شادی شدہ تو نہیں۔ بے تو کنوارا نا۔" اس نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے نقطہ ڈھونڈ نکالا تھا۔

☆ ☆ ☆

ولیمے کی تقریب میرج لان میں منعقد کی گئی تھی۔ سوہا اتنے عرصے بعد دلہن بن کر پھر سے شرمارہی تھی۔ زیادہ تر لوگوں نے اس حوالے سے اس کا اور انس کا خوب مذاق اڑایا۔ انس سب کی باتوں کا ہنس ہنس کر جواب دیتا رہا حدید اسٹیج کے سامنے اور قریب ترین رکھے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھا رہا۔
ماہا بھی ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ چھوٹی موٹی سی دلہن بنی بیٹھی تھی۔ نکاح کا مرحلہ بخیر و خوبی اپنے انجام کو پہنچا انس اور حسیب کے مشترکہ دوستوں اور خاندان کے کچھ منچلوں نے شور مچا دیا کہ دونوں کو اسٹیج پر ساتھ بٹھایا جائے۔
حسیب بڑے پروقار انداز میں اس کے برابر میں بیٹھا اور سرخ گلابوں کا بکے اس کی طرف بڑھا دیا۔ خوب ہاؤ ہو ہوئی۔ شور مچا۔ اور زندگی میں پہلی بار ماہا نے اپنے آپ کو اتنا نروس محسوس کیا۔ بکے تھامتے ہوئے اس کی ہتھیلیاں بالکل بھیگ چکی تھیں۔ خاندان کے بیشتر لوگوں کی رائے تھی۔ کہ وہ دلہن بن کر سوہا سے زیادہ اچھی لگنے لگی۔ ہر چند کہ نکاح کے وقت دھواں دھار رونے سے اس کی شکل کافی بگڑ چکی تھی۔ کھانا شروع ہونے پر جب حسیب اس کے برابر میں سے اٹھا تب اس کی جان میں جان آئی۔
عفت نائلہ کے ساتھ ہی بیٹھی کھانے سے انصاف کر رہی تھی۔ اماں اور چچی جان بھی ساتھ ہی بیٹھی تھیں۔ وہ میٹھا لانے کے لیے ٹیبل سے اٹھی تو اسے دور بیٹھا حدید نظر آیا۔ وہ یوں بیٹھا تھا جیسے کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ اپنی ٹیبل پر میٹھے کی پلیٹ دے کر وہ اس کے پاس آگئی۔
"کچھ چاہیے آپ کو؟" حدید دور سے ہی اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔
"نہیں یہ بریانی زیادہ نکال لی ہے" تم پلیز پلیٹ صاف کردو۔" عفت اس انوکھی فرمائش پر ہنس پڑی۔ "تو چھوڑ دیں نا۔"
"یار بھری ہوئی پلیٹ یونہی چھوڑتے ہوئے شرم آرہی ہے۔" وہ اس کے بے چارے انداز پر کچھ اور کھل کر ہنسی۔
"یہ پلیٹ بھرتے ہوئے تو شرم نہیں آئی ہوگی۔"
"نہیں بالکل نہیں کیوں کہ یہ پلیٹ میں نے بھری ہی نہیں۔" وہ جس قدر مزے سے بولا۔ عفت ایک بار پھر دیر تک ہنستی رہی۔
"ایک بات کہوں تم سے۔" جب وہ خوب ہنس چکی تب وہ بولا۔
"جی کہیں۔"
وہ بے دھیانی میں بریانی کے بڑے بڑے نوالے نگل رہی تھی کیوں کہ ابھی اس کو پورے لان کا چکر لگا کر کھانا کھاتے ہوئے مہمانوں کے پاس جا کر میزبانی کے فرائض بھی انجام دینے تھے۔ حسب توقع نائلہ تو سن کر چڑ گئی تھی اور کھانا کھلتے ہی نہ صرف اپنی پلیٹ لے کر کھانے میں مصروف ہو گئی تھی بلکہ زبردستی اسے بھی بٹھا لیا تھا۔
"ہنستی رہا کرو تم۔۔۔ ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو۔" اس کی ہنسی کو ایک دم ہی بریک لگا تھا۔
"کیا ہوا مائنڈ کر گئیں میری بات کو۔" حدید نے اس کی خاموشی کو توڑ کیا۔ اس بات سے قطعی بے خبر کہ اس کے الفاظ نے عفت کے دل میں کیسی ہلچل مچا دی ہے۔ وہ فرصت سے اسے دیکھے گیا۔
"میں ذرا مہمانوں کو دیکھ لوں۔" عفت گڑبڑا کر یہی کہہ سکی۔

☆ ☆ ☆

ولیمے کی تقریب سے واپسی پر رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ سب ہی تھکن سے چور تھے۔ سوہا نے اندر آتے ہی ہاتھ میں اتار کر پکڑی ہوئیں سینڈلیں ایک طرف ڈالیں اور صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ لاؤنج میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ اس نے لائٹ تک آن کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ انس کوٹ اتار کر صوفے پر پھینکتا کچن میں پانی پینے چلا گیا۔ حدید دھیرے دھیرے چلتا سوہا کے سرہانے تک آیا۔

"سوہا پلیز میرے کمرے میں پانی کی بوتل ضرور رکھ دینا۔ رات میں پیاس لگے تو مشکل ہوتی ہے۔" سوہا نے اس کی بات پر آنکھیں کھول کر پہلے حدید کو اور پھر اپنے زیورات اور بھاری دوپٹے سے لدے وجود کو دیکھا۔ تھکن سے اس کا جوڑ جوڑ فریادی تھا۔ گو کہ یہ کام کوئی غیر معمولی نہ تھا مگر اس وقت تو جڑی ہوئی پلکیں تک کھولنا پہاڑ توڑنے کے مترادف لگا تھا۔ اوپر سے اس کا دلہناپے کا سنگھار۔ ابھی جا بجا ٹھونکی ہوئی سیفٹی پنیں نکالنا تھیں۔ میک اپ صاف کرنا تھا اور تو اور بالوں کی بیک کامبنگ۔

"اف خدایا!" وہ دل ہی دل میں کراہی۔

"آپ خود رکھ لیں نا حدید بھائی پلیز۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔" اس کا لہجہ بہت عاجزی بھرا تھا۔

"اوکے تم آرام کرو میں لے لوں گا۔" حدید ہولے سے مسکرا دیا۔ وہ وہیں سے مڑ کر کچن کی طرف چلا گیا۔

انس نے اسے دیکھا تو حیرت سے بولا۔

"تم کیوں آئے ہو۔ سوہا سے کہہ دیا ہوتا یا مجھے آواز دیتے۔"

"میں لے لوں گا نا۔ اس کے اتنے بھاری کپڑے۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ فریج میں پانی کی ایک بھی بوتل نہیں تھی۔ سوہا کی لاپروائی۔

"تم جاؤ میں جگ میں ڈال کر رکھتا ہوں۔" حدید واپس پلٹ گیا۔ انس نے جگ میں پانی اور برف ڈالی اور باہر نکلا تو سیڑھیوں کے پاس ریلنگ تھامے سوہا کھڑی تھی۔

"سوہا کیا ہوا۔" اس نے جگ تیزی سے ٹیبل پر رکھا اور اس کے پاس پہنچا۔

"کچھ نہیں شاید تھکن کی وجہ سے معمولی سا چکر آگیا۔" انس فکرمندی سے اس کا بازو تھام کر اوپر بڑھ گیا پانی کا جگ میز پر رکھا رہ گیا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب کسی احساس کے تحت اس کی آنکھ کھلی تھی۔ کمرے میں شدید گھٹن اور حبس تھا۔ اس کا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ اس نے ایک وحشت کے عالم میں جسم پر سے چادر اتار کر پھینکی۔ شاید لائٹ چلی گئی تھی۔ اس نے گھپ اندھیرے سے اندازہ لگایا۔

وہ احتیاطاً "موبائل سرہانے رکھ کر سوتا تھا۔ اسے ٹٹول کر ٹارچ جلائی۔ اس کا اندازہ ٹھیک تھا جانے کس وقت لوڈشیڈنگ مہمان ہوئی تھی۔ موبائل ٹارچ کی مدھم روشنی سے سائیڈ ٹیبل ذرا روشن ہوئی۔

"او نو ناٹ اگین۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ سائیڈ ٹیبل خالی تھی۔ وہاں پانی نہیں تھا۔ بمشکل تمام ٹارچ سے ٹٹول کر وہ قریب ہی رکھی اسٹک تک پہنچا۔ نیند کا غلبہ، پلاستر چڑھی ٹانگ۔ گرمی اور حبس۔ وہ ذرا سی کوشش میں ہانپ بھی گیا اور پسینے سے تر بتر ہو گیا۔ نم ہتھیلی سے اسٹک پھسلنے لگی۔ اس نے بے دردی سے ہاتھ قمیص سے رگڑ ڈالا اور بمشکل تمام کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

لاؤنج میں بھی گھپ اندھیرا تھا۔ مگر ٹارچ کی روشنی میں سامنے میز پر رکھا پانی دکھائی دے گیا۔ پیاس سے حلق میں کانٹے اگ آئے تھے۔ اس نے گلاس کی فکر چھوڑی اور جگ سے منہ لگا کر پانی پینے کا ارادہ کرتے آگے بڑھا۔ جانے اس کی پیاس زیادہ شدید تھی یا لاپروا رویہ اس کے پیر میں زبردست ٹھوکر لگی۔ اسٹک ہاتھ سے نکل گئی اور وہ پورے قد سے زمین پر آ رہا۔

(باقی آئندہ)

پانچویں قسط

ابا اپنے بیڈ روم میں ٹی وی کے عین سامنے کرسی رکھے بیٹھے تھے جب چندا اندر آئی اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول پڑے۔ "او پتری میں کش سوچ رہا ہوں۔" "ابا آپ کے سوچ لیتے ہیں باتیں کرتے ہوئے؟" وہ حیران ہوئی اور پریشان بھی کہ جو اطلاع وہ دینے آئی تھی اس کے بجائے ابا نے کوئی اور بات چھیڑ دی تھی۔ "تو کیا چاہتی ہے میں باتیں کرکے سوچا کروں؟"

"نہیں میں تو چاہتی ہوں یہ کہ آپ سوچ کر باتیں کیا کریں۔"

"یہی تو تجھے بتا رہا تھا ناں کہ میں کش سوچ رہا ہوں۔"

"لیکن ابا آپ تو کر رہے ہیں باتیں۔"

"بات سنتی ہے کہ نہیں۔" ابا کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"آپ کے بولنے سے پہلے کیسے سن لوں بات آپ کی؟"

"تاں تے میں پہلے کیا طولہ (طبلہ) بجا رہا تھا؟" اور اس سے پہلے کہ جواب میں چندا ابھی کچھ کہتی پھر بول پڑے۔

"اذیت دینے میں تے قسمے بالکل ماں پر گئی ہے تو۔"

"ابا نہ کہیں میرے سامنے دادی ماں کو ایسا اذیت پسند۔"

"وئے میں تیری ماں کی بات کر رہا ہوں۔" ابا کو چندا شاید آج زچ ہی تو کرنے پر تلی تھی۔

"اگر تھا ایسا ہی تو کیوں کی تھی ان سے شادی۔" اولاد جیسی بھی ہو کیسی کے منہ سے اپنی ماں کی برائی برداشت نہیں کر سکتی' اسی لیے چندا نے بھی ابا کو گھورا جس پر وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔

"ہاں تے اپنے گناہوں کا کفارہ بھی تے ادا کرنا تھا ناں۔"

"پھر تو آپ کو اپنے گناہوں کے حساب سے کرنا چاہیے تھیں چار شادیاں۔ صرف ایک سے بھلا کتنا کفارہ ادا ہوا ہو گا؟"

"بس اک واری چیک بک مل جانے دے فیر تیری ایہہ خاش بھی پوری کروں گا۔" بڑی بدمزا ہو کر کہتے ہوئے چندا کی نظر اچانک ہی سامنے رکھے ٹی وی پر پڑی جو حیرت انگیز طور پر بند تھا مگر ابا پھر بھی اس کے سامنے یوں بیٹھے تھے گویا بڑا دلچسپ پروگرام دیکھ رہے ہوں۔

"ابا کیوں بیٹھے ہیں ٹی وی کے سامنے؟"

"اس لیے کہ میں ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔ ہور کیا تجھے لگتا ہے تندور پر پیڑے دے رہا ہوں۔"

"لیکن ابا ٹی وی تو ہے بند۔ اس سے بہتر نہیں کہ آپ آن کر کے کوئی پروگرام دیکھ کر کریں ٹائم پاس۔"

"او پتری جن کے لیے پیسے ضائع کروں بجلی ضائع کروں اور ان کے پروگرام دیکھوں کیا وہ بھی ہمیں کش دیں گے؟" چندا نے جوابی طور پر نفی میں سر ہلایا تو ابا نے اسے اشارے سے نزدیک بلا کر سرگوشی میں کہا۔

"جب میرا کسی وڈے (بڑے) آدمی کو دیکھنے کا جی

کرتا ہے ناں تے میں ٹی وی دیکھ لیتا ہوں۔"

"مگر اس میں تو نہیں آتا کوئی بھی بڑا آدمی"

"لو وہ تے اپنی حرکتوں سے چھوٹے ہو گئے ہیں

ناں۔ لو ادھر آ اور یہ دیکھ۔" ابا نے ٹی وی کے مزید

قریب ہو کر اسے اپنا عکس دکھایا اور جوشیلے انداز میں

بولے۔

"یہ دیکھ۔ یہ ہے وہ بڑا آدمی، پر ابھی تک کسی کو پتا

نہیں چلا۔" ابا کے چہرے پر وہی تاثرات تھے جو یقینی

طور پر کولمبس کے چہرے پر بھی اس وقت ہوں گے جب اس نے امریکہ دریافت کیا۔ اور اس کے برعکس چندا کی نظروں میں ان کے لیے رحم ہی رحم تھا بے چارگی تھی' ایسی بے چارگی جیسی کسی اپنے کو پاگل خانے میں دیکھ کر ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

اک ٹریفک کانسٹیبل اس طرح گویا ہوا
کثرت خوراک سے کچھ اور برکت ہو گئی
توند میری ہو گئی میری صورت دراز
اور بھی چالان لکھنے میں سہولت ہو گئی

حوالدار اور لیڈی کانسٹیبل کھانا کھا چکنے کے بعد اب ٹیشو پیپر سے ہاتھ صاف کر رہے تھے اور ان کے سامنے خالی برتن رکھے تھے۔ جبکہ اہل خانہ چائے بنانے کے بعد اب منہ بنائے کھڑے تھے۔

"آپ کو برا نہیں لگ رہا کہ پہلے ہی دن ہمارے گھر آئے اور اتنا سارا کھانا کھا گئے۔" علی سے برداشت نہ ہوا تو بول ہی پڑا۔

"او خوچہ تم لوگ دونوں آتوں سے مولوک کو کھاتی اے' پروا نئیں۔ ام اگر ایک وقت کا کھانا کھاتی ہے تو سب چر چر کرتی اے۔" حوالدار صاحب نے اطلاعاً" ڈکار لی۔

"اگر آپ کہیں تو ہاضمے کی گولی بھی لے آؤں۔" سب سے زیادہ سہمے ہوئے ضمیر بھائی نے پوچھا۔

"نئیں خوچہ ام کو اور روک نئیں اے۔ تم بتاؤ کہ تمارا کیا نام رکھا تھا تمارے باپ نے؟" ٹیشو پیپر سے ہونٹوں پر پھیلتی چکنائی صاف کرتے ہوئے انہوں نے کوئی پانچویں مرتبہ نام پوچھا تھا۔

"جناب میرا تو ایک ہی نام ہے البتہ آپ کے لوگوں نے ایک سو ایک نام رکھے ہوئے ہیں۔" ضمیر بھائی اپنے نام کی گردان کر کر کے تھک گئے تھے تب ہی ایسا جواب دیا۔

"ام تمارا نام پوچھتی اے اپنے سب ناموں سے ام واقف ہے۔" جس طرح گونگے کی زبان اس کی ماں ہی سمجھ سکتی ہے اسی طرح پولیس آفیسر کی زبان بھی اس کے ماتحت ہی سمجھتے اور پھر دوسروں کو سمجھاتے ہیں سو لیڈی کانسٹیبل نے بھی اپنی ڈیوٹی نبھائی۔

"او ہو ان کا مطلب ہے کہ تمہاری بیوی تمہیں کیا کہتی ہے؟"

"اس کی یہ جرات کہ مجھے کچھ کہے۔ نہ نہ میں بہن کے جی بیگم کہنے والا بندہ ہوں جی۔" انہوں نے اپنے اطراف میں چینا کے نہ ہونے کی یقین دہانی کرنے کے بعد بیان جاری کیا تھا۔

"واہ لو واہ خوچہ بیوی آزار نعمت اے' اس کی قدر کرو۔"

"نعمت تو ہے اگر واقعی بزار ہوں تو۔" ضمیر بھائی تو شاید ان کے ساتھ سب ہی دکھ درد بانٹنے کا ارادہ کر چکے تھے کہ قانون حرکت میں آگیا۔

"خوچہ' قانون کے ساتھ ایرا پھیری کرتا اے۔ زیادہ پاغل بنانے کی کوشش نہ کرنا۔"

"نہیں جی نہیں۔ آپ جتنے ہیں اتنے ہی ٹھیک ہیں۔" حوالدار اور ضمیر بھائی کی باتیں خالہ کو بری طرح بور کر رہی تھیں اور یہ بوریت ان کے چہرے سے بھی ظاہر تھی جو لیڈی کانسٹیبل نے بھانپ لی۔ "لگتا ہے خالہ جی کی طبیعت خراب ہے۔"

"خالہ تو ہو گی تم یا تمہاری خالہ۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔" انہوں نے دانت پیسے۔

"ویسے بہن جی' آپ دیکھتا اے کہ قانون عوام کے ساتھ کیسا گل مل گئی ہے۔" حوالدار صاحب سارا دن گزار کر اب فری سے ہو گئے تھے۔

"سوری' میرے بی پی پر تو صبح سے نو بجے رہے ہیں اس لیے میں کمرے میں جا رہی ہوں۔" خالہ کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

"کمرے میں تو جا رہی ہیں مگر کس کے؟" لیڈی کانسٹیبل نے کارکردگی دکھانی چاہی مگر حوالدار صاحب نے اسے ٹوک دیا۔

"تم چپ کرو۔ قانون کے سامنے بگ باس بنتا ہے؟" اور پھر خالہ کی طرف متوجہ ہوئے

"نیین جی آپ جاؤ' اسے تو قانون پوچھے گی۔" خالہ نے بڑے روہانسے انداز میں علی اور پھر ضمیر بھائی کو دیکھا اور غصے میں کمرے میں جاتی ہوئی صوفے سے ٹکرا گئیں مگر شرمندگی ظاہر نہ کرتے ہوئے بغیر ہائے وائے کیے منظر سے غائب ہو گئیں۔

"سران کے چلنے سے لگتا ہے کہ ان کی ڈرائیونگ بھی خراب ہی ہوگی۔" لیڈی کانسٹیبل نے تجزیہ کیا تو حوالدار صاحب نے پہلے لیڈی کانسٹیبل اور پھر علی اور ضمیر بھائی کو دیکھا۔

"ہم بھی پہلے بس چلاتی تھی' پر پتا چلا کہ قانون بھی ہماری طرح اندھا اے' تو بس کو بیچ کر قانون میں آگیا۔"

"لیکن آپ آخر یہاں پکڑنے کیسے آئے تھے؟" علی نے اپنی تمام تر ہمت جمع کر کے آخر پوچھ ہی لیا۔

"پہلے خود فون پہ فون کر کے بلاتی اے اور پر پوچھتی اے کہ ام کس کو پکڑنے آیا ہے۔"

"کمال ہے بھئی انصاف آپ کی دہلیز پر ہے اور آپ لینا نہیں چاہتے۔" لیڈی کانسٹیبل نے جوش دلانا چاہا مگر ناکام رہی کہ ان معاملات میں "تکرار ہاؤس" کے مکین ذرا ٹھنڈے واقع ہوئے تھے۔ اسی دوران چینا ٹرے میں دو گلاس بھر کر جوس لائی اور ان کے سامنے پٹخ دیا۔

"انصاف ہے یا سبزی کا ٹھیلا؟ جو خود بخود دروازے پر آگیا ہے۔"

"کون کہتی ہے کہ انصاپ اور سبزی کے ٹھیلے میں فرق نئیں ہمیں تو اس کو پوچھوں۔"

"دیکھیں حوالدار صاحب' عزت سے بات کریں' سامنے چینا ہے۔" چینا نے یاد دلایا۔

"عزت کو گولی مارو ہم پہلے تم سے تو کرلیں۔" زنانہ لڑائی شروع ہونے کا امکان نظر آیا تو لیڈی کانسٹیبل پہلی صف میں نظر آئی۔ لڑتے ہوئے نہیں لڑائی پر اکساتے ہوئے۔

"دیکھیں' دراصل آپی کا مطلب۔۔۔" علی بیچ بچاؤ کے لیے میدان میں اترا۔

"مطلب وطلب چھوڑو یار۔ کیا بات کرتی اے تم لوگ' ہماری پرپارمنس دیکھ کر تو خود حکومت نے کتنی دپا ام کو بروک شیلڈ بھی دیا ہے۔"

"ارے واہ۔ لیکن ہم کیسے یقین کریں۔ ہم تو تب ہی مانیں گے نا اگر آپ دونوں پندرہ منٹ میں واپس پولیس اسٹیشن پہنچیں۔" علی نے چالاکی کرنے کی کوشش کی۔ اور کامیاب بھی رہا۔

"خوچہ۔ چس ٹیک اے۔ ام دس منٹ میں ہی واپس جا کر دکھاتی اے۔"

حوالدار صاحب اور لیڈی کانسٹیبل دونوں بڑے ہی پرجوش انداز میں واپس جانے لگے۔ چینا علی اور ضمیر بھائی کی خوشی کا یہ عالم تھا کہ دل چاہتا پٹاخے پھوڑیں لیکن اسی دوران ہی ابا اپنے پورشن سے برآمد ہوئے۔

"اوئے حوالدارا۔" حوالدار اور لیڈی کانسٹیبل سمیت سب ہی نے سلطان راہی جیسی بڑھک مارنے والے ابا کو دیکھا۔

"اوئے پلیس سٹیشن کے نمبر ملا ملا کر اپنی انگلیاں میں نے ٹیڑھی کرلی ہیں تے چیک بک وتیاں بغیر ہی جا رہے ہو۔"

"اچھا تو قانون کے ساتھ فون پر چھپن چھپائی تم کھیل رہے تھے؟" لیڈی کانسٹیبل نے خدشے کی تصدیق کی۔ جس پر ابا نے بڑے فخر سے گردن ہلا کر اقرار کیا تو چینا کو تو جیسے الزام لگانے کا موقع مل گیا۔ "پھر تو چینا کے خیال میں ان پر دفعہ نو دو گیارہ لگنی چاہیے۔"

"او جی' حوالدار صاحب' آپ اوپر تے آؤ۔ کوئی بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں۔" ابا اپنے اوپر دفعہ لگنے کی بات سے سہم گئے تھے' جب ہی ڈھکے چھپے لفظوں میں مل بیٹھنے کی آفر کر ڈالی' جس پر فی الحال حوالدار صاحب رضامند ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے۔

"او خوچہ نئیں ام۔"

اس سے پہلے کہ وہ اوپر آنے سے منع کرتے ابا کے عقب میں چندا بھی آن کھڑی ہوئی اور حوالدار صاحب کو نظریہ ضرورت کے تحت اپنا بیان آدھے راستے ہی

بدلنا پڑا۔
"آئی گی' آئے گی' ام کیوں نہیں آئے گی۔" اور پھر جس مقناطیسی انداز میں انہوں نے سیڑھیوں کا رخ کیا چینا وغیرہ تو بس دیکھتے ہی رہ گئے اور قانون ان کی نظروں سے او جھل بھی ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

خالہ اپنے کمرے میں نہایت افسردگی سے سی ڈی ریک کے سامنے کھڑی کبھی کوئی سی ڈی نکالتیں پھر رکھتیں اور پھر نکال دیتیں۔
"کوئی تو ایسی غم زدہ گانوں والی سی ڈی ملے جسے لگا کر خوب رونا آئے اور ذہن سے یہ خالہ لفظ کا داغ دھل جائے۔" انہوں نے سوچا۔ اور عین اسی وقت ضمیر علی اور چینا منہ لٹکائے ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔
"اب کیوں آئے ہو یہاں۔ میں تو کہتی ہوں امریکہ ہو تم تینوں امریکہ۔ جب بھی ضرورت پڑتی ہے' آنکھیں پھیر لیتے ہو۔"
"مگر خالہ اس میں ہمارا کیا قصور؟" ضمیر بھائی ایک محاذ پر شکست کھا کر اب دوسرے محاذ پر اپنا دفاع کر رہے تھے۔
"مجھے تو خالہ وہ ایسے کہہ رہی تھی' جیسے خود ابھی جھولے سے گری ہو۔"
"تو اور کیا خالہ میں تو اسے کچھ کہنے ہی والا تھا مگر پھر عورت سمجھ کر اس کا لحاظ رکھا۔" علی بولا اور چینا کے ساتھ ہی سامنے رکھے صوفے پر گر سا گیا۔
"اچھا خالہ چلو چینا کی بات بھی مان لو اور غصہ تھوک دو۔ سب مل کر اس کا حل نکالتے ہیں۔" چینا نے انہیں تسلی دی۔
"اور وہ۔ وہ جو مجھے۔ بن جی کہہ رہا تھا۔" ایک ایک دکھ خالہ کو اذیت دے رہا تھا گیا کرتیں۔
"ویسے خالہ تمہارا منہ ہی بہنوں والا ہے۔ بندہ اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔" ضمیر بھائی خالہ کے عین سامنے جا بیٹھے تھے اور ان ہی کے زخموں پر نمک پاشی بھی کرنے لگے۔
"ضمیر' مجھے' تم سے سے کم از کم یہ امید نہیں تھی۔" خالہ نے مایوسی سے کہا تو چینا پھر بولی۔
"اچھا نا چلو چھوڑو۔ چینا کہہ رہی ہے تو پلیز غصہ تھوک دو۔"
"اچھا خالہ میں بھی معافی مانگتا ہوں' اب غصہ تھوک دو۔" ضمیر بھائی بولے تو علی کو بھی مذاق سوجھا۔
"ویسے اس بات کا کریڈٹ تو پھر چینا آپی کو ہی جاتا ہے نا۔"
"کس بات کا؟" ضمیر بھائی حیران تھے کہ کیا کریڈٹ کارڈ کے علاوہ بھی اس کو کریڈٹ مل سکتا ہے۔ "اس بات کا کہ انہوں نے آپ کو معافیاں مانگنے میں اچھا خاصا ایکسپرٹ کر دیا ہے۔"
"ضمیر۔ کاش چینا تمہیں سب کے سامنے سویٹی پائی کہہ سکتی۔" چینا نے بڑے ہی پیار سے انہیں دیکھا
"ارے بھائی کہہ دیا تو خواہ مخواہ نکاح ٹوٹ جائے گا۔ یہاں پہلا ہی نہیں ہو رہا پھر تمہارے دوسرے نکاح کی بھی فکر لگ جائے گی۔" خالہ نے تشویش ظاہر کی جس کی ضمیر بھائی نے پرزور تردید کی۔
"خالہ' چینا نے بھائی نہیں پائی کہا ہے۔"
"ہاں تو میں کب نانی کہہ رہی ہوں' میں نے بھی تو بھائی کہا ہے نا۔"
"اچھا چھوڑو خالہ اٹھو کھانا کھائیں۔" چینا نے کہا تو وہ ضدی بچوں کی طرح دائیں بائیں گردن ہلا کر منع کرنے لگیں۔
"اب مان جاؤ ناں خالہ پلیز۔ اور غصہ تھوک دو۔" خالہ نے فیصلہ کرنے کے انداز میں باری باری ان تینوں کو دیکھا اور بڑی شدت سے ضمیر بھائی پر تھوک دیا۔ جس پر وہ غصے میں بلبلا ہی تو اٹھے تھے۔
"خالہ۔"
"نہیں نہیں بس اب ٹھیک ہوں اتنا ہی غصہ تھا۔" خالہ نے باہر نکلتے ہوئے بے نیازی سے کہا تو چینا بھی مڑ کر دیکھنے لگی۔
"ضمیر' چینا کی خاطر شرٹ چینج کر کے آنا۔"

"لگتا ہے خالہ نے بھی پہچان لیا ہے آپ کو۔" چینا کے پیچھے کمرے سے نکلتے علی نے بھی ٹکڑا لگایا تو ضمیر بھائی نے بڑے غصے سے سامنے رکھی سی ڈیز بیڈ پر پھینک دیں۔

☆ ☆ ☆
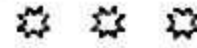
پہلے آپ کے ہونٹوں پر جو مسکان وغیرہ
قربان گئے اس پہ دل و جان وغیرہ
بے حرص و غرض فرض ادا کیجیے اپنا
جس طرح پولیس کرتی ہے چالان وغیرہ

ابا کمرے میں داخل ہوئے تو حوالدار کی مسکراتی نظریں چندا کے چہرے پر چپکی ہوئی محسوس کر کے انہیں اپنے اندر محفوظ کر کے رکھی گئی غیرت انگڑائی لے کر جاگتی محسوس ہوئی۔

"او کون اے تو حوالدار؟"

حوالدار صاحب بھی اس اچانک پڑنے والے چھاپے کے لیے بھلا کب تیار تھے اس لیے گڑبڑا گئے۔

"نہیں۔۔۔ میں ہوں آئی جی۔"

"چوتھوں کا؟" (بھوتوں کا) ابا نے اپنی معلومات عامہ بڑھانے کو سوال کیا۔

"خو چہ ام اپنی ماں کا آئی جی ہے، چوتھوں موتھوں کو ام نہیں مانتا۔"

"ماں کا آئی جی؟" ابا کو حیرت ہوئی۔

"اوئے حوالدار! اک بات تے بتا کہ۔۔۔ کہ یہ محکمہ پولیس تیری ماں ہے؟" اتنا کہنا تھا کہ حوالدار صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے ابا کا گریبان پکڑ لیا۔

"ام کو گالی دیتا اے خانہ خراب۔ میں تیرے کو چھوڑے گی نہیں۔"

"چھوڑ دیں نا سر۔ یہ آخر کار ہیں میرے ابا۔!" چندا نے درخواست کی تو ابا کو اپنے گریبان پر حوالدار صاحب کے ہاتھ ڈھیلے پڑتے محسوس ہوئے۔

"سر؟ اتنی عزت سے تو اماری بیوی نہیں بلاتی۔"

"وہ بیوی ہے نا۔ اچھی طرح جانتی ہے آپ کو۔" لیڈی کانسٹیبل نے اطلاع دی۔

اوپر آئی ہی؟ ابا کا دماغ ابھی تک وہیں اٹکا ہوا تھا۔

"انار گل کو ام چھوٹا چھوٹا کر کے آئی جی بولتی۔" حوالدار صاحب نے وضاحت کی۔ "دراصل ام جب پیدا ہوا تو انار کے مافق سورخ تھا بس ماں نے امارا نام ہی انار رکھ دیا۔"

"انار چھوڑ حوالدار اب تے اچار جیسا رنگ ہو گیا ہے۔" ابا کا خیال تھا کہ شاید حوالدار صاحب اب تک اپنے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہیں لہٰذا اطلاع دے کر اپنا فرض پورا کیا۔

"دراصل حوالدار صاحب پہلے ٹریفک پولیس میں تھے تو ان کا رنگ اڑ گیا ہے۔" لیڈی کانسٹیبل نے حوالدار صاحب کے اشارے کو سمجھتے ہوئے انہیں بتایا۔ تو چندا کو تواضع کا خیال آگیا۔ "آپ لیں گے ٹھنڈا پئیں گے گرم؟"

اور ابا کو چندا کی اسی عادت سے اختلاف تھا بھلا کیا ضرورت تھی کسی بھی شخص کو کھلانے پلانے کی اور بغیر اشد ضرورت کے خود بھی کھانے کی' جب ہی انہوں نے چندا کو یوں گھورا کہ کھولتے پانی میں ابلتے انڈوں کو بھی ان کی دھندلی نظر نے مات دی۔

"او ٹھنڈا منڈا ام پی کے آیا ہے' دوسرا آپشن ٹیک اے۔"

"ہاں میرا بھی یہی نیک خیال ہے کہ ٹھنڈا رہنے دیں۔" لیڈی کانسٹیبل بھی مسکرائی۔ لیکن جب بات ہو کیسی بھی قسم کے خرچے کی تو ابا کا ان کی مسکراہٹ بھلا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ چندا نے ڈرتے ڈرتے ایک بار پھر انہیں دیکھا۔ تو تاثرات وہی جارحانہ تھے۔ اوپر سے حوالدار صاحب کی باتیں انہیں مزید اشتعال دلا رہی تھیں۔

"جیسے ان دونوں بہنوں کی مرضی۔ ام تو خوچہ عورتوں کی باتوں میں بولتی نیں اے" حولدار صاحب نے چندا اور اپنی ماتحت اہلکار کی طرف اشارہ کیا تو ابا اپنی جگہ سے ہلے۔

"میں خود لاتا ہوں جا کے۔" اور پھر چندا کے پاس سے لرزتے ابا نے جاتے جاتے زیر لب کیا کہا کہ چندا کا منہ ٹریفک کی اس بتی جیسا ہو گیا جو گاڑیوں کو نہ رکنے کا اشارہ دیتی ہے نہ فوراً "گزارنے کا۔

☼ ☼ ☼

یہ لغزش "احتراماً" ہو گئی تھی
جوانی کو بڑھاپا کہہ دیا تھا
وہ بیبی آج تک ہم سے خفا ہے
جسے بھولے سے آپا کہہ دیا تھا

آج اٹھ کر اگر حولدار صاحب کو غلطی سے کچھ دینا پڑ گیا تھا تو انہیں برا بھلا کہنے اور مورد الزام ٹھہرانے کے لیے بھی خالہ ہی یاد آئی تھیں۔ حالانکہ یہ حقیقت کراچی شہر میں دن کے وقت جلتی اسٹریٹ لائٹس کی طرح روشن تھی کہ حوالدار صاحب کے آنے کے معاملے میں تو خالہ کا کوئی بھی قصور نہیں تھا لیکن پھر بھی شاید وہ ابا کے دل سے ان کی قمیص کے خالی جیب کی طرح نزدیک تھیں اسی لیے مشکل وقت میں سب سے پہلے وہی یاد آئیں۔ اور تب انہوں نے کچن میں داخل ہو کر پہلے تو سرد موسم میں سرد آہ بھری اور ان کی نظریں کھڑکی کے ساتھ دھوپ میں رکھی ہوئی پانی کی بوتل پر پڑی۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور ہاتھ لگا کر اس کا گرم ہونا محسوس کیا تو وہ اچھی خاصی گرم ہی محسوس ہوئی۔

باوجود اس کے کہ دھوپ اب فلرٹ حسینہ کی طرح نظریں پھیر چکی تھی۔ سو انہوں نے کپ ٹرے میں رکھے اور اسی پانی کو چند ہی لمحے چولہے پر رکھ کر پھر کپوں میں ڈال لیا۔ چہرے پر دکھ کسی چپیرے کی طرح اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ اور اسی عالم جذبات میں ان کا زمین کی ہتھیلی جیسا منہ ایسا سکڑ گیا تھا کہ لگتا ننھے بچے نے دعا مانگنے کے لیے دونوں ہتھیلیاں ملا رکھی ہیں۔

"پی چائے بنانے کے لیے پانی گرم کیا ہوا تھا۔ پر آ۔ہا۔" ہنکارا بھرتے ہوئے انہوں نے بڑی ہی دکھی خود کلامی کی تھی۔

"بتی لے کر بھی پوری دنیا وچ کوئی فضول خرچ بندہ

ڈھونڈ دناں تے سامنے میری ہی اپنی ذاتی دھی بوتھا کھول کے کھڑی ہوگی۔

کیا تے کش سمجھا چکا ہوں اسے پر۔ کش اثر نہیں ہے۔" ابا دونوں کپ ٹرے میں رکھ کر کچن سے نکلے تو دل ایسا بھاری تھا کہ جیسے ان کی رخصتی ہو رہی ہو۔ وہ بھی ہیر جیسی۔!

☼ ☼ ☼

ٹی وی لاؤنج میں حوالدار صاحب سمیت چندا اور لیڈی کانسٹیبل بھی اس انتظار میں تھی کہ اب دیکھتے ہیں کہ چینا کے گھر سے کھانا لینے کے بعد اب یہاں تواضع کا کیا عالم ہوگا اور چونکہ یہ دونوں گھرانے ایک دوسرے کے مقابلے پر تھے اس لیے بڑی پر تکلف تواضع ہونے کا امکان تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ چندا کو اس طرح کی کوئی بھی خوش فہمی اس لیے نہیں تھی کہ وہ ابا کے ساتھ ہی زندگی گزار رہی تھی اور انہیں اچھی طرح جانتی تھی۔ سو ابا ٹرے میں صرف دو کپ رکھ کر لائے تو حوالدار صاحب اور لیڈی کانسٹیبل نے پہلے تو ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر یہ سوچ کر کہ چلو کوئی بات نہیں ابھی نیچے سے تو اتنا کچھ کھا کر آئے ہی ہیں اس لیے ہاضمے کو بہتر بنانے کے لیے ایک ایک کپ چائے بھی چلے گی، مسکرا دیے اور ابا کا پیش کردہ کپ اٹھالیا۔ کپ کیا تھا ایک معمہ تھا، وہ جیسے چائے سمجھے بیٹھے تھے وہ ایک ایسا محلول تھا جس کا کوئی رنگ نہ تھا اور رہا پھر اس نے پکی عمر کی نئی نویلی دلہن کی طرح خود کو کسی کے بھی رنگ میں رنگنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

بہرحال، جو بھی تھا دونوں نے اپنا اپنا کپ اسی تجسس میں اٹھالیا۔

"اس کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں تھی، بس تکلف ہی کیا آپ نے۔" لیڈی کانسٹیبل نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے وہ الفاظ کہے جو ہمارے معاشرے میں اس طرح کے موقعوں پر بولنا ہر مہمان کے لیے فرض خیال کیے جاتے ہیں۔ بے شک خود گھر سے دو دن کے بھوکے اٹھ کر آئے ہوں اور تواضع کے لیے رکھی گئی چیزوں کو دیکھ دیکھ کر منہ سے میونسپلٹی کے نل سے نکلتے پانی کی طرح رال قابو میں نہ آرہی ہو، بے شک دل چاہتا ہو کہ اب انہیں اس سجی ہوئی میز پر تنہا چھوڑ کر ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ لیکن جب تک وہ یہ اور اس طرح کے ایک دو اور جملے نہ کہہ دیں دل کا چور یہی کہتا ہے کہ شاید میزبان انہیں ندیدا ہی خیال نہ کرے۔ ورنہ تو یہ سب باتیں کہتے ہوئے وہ کھانے پینے کی اشیا کو یوں دیکھتے ہیں جیسے نکاح کے بعد کی رسموں میں دولہا اپنی دلہن کو دیکھتا ہے۔

"ضرورت نئیں تھی تے پہلے بتاتے، کھانے پینے کے معاملے میں نہ کرنی ہوتے شرماتے نئیں۔" ابا نے مفت مشورہ دیا ہی تھا کہ حوالدار صاحب کے منہ کے زاویے امیر اور لاپروا والدین کی اولاد کی طرح آہستہ آہستہ بگڑنے لگے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے ایک گھونٹ پی لی تھی۔ ابا کی بنائی ہوئی ممکنہ چائے۔!

"او خوچہ خانہ خراب یہ تو پانی نا۔"

"نئیں تے میں کپ میں تیرے لیے شوری (شوربہ) ڈال لیتا مرغی کا؟" "گرم پانی اور وہ بھی اتنا گرم۔۔۔؟ لیڈی کانسٹیبل کے بھی ارمانوں پر بجلی تھی۔

"وئے ابھی نئیں کہا تم نے ہم کہ ٹنڈا بی کے آئی ہے۔" ابا نے پنجابی تلفظ کے ساتھ پختون لہجہ بنا کر حوالدار صاحب کی نقل اتارنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے حکم دینے کے انداز میں گزارش کر رہے ہوں۔

"توبہ توبہ، ام کو تو اتنی سردی میں بھی اس ایک گھونٹ سے گرمی لگ گیا ہے۔ ہنکالگاؤ چندا ہنکا۔" حوالدار صاحب نے جس بے تکلفی سے چندا کو پکارا تھا ابا نے فوراً ہی گردن گھما کر پہلے تو چندا کے کنفیوژ چہرے کو دیکھا اور پھر حوالدار صاحب کے نین نقش کا بغور جائزہ لیا تو جیسے ان کی جان میں جان آئی، کیونکہ وہ جو اتنی دیر سے ان کو نوجوان سمجھے بیٹھے تھے، نزدیک سے جانچنے پر پتا چلا کہ وہ اب اتنے بھی نوجوان نہیں ہیں اس لیے ابا نے بھی بڑی بے فکری سے مسکراتے ہوئے چندا کو دیکھا اور مطمئن وہ اس لیے

بھی تھے کہ ان کا خیال تھا حوالدار صاحب اس وقت عمر
کے جس درمیانی دور میں تھے اس میں کسی بچوں والی
عورت پر بھی دل آسکتا ہے ہاں البتہ دو چار برس آگے
ہوگئے تو ان کی صحت اور نیت دونوں ہی سی ڈی کی
طرح آٹومیٹک ریوائنڈ ہو جائیں گی۔ حوالدار صاحب
کے ساتھ موجود اس جوان جہان لیڈی کانسٹیبل کی بے
فکری بھی ابا کو اپنے اسی تجزیے کے تحت معلوم
ہوئی۔

"چلا تو دوں پنکھا' لیکن یہ تو چلتا ہے صرف ہوا
سے۔"

"کیا مطلب؟" لیڈی کانسٹیبل نے سوال کیا۔

"مطلب یہ کہ اگر لگے ہم کو گرمی تو ہم اسے گھر کی
سب کھڑکیاں کھول دیتے ہیں اور پھر اندر آجاتی ہے
باہر کی ہوا۔"

"واہ واہ خوچی علینئی تم لوگوں نے اپنے گر کا بجٹ بھی
تنوں (تھنوں) کے مابق (مافق) چوتا چوتا رکھا اے۔"

حوالدار صاحب کو ان دونوں سے اس قدر ذہانت کی
امید ہرگز نہیں تھی۔ اور لوگوں کی امیدوں کے
برخلاف جانا تو ویسے بھی ان کا وطیرہ تھا۔ جب ہی بڑے
فخر سے سر ہلاتا ہلاتے ہوئے ابا نے پہلے چندا اور پھر ان
دونوں کو یوں دیکھا کہ جب دیکھنے کے دوران ان کی
آنکھیں لیڈی کانسٹیبل تک پہنچیں تو بائیں آنکھ
اچانک ہی دائیں کو کھلا چھوڑ کر بند ہوگئی۔ اب یہ نتیجہ
نکالنا مشکل تھا کہ آیا اب کی بائیں آنکھ اچانک ہی کچھ
پڑجانے سے بند ہوئی تھی یا پھر عین لیڈی کانسٹیبل کو
دیکھتے ہوئے بائیں آنکھ بند ہونے کا مقصد وہی تھا جو
عام طور پر مرد حضرات پورا کرنے کی کوشش میں رہتے
ہیں۔

یہ اور بات تھی کہ اگر ان کی یہ ہی دانستہ یا نادانستہ
سرزد ہونے والی حرکت کا نوٹس لے لیا جاتا تو صرف آنکھ
نہیں وہ خود بہ نفس نفیس جیل میں بند ہو سکتے تھے۔

جسے دیکھو وہ لڑ کے جا رہی تھی
اور اک وہ ہاتھ جڑ کے جا رہی تھی
خطا اتنی تھی میں در پر کھڑا تھا
اور میری آنکھ پھڑ کے جا رہی تھی بائیں

* * *

اوپر والے پورشن میں ان کے خلاف ہوتی مبینہ
قانونی سازش اور اس کے آئینی خطرات و خدشات
کے پیش نظر نچلے پورشن والوں کا بھی دل کا چین غائب
تھا۔ ضمیر بھائی جن پر خالہ تھوک کر آئی تھیں۔ انہیں
شرٹ بدلنے میں اتنی دیر ہوگئی تھی کہ لگتا شرٹ نہیں
نظام بدل رہے ہوں البتہ علی ہمیشہ کی طرح انہیں اس
کیفیت میں مبتلا دیکھ کر خوش نہیں بہت خوش ہوا تھا۔

"خالہ چھوڑو نا اگر کسی نے خالہ یا بہن کہہ دیا ہے
تو۔ ان کے حصے کی سزا تو ضمیر بھائی کو ملے گی اب بتاؤ
تمہیں کھانا ڈال دوں؟"

بالآخر علی نے ہی چینا اور خالہ کی خاموشی توڑنے کا
ارادہ کیا۔

"شرم تو نہیں آتی تمہیں علی۔ گھر کی لڑکی پر نظر
رکھتے ہو۔" خالہ نے ڈانٹ دیا۔

"گھر کی لڑکی؟ لیکن خالہ چندا تو اوپر والے پورشن
میں رہتی ہے نا۔"

"ہاں تو پھر اس کو جا کر دانہ ڈالو نا۔ مجھے کیوں کہہ
رہے ہو دانہ ڈال دوں؟" خالہ بھی اپنے نام کی ایک
تھیں جن کے نزدیک سماعت صرف اور صرف
"مساں" کی جمع تھی بس' اس کے علاوہ اکثر اوقات وہ
اس سے ناواقف نظر آئیں۔

"تو یہ ہے یہ غیر ملکی ڈرامے بھی نا۔ انہوں نے تو
بہن' بھائی' خالہ' چاچی سب رشتوں پر جھاڑو پھیر دی
ہے۔ عزت آبرو تو گویا ختم کرنے پر تلے ہیں۔" خالہ کا
یہ رکنے کا ارادہ جان کر چینا بھی ان کی باتوں سے گھبرا گئی
تھی۔

"علی۔ تم نے خالہ کے ساتھ کوئی ایسی حرکت کی'
جیسی غیر ملکی ڈرامے کر رہے ہیں؟"

"واہ چینا واہ۔ میرے بتانے کے باوجود تم اس سے
پوچھ رہی ہو' اعتبار نہیں ہے کیا مجھ پر کوئی بکا ہوا صحافی

سمجھ رکھا ہے کیا؟" وہ تلملائیں۔

"میں نے تو صرف اور صرف خالہ کو کھانا ڈالنے کی آفر کی تھی آپی! ورنہ میں تو باسی کھانا کھانا پسند نہیں کرتا یہ تو پھر۔"

"اب بات مت بدلو علی۔ مانا کہ میں جوان ہوں' حسین ہوں' ہزاروں دل مجھے دیکھ کر ایک دم دھڑک اٹھتے ہیں لیکن۔" خوش فہمیاں ڈالر کی طرح اپنے عروج پر تھیں۔

"خالہ کوئی بھی ڈراؤنی چیز دیکھ کر دل یونہی ایک دم دھڑک اٹھتے ہیں اس لیے خواہ مخواہ رومانٹک ظاہر نہ کریں خود کو۔" چینا نے برا منایا۔

"لیکن اسے کچھ تو عمر اور میرے رشتے کا بھی لحاظ ہونا چاہیے کہ نہیں۔" خالہ نے سوال کر کے چینا کو سوچ میں ڈال دیا تھا۔

"ارے ارے ارے خالہ چھپی رستم' تمہارا عمر سے رشتہ ہوگیا؟ کب؟ کس نے کروایا اور چینا کو کیوں نہیں بتایا؟"

"بے فکر رہیں آپی' خالہ کا رشتہ ہمارے ملک میں انصاف کی طرح ملنا بہت مشکل ہے۔" علی نے منہ بسورا۔ خالہ نے اس کے سچے جذبے کو غلط سمجھا اس بات پر اسے اتنا دکھ ہو رہا تھا جتنا فیس بک پر سب سے چلبلی چیٹنگ کرنے والی لڑکی کے آن لائن نہ ہونے کا ہوتا تھا۔

"خبردار علی' مجھے ادھر ادھر کی باتوں میں مت الجھاؤ اور میں تمہیں بتادوں کہ حوالدار صاحب والے واقعے کے بعد میں بہت سخت ہوگئی ہوں اس لیے مجھے اس نظر سے دیکھنا بھی مت۔"

"ڈونٹ وری پیاری خالہ۔ میری تو ویسے ہی نظر خراب ہے۔" علی مسکرایا۔

"ہاں اسی لیے تو جس پر بھی ڈالو خراب نظریں ڈالتے ہو۔" علی کے معاملے میں چینا بہت کم کسی کی بات برداشت کرتی تھی کہ آخر اکلوتا اور چھوٹا بھائی تھا اس لیے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور بولی۔

"نہیں نہیں بہت ہوگیا خالہ۔ خبردار! جو اب ایک لفظ بھی اب چینا کے بھائی کو کہا تو۔"

"لیکن تم اسے لگام۔"

"دیکھئے گا' دیکھئے گا' چینا کا بھائی تمہیں اسی نظر سے دیکھے گا۔ اب بے چارہ "میرا" کی نظر "تو لانے سے رہا۔" غصے میں چینا شالیمار ایکسپریس کی طرح پھر رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اس کے بولنے پر علی کو بھی ڈھارس ہوئی ورنہ تو وہ بھی خود کو ضمیر بھائی کی کیٹگری کا سمجھ رہا تھا۔

"میرا" کی "نظر" تو آپی ملے گی نہیں' پاکستان میں بین لگ گیا تھا اس پر۔"

واہ بھئی واہ۔ ہمارے سنسر والے بھی تو شاید ایک شیشے کی عینک لگاتے ہیں کہ فلموں میں میرا کی "نظر" نظر آگئی اور غیر ملکی ڈراموں میں ان کی بد نظری نظر نہیں آئی۔"

خالہ نے بد نظری کو بدہضمی کے انداز میں کہا تو علی اور چینا ان سے متاثر نظر آنے لگے۔ خالہ کاش چینا تمہیں "شاباش" دے سکتی۔"

"آئے ہائے تو دے دو نا' روکا کس نے ہے؟" خالہ اس خاتون شخصیت کی طرح خوشی سے بھول گئیں تھی جنہیں سوتے سوتے ہی خوش خبری ملی کہ انہیں حکومت کی طرف سے تمغہ امتیاز دیا جارہا ہے۔ اب یہ الگ بحث ہے کہ وہ کسی امتیاز کا تمغہ تھا جو انہیں ملتا" ملایا اس تمغے کا امتیاز تھا کہ ان جیسی شخصیت کو ملا بہرحال جو بھی ہو قصہ اس دیہاتی خاتون جیسا تھا جس کا نام اس کے والدین نے وزیرہ رکھا اور پھر وہ اعظم نامی شخص سے شادی کر کے پورے دیہات میں وزیر اعظم کے طور پر جانی اور پہچانی جاتی ہو۔

☼ ☼ ☼

حوالدار صاحب اپنے حوالات میں تو کسی کی جو خاطر کرتے ہوں گے کرتے ہی ہوں گے' لیکن جو خاطر مدارات ان کی اماں نے کرنی تھی وہ یقیناً ان کے یادگار

تھی کہ آج تک نہ تو کسی نے ایسی تواضع کی تھی اور انہیں یقین تھا کہ نہ کوئی آئندہ ان کی ایسی تواضع کر سکتا تھا اور اب جب انہیں ابا کی اوقات کا اندازہ ہو چلا تو انھوں نے معاملے کو نبٹانے کی طرف پہلا قدم بڑھایا اور بولے۔

"اچھا تو خوچہ اب ام کو یہ بتاؤ کہ بار بار فون پر کیوں ہارن دیتی تی؟"

"او جناب عالیہ دراصل۔۔۔" اس سے پہلے کہ ابا کچھ جواب دیتے حوالدار صاحب کو جیسے کسی نے چٹکی کاٹی۔

"اوئی۔۔۔" اس اوئی کا دورانیہ ڈرامے کی نسبت ٹیلی فلم جتنا تھا اور حیرت کا اظہار کرنے کی غرض سے دونوں آنکھیں اور ہونٹ "اوئی" کرتے ہوئے اس قدر گول ہوگئے کہ لگتا چہرہ نہیں ہے بلکہ کسی بچے نے وائٹ بورڈ پر موٹے موٹے حروف میں چار "تون" لکھ رکھے ہیں چار اس لیے کہ ان کا ناک بھی نامولود بچے کی مجسم تصویر تھا جبکہ ابا نے شک کی گہری نگاہ سے ان کے ساتھ ہی بیٹھی لیڈی کانسٹیبل کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنا شک ظاہر کرنے کی کوشش بھی کی جسے قانون کی اس محافظ نے نگاہ غلط سمجھ کر نظر انداز کردیا کہ ان کی اس "اوئی" کے پیچھے اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔

"خوچہ تم بھی پہلے بس چلاتی تی۔۔۔ اس لیے ام کو ہارن دیتی؟"

"او توبہ کرو جی میں نے تے اج تک ہانڈی میں چمچ نئیں چلایا تسی بس دی گل کر رہے ہو۔"

"تم بس نئیں چلاتی۔۔۔ مطلب تماری آنکھیں مانئیں ٹیک اس پر تم ام کو عالیہ عالیہ کیوں بولتی؟ تم کو ایک کبھرو شیر جوان نظر نئیں آتی اے؟"

"کبھرو تے شیر تے جوان۔۔۔ پر ہے کدھر؟" ابا ان تین نئے ممکنہ آنے والے اشخاص کو کھوجی نظروں سے یوں یہاں وہاں دیکھنے لگے کہ ان پر گیدڑ کا گمان گزرا جب ہی لیڈی پولیس نے اپنی ذمہ داری نبھانے کا سوچا۔

"او احمق انسان ادھر دیکھو ادھر۔" ابا سے مخاطب ہو کر وہ کبھرو شیر جوان کے طور پر حوالدار صاحب کو متعارف کروانا چاہتی تھی مگر ناکام رہی اور ابا نے حوالدار صاحب کی توجہ اس طرف دلائی۔

"او تینوں بلا رہی ہے۔" اور اس سے پہلے کہ قانون کی اس بے حرمتی پر ابا کے خلاف کوئی کارروائی کی جاتی چندا کی آواز حوالدار صاحب کے کانوں میں یوں اتری جیسے فلمی ہیروئن سوئمنگ پول میں اترتی ہے۔ دھیرے دھیرے۔۔۔ متوجہ کرتے ہوئے!

"سر وہ۔۔۔ آپ کو کیا تھا فون رپورٹ کے لیے۔"

چندا کی آواز نے حوالدار صاحب کا موڈ ایسے تبدیل کیا جیسے دودھ میں روح افزا ڈال دیا ہو۔ پہلے کیا تھا' کیسا تھا کچھ خبر نہیں' جب ہی وہ اپنی جگہ سے ہلے بغیر صرف جسم کا اوپری حصہ اس کی جانب موڑ کر بولے۔

"اچھا اچھا۔۔۔ یعنی تم نے لیبارٹری سے رپورٹ لینے کے لیے ام کو رانگ نمبر ملایا۔"

"بس یہی تو خرابی ہے اس رانگ نمبر میں کہ کبھی بزی نہیں ہوتا۔ ہمیشہ مل جاتا ہے۔" لیڈی کانسٹیبل نے مفت کی رائے دی۔

"او ہم نے ایف آئی آر لکھوانی تھی جناب عالی۔۔۔"

جناب عالیہ کہتے کہتے ابا نے جو حوالدار صاحب کے چہرے پر ابھرتے غصیلے تاثرات دیکھے تو فوراً وہیں چپ کر گئے اور اس فوری چپ کرنے میں خود ان کی حالت وہی تھی جو بانچ بریک لگنے پر چلتی گاڑی کی ایک دم بریک لگنے پر ہوتی ہے۔

"اچھا تو تم ام کو جاہل مطلق مانتا اے؟ قانون کو ان پڑھ سمجھتا اے؟ ام خود ایف آئی آر نئیں لکھ سکتی اے جو تم ام کو لکوائے گی؟" ابا نے مدد طلب نظروں سے پہلے لیڈی کانسٹیبل اور پھر چندا کو دیکھا کہ کسی طور پر قانون کی یہ غلط فہمی دور کروا کر اسے انصاف کی طرح خاموش کروایا جائے۔

"سر، دراصل ہمارے گھر میں ہو گئی ہے چوری۔" چندا کی آواز نے ایک بار پھر ان کا مزاج معتدل کیا۔

"چوری؟ امارے علاقے میں؟ اور وہ بھی ام کو بتائے بغیر؟" حوالدار صاحب کی پریشانی کا یہ عالم تھا کہ لگتا چور ان کی ٹوپی اور بیلٹ چرا کر بھاگ گیا ہو۔ اور ان کے علاقے میں انہیں بتائے بغیر چوری کرنا بھی انہیں اپنی غیرت پر حملہ محسوس ہو رہا تھا۔

"جی سر۔ اور یہی تو ہم آپ کو چاہتے تھے بتانا۔"

"پر اب بتانے کا فائدہ؟ یہ تو تم کو چوری سے پہلے بتانا چاہیے تھا۔" حوالدار صاحب کے ذہن میں ایک ایک کر کے ان سب ممکنہ چوروں کی شکلیں سیکنڈ کی سوئی بنے گھوم رہی تھیں جو بغیر بتائے ہی قانون کے ساتھ چھیڑ خانی کرنے کی اہلیت، صلاحیت اور قابلیت رکھتے ہوئے قانون کو چیلنج کر سکتے ہوں۔

"او حوالدارا۔ چوری تو پیلاں (چوری سے پہلے) کی بتاتے؟"

"تم ام کو بتاتے کہ خوچہ امارے گھر چوری ہونے والا اے۔" حوالدار صاحب نے قانونی مشورہ سبزی کے ساتھ دھنیے کی طرح دیا۔ بالکل مفت!

"لیکن اگر ہم بتا دیتے تو کیا کر لیتے آپ؟"

"ام چوروں کو میڈیا پر آ کے بتاتی کہ تماری خفیہ نگرانی ہو رہی اے، تاکہ وہ چوری نہ کرتے۔"

"مگر کیا کریں گے اب؟" چندا پریشان تھی اور اس کی پریشانی حوالدار صاحب کو اپنی پریشانی لگ رہی تھی۔ اس لیے انگشت شہادت ناک پر رکھ کر کچھ سوچنے کی کوشش کرنے لگے۔

"چلو تم فکر نہ کرو، ام کچھ کرتی اے۔ کتنے کا مال تا؟"

"مال کا تو اندازہ نہیں، دراصل چوری ہوئی ہے ہماری چیک بک۔" چندا نے تصحیح کی۔

"ارے تو پھر بھلا فکر کیسی، آپ لوگوں کی ہے نا تو خالی ہی ہو گی۔" لیڈی کانسٹیبل نے خدشہ ظاہر کیا تمام موجودہ حالات و واقعات کے تناظر میں اسے ابا کی جیب کی حالت پتلی ہی محسوس ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے پر میرا کونٹ (اکاؤنٹ) تے خالی نئیں ہے نا۔"

"خوچہ، اچھا ام کو بتاؤ کہ کون سے بینک کا چیک بک تا؟ پر ام ان کو پون (فون) کر کے بتائے گی کہ۔۔۔"

"او جی ایہو تے مسئلہ ہے کہ مجھے بنک کا نام بھل گیا ہے۔" حوالدار صاحب نے ابا کو ایسے دیکھا گویا انہیں بنک کا نہیں اپنے والد کا نام بھول گیا ہو اور ابا بھی کیا کرتے اس وقت انہیں حوالدار صاحب کی ضرورت تھی اس لیے ان کا بات کرنے کا انداز سو فیصد وہی تھا جو عام طور پر بیویوں کا اپنی فرمائش پوری کروانے سے پہلے ہوتا ہے۔

"نئیں نئیں فکر نئیں کرنی، میرے بینک والوں کے ساتھ بڑے جیز تلقات (جائز تعلقات) ہیں۔ وہ بالکل برا موس نئیں کریں گے۔"

حوالدار صاحب نے گہری سانس لے کر کچھ سوچتے ہوئے بڑے دل سے خواہش کی تھی کہ کاش وہ پولیس اسٹیشن میں بار بار ہوتی ٹیلیفون کی بیل پر یوں دوڑے دوڑے "تکرار ہاؤس" کا رخ نہ کرتے تو آج انہیں ابا جیسے انسان سے نہ ملنا پڑتا۔

"سر آپ کریں نا کچھ ہمارے لیے۔" چندا تو ان کے لیے ویسے بھی سپریم کورٹ کا درجہ رکھتی تھی کہ اس کا ہر حکم ان کے سر آنکھوں پر تھا گو کہ حوالدار صاحب کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا تھا کہ جن کی شخصیت دیکھ کر زیادہ سے زیادہ ان سے ہمدردی ہی کی جا سکتی تھی اور چندا کی تو ہر بات وہ کانوں سے نہیں آنکھوں سے سنتے تھے اور ابا سامنے نہ ہوتے تو یقیناً بولتے بھی آنکھوں سے ہی اور انہیں یقین تھا کہ چندا ان کی باتوں کو مکمل دھیان سے سنتی۔ کیوں کہ دنیا میں سب سے زیادہ بے دلی، کم توجہ اور بے دھیانی میں ڈانٹ ڈپٹ والی گفتگو اور سب سے زیادہ دل لگا کر مکمل توجہ کے ساتھ رومانٹک اور پیار محبت والی باتیں ہی سنی جاتی ہیں، وصیت کا نمبر دوسرا ہے۔

"سرپلیز...!"

"اچھا ام کو بتاؤ کیا کروں؟ پوری ایک کلو سی این جی لاؤں۔"

"نہیں نہیں، آپ صرف لادیں ہماری چیک بک۔"

"ندی موقعے سے فیدہ نہ اٹھائیں۔" ابا کو چندا کا یوں منع کرنا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

"بھلا اک کلو سی این جی منگوالیتیں، بندہ گیس کے غبارے والوں کو وچ (بیچ) دیتا ہے۔"

"نری چول بنے کی بوڑی ہو گئے۔"

"یہ چول کسے کہہ رہے ہیں جناب اور اس کا مطلب کیا ہے؟" لیڈی کانسٹیبل نے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ابا سے سوال کیا مگر جواب سن کر چپ ہی کر گئی۔

"چول پنجابی کا ایک ایسا لفظ ہے جو سمجھایا نہیں صرف دکھایا جاسکتا ہے۔ تے ہر خاندان میں اک چول ہونا اتنا ہی یقینی ہے جتنا کیدو کے ساتھ اس کی لاٹھی۔ خاندان کی کوئی تقریب ہو یا کش ہو، سب گھر آکے اس "چول" کی باتیں ضرور کرتے ہیں۔"

"سرپلیز آپ قانون کے مطابق۔" حوالدار صاحب نے چندا کی بات کاٹ دی تھی۔ وہ بھی ہر ایرے غیرے کی طرح قانون کی اگلی پچھلی پشتیں نہ نکال بیٹھے۔

"یہ جو تم قانون کی بات کرتی اے۔ پورے مولوک کے واسطے برابر اے۔ سمجھا؟" چندا نے دائیں بائیں موجود ابا اور لیڈی کانسٹیبل کو دیکھ کر یوں نفی میں سرہلایا جیسے سلام پھیر رہی ہو۔

"حوالدار صاحب کا مطلب ہے کہ قانون پورے ملک کے لیے برابر ہے، اور جب ہمارے وزیروں، مشیروں کے کیس رجسٹریشن نہیں ہوتے، ایف آئی آر نہیں کٹتی تو تمہاری ایک دم کیسے کٹ لیں۔" لیڈی کانسٹیبل یقینی طور پر حوالدار صاحب کے ساتھ وہی مقام رکھتی جو طلباء کے لیے مشکل مضامین کی حل شدہ گائیڈز کا ہوتا ہے۔

"دیکھو جی، آپ میری چیک بک لیا دو تے میری طرف سے ساری حیاتی دعا ملے گی۔"

"صرپ دعا؟" حوالدار صاحب نے دعا کا مطلب اور اثر دغا دینے کے برابر لیا تھا۔

"اچھا جی، چیک بک تے ملنے دو۔ فیر جو کہو گے ملے گا؟" ابا نے اپنی آفر میں ذرا رد و بدل کیا تو حوالدار صاحب اور لیڈی کانسٹیبل نے ایک دوسرے کو مشورہ کرنے کے انداز سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اوکے بھی کر دیا۔

چوڑو چوڑو، ام تو بیٹا ای عوام کی خدمت کے لیے اے، اور عوام کی خوشی کے لیے تو یہ بھی لینا پڑتا ہے۔"

دونوں اب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

حوالدار صاحب نے ناراض بیوی کی طرح ساتھ چھوڑنے سے پہلے ہی پینٹ کو اوپر کی طرف کھینچا تو ایسا کہ لحہ بھر کے لیے خود بھی چینوں کے بل ہو گئے۔

"لیکن آپ اٹھ رہے ہیں کیوں؟"

"امارا ڈوٹی (ڈیوٹی) کی شب ختم ہو گیا ہے ناں خوچی۔" حوالدر صاحب نے آنکھوں کا استعمال زبان سے زیادہ کیا تھا اور چندا کی نا سمجھ پر اپنا سامنہ لے کر شرمندگی سے مسکرانے لگے۔ "اور اوور ٹائم کرنا امارے محکمے کے خلاف ہے۔" حوالدار صاحب نے رسٹ واچ کی طرف اشارہ کیا۔

"ام کل پر آئے گی خوچی۔" حوالدار صاحب کے لہجے میں چندا کو ایک ماں کی ممتا محسوس ہوئی "کل جب ام آئے گی تو آپ آئی آر بھی کاٹے گی اور کیس بھی بنائے گی۔"

"چنگا خیر رب رکھا۔" ابا نے الوداعی مصافحے کے طور پر ایسے ہاتھ بڑھایا جیسے چونی پکڑا رہے ہوں۔ اور عین اسی وقت جب بات کرنے کے ساتھ ساتھ حوالدار صاحب وغیرہ نیچے اتر رہے تھے اسی وقت ضمیر بھائی بھی اپنے لاؤنج میں سے گزر رہے تھے اور آخری بات سن کر جو بوکھلاہٹ ان پر سوار تھی لگتا تقریب ولیمہ میں کھانا شروع کرنے کا اعلان عین اس وقت ہوا ہو جب وہ قطار میں سب سے پیچھے تھے۔

٭ ٭ ٭

اور بھی چیزیں بہت سی لٹ چکی ہیں دل کے ساتھ
یہ بتایا دوستوں نے عشق فرمانے کے بعد
اس لیے کمرے کی اک اک چیز چیک کرتا ہوں میں
اک تیرے آنے سے پہلے اک تیرے جانے کے بعد

حوالدار صاحب کے جاتے ہی ابا نے صوفوں پر رکھے کشن بھی ایک ایک کر کے پلٹ کر واقعی وہیں موجود ہونے کی یقین دہانی کروائی تھی۔ جانے کیوں انہیں لگتا تھا کہ چیک بک کے ساتھ ہی نجانے ان کا اللہ بھی کیا کچھ چوری ہو گیا ہو۔ اور پھر بدقسمتی سے محکمہ پولیس کی شہرت کچھ ایسی ہے کہ ابا کو تو ان دونوں پر بھی بلاوجہ کا شک ہو رہا تھا عجب بے یقینی اور بدحواسی تھی۔ اور یہ عالم صرف اوپر والے پورشن میں ہی برپا نہیں تھا بلکہ ان کی بات چیت کا آخری حصہ سن کر ضمیر انتہائی بوکھلاہٹ میں باقی ماندہ لوگوں کے پاس پہنچے تو وہ سب بھی پریشان ہو گئے۔

"کیا ہوا ضمیر بھائی۔۔۔ کوئی مریض پیچھے لگ گیا ہے کیا؟" علی نے دیکھا ناک پر پھسلتی عینک کو سنبھالتے انتہائی گھبراہٹ میں وہ ایسے لگ رہے تھے جیسے ان جیسے لوگ گھبراتے ہوئے لگتے ہیں۔

"مریض تو اب ہم سب بنیں گے۔ بس ذرا سا انتظار۔" ایک تو بوکھلاہٹ اوپر سے علی کا طریق خطابت ضمیر بھائی کا دل چاہا تھا کہ حوالدار صاحب کے سامنے علی کو ہدیہ کی رقم کے طور پر پیش کر آئیں۔

"نفسیاتی مریض تو ہم بن ہی چکے اب کیا جذباتی مریض بنیں گے؟"

"جو کچھ میں سن کر آرہا ہوں نا علی' تم لوگوں میں سے کوئی بھی سنتا تو بے ہوش ہو جاتا۔"

"ظاہر ہے ضمیر۔ اب ہر بندے کو تو گالیاں سننے کی عادت نہیں ہوتی نا۔" چینا نے بینگن کے قتلے کو روٹی میں لپیٹتے ہوئے منہ بنایا تو ضمیر بھائی کا بھی منہ بن گیا۔

"چینا۔ میں تمہارا شوہر ہوں۔"

"اوہ اچھا ہوا یاد دلا دیا۔۔۔ یہ ذرا سالن گرم کر لانا۔"

چینا نے اپنی پلیٹ ان کی طرف بڑھائی تو وہ مزید غصہ کھا گئے۔

"میرا دماغ گرم ہو رہا ہے اور تمہیں کھانے کی پڑی ہے۔" ان کی بات پر یقیناً خالہ کو ترس آیا تھا اسی لیے وہ فوراً "انھیں اور ضمیر بھائی کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی ساتھ والی کرسی پر بیٹھا دیا۔

"ادھر آؤ۔۔۔ تم میرے ساتھ بیٹھو میاں۔" تب ضمیر بھائی کو خالہ پر بے حد پیار آیا تھا کہ بیوی نہ سہی ماں سی ماسی یعنی خالہ تو ہیں جو ان کا اتنا خیال رکھتی ہیں۔

"دیکھا چینا' خون کا رشتہ آخر خون کا ہی ہوتا ہے۔" فخر کے مارے وہ خمیر زدہ آٹے کی طرح پھول گئے تھے۔

"ارے چھوڑو بھی رشتے وشتے کو۔ یہ پلیٹ ذرا پکڑ کر رکھنا گرم ہو جائے۔" خالہ نے اپنی سالن کی پلیٹ گرم کرنے کی غرض سے ان کے سر پر رکھی تو چینا اور علی حیرت سے جبکہ ضمیر بھائی شدید ترین صدمے سے انہیں دیکھنے لگے۔

"خالہ۔ یہ۔۔۔" ضمیر بھائی نے بڑے دکھ سے انہیں دیکھا ان کا بس چلتا تو خالہ کو اسی وقت اس کرسی سے اتار دیتے جس پر وہ بڑے آرام سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھیں لیکن ایسا ہرگز ممکن نہ تھا کیونکہ ان تینوں میں سے کسی ایک کو بھی کرسی سے اتارنا اور وہ تو خود ان کی موجودگی میں صرف جوتیں جرابیں ہی اتار سکتے تھے 'ان کے نہیں' اپنے!

دوسرا آپشن وہ تھا جو عام طور پر ہمارے معاشرے کے مرد حضرات اپنی مردانگی دکھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن ضمیر بھائی کے لیے مردانگی دکھانے کے لیے غصے میں گالی دینا ضروری نہیں تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گالی دینے والے مرد اور ڈگالی کرنے والے جانور میں سے اگر چار ٹانگوں کے فرق کو نکال دیا جائے تو دونوں کو با آسانی ایک ہی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے بس دکھ سے دیکھتے رہے۔

"مجھے پتا تھا ضمیر' تمہارے انتظار میں بیٹھے بیٹھے جو کھانا ٹھنڈا ہوا' اسے چینا تو گرم کرنے کے لیے اٹھے گی

نہیں' سوچا تمہارا دماغ گرم ہے' اس پر ہی کر لوں۔"

ضمیر بھائی نے روہانسے انداز میں پلیٹ میز پر پٹخی تو عینک پھر کھسک کر نیچے آگئی۔ جسے انہوں نے کنڈی لگانے کے انداز میں اوپر کیا۔

"دھیان سے ضمیر بھائی' پلیٹ ٹوٹ گئی تو چینا آپی پورا سیٹ خریدنے نکل پڑیں گی۔"

"علی تم چینا اور ضمیر کی باتوں میں چپ رہو۔"

"ہاں کوئی چمچہ تھوڑی ٹوٹے گا' جو تمہیں اپنی برادری کی فکر ہو رہی ہو۔" خالہ نے سامنے سے وار کیا مگر ضمیر بھائی کے بولنے سے علی کو خاموش رہنا پڑا کہ ضمیر بھائی کی حالت زیادہ سیریز معلوم ہوئی تھی۔

"واہ چینا' تمہیں پلیٹوں چمچوں کی تو پروا ہے' مگر میری نہیں ہے۔"

"اس لیے نا ضمیر کہ پلیٹوں اور چمچوں کو تو چینا جب چاہے اٹھا کر پھینک سکتی ہے۔" علی فوراً" ہی چینا کی بات کا مفہوم سمجھ کر مسکرانے لگا تھا تب ضمیر بھائی نے اسے یوں دیکھا جیسے مچھلی پانی سے منہ نکال کر سانس لیتی ہے۔ اور سگریٹ مسلنے کے انداز میں پاؤں رگڑنے لگے۔

"ضمیر تمہیں کچھ برا تو نہیں لگا؟ یا چینا نے کچھ غلط کہہ دیا؟" ضمیر بھائی کی خاموشی سے چینا کو احساس ہوا تھا کہ کچھ غلط کر بیٹھی ہے اور تب ضمیر بھائی نے جن نظروں سے چینا کو دیکھا وہ اسے دیکھتے ہوئے کم اور دکھتے ہوئے زیادہ محسوس ہوئے۔

"میں تو حوالدار صاحب کے بارے میں بتانے آیا تھا مگر۔" ضمیر بھائی نے پاکستانی روپے کی طرح بار بار گرتی عینک اتار کر اب ہاتھ میں پکڑی اور ایک لعزتی نظران تینوں پر ڈالنے کے بعد مڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ ان کے قدموں کی تھکان بتاتی تھی کہ انہوں نے اپنی شادی شدہ زندگی سے یہ سبق سیکھا ہے کہ کبھی بھی بیویوں کو سبق سکھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

"علی۔ یہ ضمیر حوالدار صاحب کی کیا بات بتانے آیا تھا؟" خالہ نے لقمے میں سالن یوں ڈالا جیسے بیلچے میں سیمنٹ ڈال رہی ہوں۔ یہ ان کا ذاتی طریقہ تھا البتہ چینا ہمیشہ روٹی کا نوالہ توڑ کر اسے سموسے کی شکل میں دائیں بائیں اور آگے سے لپٹ کر سالن سے متعارف کرواتی۔ جبکہ علی کا طریقہ واردات سب سے مختلف تھا وہ نوالے سے سالن کو یوں ڈھانپ کر اٹھاتا جیسے پولیس ایک دم چوروں پر چادر ڈالتی ہے۔

"میں حوالدار ہوں؟" علی نے خالہ کو نوالہ منہ میں ڈال کر بے یقینی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں' تم تو حوالدار نہیں ہو۔"

"میں ضمیر بھائی ہوں؟"

"بالکل بھی نہیں۔ تم تو علی ہو۔"

"تو پھر مجھے کیا پتا خالہ' ان سے جا کر پوچھو نا۔" علی کی طرف سے بیزاریت کا بھرپور مظاہرہ دیکھنے کے بعد اب خالہ چینا کی طرف متوجہ ہوئیں جو ہتھیلی پر ایسے چہرہ ٹکائے ہوئے تھیں کہ لگتا چہرہ جان بوجھ کر ہتھیلی پر رکھا نہیں گیا بلکہ مکمل اتار کر ہی رکھ دیا ہے' بے سدھ' بے جان!

"چینا یہ ضمیر ہمیں حوالدار کی کیا بات بتانے آیا تھا؟"

"چینا کو کیا پتا خالہ' چینا کوئی نجومی ہے کیا؟"

"ویسے آپی' آج تو ضمیر بھائی آپ کے شوہر کم اور اتحادی زیادہ لگ رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" چینا کو مختلف ویب سائٹس کی ٹرمز اینڈ کنڈیشنز کی طرح اس کی بات بالکل بھی پلے نہیں پڑی تھی اسی لیے نا سمجھی سے دیکھا۔

"مطلب یہ پیاری آپی کہ شوہروں کی کیا اوقات' اس طرح تو حکومت اپنے اتحادیوں کے ناراض ہو جانے سے اپ سیٹ ہو جاتی ہے؟"

"چینا نے ضمیر کی بات نہیں سنی۔" چینا کے لفظوں سے افسوس پان فروش کے منہ کی پھوار کی طرح برس رہا تھا۔

"خیر ہے چینا' آج کل تو ویسے بھی کوئی ضمیر کی نہیں سنتا۔"

"نہیں خالہ' چینا کو بہت دکھ ہو رہا ہے۔"

"ارے اتنا ہی دکھ ہو رہا ہے تو جاؤ جا کر منالو۔" خالہ نے پکوڑوں کے ساتھ چٹنی کی طرح مفت مشورہ دیا۔ تو چندا چونکی کہ خود اس کو یہ خیال پہلے کیوں نہ آیا اور یہ بات تو وہ مانتی تھی کہ ضمیر ایک اچھا شوہر ہے اور ہر آدمی اتنا برا بھی نہیں ہوتا جتنا اس کی بیوی اسے سمجھتی ہے اور اچھا بھی نہیں ہوتا جتنا اس کی ماں اسے سمجھتی ہے۔ اسی لیے اسے ماں اور بیوی کی درمیانی نظروں سے دیکھتے ہوئے منانے کے طریقوں پر غور کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

ابا اپنے بیڈ پر چپ چاپ گم سم ٹیلیفون پر ہونے والی مدھر بات چیت یاد کر رہے تھے کہ چندا ان کے کمرے میں آئی اور انہیں یوں خاموش دیکھ کر گھبرا گئی۔

"ابا کیا بات ہے' کیا ہو رہا ہے' آپ کے دانت میں درد؟"

"درد؟" وہ چونکے۔

"کیوں پتری' میں نے کوئی دوائی شوائی تے نئیں مانگی۔"

"نہیں وہ دراصل آپ بیٹھے ہیں نا اتنے چپ چاپ۔ اس لیے پوچھا۔" ابا کی سوچ جتنے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ ان کے بیڈ پر ہی ایک کونے میں یوں بیٹھی کہ اگر بیڈ کو پاکستان کا نقشہ تصور کیا جاتا تو وہ کشمیر قرار پاتی۔

"نہیں۔ چپ تے نئیں تھا' بس ایویں ای اسے یاد کر رہا تھا۔" ابا کے ٹھنڈی آہ بھرنے پر وہ بے ساختہ ناک پر ہاتھ رکھنے پر مجبور ہوئی۔ اور پھر خود بھی اداس ہو گئی۔

"ہاں ابا۔ میں بھی اماں کو کرتی ہوں بہت یاد۔"

"اوہو پر میں تے تیری ماں کو بالکل یاد نئیں کر رہا تھا۔" وہ بدمزا ہوئے۔

"تو پھر کر رہے ہیں کس کی ماں کو یاد؟" اس کی یہ بے تکلفی کو ابا کو بالکل نہیں بھائی تھی جب ہی چہرے پر ٹریفک کی وہ بتی نظر آنے لگی جو ہر گاڑی کو وہیں رک جانے کا اشارہ دیتی ہے۔

"وہ ابا میرا مطلب تھا کہ آپ کر رہے ہیں اپنی اماں کو یاد؟"

"نئیں نئیں چپ کر' مجھے ایویں ای جذباتی کرنے کی کوشش ناں کر۔" انہوں نے بیٹھے بٹھائے یوں پہلو بدلا جیسے توے پر روٹی کی سائیڈ بدلی گئی ہو۔۔۔ مکمل!۔

"اوہو تو پھر کیوں ہیں اتنے چپ؟"

"او پتری میں تے اپنی چیک بک کو یاد کر رہا تھا۔"

اصل بات کو ٹیکس کی طرح چھپا کر انہوں نے جواب دیا تو چندا کو کچھ سکون ملا۔

"فکر نہ کریں ابا۔ مل جائے گی ضرور ایک دن۔"

"اتنا یقین؟ کیوں تیرے نال اس کا سٹہ لگا ہوا ہے؟" ابا کو حیرت ہوئی تھی۔

"دراصل کیس چلا گیا ہے نا پولیس کے پاس اس لیے۔" لاپروائی سے کہتے ہوئے وہ اٹھی اور سامنے رکھے ڈریسنگ ٹیبل کی سامنے جا کھڑی ہوئی جہاں آئینے پر ابا نے کپڑا ڈالا ہوا تھا۔ اس نے کپڑا ایک طرف اٹھایا اور ہیئر برش پکڑا ہی تھا کہ ابا دوڑتے ہوئے آئے۔

"او پتری' اے کی کرنے لگی ہیں؟"

"بس ذرا ٹھیک کر رہی تھی بال۔"

"کیوں' ابھی کمرے میں ہنھیری آئی تھی؟" ابا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسی محکمہ اور مینہ ہنھیری (آندھی) میں چندا کو بھی اڑا دیں جس نے شیشے کو بے لباس کر دیا تھا۔

"ویسے ہی ابا یہاں کھڑی تھی سوچا کر لوں اپنے بال ٹھیک۔" چندا نے منہ بسورا تو ابا کا بھی چہرے کے زاویے بگڑے اور تاثرات سے ایسا لگا جیسے کوئی تخت جان ڈبا کھول رہے ہوں' گردن کو جھٹکا دے کر انہوں نے دراز کھولا اور اس میں سے چند مرر نکال کر چندا کے سامنے رکھتے ہوئے بڑے آئینے کو ایک بار پھر پرانی دلہنوں کے چہرے کی طرح ڈھک دیا۔

"یہ پکڑ۔۔۔ تے اب اس فضول خرچی کی عادت کو

چھوڑو۔۔۔ ابا تیرا کب تک چیزیں سنبھالے۔"

"لیکن۔۔۔ میں نے کی ہے کون سی فضول خرچی؟"

"شاواشے پتری۔۔۔ اور تیرا چار انچ کا منہ تے اس شیشے میں وی نظر آجاتا ہے۔ فیر اینا وڈا ایمبرائیڈ کا شیشہ استعمال کرنا فضول خرچی نئیں؟"

اور تب چندا کو اپنے ابا کی ذہنیت پر ایک بار پھر ترس سا آنے لگا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ ابا کی اسی عادت نے انہیں انسان سے فرشتہ بننے سے بال بال بچایا ہوا ہے۔ اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے ابا نے بات کا موضوع بدلا۔

"اچھا چل چھوڑ ان باتوں کو۔۔۔ صبح اس حوالدار نے آنا ہے خاص خاص چیزیں چھپا دیں۔" چندا ایک تو پہلے ہی ان کی باتوں سے عاجز تھی یہ نیا حکم سنتے ہی جل ہی تو گئی۔

"اباوہ آرہے ہیں ہماری مدد کرنے اور آپ کر رہے ہیں ان پر شک۔"

"بس ٹھیک ہے نہ کریں، خوش۔" ابا نے بادل ناخواستہ کہا تو چندا کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"میں آپ ہی کروں گا سب کش۔" آہستگی سے کہہ کر انہوں نے ایک بار پھر پہلے اطمینان بخش نظروں سے برقعہ پوش آئینے کی طرف دیکھا اور پھر چھوٹے آئینے کو اخبار میں لپیٹ کر دراز میں رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ بھی دن تھے دل کہتا تھا یوں آرادونلی مائن
سارا سارا دن کرتے تھے اک دوجے کو جوائن
ہوئے نکاح نامے پر جھٹ پٹ پھر دونوں کے سائن
کچھ عرصہ تو گزرا کتنے ایوری تھنگ از فائن
پھر اپنی اس پریم کہانی پر آیا ڈیڈ لائن
اب وہ مجھ کو جن کہتی ہے اور میں اس کو ڈائن

چینا اپنے کمرے میں آئی تو ضمیر بھائی منہ لٹکائے بیٹھے تھے، ناراضی کا عالم یہ تھا کہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کے باوجود آواز پر سر تک اٹھانا گوارا کیا اور نہ ہی تنہائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چینا کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے رومانٹک ہونے کی کوشش کی، ورنہ تو بے چارے موقعے کی تلاش میں ہی رہتے، مگر جب تک علی اور خصوصاً" خالہ سو نہ جاتیں، وہ چینا کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی خود کو ایک ٹانگ پر کھڑا ہی محسوس کرتے اور مکمل اطمینان بھری مسکراہٹ اور شوخیاں خالہ کے دریائے ٹیمز کو مات دیتے خراٹوں کی آواز کے ساتھ ہی ابھرتیں۔ سیدھے سادھے ضمیر بھائی جب اپنی عینک اتار کر چینا سے آنکھیں چار کرتے ہوئے اظہار محبت کرتے تو چینا کو لگتا یہ منت آمیز لہجے میں وہ اس سے جوابی محبت نہیں بلکہ فاتحہ کی ٹافیاں مانگ رہے ہیں۔ اسے لگتا ضمیر بھائی نے پانچ سال کو ایجوکیشن میں رہ کر ڈاکٹری نہیں پڑھی بلکہ چائے پینے کے بہانے کینٹین میں ٹیبل پر رکھی کسی کی ڈگری اٹھا لائے ہیں۔ کیوں کہ یہ تو چینا کو پتا تھا کہ آج کل کی نسل یونیورسٹی سے اور کچھ حاصل کرے نہ کرے اظہار محبت کے ایک سو ایک طریقے ضرور سیکھ کر نکلتی ہے۔ اسی لیے تو ہر ایک سے ہر دو دن بعد سچا پیار ہو جانے کی صورت میں محبت کا اظہار ایسے کرتے ہیں جیسے لڑکیاں گھر کے کام کاج کرتی ہیں۔۔۔ روانی سے اپنی عادت سمجھ کر!

چینا نے انہیں یوں ابھی تک سر جھکائے دیکھا تو مخاطب کرنے کے بجائے سب سے پہلے اپنے موبائل پر ہی ایک خوب صورت اور محبت بھرا کلاسیک نغمہ لگایا جس کے نتیجے میں اسے یقین تھا کہ ضمیر بھائی ضرور اس کی طرف متوجہ ہوں گے مگر پورا ایک بول سننے کے بعد بھی جب چینا نے ان کی آنکھوں میں پیار کو سیلابی پانی میں گاڑیوں کی طرح ہلکورے لیتا نہ دیکھا تو ہلکی ہلکی آواز میں خود بھی گنگنانے کے ساتھ ساتھ بال کھول کر ہلکا ہلکا سا میک اپ کرنے لگی، چیزوں کو رکھنے اور اٹھانے کی آوازیں وہ جان بوجھ کر انہیں متوجہ کرنے کے لیے پیدا کر رہی تھی تاکہ کسی طریقے اسے سوری نہ کہنا پڑے اور وہ خود ہی دل اور جذبات کے ہاتھوں

اس کی طرف کھنچے چلے آئیں' لیکن جب گانے کے آخری بول کے شروع ہونے تک بھی وہ اسی طرح بیٹھے رہے تو چینا کو احساس ہوا کہ اس دفعہ ناراضی کچھ زیادہ ہی سخت قسم کی ہے ورنہ تو ضمیر بھائی ناراض ہوتے تو تھے مگر ناراض رہتے نہیں تھے کیوں کہ ان کا شمار دنیا کے عقل مند مردوں میں ہوتا تھا جو اپنی ساری کمائی بیوی کی ہتھیلی پر لا کر رکھتے اور پھر بیوی سے اپنا جیب خرچ طلب کیا کرتے اور اس کے دیے ہوئے جیب خرچ میں ہی گزارا کرتے' ایسی صورت حال میں بھلا ناراضی کا سوال کیسے پیدا ہوتا یہ الگ بات ہے کہ کچھ "پوشیدہ" زن مرید حضرات ایسے عقل مند شوہروں کو عقل بند کہہ کر اپنا غم غلط کیا کرتے۔

اور بالآخر چینا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا' ہلکے ہلکے میک اپ' بالوں کو خوب صورت و دلکش انداز میں کھولنے' مسحور کن میوزک کے بعد آخری کوشش کے طور پر اس نے ضمیر کے پسندیدہ پرفیوم کا اسپرے اس شدت سے کیا جیسے محکمہ زراعت کے اہلکار ٹڈی مار اسپرے کرتے ہیں' مگر اس کے باوجود ضمیر بھائی جس طرح پہلے اس کی مخالف سمت میں سر جھکا کر بیٹھے تھے ویسے ہی بیٹھے رہے تو زندگی میں پہلی مرتبہ چینا نے سوچا کہ آخر غلطی چونکہ اس کی تھی اس لیے اسے ہی بات چیت میں پہل کرنی چاہیے اور یا تو وہ پہلے ضمیر سے بحث کرے کہ غلطی تو اس کی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ سوری کر رہی ہے اور یا پھر وہ سارا ملبہ ضمیر پر ڈال کر اسے ناراض کرے اور تازہ تازہ سوری کرے کہ اتنی دیر سے سر جھکا کر بیٹھا ناراض ناراض سا ضمیر کو دیکھ چینا کو کچھ اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا جب ہی بڑی ادائے دلبرانہ کے ساتھ خود کو نازک اندام حسینہ خیال کرتے ہوئے بڑی ہی محبت سے آنکھوں کو خمار آلود بنا کر ہونٹوں کو دو سالہ بچی کی "پونی" کی شکل دینے کے بعد انگلیوں میں پیار کی کھجلی بھری اور ضمیر کے بالوں میں پھیرنے لگی اس وقت وہ صوفے پر بیٹھے ضمیر کے اس قدر قریب کھڑی تھی کہ لگتا وہ کوئی سرکاری عمارت اور ضمیر دھرنا دیے بیٹھے مظاہرین میں سے ایک ہیں۔

اور اس وقت چینا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ضمیر بھائی کا سر ایک جھٹکے سے نیچے گرا اور پھر وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے اپنے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پائے گئے۔

"ضمیر۔ تم سو رہے تھے؟" چینا جو اتنی دیر سے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے حربے آزما رہی تھی۔ اس کی سابقہ خوابیدہ حالت کا پتا چلنے پر سخت غصے میں تھی جبکہ ضمیر بھائی کمرے میں پھیلی مسحور کن خوشبو' میک اپ سے کھلے چہرے اور بریک ٹائم میں بکھرے اسکول کے بچوں کی طرح کے بالوں کو دیکھتے ہوئے اس سے پہلے کہ بے وقت رومانٹک ہونے کی کوشش کرتے' چینا نے پھر تصدیق چاہی۔

"ضمیر۔ اس سے پہلے کہ چینا کے دل کا دماغ خراب ہو جائے فوراً" بتاؤ کہ تم سو رہے تھے نا؟"

"ہاں۔ وہ۔ دراصل آنکھ لگ گئی۔ تھی میری۔" انہوں نے بمشکل خود کو رومانٹک ہونے سے روکتے ہوئے چینا کے مزاج کے مطابق جواب دیا۔

ویسے بھی کامیاب ازدواجی زندگی کا بہترین اصول چینا کی نظر میں یہ تھا کہ بیوی کے موڈ کو دیکھ کر بات کی جائے اور ان تمام باتوں سے پرہیز برتا جائے جن سے گھر کی رونق مدہم ہونے یعنی بیگم کے موڈ خراب ہونے کا خدشہ ہو۔

"یعنی تم واقعی۔" چینا کو اتنی دیر کی جانے والی جدوجہد کے ضائع ہونے کا دکھ تھا۔

"ہاں۔ میں ذرا۔"

"چپ ہو جاؤ ضمیر۔ چپ ہو جاؤ' کاش چینا تمہیں سویا ہوا نصیب کہہ سکتی۔" وہ واپس جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ ضمیر بھائی جھٹکے سے اٹھ کر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"آج کے بعد کبھی تمہیں بغیر بتائے یوں لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں سوؤں گا۔"

"خود سوچو۔ اگر چینا اس طرح اتنی دیر خاموش' سر جھکا کر بیٹھتی تو تم کیا کرتے؟"

چاہیے۔"

جبکہ دوسری طرف ابا سمجھ چکے تھے کہ اگر اب بھی پیسے ارسال نہ کیے گئے تو معاملہ بگڑ سکتا ہے جب ہی پرسوچ انداز میں یہاں وہاں ٹہلنے لگے۔

☼ ☼ ☼

غیبت اور مونگ پھلی دو ایسی چیزیں ہیں جنہیں شروع کردو تو سمجھ ہی نہیں آتا کہ ختم کہاں پر کب اور کیسے کریں اور خصوصاً" غیبت میں تو (اللہ معاف کرے) وہ خوشی محسوس ہوتی ہے جو پرانے کپڑوں کی جیب سے اچانک ہزار کا نوٹ ملنے پر بھی نہیں ہوتی ہوگی ایسا ہلکا پھلکا پن لگنے لگتا ہے کہ کیا مثال اور جس بندے کو شریک غیبت کیا گیا ہو وہی اس وقت سب سے قریبی اور مخلص رشتے دار لگنے لگتا ہے۔ وہ بھی اس دور میں جب لوگ معمولی بات پر صدیوں پرانا رشتہ توڑ دیتے ہیں اور گلی محلے میں بچے تک تالیاں بجا کر اعلان کرتے نظر آتے ہیں کہ "مونگ پھلی میں دانہ نہیں ہم تمہارے نانا نہیں" اب کوئی پوچھے کہ بھلا نانا نے بچوں کو وزیر اطلاعات کیوں رکھا خود ہی بتا دیتے' لیکن اس طرح جو بات کئی اشخاص کے منہ اور کانوں سے ہوتی ہوئی پہنچے وہ زیادہ طویل' دلچسپ اور چٹخارے دار ہوتی ہے اور اس وقت چینا اور خالہ بھی کچن میں کھڑی جب اسی طرح کے چٹخارے لیتی کچھ تھک سی گئیں تو اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھنے لگیں' لیکن ایک دم سے ہی خالہ کو جو اپنے پاؤں کے ساتھ کاکروچ نظر آیا تو چیخنے کے ساتھ یوں اچھلنے لگیں جیسے ٹی ٹوئنٹی میں چھکا لگا ہو۔ ان کے چیخنے کی آواز کانوں میں پڑتی ہی چینا بھی وہیں پاؤں جما کر آنکھیں بند کیے چیخنے لگی یہی نہیں بلکہ سیڑھیوں سے نیچے آتی چندا بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئی اظہار یکجہتی کی اس مثال نے علی اور ضمیر بھائی کو بھی کمروں سے نکل باہر کیا اور اب وہ حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے پریشانی سے پہلے ایک دوجے کی طرف متوجہ ہوئے پھر علی چندا کو خلاف توقع وہاں دیکھ کر بولا۔

"تم یہاں ہمارے پورشن میں؟ اور اس وقت؟ چیخ کیوں رہی تھیں؟"

"پتا نہیں کیوں چیخ رہی تھی میں؟ شاید دیکھ کر ان دونوں کو۔" دونوں ہاتھ منہ سے ہٹا کر وہ بولی۔

"نہیں پتا؟ کیوں تم آٹو میٹک ہو جو خود ہی چیخنے لگیں؟"

"چینا تمہیں کیا ہوا ہے؟" ضمیر بھائی نے آنکھوں میں سرمے کی طرح غصہ بھر کر پوچھا مگر چینا انہیں یقینی طور پر گھر داماد خیال کر چکی تھی اسی لیے اہمیت نہ دیتے ہوئے کندھے اچکا دیے۔

"چینا کو تو کچھ نہیں ہوا' چینا تو بس خالہ کو دیکھ کر اس لیے چیخی کہ وہ خود کو اکیلا نہ سمجھیں۔"

"اوہو تو خالہ بتا بھی دو آخر ہوا کیا تھا؟" ضمیر بھائی زچ ہوگئے تھے۔

"وہ... دراصل نا کچن میں کاکروچ تھا۔" خالہ نے لالٹین کی طرح منہ لٹکایا۔

"ویسے میں ڈرتی تو نہیں ہوں مگر پتا نہیں کیوں... چیخیں نہیں رکتیں۔"

"میرے ابا کہتے ہیں کہ کاکروچ ہوتے ہیں اپنے قوم کے سیاستدان۔" خالہ کے چپ ہونے پر چندا نے بات شروع کی تو سب کے چہرے حیرت سے سکڑ سے گئے۔

"ماننے والی بات ہے... سیاستدان ہی ہوں گے تب ہی تو رات کے اندھیرے میں نکلتے ہیں اور خون تو ان کا ہوتا ہی سفید ہے۔" علی نے فوراً" سے چندا کی بات پر تسلیم کی مہر لگائی تو چینا کو اس کا انداز کچھ اچھا نہ لگا۔ "یعنی تمہارے ابا بھی کبھی عید شب برات پر صحیح بات کر لیتے ہیں۔"

"ہاں... اس کے ابا تو ہمیشہ صحیح بات ہی کرتے ہیں۔" علی نے چاہا کہ آج چینا خاموش رہے مگر اس کا نام چینا تھا جو اس وقت علی کا جلیبی کی رال بنتا بالکل برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔

"اچھا ایک بات بتاؤ چندا' کیا تمہارے ابا کو آج بھی چیزیں چوری ہونے کا دورہ پڑا ہے؟"

"میں تو فورا" سے پہلے تمہاری نبض چیک کرتا کہ چینا اور وہ بھی سر جھکائے اور پھر خاموش ہے...!" ضمیر بھائی نے پیشہ ورانہ جواب دیا تو چینا ان کی ذہانت پر واری صدقے ہونے لگی۔

"کاش چینا تمہیں مائی جانو کہہ سکتی۔"

کہہ دو جو بھی من میں آئے۔

ایسا نہ ہو خامشی میں۔

سننے والا بھی کھو جائے۔" ضمیر بھائی کے گانے کا انداز ایسا تھا کہ چینا ان کے گانے سے زیادہ گا کر دکھانے پر زیادہ فدا ہو رہی تھی اور خود کو دنیا کی خوش نصیب بیوی تصور کر رہی تھی۔ ویسے بھی اگر میاں بیوی دونوں ہی عقل سے پیدل ہوں تو زندگی کی گاڑی بہت سکون سے منزل مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔ مسئلہ کھڑا ہوتا ہے تب، جب دونوں میں سے کسی ایک کی عقل ہوش میں آنے لگے۔

☼ ☼ ☼

کون کہتا ہے کہ خون صرف مچھر چوستے ہیں حالانکہ یہ خوبی تو منگائی کے علاوہ کچھ رشتے داروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ رشتے داروں کی وہی نایاب قسم ہوتی ہے جو ہر اچھی بات میں سے بھی کوئی نہ کوئی منفی پہلو ڈھونڈ لینے کے ایسے ماہر ہوتے ہیں جیسے صاف چنے ہوئے چالوں میں سے کنکر نکال لانے والے، کوئی ایسا شخص جو غلطی سے آپ کی تعریف ان کی موجودگی میں کردے تو وہاں یہ رشتے دار کے بجائے آپ کی خامیوں کے اشتہار کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں اور کچھ اس طریقے سے ظاہر ہوتے ہیں کہ بھول چوک سے تعریف کردینے والا بندہ اپنی ہی لفظوں کو اس نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے ولن ہیروئن کو دیکھتا ہے۔ سو علی نے بھی آج اپنا ان ہی رشتے داروں جو ساتھ والے کمرے میں ہونے کی وجہ سے اس کے قریبی رشتے داروں میں شامل تھے کی وجہ سے ابا سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی نسوانی آواز میں چیختی یہ خفگی فون کے اس پار اور اس کے کمرے کی چھت کو اپنا فرش بنائے ابا نے بھی محسوس کرلیا اور بولے۔

"سرکار اج تے کش نراض لگ رہے ہو... خیر تے ہے نا؟"

"خیر...؟ آج تک فون میں ایک کارڈ تک تو ڈلوا کر نہیں دیا اور وعدہ کیا تھا مالی امداد کا' ہونہہ۔" علی کا خیال تھا (جو کہ خام خیال تھا) کہ ابا اس کی باتوں میں آجائیں گے' مگر دوسری طرف بھی ابا تھے۔ بڑی معصومیت سے بولے۔

"فون وچ کارڈ وی ڈلتا ہے؟"

"نہیں پانی ڈلتا ہے۔" علی نے جل کر کہا۔

"او نہ جی مذاق نہ کرو۔" ابا نے ہولناک سا قہقہہ لگا کر علی کے تاثرات دردناک کردیے۔

"مذاق تو آپ نے بنالیا ہے میرے بھائی کی زندگی

گا۔" علی کے لہجے اور انداز میں "شوہرانہ ٹچ" نمایاں تھا۔

"لوگ ہاتھوں میں نوٹ لیے کھڑے ہیں، لیکن میں آپ کے انتظار میں ہوں۔" علی کی یہ بات سن کر ابا تھالی کے بینگن کی طرح یہاں وہاں لڑھکتے پائے گئے۔

"ہائے اوئے' کی کہہ دتا ای" ابا عمر کے جس دور سے گزر رہے تھے اس میں صنف مخالف کی طرف سے یوں توجہ ملنا ہی دل میں تھرتھلی مچا دیتا ہے سو ابا کے دل میں ہوتی گدگدیاں بھی حقیقی ہی تھیں۔

"بس فیر میں آپ کو کش دن میں پیسے پہنچاتا ہوں۔۔۔ یہ میں نے آپ کو زبان دی۔"

"کیا یہ ایک مرد کی زبان ہے؟" علی نے آواز کو مزید لچکایا تو ابا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے سامنے اپنا آپ گروی رکھ آئیں۔

"مرد کی زبان؟" چند لمحے رک کر انہوں نے یقین دہانی کی، پھر بولے۔

"آہو۔۔۔ شک تے مجھے وی پی ہے۔" بس آخری چانس دیتے ہوئے علی نے فون کھٹاک سے بند کیا اور بالوں میں انگلیاں پھنسا کر خود کلام ہوا۔

"توبہ توبہ چلو ہمارا تو حق بنتا ہے کہ عمر ایسی ہے مگر کم از کم اس عمر میں بندے کو اتنا بھی ٹھرکی نہیں ہونا

"وہ ابا ہیں میرے اور بڑے ہیں آپ سے۔" چندا کو برا لگا تھا۔

"ارے تو چینا نے کب کہا کہ وہ تمہاری اماں ہیں اور وہ بھی اس سے چھوٹی۔" خالہ بھی میدان میں اتریں۔

"ویسے تمہارے ابا کی عمر کیا ہے؟" چندا کو واپس جاتے دیکھ کر ضمیر بھائی نے سوال کیا۔

"وہی جو میری ہے۔"

"یعنی تم اور تمہارے ابا دونوں جڑواں ہو؟" ضمیر بھائی نے حیرت کے سمندر میں گرنے سے خود کو بمشکل روکا اسی دوران چندا نے بھی وضاحت کی۔

"دراصل جس دن میں ہوئی تھی پیدا، اسی دن تو وہ بنے تھے ابا۔" چندا کی بات کو علی مکمل طریقے سے سمجھ گیا تھا۔

"یعنی تمہارے دادا کے بیٹے، اماں کے شوہر اور ابا کی عمریں الگ الگ ہیں؟"

"علی۔۔۔؟" چندا نے اسے سکتے کے سے انداز میں دیکھا اور پھر مسکرانے لگی۔

"ویسے لگتا نہیں ہے کہ تم اتنے ذہین ہو۔" علی کو لگا جیسے اسی بات سے چندا کے ذہن میں تبدیلی آ نہیں رہی تھی بلکہ تبدیلی آ گئی تھی۔

"اچھا ویسے دادا کے بیٹے، اماں کے شوہر اور تمہارے ابا میں سے بڑا کون ہے؟" خالہ نے یہاں وہاں دیکھ کر تفتیشی انداز میں پوچھا تو اس کی جگہ چینا بول پڑی۔

"دادا کے بیٹے ہے نا۔"

"جی ہاں، کیوں کہ میری دادی کو نہیں پسند تھی کچی چیزیں، اس لیے بیٹے کی شادی بھی بڑی ہی پکی عمر میں کی۔"

"جن مردوں کی شادیاں اتنی پکی عمر میں ہوئی ہوں وہ بڑے بڑے اتنے پک چکے ہوتے ہیں کہ شادی کے بعد پڑے پڑے سڑنے لگتے ہیں۔" چینا نے بھڑاس نکالی تو خالہ کو زبردستی ہی شرم آ گئی۔

"بس اسی لیے تو میں بھی شادی نہیں کر رہی۔"

"ارے خالہ۔۔۔ شادی کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔" ضمیر بھائی نے دزدیدہ نظروں سے چینا کو دیکھا اور مخاطب خالہ کو کیا۔

"بچوں کا کھیل نہیں ہے اسی لیے تو شادی نہیں کر رہی بلکہ اپنے بڑے ہونے کا انتظار کر رہی ہوں۔" خالہ نے اب تک خود کو بچہ کہا اور سمجھا تو وہ سب رات کے اس پہر یہ صدمہ نہ جھیلتے ہوئے چپ سے ہو گئے اور اپنے اپنے کمروں میں جاتے ہوئے وہ چندا سے یہ تو پوچھنا بھول ہی گئے تھے کہ رات کے اس پہر وہ نیچے ان کے پورشن میں کیوں آئی تھی اور ان کے اپنے اپنے کمروں میں جانے کے بعد بھی وہیں کیوں کھڑی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

نازیہ جمال

جو دل جانے

"تم نے بچی دلشاد کو دیکھا ہے؟"

سعدیہ نے سلاد کے لیے ٹماٹر کاٹتے ہوئے ماریہ سے پوچھا جو تیزی سے بریانی کا مسالا تیار کرنے میں جتی ہوئی تھی۔

"ہاں دیکھا ہے' کئی بار دیکھا ہے۔ بلکہ بچپن سے انہیں دیکھتی آرہی ہوں۔" ماریہ نے اثبات میں سرہلا کر سادگی سے جواب دیا۔

"افوہ!" سعدیہ ذرا سا جھنجلائی۔

"میں اس دفعہ کی بات کررہی ہوں۔ تم نے دیکھا کہ کتنی میٹھی اور خوش اخلاق بنی ہوئی ہیں۔ مجھے شہزادی' تمہیں رانی کہا اور تو اور رابعہ باجی کو تو لگاتار پندرہ منٹ چومتی رہیں۔"

"ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ واقعی اس بار بدلی بدلی سی لگ رہی ہیں۔ لہجے کی کرختگی' چہرے کی تیوریاں سب غائب۔۔۔ اور ثوبیہ کو دیکھا' کتنی خوش باش اور فرینڈلی سی ہو کر اس بار ملی ہے۔" بھگوئے گئے چاولوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے ماریہ تعجب سے بولی۔

"ہاں پہلے تو محترمہ بات تک کرنا گوارا نہ کرتی تھیں' اتنے کروفر سے بات کرتی ہے کہ گویا کسی سلطنت کی ملکہ ہو۔" سعدیہ نے ناک سکوڑ کر کہا۔ سلاد بن چکا تھا۔ وہ سنک میں ہاتھ دھونے لگی۔

"کھانا تیار ہے تو امی کہہ رہی ہیں کہ دستر خوان لگادو۔ میں امی کی دو روٹیاں پکالیتی ہوں۔"

اسی دم رابعہ کچن میں داخل ہوئی۔ وہ ابھی ابھی مغرب کی نماز پڑھ کر آرہی تھی۔ اچھی طرح لپٹے دوپٹے کے ہالے میں سانولے چہرے سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

"جی باجی تقریباً تیار ہے۔" کھولتے پانی کی دیگچی میں چاول ڈالتے ہوئے ماریہ نے جواب دیا۔

اگلے پندرہ منٹوں میں تینوں بہنوں نے مل کر دستر خوان سجادیا۔

"ارے بھئی ساجدہ! اتنا اہتمام کیوں کرلیا۔ ہم کوئی مہمان تھوڑی ہیں۔ میرے دیور کا گھر ہے' دال روٹی غنیمت ہے۔" بریانی کا بڑا سا چمچہ منہ میں منتقل کرتے ہوئے دلشاد بولیں۔

"ارے نہیں بھابھی' اہتمام کیسا' بس روز کا کھانا ہے' ویسے بھی آپ کافی عرصہ بعد آئی ہیں تو بہت خوشی ہورہی ہے۔" ساجدہ دھیما سا مسکراتے ہوئے انکساری سے بولیں۔

"اور ثوبیہ بیٹا! تم اچھی طرح لونا۔ تکلف نہیں کرنا۔" وہ ثوبیہ سے مخاطب ہوئیں۔ جو کافی نزاکت سے کھانا کھارہی تھی۔

"ارے چاچی! تکلف کیسا۔ خوب ڈٹ کر کھارہی ہوں۔" ثوبیہ خوش دلی سے بولی۔

"اگر رابعہ باجی نے کھانا بنایا ہے تو پھر مزے ہیں ہمارے ساری زندگی' ایسے لذیذ اور مزے دار کھانے کھاتے رہیں گے۔" ثوبیہ' رابعہ کو دیکھتے ہوئے شوخی سے بولی تو رابعہ کا پہلے سے جھکا سر مزید جھک گیا تھا۔ البتہ ماریہ اور سعدیہ نے جھٹکے سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ دونوں کے چہرے پہ الجھن اور ناسمجھی کا تاثر تھا۔

"ارے میری بخت آور بچی تو دسوں انگلیاں دسوں چراغ ہے۔ کیا کھانا پکانا' کیا سینا پرونا۔" دلشاد نے محبت لٹاتی رابعہ کو دیکھا جو اب برتن سمیٹ رہی تھی۔

"سنا ہے کہ غیر متوقع خوشی بندے کی جان لے لیتی ہے۔ دیکھا ہے کہ بہت زیادہ غم بھی سانسوں کی ڈور کاٹ دیتا ہے مگر بہت زیادہ بے یقینی بھی جان لیوا ہوسکتی ہے' یہ میں اپنے بارے میں کہہ رہی ہوں۔" کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آکر سعدیہ مسلسل چکراتے ہوئے بول رہی تھی۔

"تم اپنی موت کی پیش گوئی بند کرو۔ اور سیدھے سیدھے امی سے پوچھ لو کہ چاچی اور ثوبیہ ہمیں حیران کرنے پہ کیوں تلی ہوئی ہیں۔" ماریہ نے کمبل جھٹک کر پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔

"ماریہ! بھابھی کا بستر سیٹ کردو۔ اور دیکھنا کوئی چیز کم نہ ہو۔" ساجدہ نے اندر جھانک کر ماریہ کو مخاطب کیا۔

"امی! یہ سب کیا ہے؟ چاچی اتنا سب کچھ کس لیے

لائی ہیں۔ مٹھائی' پھل' دیسی گڑ' چاولوں کا آٹا' بیسن۔۔۔ نجانے کیا کیا' سچ ہے مجھ سے تو یہ سب کچھ ہضم نہیں ہو پا رہا ہے۔" سعدیہ دونوں ہاتھ حلفیہ انداز میں اوپر اٹھاتے ہوئے صاف گوئی سے بولی۔

"ہاں بیٹا! تمہاری بات ٹھیک ہے۔ بھابھی ہمیشہ ہمارے گھر خالی ہاتھ ہی آئی ہیں مگر اس دفعہ تو وہ بیٹے کی شادی کی تاریخ لینے آئی ہیں۔ تو خالی ہاتھ کیا اچھی لگتیں۔" ساجدہ سادگی سے بولیں۔

"امی!" ماریہ اور سعدیہ دونوں نے بھونچکا ہو کر ماں کو دیکھا۔

"یہ منیر اور رابعہ کی تاریخ طے کرنے آئی ہیں۔ مجھے تو اگلے مہینے کی کوئی بھی ڈیٹ مناسب لگتی ہے۔ آخر تیاری۔۔۔"

"امی! اٹ از امپاسبل" ماریہ ماں کی بات کاٹ کر چلائی تھی۔

"کہاں ہماری پڑھی لکھی بہن اور کہاں ان کا مڈل پاس گنوار بیٹا۔ کھیتوں میں پانی دینے والا۔ جس کے پاس کوئی ایک ڈگری بھی نہیں ہے۔ روزگار کے نام پر صرف چند ٹکڑے زمین کے۔" ماریہ کی آواز صدمے سے پھٹی پڑ رہی تھی۔

"جی امی! باجی ایسا رشتہ ڈیزرو نہیں کرتیں۔ ہمارے اور چاچی لوگوں کے ماحول' رہن سہن اور مزاجوں میں بہت فرق ہے۔" سعدیہ نے بھی بہن کے موقف کی تائید کی۔

"وہ لوگ گاؤں کی آب و ہوا میں پلے بڑھے ہیں۔ ان کی عادات' حتیٰ کہ بول چال سے بھی ان کے ماحول کی عکاسی ہوتی ہے۔ رابعہ باجی وہاں نہیں رہ پائیں گی۔"

"بیٹا! منیر تم لوگوں کا چچا زاد بھائی ہے' یہ رشتہ تمہارے ابو اور چچا نے جوڑا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان دونوں کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ہم ان کی زبان کا پاس نہ رکھیں' محض گاؤں' شہر کے فرق کو دیکھتے ہوئے برسوں پرانی طے کی ہوئی نسبت توڑ دیں۔" ساجدہ بیٹیوں سے ایسے شدید ردعمل کی توقع کر رہی تھیں سو تحمل سے انہیں قائل کرتے ہوئے بولیں۔

"چھ ماہ کی بچی کا رشتہ کرنا ہی قابل قبول نہیں ہے۔ اور اگر ہو بھی گیا ہے تو مرے ہوئے بزرگوں کے عہدوں کی پاسداری سے زیادہ بقید حیات انسانوں کا مستقبل' خوشیاں اور خواب زیادہ اہم ہوتے ہیں۔" ماریہ تقریباً" روہانسی ہو کر بولی۔

"تم لوگ خود بتاؤ اگر منیر کے لیے انکار کر دوں تو بھی رابعہ کے لیے کوئی متبادل رشتہ نہیں ہے وہ پچیس سے اوپر کی ہو چکی ہے' رنگ تم دونوں کی نسبت دبتا ہوا ہے' بالفرض اگر غیروں سے کوئی رشتہ آبھی جائے تو اس کی چھان پھٹک کون کرے گا؟ میں بیمار' کمزور عورت جس کی بیوگی کی چادر پہ جابجا درد کے پیوند لگے ہیں۔" ساجدہ کا لہجہ ایک دم سے بھر آگیا تھا۔ ماریہ اور سعدیہ دونوں کی آنکھوں میں پانی چمکنے لگا تھا۔

"میں مانتی ہوں منیر کم تعلیم یافتہ اور دیہی بودوباش میں پلا بڑھا نوجوان ہے مگر اپنے مرحوم باپ کے طے کیے رشتے کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ میری رابعہ کو ضرور خوش رکھے گا۔" ساجدہ افسردگی سے بولیں' پھر اٹھ کر باہر چل دیں۔

"رابعہ باجی! آپ خود امی سے اس رشتے سے انکار کریں۔ منیر بھائی آپ کے بالکل قابل نہیں ہیں۔" نائٹ کریم ہاتھوں پہ ملتے ہوئے ماریہ دوٹوک انداز میں بولی تھی۔

"تو اور کیا' آپ دھول مٹی سے اٹے ماحول میں کیسے رہ پائیں گی۔ چاچی کے گھر ہر وقت تو گائیں' بکریوں کا شور مچا رہتا ہے۔ اتنے غلیظ پر شور ماحول میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔" سعدیہ ناگواری سے کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔ اس کے ذہن میں کوئی لگ بھگ آٹھ برس قبل دیکھا چچی کا گھر یاد آگیا تھا۔ وہ لوگ رحیم چاچا کی وفات پر گاؤں گئے تھے۔ فوتگی کے افسردہ ماحول میں بھی اس نے اور ماریہ نے خوب انجوائے کیا تھا۔ گھر میں بندھی بکریوں کے چھوٹے چھوٹے معصوموں کو گود میں بھر کر خوب پیار کیا'

دھریک کے درخت سے بندھی پینگ پہ خوب جھولے کھائے' مرغی کے چوزوں کو ہاتھ میں لے کر ان کی نرماہٹ کو محسوس کیا' مگر بچپن کی ان تمام تفریحات سے قطع نظر اپنی بڑی بہن کو اس ماحول کا مستقل حصہ بنے ہوئے دیکھنا ان دونوں کے لیے تکلیف دہ تھا۔

"ہاں اب آپ خود ہی اپنے لیے اسٹینڈ لے سکتی ہیں۔ ورنہ امی تو ہمارے احتجاج کو کسی خاطر میں نہیں لارہی ہیں۔" ماریہ نے حوصلہ افزا انداز میں رابعہ کو مخاطب کیا' جس نے اس کی بات پہ لمحہ بھر بہن کا چہرہ دیکھا تھا پھر سر جھٹک کر بولی۔

"میں امی کو انکار نہیں کرسکتی۔ وہ میری ماں اور باپ کی جگہ پر ہیں' ان کا ہر فیصلہ مجھے دل و جان سے قبول ہے۔ ماں باپ کے فیصلوں میں خدا کی رضا بھی شامل ہوتی ہے۔" رابعہ اپنے اسی نرم اور پرسکون انداز میں بولی پھر غڑاپ سے کمبل میں گھس گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میرے پہلے پتر کا ویاہ ہے۔ گج وج کے بارات لاؤں گی۔" خوشی دلشاد کے لہجے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"بھابھی! بری کہاں سے بنوائیں گی؟ میرے خیال میں یہیں شہر سے خریداری کرلیں۔ وہاں گاؤں میں اچھی چیز کہاں سے ملتی ہے۔" شگفتہ نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"ارے نہیں پھپھو! میں خود ملتان سے شاپنگ کروں گی اپنی بھابھی کی۔" جواب ثوبیہ نے دیا جو پرائیویٹ ایف اے کرتے ہوئے پورے پنڈ میں "پڑھی لکھی کڑی" کے نام سے مشہور تھی۔

"اور ہاں ساجدہ!" دلشاد جاتے جاتے پلٹیں۔ "مہندی پہ میں اپنے سارے میکے والوں کو لاؤں گی' بہشتی رحیم کا کنبہ تو یہ دو بہن بھائی ہیں۔ میرا میکہ کافی بڑا اور ماشاء اللہ خوش اخلاق' نفیس اور ذرا مزاج دار ہے۔ اس لیے تم کھانا بنوانے میں ہاتھ تنگ بالکل نہ رکھنا۔" دلشاد کا انداز سمجھانے والا تھا۔

"جی بھابھی! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آپ کے بیٹے کی شادی ہے تو میرے بھی یوں سمجھیں بیٹے ہی کی شادی ہے۔ میری بیٹیاں' بیٹوں کی جگہ پر ہیں۔" ساجدہ نے انہیں مطمئن کیا تھا۔

دلشاد کا میکہ واقعی کافی بڑا تھا مگر نفیس اور باتمیز ہرگز نہیں۔۔۔! زرق برق پوشاکوں میں ملبوس اور ڈھیروں میک اپ تھوپے دیہاتی خواتین کھانے پہ یوں ٹوٹیں کہ الامان! ایک تو بڑی تعداد میں مہمان اور اوپر سے تمیز و شائستگی سے عاری۔۔۔ ماریہ اور سعدیہ تو ان کی خاطر کرنے میں ہی ہلکان ہوگئیں۔ کئی بار ان کی پلیٹیں بھریں مگر وہ سیر ہو کے نہ پا رہی تھیں۔ اور کھانا اتنے بے ڈھنگے اور ندیدے پن سے کھایا گیا کہ صحن میں ہر طرف ہڈیاں' چاول اور روٹی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ماریہ کا تو اس وقت صدمے سے برا حال تھا جب بری دکھائی گئی۔

شوخ بھڑکیلے رنگوں والے کامدار سستے سے چار پانچ جوڑے' گھٹیا میک اپ کا سامان اور جوتے' ہر چیز سے ان لوگوں کا ذوق جھلک رہا تھا۔

ثوبیہ تو کہہ رہی تھی کہ وہ ملتان سے بری خریدے گی' مگر یہ تو کسی پھیری والے سے خریدا ہوا سامان لگ رہا ہے۔ اف میری ساری دوست اس وقت مدعو ہیں۔ کتنی ہتک ہو رہی ہے میری کہ میری باجی کی ایسی سسرال ہے۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ ثوبیہ نے ایسی بری تیار کی ہے تو میں اپنی کسی فرینڈ کو انوائٹ نہ کرتی۔" سعدیہ روہانسی ہو کر بول رہی تھی۔

"بیٹا! ظاہر بین مت بنو۔ اللہ ہماری رابعہ کا نصیب اچھا کرے۔ چیزوں کی اتنی وقعت نہیں ہوتی۔ تم اپنے دل کو سنبھالو۔" شگفتہ پیار سے اسے ساتھ لگاتے ہوئے سمجھانے لگیں۔

"ویسے ماریہ! اماں کی تاکید کے باوجود بھی تم لوگوں نے کھانا اتنا مزے دار نہیں بنوایا۔ قورمہ گزارے لائق تھا' مگر بریانی میں تو برائے نام مسالا ڈالا گیا تھا۔" ثوبیہ اس کے قریب آکر کافی نخوت سے بولی۔ وہ پارلر سے تیار ہو کر آئی تھی۔ نفاست سے کیا گیا میک اپ' خوب صورت قیمتی لباس وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔

ماریہ جی جان سے سلگ کر رہ گئی تھی۔

"اسے کہتے ہیں جوتوں سمیت آنکھوں میں۔" گھستا ماریہ دل ہی دل میں دانت پیسنے لگی تھی۔ مگر بظاہر مسکرا کر بولی۔

"کمال ہے ثوبیہ! تمہیں کھانا کچھ خاص نہیں لگا۔ مگر خالی دیگیں تو بتا رہی ہیں کہ مہمانوں نے خوب ڈٹ کر کھایا ہے۔ اگر دوسری بار پلیٹ بھری جائے تو اس کا مطلب ہے کہ ذائقہ لاجواب ہے اور یہاں تو آپ کے ننھیالوں نے دو نہیں بلا مبالغہ پانچ پانچ بار پلیٹیں بھری ہیں۔ میں تمہاری بات کو کیسے سچ مان لوں؟" ماریہ کی بات میں واضح طنز تھا، جسے محسوس کرتے ہوئے ثوبیہ کے چہرے پہ ناگواری چھا گئی تھی۔

"اور ثوبیہ! بری کے اور اپنے جوڑے کم از کم ایک جیسے اور ایک ہی شاپ سے خرید لیتیں۔" ماریہ نے اس کی بیش قیمت فراک پہ لگے اسٹونز کو گھورتے ہوئے کچھ جتانے کی کوشش کی تھی۔

"ارے نہیں بھئی! اگر ایک جیسے کپڑے لے لیتی تو لوگ کہتے کہ دیکھو بھابھی سے مقابلہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔" ثوبیہ نے بھولپن سے جواب دیا۔

"اور ویسے بھی اتنے بھاری کپڑے میں نہیں پہن سکتی، جتنا بری میں دیے گئے ہیں۔" ثوبیہ نے نزاکت سے زمین کو چھوتے فراک کو چٹکیوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"لیکن باجی رابعہ ایسے کپڑے ضرور پہن لیتیں۔ جیسے اس وقت تم نے زیب تن کیے ہوئے ہیں۔" ماریہ نے چبھتے ہوئے انداز میں ثوبیہ کی آنکھوں میں جھانک کر ان کی تنگ دلی کو جتانے کی کوشش کی اور اگلے ہی لمحے آگے بڑھ گئی۔

رخصتی والے دن منیر روایتی طمطراق سے خواتین کے پنڈال میں داخل ہوا تو دولہا کی رشتہ دار خواتین نے بڑھ چڑھ کر اس کے گلے میں نوٹوں کے ہار ڈالنا شروع کر دیئے تھے۔ ہاروں کی لمبائی اتنی تھی کہ اس کے پیروں تلے آرہی تھے اور چوڑائی اتنی کہ جب رابعہ کے پہلو میں صوفے پہ بیٹھایا گیا تو رابعہ تقریباً" ہاروں میں چھپ گئی تھی۔

اسٹیج پہ بیٹھنے کی وجہ سے تمام مہمان خواتین مراد کو واضح نظر آرہی تھیں۔ مگر اس سجے سنورے مجمع میں وہ چہرہ اسے واضح چونکا گیا تھا جس پہ گہری براؤن آنکھیں سجی تھیں۔ لمبے دراز سلکی بال، رائل بلو فراک پاجامے میں ملبوس، جس کے تنگ بازو چوڑی دار تھے۔ وہ یک ٹک اس پری چہرہ کو دیکھے گیا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکی سج سج کر قدم اٹھاتی اسٹیج پر آگئی اور منیر بھائی کو دودھ کا گلاس پیش کر دیا۔ یہ اس کی چچا زاد ماریہ تھی، منیر بھائی کی پہلے نمبر والی سالی۔ اس نے ایک دم شانت ہوتے ہوئے صوفے سے ٹیک لگائی تھی۔

"ارے یہ کیا صرف ایک گلاس۔۔۔ کم از کم شہ بالا کو تو دودھ پلائی میں شامل کرنا چاہیے تھا۔" مراد اسے گہری نظروں سے تکتے ہوئے شکایتی انداز میں بولا۔

"کیوں آپ کو کس رشتے میں پلائیں۔ یہ تو ہمارے دولہا بھائی ہیں۔" ماریہ نے تنک کر جواب دیا۔ مراد کی خود پہ جمی شوخ نگاہیں اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھیں۔

"فی الحال تو آپ کا چچا کا پتر ہوں، آگے کے رشتے کا تعین وقت آنے پہ کریں گے۔" مراد نے معنی خیزی سے جملہ اچھالا تو وہ کانوں تک سرخ پڑ گئی۔

ادھر منیر نے نصف دودھ کا گلاس چڑھایا اور ادھر وہ بغیر نیگ وصولے تیزی سے نیچے اتر آئی تھی۔ مراد نے جو اس کا وہاں ٹھہرنا دوبھر کر دیا تھا۔

"ارے! پیسے تو لیتی جائیں۔" اس نے پیچھے سے شوخی بھری ہانک لگائی۔ پھر سرشاری سے ہنس پڑا۔

رخصتی میں ابھی کافی وقت پڑا تھا مگر سعدیہ کی آنکھیں چھما چھم برسنے لگی تھیں۔ اپنی نازک و معصومانہ خدوخال کی مالک بہن کے شریک حیات کو دیکھ کر اس کے ننھے دل کو صدمہ پہنچا تھا۔ گہری سانولی رنگت اور لمبی مونچھوں والا منیر اسے اپنے بہنوئی کے طور پر قطعاً" پسند نہ آیا تھا۔ جس کے بیٹھنے کے انداز سے لے کر چہرے کے تاثرات تک گنوار پن ہی چھلک رہا تھا۔

ادھر ادھر پھرتے 'ڈھیروں کام نمٹاتے فہد کی نظر بیسیوں بار سعدیہ پر پڑی تھی جو کافی رش سے الگ تھلگ ایک کرسی پہ بیٹھی چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔

"ابھی دلہن تو ریلیکس بیٹھی ہے مگر تمہارے رونے کا سیشن ابھی سے کیوں شروع ہو چکا ہے؟" وہ اس کے سر پر کھڑا پوچھ رہا تھا۔ سعدیہ نے کوئی جواب نہ دیا بس بیٹھی سوں سوں کرتی رہی۔

اگر اتنا ڈھیروں مسکارا' لائنر الابلا آنکھوں پہ تھوپ ہی لیا ہے تو اپنے آنسوؤں پہ بھی قابو پاؤ۔ ایمان سے ڈریکولا کی مونث لگ رہی ہو۔" وہ کرسی گھسیٹ کر قریب بیٹھتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولا جہاں سے واقعی سیاہی کی لکیریں بہہ رہی تھیں۔

"تمہیں اس سے کیا کہ میں ڈریکولا لگوں یا پرنسز؟" وہ خفگی سے چلائی تھی۔ بہن کی جدائی کے غم سے اس کا مزید رونے کو دل چاہ رہا تھا اور اسے شوخیاں سوجھ رہی تھیں۔ بے حس نہ ہو تو۔

"اگر تمہیں میری بات کی صداقت پہ شبہ ہے تو کسی اور سے تصدیق کر لیتے ہیں۔ آنٹی فاطمہ! آپ بتائیں کیا سعدیہ آپ کو اس وقت انسانوں کی کسی بھی کیٹگری سے تعلق رکھتی محسوس ہو رہی ہیں؟"

قریب سے گزرتی فاطمہ آنٹی نے رک کر اس کی آنکھوں میں مچلتی شرارت کو دیکھ کر لب دبائے پھر سنجیدگی سے سعدیہ سے مخاطب ہوئیں۔

"ہاں سعدیہ! تمہارا میک اپ واقعی خراب ہو چکا ہے۔ تم اٹھ کر منہ دھو لو۔" آنٹی تو مشورہ دے کر چل دی مگر وہ جی جان سے سلگ کر رہ گئی۔ کھا جانے والی نظروں سے فہد کو دیکھا جس کے چہرے پر فاتحانہ تاثرات چھائے ہوئے تھے۔

"دیکھا میں کوئی جھوٹ بول رہا تھا۔"

"دفع ہو جاؤ تم۔ میری بہن کی شادی ہے۔ میری مرضی میں روؤں یا ہنسوں پتا نہیں لوگوں کو کیا تکلیف ہے؟" وہ چڑ کر بولی۔

"پہلی بات یہ کہ میں "لوگ" نہیں ہوں۔ تمہارا کزن ہوں۔ اور دوسری بات تکلیف کی تو جب ایسی مضحکہ خیز صورت کو دیکھ کر مہمان باتیں بنائیں گے تو لازما" مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ آخر کل کزن ہو میری جیسی بھی سہی۔" وہ معصومیت بھرے انداز میں بولا۔

"جیسی بھی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" وہ طیش سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خود کو سمجھتے کیا ہو تم؟ صرف فہد اقبال ہو تم' کوئی "محمد مصطفیٰ" نہیں کہ بہت ناز کرنے لگے ہو خود پر" دونوں ہاتھ نازک کمر پر ٹکا کے خوب چبا چبا کے بولی اور آگے بڑھ گئی۔ جبکہ فہد پیچھے محض ہنس دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بے تحاشا درد سے دکھتے سر کو رابعہ نے بیڈ کے کراؤن سے ٹکایا ہی تھا کہ لکڑی کا روغن شدہ دروازہ دھڑ سے کھلا۔ وہ چونک کر سیدھی ہو بیٹھی۔ چاچی دلشاد نصف درجن خواتین کو لیے اندر آ رہی تھیں۔

"آجاؤ' آجاؤ۔ خیر نال میری نوں (بہو) ویکھو۔"

"وے بھر جائی شادو! نوں تو تو نے بڑی سوہنی ڈھونڈی ہے؟" ایک عورت اس کے دائیں سائیڈ پہ بیٹھتے ہوئے ستائش انداز میں بولی۔

"ہاں داج (جہیز) بھی بہت لائی ہے۔" دوسری نے نئی نویلی کو ریا سے بھرے کمرے میں آنکھیں گھماتے ہوئے بھو لیا۔

"میرے دیور کی دھی ہے۔ یتیم ہے' اب میں دیورانی کا بوجھ ہلکا نہ کروں گی تو اور کون کرے گا۔ میرے منیر کو تو پنڈ کے سارے ہی لوگ اپنی دھی دینے پر تیار تھے۔ اونچا لمبا' گھبرو جوان' اپنی زمینوں پہ کام کرتا ہے' کسی کا مزارعہ نہیں ہے۔" دلشاد تفاخر بھرے انداز میں بولیں تو باقی ساری ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔

"اپنے محلے کی پٹوارن نے خود مجھے کئی بار اشارے کنایوں میں دھی لینے کو کہا' دروغے نے خود منیر سے کہا کہ میری بہن سے ویاہ کر لے' داج میں ہو گا' بھر زمین دوں گا' مگر میرا دل نہ مانا' مرحوم دیور کی پوری تین جوان دھیاں (بیٹیاں) بیاہ کو تیار بیٹھی ہوں اور میں ادھر

ادھر سنجوگ جوڑتی بھلا اچھی لگوں گی؟" لہجے میں مقدور بھر عاجزی سموتے ہوئے دلشاد نے استفسار کیا۔ ساتھ گنڈیریوں کی پلیٹیں بھی خاطر تواضع کے لیے ان کے سامنے رکھ دیں۔

"بھرجائی! اللہ اس نیکی پر تمہیں اجر دے گا۔ یتیم بچی کے سر پر ہاتھ رکھنا بڑے ثواب کا کام ہے۔" زرینہ نے ہونٹ کے کنارے سے بہتے گنے کے رس کو دوپٹے سے پونچھتے ہوئے دلشاد کو برملا سراہا پھر گنڈیری اچھی طرح چوس کر پھوگ نیچے پلنگ کے پھینک دیا کہ باقی ساری خواتین بھی تو پھوگ ادھر ادھر کمرے میں فرش پر پھینک رہی تھیں۔

رابعہ کا ہر طرح سے جائزہ لینے' جہیز کے سارے آئٹم غور سے دیکھنے کے بعد خواتین اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جانے سے قبل میلے کچیلے دوپٹوں کے پلوؤں سے بندھے کسی نے دس تو کسی نے مڑتے تڑے بیس تیس روپے نکالے اور رابعہ کی طرف منہ دکھائی کے طور پر بڑھا دیے۔

دلشاد محلے دار خواتین کو دروازے تک رخصت کرنے گئیں' پھر تیزی سے واپس اس کے کمرے میں آگئیں۔

"یہ ساری تجھے کتنی منہ دکھائی دے گئی ہیں؟" دلشاد کو سخت تجسس تھا۔

"یہ چاچی بس یہی دیا ہے؟" اس نے گود میں رکھے پیسوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں لا ادھر دے مجھے میں نے بھی تو آخر انہیں دینے ہیں۔ کبھی اس کا پتر دھی پیدا ہو رہا ہے تو' کبھی کوئی بیمار' کسی کی مَنج (بھینس) مرے تجھی تو دس بیس روپوں کے بغیر افسوس نہیں ہوتا یہاں۔"

دلشاد تیزی سے پیسے کھول کھول کر سیدھا کرتے ہوئے بول رہی تھیں۔

"اور باقی کے پیسے کدھر ہیں؟"

"کون سے پیسے چاچی؟" اس نے پھیکے انداز میں پوچھا۔

"ارے یہ جو ہفتہ بھر سے میرے میکے والے اور پنڈ والیاں تجھے دیکھنے آرہی ہیں' کیا خالی ہاتھ لٹکاتی آئی تھیں؟" دلشاد نے طنز سے پوچھا۔

"وہ پیسے تو یہاں ہیں۔" اس نے چپ چاپ پرس دلشاد کی طرف بڑھا دیا۔ جسے انہوں نے فوراً" جھپٹ کر پیسے نکالے' کرتے کی سائیڈ والی جیب میں منتقل کر دیا۔

اسے اس بے حد پسماندہ' شعور و تہذیب سے عاری ماحول کا مستقل حصہ بنے تقریباً" دو ہفتے ہونے کو آرہے تھے۔

روز اول سے تا امروز دیہاتی خواتین اسے دیکھنے آرہی تھیں۔ اسے ان کے دیکھنے سے کوئی مسئلہ نہیں تھا' بس ان کی تجسس' اشتیاق اور کھوج بھری نگاہوں سے الجھن ہوتی تھی' ٹٹول ٹٹول کر سرتاپا اسے دیکھتیں' پھر ایک دوسرے کے کانوں میں کوئی بات کرتے ہوئے قہقہہ مار کر ہنس پڑتیں۔ رابعہ کو لگتا جیسے وہ چڑیا گھر میں آیا ہوا کوئی نیا جانور ہے جسے دیکھنے کو شہر بھر ٹوٹ پڑا ہو۔ اور اوپر سے ان کے انتہائی بے مقصد اور بے تکے جملے۔

"شہری چھوکری ہے بس چار دن ہی ٹک پائے گی۔"

"خدا نا خواستہ کوئی کمی اور عیب تو نہیں جو ماں نے منیر جیسے سانڈ سے بیاہ دیا۔"

"شکل سے خوش نہیں لگتی۔ شاید دل راضی نہیں ہے۔"

اس کا دل چاہتا کہ ساری مروت' لحاظ بالائے طاق ان بے ہودہ عورتوں کو کمرے سے باہر نکال کر اندر سے کنڈی لگوائے اور خود بند کمرے میں بیٹھ کر خوب چیخ چیخ کر روئے۔ شادی شدہ زندگی کے یہ رنگ اتنے بدصورت' بھدے اور بھیانک نکلے کہ دو ہفتوں میں ہی اس کا آدھا خون خشک ہو چکا تھا۔

سعدیہ کا کہنا تھا کہ منیر جیسے دیہاتی نین نقش رکھنے والا اخلاق و تمیز سے مبرا نظر آتا ہے۔

منیر بے تحاشا کھانے کا شوقین اور آداب بول چال سے ناواقف ہوتا تو تب بھی غنیمت تھا' مگر وہ تو بے حد اکھڑ مزاج' تند خو اور جابر صفت مرد نکلا۔ ایک تو سیاہی

مائل سانولے چہرے پہ چھائی کرختگی' اوپر سے چنگھاڑ نما بولنے کا انداز۔۔۔ رابعہ کا تو نازک دل سینے کے پنجرے میں ہی پھڑپھڑا کر رہ جاتا تھا۔

دن بھر وہ نجانے کہاں غائب ہوتا تھا۔ شاید کھیتوں میں یا کسی دوست کے ڈیرے پر۔ البتہ رات کو ضرور واپس آتا تھا۔ اور جونہی شام کے سرمئی لبادے میں رات کی تاریکی گھلنے لگتی' رابعہ کی حالت تقریباً "غیر" ہونے کو آجاتی۔ ٹانگیں ایک دم سے بے جان ہوجاتیں۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔

"وہ پیسے کہاں ہیں؟" اپنے ازلی اکھڑ انداز میں پوچھا گیا۔

"کون سے پیسے؟" رابعہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"ارے وہی جو تجھے سب نے منہ دکھائی میں دیے ہیں۔"

میرے سامنے ہی تو تجھے مراد نے پورے تین ہزار دیے تھے۔ باقی میری ماسیوں' ماسیوں' ممیوں سب نے تو کچھ نہ کچھ تھمایا تھا' پورے دس ہزار تو لازمی ہوں گے۔" گیلے ہاتھ تولیے سے پونچھتے ہوئے وہ یقین سے کہہ رہا تھا۔

"میں نے گنے نہیں۔ چاچی نے مانگا تو میں نے انہیں دے دیے۔" اس نے سر جھکا کر سادگی سے جواب دیا۔

"کیا اماں کو دے دیے؟" منیر نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"اسے کیوں دیے' وہ تیری منہ دکھائی تھی' تیرے پیسے تھے' اور تیرے پیسوں پہ صرف میرا ہی حق تھا' پاگل عورت۔" وہ ایک دم غصے سے چیخا۔

"خریف کا موسم سر پہ آچکا ہے' سبزیوں کے بیج' پنیری کھاد کتنا خرچہ سر پہ کھڑا ہے۔ سوچا تمہارے پیسوں سے کام چلالوں گا۔۔۔ مگر اتنی احمق ہو کہ تم اماں کے کھیسے میں جو دھیلا گیا سو گیا۔ ہمیں سے بھی شہری پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی نہیں لگتی ہو۔" وہ سخت طیش میں بولتے ہوئے رکا پھر تولیہ اس کے منہ پر زور سے مار کر باہر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

بالآخر پورے چار سال "سخت محنت" کے بعد ثوبیہ نے ایف اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر ہی لیا۔ گھر میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ دلشاد نے بتاشے پورے محلے میں بانٹے تھے۔

"میری بخت آور' لائق فائق رانی!" دلشاد آتے جاتے اس کا منہ چوم رہی تھیں۔

"میں آگے بی اے ریگولر پڑھوں گی' کسی کالج میں۔" مراد ملتان سے گھر آیا تو اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

"آگے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر پڑھنا ہے تو یہیں گھر میں پڑھ لو' میں کتابیں لا دوں گا۔" موبائل پہ مگن مراد نے جواب دیا۔

"ہونہہ' یہ گاؤں ہے کسی پڑھنے کے قابل۔" ثوبیہ نے طنز سے ہنکارہ بھرا۔

"اور ویسے بھی ایف اے میں نے اپنی محنت سے پاس کرلیا' بی اے میں ٹیچر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں کون مجھے پڑھا سکتا ہے۔ بس تم میرا ایڈمیشن کروادو۔ کسی اچھے سے کالج میں۔ میں اپنی پیکنگ کرتی ہوں۔" ثوبیہ نے حسب عادت دھونس بھرے انداز میں فیصلہ سنادیا۔

"بس گھر میں رہ کے گھرداری سیکھو۔ روٹی سیدھی ڈال نہیں سکتیں۔ اور اماں تو اسے اب بیا ہنے کی کر۔" وہ براہ راست دلشاد سے مخاطب ہوا جو چھاج میں رکھے ساگ کو کتر رہی تھیں۔

"زیادہ مشورے دینے والا نہ بن۔ میرا ابا جو مر گیا ہے اس لیے خرچہ بچانے کے لیے الٹے سیدھے مشورے دے رہا ہے۔" ثوبیہ کو غصہ آگیا۔ ساتھ آنکھیں بھی لبالب آنسوؤں سے بھر آئیں۔

"ہائے مراد! اتنا تھڑدلا نہ بن۔ ایک ہی تو تیری بہن ہے۔ اس کی بھی جائز خواہش پوری نہیں کرسکتا۔ اس کا باپ اگر زندہ ہوتا تو آج تم بھائیوں کی منت نہ کررہی ہوتی۔ اس نمانی نے تو پیو کی شکل تک نہیں دیکھی۔"

بے حد جذباتی انداز میں بولتے ہوئے دلشاد کا لہجہ بھرا گیا۔

"اُفوہ اماں!" مراد جھنجلا کر اٹھ بیٹھا۔

"بجائے اسے سمجھانے کے اسے بڑھاوا دے رہی ہے۔ دیکھتا ہوں کوئی اچھا سا کالج۔" وہ کوفت سے بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ثوبیہ نے نظر نہ آنے والے آنسو نزاکت سے پونچھے اور مسکرانے لگی۔

"بھابھی! آپ تیار ہو جائیں۔ میں ملتان جاتے ہوئے آپ کو چچی کے گھر چھوڑتا جاؤں گا۔" وہ رابعہ سے مخاطب ہوا جو چھپر تلے روٹیاں پکا رہی تھی۔

"ارے اسے جو لے جائے گا تو گھر کا کام میں بڈھی کر سکتی ہوں؟" دلشاد نے بیٹے کو گھورا جو بھابھی پہ اکثر مہربان رہتا تھا۔

"ارے اماں! پہلے بھی تو کرتی تھی' ہاں اب بھابھی کے آنے سے تو یک دم بڈھی ہو گئی ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" کہہ کر وہ کان کھجانے لگا۔ دلشاد نے منہ سے کچھ نہ کہا کہ ایک ہی تو کمانے والا بیٹا تھا۔ مراد کی بات سن کر رابعہ کے چہرے پہ چمک آگئی تھی۔ ماں بہنوں سے ملنے کے خیال نے ہی اس کے اندر تقویت بھر دی تھی۔ آخر پورے چھ ماہ ہونے کو آرہے تھے ان سے جدا ہوئے۔

منیر نے کبھی بھولے سے بھی اسے میکے لے جانے کی بات نہیں کی تھی۔ البتہ مراد جب بھی آتا تو اپنے موبائل پہ اس کی بات ماں' بہنوں سے ضرور کرا دیتا تھا۔

"تمہارے بھائی شام کو آئیں گے تو ان سے اجازت لیتی ہوں۔" رابعہ نے پرات صاف کرتے ہوئے مراد کو جواب دیا۔ اور منیر کا کیا جواب ہونا تھا سوائے اس کے

"اماں سے پوچھ لو' جو وہ کہیں تم نے وہی کرنا ہے۔"

"ارے بیٹا! چلی تو جائے' میں جیسے تیسے گھر کے کام کرلوں گی مگر یہ بھی دیکھو کہ یہ دوسرے جی سے ہے ابھی شروع کے دن چل رہے ہیں۔ سفر کرنا مناسب نہیں۔" دلشاد نے بے حد مکاری سے بات بنائی۔

رابعہ اس سے [illegible] بے [illegible] سے کئی گنا زیادہ مراد مایوس ہوا تھا کہ ماریہ کو دیکھنے کا چانس مس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"امی! ہم رابعہ باجی کو ڈلیوری کے لیے ادھر لے آئیں گے نا؟" بال سلجھاتے ہوئے ماریہ نے پوچھا۔

"ہاں میں بھابھی دلشاد کو فون تو کروں گی کہ رابعہ کا پہلا بچہ میکے میں ہو۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی چاہیں کہ پہلا بچہ ان کے گھر ہو۔" ساجدہ نے خیال ظاہر کیا۔

"کمال کرتی ہیں' آپ بھی۔" ماریہ تپ کر بولی۔

"ہو سکتا ہے کہ دوران ڈلیوری کوئی پیچیدگی ہو جائے تو کیا گاؤں میں کوئی گائنی بروقت دستیاب ہو سکتی ہے؟" ماریہ نے رسانیت سے کہتے ہوئے چوٹی گوندھنی شروع کر دی۔

"ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو۔" ساجدہ نے بیٹی سے اتفاق کیا۔

"میں تو کہتی ہوں کہ اسی ہفتے جا کر ان کو لے آتے ہیں۔ پتا نہیں ان کو مکمل خوراک اور آرام مل بھی پا رہا ہے یا نہیں؟" سعدیہ دھم سے قریب آبیٹھی اور بولنے لگی۔

"خیر خوراک کی تم فکر نہ کرو۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ رابعہ فون پہ بتا رہی تھی کہ سبھی بہت خیال رکھنے والے اور پیار کرنے والے ہیں۔" ساجدہ طمانیت سے بولیں۔

"تو پھر تیاری کریں باجی کے پاس چلنے کی۔" سعدیہ پرجوش ہو کر بولی۔

"ہاں تمہاری پھوپھو شگفتہ سے مشورہ کرتی ہوں۔ آخر فہد کو بھی ساتھ لے جانا ہو گا نا۔"

☼ ☼ ☼

"ثوبیہ! تمہیں کچھ چاہیے تھا؟" رابعہ صحن کی صفائی کر کے اندر آئی تو دیکھا کہ ثوبیہ اس کے کپڑوں کی الماری کھولے ہینگر میں لٹکے جوڑوں کو آگے پیچھے

رہی تھی۔

"ہاں بھابھی! میرے کالج میں فوڈ فیسٹیول ہو رہا ہے۔ اس کے لیے مجھے اچھا سا جوڑا چاہیے آپ کا۔" ثوبیہ پٹ پٹ چھوڑتے ہوئے بولی۔

"ہاں تو اپنی پسند کا کوئی ایک لے لو۔" رابعہ نے فراخ دلی سے اجازت دی۔ اگر وہ نہ بھی دیتی تو ثوبیہ نے من مانی کرتے ہوئے سوٹ لے ہی لینا تھا' آخر پہلے بھی تو وہ اس کی متعدد استعمال کی چیزیں مثلاً "کپڑے' جوتے' میک اپ' کمبل تک بھی پوچھ کر اور کبھی بنا پوچھے اٹھا کے ہاسٹل لے جا چکی تھی۔ ماں کی جتنی لاڈلی تھی' بھائیوں کی اس سے بھی زیادہ۔ منیر تو جان دیتا تھا۔ سو رابعہ کے پاس سوائے صبر کے گھونٹ بھرنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔

ثوبیہ کو ضرورت ایک سوٹ کی تھی مگر اپنی بے حس اور خود غرض فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تین چار اور فینسی جوڑے بھی الماری سے نکال لیے اور بغیر شکریہ ادا کیے باہر نکل گئی۔ رابعہ لب بھینچے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اگر ثوبیہ جوڑے پہننے کے بعد اسے واپس کر دیتی' تب بھی غنیمت تھا' مگر وہ تو لے کر واپس کرنا بھول ہی جاتی تھی۔ پچھلی بار بھی اس نے رابعہ سے چین مانگی تھی جو رابعہ ہر وقت پہنے رکھتی تھی۔ یہ چین دراصل ساجدہ کی تھی' جو ان کی مرحومہ اماں نے ان کو شادی کے وقت دی تھی۔ اب رابعہ کی شادی پہ یہی چین انہوں نے تحفتاً "اس کے گلے کی زینت بنا دی تھی اس تاکید کے ساتھ کہ "اس کا خاص خیال رکھنا' یہ میری اماں کی نشانی ہے۔" سو واپسی کا تقاضا رابعہ کی مجبوری تھی۔

"کون سی چین؟" ثوبیہ نے لمبے ناخنوں پہ لسن رگڑتے ہوئے حیرانی سے رابعہ کو دیکھا تھا۔

"وہی چین جو تم پچھلی بار تم مجھ سے مانگ کر لے گئی تھیں' ہاسٹل" رابعہ نے جھجکتے ہوئے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"اگر میں نے لی ہوتی تو اس وقت میرے گلے میں ضرور ہوتی۔ یا آپ کو ضرور واپس کر دیتی۔" ثوبیہ کی لاپروائی عروج پہ تھی۔

"مگر ثوبیہ! تم نے... یاد ہے جب میں دودھ ابال رہی تھی۔" رابعہ تو اس کے یوں صاف مکرنے پہ ششدر رہ گئی تھی۔

"دیکھیں اماں! بھابھی کو کیسے مجھ پر الزام لگا رہی ہیں۔" منہ بسور کر دلشاد کو پکار آ گیا۔

"ارے رابعہ! خدا کو مان' کیوں میری معصوم بچی پہ الزام لگا رہی ہے۔ کوئی کپڑا لتا نہیں' سونے کی زنجیر کا الزام۔" دلشاد نے اسے شرمندہ کرنا چاہا' ساتھ ہی منیر کو بھی بلا لیا جو گائیں کے باڑے کی طرف جا رہا تھا۔

"ارے منیر! ادھر دیکھو تیری بیوی میری یتیم بچی پہ کیا الزام لگا رہی ہے۔" رابعہ تو ساس کے یوں آپے سے باہر ہونے پہ ہکا بکا بیٹھی تھی۔

"ہاں کیا مسئلہ ہے۔" منیر ماں کے ساتھ والی چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"یہ تیری بیوی کہہ رہی ہے کہ ثوبیہ نے اس کے سونے کا کوئی زیور غصب کر لیا ہے۔ غضب خدا کا میری یتیم بچی صرف بڑی بہن سمجھ کر کچھ مانگ لیتی ہے اور یہ ہیں کہ اسے چور' نا دیدی پتا نہیں کیا کہہ چلی جا رہی ہیں۔" دکھ سے دلشاد سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

"کیوں رابعہ! یہ اماں کیا کہہ رہی ہے۔ اپنی اوقات میں رہ۔ زیادہ سر پہ چڑھ کر ناچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں وہ مرد نہیں ہوں کہ جو اپنے کان' آنکھ سمجھ بوجھ سب بیوی کے پاس گروی رکھ کر کاٹھ کا الو بن جاؤں۔ میری ماں' بہن کو کوئی شکایت ہوئی تو تم بھی اس گھر میں نہیں رہ پاؤ گی۔ سمجھیں؟" وہ اس کے سر پہ کھڑا چیخ رہا تھا۔

رابعہ نے پہلے تو ہاتھ کانوں پر رکھ لیے پھر بے ساختہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کا سانس یوں تیزی سے چل رہا تھا جیسے میلوں کا سفر طے کر کے آ رہی ہو۔

☼ ☼ ☼

آج صبح ہی سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ اٹھنے کو من نہیں کر رہا تھا۔ چاچی دلشاد سے بات کی تو اس

نے تھوڑی سی پھکی لا کر دی۔

"الو کھا بچہ نہیں پیدا کر رہی ہو۔ ہم نے بھی بچے جنے ہیں 'مگر ٹھاٹ نہیں سنبھالی تھی۔" جاتے جاتے زہر اگلنا نہ بھولی تھیں۔ وہ بدقت اٹھی 'روٹین کے کام نمٹائے۔ مشکل گوبر کا تھال بھر کر صحن لانے میں ہوئی تھی۔ وہ کس کو اٹھانے کا کہتی؟ چاچی دلشاد کو جو سارے کام اسے تفویض کر کے خود پڑوس میں نکل جاتی تھیں۔

"باجی!" اس کے قریب ابھرنے والی آواز بہت بلند اور بے یقینی لیے ہوئے تھی۔ پلٹ کر دیکھا تو ساکت رہ گئی۔ اپلا تھامے ہاتھ تھم گئے تھے۔ سامنے اس کی ماں بہنیں کھڑی تھیں۔ نظروں میں شدید دکھ 'صدمہ اور بے یقینی کی کیفیت لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ساتھ فہد بھی تو کھڑا تھا۔ اس نے دوپٹا اتار کر نجانے کہاں رکھ دیا تھا۔ اس کی موجودگی میں ننگے سر اور وہ بھی اس حالت میں۔۔۔ اسے ڈھیروں شرمندگی نے آگھیرا۔

"امی! آپ لوگ کب آئے؟" خوشدلی سے کہتے ہوئے اس نے اٹھنے کی سعی کی مگر جسمانی بوجھ کی وجہ سے ناکام رہی۔

"میری بچی! یہ کیا اپنی حالت بنا رکھی ہے؟" ساجدہ نے آگے بڑھ کر اسے تھام کر کھڑا کیا پھر وفور جذبات سے اسے چومنے لگیں۔

رابعہ نے گوبر سے گندے ہاتھوں کو دھویا مگر جب ماریہ سے گلے ملنے لگی تو ماریہ کو اس سے بدبو کا ایسا **بھبھکا** آیا کہ وہ بے ساختہ اس سے الگ ہو کر ناک پہ دوپٹا رکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔ سعدیہ کے لیے بھی وہاں ٹھہرنا دو بھر ہو رہا تھا جہاں سوکھے 'گیلے اپلوں کے ڈھیر لگے تھے 'مگر فی الوقت اس کی نظریں بہن پہ جمی تھیں۔ اس کا دل و دماغ دونوں ماننے سے انکاری ہو رہے تھے کہ یہ ان کی نازک نفیس اور سلیقہ مند بہن ہے جس کے رکھ رکھاؤ اور سلیقہ شعاری کے ان کے خاندان میں قصے مشہور تھے۔ مگر اس وقت بغیر دوپٹے کے 'میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس الجھے بکھرے بال 'چہرہ بے حد کمزور مدقوق کہ رخساروں کی ہڈیاں ابھر کر اسے برسوں کا بیمار ظاہر کر رہی تھیں۔

صرف سعدیہ کیا 'ساجدہ 'ماریہ اور فہد تک رابعہ کی حالت دیکھ کر شاکڈ کھڑے تھے۔ رابعہ فون پہ انہیں جو اپنی خوشحال 'مطمئن اور آسودہ خانگی زندگی کے قصے سناتی رہی تھی 'ان کا شائبہ تک اس کی شخصیت میں نظر نہ آرہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں دلشاد "مکھ پاترا" مکمل کر کے واپس آگئیں۔ ویرانی اور بچوں کے چہروں پر چھائے تناؤ اور سنجیدگی نے اسے ٹھٹک جانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے خود کو سنبھال کر وہ استقبال کو آگے بڑھیں۔

"خیری صلا' یہ آج میرے گھر کا راستہ کیسے بھول پڑے ہو؟" زور زور سے **جپھیاں** ڈالتے ہوئے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا گیا۔

"بس بھابھی! بچیوں کا بہن سے ملنے کو جی چاہا تو چلے آئے۔ ویسے بھی رابعہ کو ساتواں مہینہ لگ چکا ہے۔ میں چاہتی ہوں ڈلیوری ہمارے ہاں ہو۔" ساجدہ نے سنجیدگی سے آنے کا مدعا بیان کیا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں؟ اتنا بڑا گھر' مال مویشی کا چارہ بھوسہ' کتنے کام اور اکیلی جان۔ نوں اور پوترے کو وہ توجہ نہیں دے پاوے گی جو تمہارے گھر ملے گی۔"

نہایت محبت سے رابعہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے دلشاد نے اجازت دے دی۔

"بس رات کو منیر آجائے تو اس سے صلاح کر کے رابعہ آپ کے ساتھ چلی جائے؟" ساجدہ کو داماد کے رویے نے بڑا مایوس کیا تھا۔ منیر نہ تو ان کے پاس بیٹھا اور نہ ہی کوئی خیریت 'طبیعت پوچھی۔ بس کھڑے پیروں سلام کر کے باہر نکل گیا۔

اب ساجدہ کیا جانیں کہ پڑھی لکھی شہری ساس اور سالیاں دیکھ کر منیر کا احساس کمتری دوچند ہو گیا تھا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی۔ تعلیم یافتہ باشعور بیوی پہ تو چلو اپنی "زبان دانی" سے خوب رعب رکھا ہوا تھا مگر ان لوگوں کے سامنے اسے عجیب سی گھبراہٹ

ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر رخشندہ کے مطابق ناکافی آرام' خوراک اور جسمانی مشقت کی وجہ سے ڈلیوری میں پیچیدگی درپیش آسکتی ہے۔

"رانی! میری جان! تم نے ہمیں بھنک بھی نہیں لگنے دی کہ دلشاد بھابھی تمہارے ساتھ اتنا افسوس ناک رویہ روا رکھے ہوئے ہیں۔" ساجدہ' رابعہ کو ساتھ لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

"کیا بتاتی امی! آپ لوگ یقیناً مجھے وہاں نہ رہنے دیتے' یہاں کون ہے میرا جس کے برتے پہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلی آتی نہ باپ نہ بھائی' کمزور بیوہ ماں کو کیا پریشان کرتی۔" رابعہ پھیکے سے مسکرا دی۔ بے رنگ' ویران نظریں فرش پہ جمی تھیں۔

"ارے ایسا کیا غضب ہو گیا۔ تم مجھے بتاتیں۔ میں بھابھی بیگم کو وہ سیدھا کرتی کہ سب دیکھ لیتے۔"

شگفتہ نے طیش بھرے انداز میں بولتے ہوئے دانت پیسے تھے۔ وہ تو خود رابعہ کی حالت دیکھ کر ششدر رہ گئی تھیں۔ رابعہ بے حد حساس' متین اور صابر لڑکی تھی۔ شوہر ساس کے ناروا سلوک کے باوجود اس نے کبھی گھر والوں کے سامنے منہ سے بھاپ نہیں نکالی تھی۔ مگر اب جو اتنے سارے مہان رشتے سامنے پائے تو خود پہ قابو نہ پاسکی۔ روتے ہوئے سب کچھ بتاتی چلی گئی۔ سب کچھ۔ دلشاد بی بی کی سازشی و عیار فطرت' منیر کا جابرانہ و حاکمانہ سلوک' ثوبیہ کا ہتک آمیز و جارحانہ رویہ۔

"میں کہتی تھی' یہ رشتہ سراسر بے جوڑ ہے مگر اس وقت کسی نے میری نہیں سنی۔"

ماریہ نے شکایتی انداز سے ماں کو دیکھتے ہوئے رنجیدگی سے کہا۔

"بس بیٹا! نصیب کی بجھارت کون بوجھ پایا ہے۔ ورنہ اپنی صابر' تابع دار بچی کے لیے ایسے ناقدروں کو پسند کرتی؟" ساجدہ دوپٹے سے گیلی آنکھیں پونچھتے لگیں۔

☆ ☆ ☆

"ہرگز نہیں' میرے جیتے جی ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" دلشاد بیگم نے حسب عادت چیختے ہوئے کہا۔

"تو پھر بتا اماں! تیرا کب تک دنیا چھوڑنے کا پروگرام ہے؟" مراد نے ہنس کر پوچھا۔

"ارے مریں میرے دشمن میں کیوں خدانا خواستہ مروں؟" دلشاد نے سخت غصیلی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ جس نے آرام سے اس کے مرنے کی بات کر دی تھی۔

"تو اور کیا۔۔۔ تو جیے ہزاروں سال اور ہر سال کے ہوں کئی ہزار سال' میں بھی چاہتا ہوں کہ میرے مکھڑے پہ سہرا سجنے سے پہلے تو نے کہیں نہیں جانا۔" مراد نے کچا سبز چنا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہ تو میں آج ہی لے آؤں' تیری ووہٹی' تیرے مامے کی دوسری بیٹی فرزانہ' دیکھ تو چن (چاند) کا ٹوٹا ہے۔" دلشاد ایک دم سے شکر گھلے لہجے میں بولنے لگیں۔

"ہاں وہ چاند کا ٹکڑا فرزانہ۔۔۔ نرا سفید رنگ' چاند کی طرح چھائیوں کے کتنے تو داغ ہیں۔" مراد نے نکتہ اعتراض کیا۔

"بس تو چاچے کے گھر چلنے کی کر۔ میں کل والی کوسٹر کے دو ٹکٹ کٹوانا ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔ ساجدہ کی دوسری بیٹی مجھے کسی صورت منظور نہیں' میں ایک سے بھر پائی۔" دلشاد نے قطعیت سے کہا۔

"تو خوامخواہ بیر پال رہی ہے ان سے' کتنی اچھی تو ہے رابعہ بھابھی' بالکل گاؤ دی۔" مراد نے نرمی سے رام کرنا چاہا۔

"ہونہہ۔۔۔ خاک اچھی ہے۔ سنا نہیں سوکھی چرخ بیٹی پیدا کی ہے اس نے۔ اگر پوتا ہوتا تو کسی طور تو میرا جی ٹھنڈا ہوتا۔" دلشاد نے جاہلانہ انداز میں کہتے ہوئے

سینے پہ ہاتھ مارا۔

"جو بھی ہے' تو ماریہ کے لیے میرا رشتہ مانگ' ورنہ میں وہ کروں گا جو تو نے سوچا نہیں ہوگا۔" مراد سنگین لہجے میں دھمکا کر چلا گیا۔

"ہونہہ۔ جانتی ہے میری جوتی' بی ساجدہ کے گھر۔" دلشاد اونچی آواز میں بڑبڑانے لگیں۔ کسی نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر دبایا تو انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ ان کے پیچھے ثوبیہ کھڑی تھی جو آنکھوں سے انہیں شانت رہنے کا کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"توبہ! کتنے بے حس اور خود غرض لوگ ہیں۔ پتا بھی چل چکا کہ ان کے گھر رحمت آچکی ہے' پھر بھی بہو و پوتی کو دیکھنے نہیں آئے۔" ڈیڑھ ماہ کی نوزائیدہ بچی کو ماریہ نے گود میں لیتے ہوئے افسوس سے کہا۔

"انہیں نعمت سے غرض تھی نا' اس لیے آنے سے گریزاں ہیں؟" رابعہ دکھ بھرے انداز میں بولی۔ اسے حقیقتاً منیر کی لاپروائی اور بے حسی نے اندر تک توڑ دیا تھا۔ دوسرا ماہ لگ چکا تھا' مگر نہ تو اس نے فون پہ اس کی اور بچی کی خیریت دریافت کی اور نہ ہی آنے کا تکلف کیا۔ ساجدہ کو بھی داماد کی خاموشی نے خوف زدہ کر دیا تھا۔

"ارے نہیں۔ تم خوامخواہ پریشان مت ہو۔ دلشاد' بھابھی کو میں جانتی ہوں' صرف اس لیے پوتی کو دیکھنے نہیں آ رہیں کہ کہیں ہم اسپتال کا خرچا ان سے نہ مانگ لیں۔ ایسی ہی تو پیسے کی پجاری ہیں وہ۔" شگفتہ نے ساجدہ کو ٹھنڈے ہاتھ تھامتے ہوئے تسلی دی۔

"امی! وہ چاچی دلشاد اور ثوبیہ آئی ہوئی ہیں۔" اسی دم سعدیہ اندر داخل ہوئی۔ سب نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ رابعہ کے چہرے پہ آسودگی کی چمک لہرائی تو سب ہی مطمئن اور ہلکے پھلکے ہو کر ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑے۔

"بھابھی مبارک ہو۔ آپ دادی بن گئی ہیں۔" ساجدہ نے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے دلشاد کو مبارک باد دی۔

"ہاں۔ کون سا پوتے کی دادی بن گئی ہوں۔" دلشاد نے نخوت سے ہاتھ' کان کے قریب اڑا کر کہا' تو سب کے چہروں پہ سایہ سا لہرا گیا۔

"خیر۔ یہ بتائیں منیر نہیں آیا۔ بیوی اور بیٹی سے ملنے۔" ساجدہ نے سنبھلتے ہوئے خوش دلی سے پوچھا۔

"اے حد کرتی ہو' ساجدہ! تم بھی اگر بیٹے کی خوش خبری ہوتی تو دیکھتیں کیسے دوڑا چلا آتا۔ مگر بیٹی کا سن کر تو ایسا ٹھنڈا پڑا ہے کہ حد نہیں' کہنے لگا اماں! رابعہ کہیں چاچی ساجدہ کی طرح تین بیٹیاں نہ پیدا کرے۔" دلشاد بیگم کاٹ دار انداز میں بولتے ہوئے سب کے چہروں کو دیکھنے لگیں۔ جہاں ضبط کی سرخی چھا رہی تھی۔

"بھابھی! بیٹیاں بھی اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔ بس اللہ ان کے نصیب اچھے کرے۔" شگفتہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"رابعہ گھر کے لیے بہت اداس ہو رہی تھی اور کہتی ہے کہ اب چھلہ تو ہو گیا ہے۔ میں اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔ آخر کافی دن رہ لیے ہیں یہاں۔" ساجدہ نرم و عاجزی بھرے انداز میں بولتے ہوئے جیٹھانی کے قریب بیٹھ گئیں۔

"ہاں ہمیں بھی بھابھی کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔" کافی دیر سے خاموش بیٹھی ثوبیہ نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔ پھر ماں کا ہاتھ معنی خیز انداز میں دبا کر اسے تو دی پوائنٹ بات کرنے کو کہا۔

"ایسا ہے ساجدہ! کہ میں اپنے مراد کے لیے ماریہ کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔ امید ہے تم انکار نہیں کرو گی۔ دونوں بہنیں اکٹھی خوش آباد رہیں گی۔" دلشاد نے کافی نخوت سے مدعا پیش کیا۔ رابعہ کی دفعہ والی عاجزی' محبت اور خوش اخلاقی کا کہیں شائبہ نہ تھا۔ سانپ ہر جگہ ٹیڑھا ہی چلتا ہے' مگر جب بل میں جاتا ہے تو اسے سیدھا ہونا ہی پڑتا ہے۔

منیر پرائمری پاس ہونے کے ساتھ بدزبان اور ہتھ چھٹ بھی تھا۔ گاؤں میں کوئی بھی اپنی بیٹی اسے دینے پہ رضامند نہیں تھا۔ اپنے جذباتی' بے صبرے اور

غصیلے بیٹے کے لیے انہیں خاموش طبع اور پرسکون طبیعت کی حامل رابعہ ہر لحاظ سے موزوں لگی تھی۔ اسی لیے تو جھوٹی محبت اور اپنائیت جتا کر رابعہ بیاہ لے گئی تھیں۔

مگر مراد کا معاملہ یکسر الٹ تھا۔ مراد نہ صرف سلجھا ہوا، میٹرک پاس اور خوش شکل تھا، بلکہ ملتان میں اس کا اچھا خاصا وسیع گاڑیوں کے شوروم کا کاروبار بھی تھا۔ جس میں اس کے ایک دوست کی شراکت بھی تھی۔ دلشاد کو مراد کی کمائی اور وجاہت پہ بڑا ناز تھا۔ اس لیے تو وہ اسے اپنی بھتیجی سے بیاہنے کے چکروں میں تھیں۔ مگر مراد کے مطالبے نے ان کا موڈ خراب کرکے رکھ دیا تھا۔

"جیسے رابعہ خوش آباد بس رہی ہے، ویسے ہی ماریہ کو بسائیں گی۔" شگفتہ نے تلخی سے پوچھا۔

"دیکھو شگفتہ! تم اپنے گھر کی ذمہ دار رہو تو بہتر ہے۔ میں ساجدہ سے بات کر رہی ہوں۔" دلشاد نے روکھے انداز میں شگفتہ سے کہا۔ انہیں حقیقتاً "نند کی دخل اندازی بری لگی تھی۔

"ہاں تو ساجدہ! تم مجھے بتاؤ، میں کب مراد کی بارات لے کے آؤں۔" دھونس بھرے انداز میں ساجدہ سے پوچھا جو جیٹھانی کے مطالبے پہ گم صم بیٹھی تھیں، چونک کر سر اٹھایا۔

"دیکھیں بھابھی! میں بچیوں، بلکہ ماریہ سے مشورہ کرتی ہوں۔ آخر زندگی اس نے ہی گزارنی ہے۔"

"جس سے بھی مشورہ کرلو، مگر جواب ہاں میں ہی ہونا چاہیے۔" تحکمانہ انداز میں کہتے ہوئے خود بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور ثوبیہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اور رابعہ؟" ساجدہ نے ڈوبتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"رابعہ فی الحال بیٹھی رہے۔ جب ماریہ کو رخصت کرانے آئیں گے، تو اسے بھی ساتھ لے جائیں گے۔" متکبرانہ انداز میں کہتے ہوئے وہ دونوں ماں بیٹی تو باہر نکل گئیں۔ مگر ساجدہ نے بے ساختہ سر کو تھام لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دیکھا اماں! تجھے نہ کہتی تھی کہ بھائی سے الجھنا ٹھیک نہیں۔ چاچی ساجدہ سے منوا کر ہی رہیں گے۔" ثوبیہ خوشی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں تیری ترکیب ٹھیک رہی۔ میں خوامخواہ مراد کی نظر میں بری بن رہی تھی۔ اگر وہ خرچا پانی بند کردیتا تو میں کیسے چولہا جلا پاتی۔"

"تو اور کیا۔ میری تعلیم کا سارا خرچا ہی بھائی مراد اٹھا رہا ہے۔ اگر بگڑ گیا تو میری تعلیم تو ادھوری رہ جانی ہے۔" سرخ رنگے ہوئے بالوں میں انگلی چلاتے ہوئے ثوبیہ نے خدشہ ظاہر کیا۔ مراد کو انہوں نے یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ ساجدہ نے ابھی سوچنے کا وقت مانگا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ رابعہ کی واپسی بھی اس کی شادی سے مشروط کردی ہے۔ پوچھا تو منیر نے بھی تھا رابعہ کے بارے میں۔ مگر اپنے انداز سے۔

"ہاں! تیری بہو کا ابھی میکے سے جی نہیں بھرا۔ اس کے گھر کی روٹیاں راس آگئی ہوں گی۔ معلوم ہے نا یہاں کام کرکے کھانا پڑتا ہے۔ وہاں پلنگ پہ بیٹھی ہوگی مہارانی۔" عجیب کٹیلا انداز تھا۔

"میرا بچہ! اس کا دل چاہ رہا تھا ماں کے گھر رہنے کو تو میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔ میں بوڑھی بیماری ماری جیسے تیسے کام کرتی رہتی ہوں۔ بس نصیب والے ہوتے ہیں وہ جنہیں بہوؤں کی خدمت نصیب ہوتی ہے۔" دلشاد بیگم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"امپاسبل۔۔۔ میں مر تو سکتی ہوں، مگر اس جاہل ماحول میں نہیں جاسکتی۔ امی! آپ کو اسی وقت منع کردینا چاہیے تھا۔" ماریہ نے جب سے اس پرپوزل کے بارے میں سنا تھا۔ اس وقت سے جلے پیر کی بلی کی طرح ادھر ادھر چکراتی غصہ نکال رہی تھی۔

"ہونہہ۔۔۔ میری بہن میں زندگی کی رمق تک نہیں چھوڑی اور چلی ہیں دوسری کا ہاتھ مانگنے، مرغیوں کی بیٹ، گائیں، بھینسوں کے اپلے تھاپنا، لپائی کرنا۔۔۔ چھی، مجھے تو یہ سب سوچتے ہی ابکائی آرہی ہے۔" کہا کہ

وہاں جا کے ساری زندگی بسر کرتا۔" ماریہ کراہت آمیز انداز میں بولی۔

"تمہارے لیے انکار کرنا مشکل نہیں ہے۔ مگر مسئلہ تو رابعہ کا ہے جو کب سے میکے کی دہلیز پہ آ بیٹھی ہے۔" ساجدہ ملول انداز میں بولیں۔ بیٹی کا غم انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔

"امی! اگر ہم نے ماریہ کا ہاتھ نہ تھمایا تو کیا خدانا خواستہ رابعہ باجی ساری زندگی یہیں رہیں گی۔" سعدیہ نے خوف زدہ انداز میں ساجدہ سے پوچھا۔

"بیٹا! کیا کہہ سکتے ہیں۔ جو رب بہتر کرے؟" ساجدہ اٹھ کر وضو کرنے چل دیں۔

☼ ☼ ☼

"باجی! ایک تو میں نے بنا لیا ہے۔ باقی سب کچھ سعدی کر رہی ہے۔ آپ کے ذہن میں کوئی پسند کی ڈش ہے تو وہ بھی بتا دیں میں شامل کر لیتی ہوں۔" ماریہ بولتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

"نہیں کچھ خاص نہیں' اتنا اہتمام مت کرو۔" رابعہ نے بجھے انداز میں جواب دیا۔

"ارے کیسے اہتمام نہ کریں میری پیاری پیاری اکلوتی بھانجی کی فرسٹ برتھ ڈے ہے۔" کہتے ہوئے ماریہ نے جھولے میں سوئی ہوئی حبہ کی پیشانی کو چوما۔ پھر مڑ کر رابعہ کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

"ذرا اپنے حلیہ پر بھی رحم کر لیں۔ کپڑے اتنے میلے چیکٹ ہو چکے ہیں کہ قسم سے ہماری باجی لگ رہی ہیں۔ اگر آپ کے جھونجھ بالوں میں کنگھی گھس جائے تو میں جرمانہ بھرنے کو تیار ہوں۔ آج آپ کی صاحب زادی کی سالگرہ ہے اور آپ ہیں کہ ہنوز ماتم زدہ صورت بنائے بیٹھی ہیں۔ یہ کپڑے چینج کر کے فٹافٹ باہر آ جائیں۔ پھپھو اور فہد آنے والے ہیں۔" ماریہ نے الماری سے جوڑا نکال کر رابعہ کے پاس ڈالا اور خود کچن میں کیک کی خیر خبر لینے چل دی۔

فنکشن بے حد خوش گوار رہا۔ رابعہ نے کپڑے چینج کر کے بال تو بنا لیے مگر چہرے پہ دکھ اور اداسی کی تحریر اتنی واضح تھی کہ شگفتہ ٹھٹک گئیں۔

"رابعہ خیر سے بیاہتا ہے۔ یوں میکے بیٹھے رہنا آخر کب تک مناسب رہے گا۔ دلشاد بھابھی سے مل کر اس مسئلے کا حل نکالتے ہیں۔ آخر سال ہو چکا ہے۔" شگفتہ اپنی پلیٹ اور کپ لے کر ساجدہ کے پاس آ بیٹھیں۔

"ان کے پاس ایک ہی حل ہو گا ماریہ کی مراد سے شادی۔" ساجدہ بے بسی سے بولیں۔

"تو آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ مراد بہت مختلف لڑکا ہے۔ اچھا سلجھا ہوا اور تمیزدار بس تم بس ماریہ کو قائل کرو۔"

"بڑی بیٹی کا گھر بسانے کے لیے دوسری کی زندگی برباد کر دوں۔" ساجدہ نے زخمی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"خدانا خواستہ برباد کیوں' بہت فرق ہے دونوں بھائیوں میں۔" شگفتہ اپنی بات پہ زور دے کر بولیں۔

"جی امی! مراد کا منیر سے کوئی مقابلہ ہے ہی نہیں۔ مراد کا پڑھے لکھے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ کاروباری سوجھ بوجھ کا مالک ہے۔ پورا گھر وہی چلا رہا ہے۔ میرا بھی وہی خیال رکھتا ہے۔" رابعہ بھی دھیمے انداز میں شامل گفتگو ہوئی۔ ساجدہ عجیب مخمصے میں پڑ گئیں۔

"میں ماریہ کی رضامندی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی اور ماریہ کا وہی ایک سال پہلے والا فیصلہ۔"

"میں مر تو سکتی ہوں مگر اس جاہل ماحول کے پروردہ مراد کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتی۔" ٹھوس لہجہ اٹل انداز۔

"دیکھو ماریہ! یہ مت دیکھو کہ مراد منیر کا بھائی ہے' ہم بہنیں بھی آپس میں کوئی قدر مشترک نہیں رکھتیں۔ چاچی یہ رشتہ سراسر مراد کی چاہ پہ لے کر آئی ہیں۔ صرف وہی ان کو مجبور کیے ہوئے ہے۔ وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔" ماریہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے رابعہ ہولے سے بولی۔ ماریہ کے چہرے پہ سخت اضطراب چھا گیا تھا۔

"دیکھو بیٹا! تمہارے فیصلے سے تمہاری بڑی بہن کا

مستقبل جڑا ہے۔ اس کی حالت تمہارے سامنے ہے۔ نہ زندوں میں' نہ مردوں میں۔ بچی ابھی ایک سال کی ہے۔ کل کو بڑی ہوگی تو باپ کا پوچھے گی۔" شگفتہ نے ماریہ کو سوچ میں پڑتے دیکھ کر کہا۔

"نہیں پھپھو! آپ اسے میرے لیے مجبور نہ کریں۔ میرے' جو نصیب میں ہے' وہ مجھے مل کر رہے گا۔"

رابعہ مضبوط لہجے میں بولی۔ پھر ماریہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تم بس یہ بتاؤ۔ کیا واقعی تمہارا دل مراد کے لیے سو فیصد انکاری ہے؟"

"میرا دل؟" رابعہ کی بات پہ ماریہ نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ مراد کی خود پہ جمی شوق نگاہیں یاد آئیں تو دل بے ساختہ ایک نئی تال پہ دھڑک اٹھا۔ ہتھیلیاں پسینے سے تر اور آنکھیں خود بخود جھکتی چلی گئیں۔

✡ ✡ ✡

چار کنال پہ محیط کچے اور گائیں' بھینسیں' بکریوں اور مرغیوں والے گھر میں ماریہ کو مراد کی طرف سے ایسی والہانہ' پرجوش اور خالص محبت ملی کہ وہ اپنی قسمت پہ نازاں ہوئے بغیر نہ رہ پائی۔

مراد ایک مضبوط' باکردار اور ٹھوس رائے رکھنے والا مرد تھا۔ جو بیوی کی عزت کرنا بھی جانتا تھا اور کروانا بھی۔ دلشاد بیگم چھوٹی بہو بیٹے کی باہمی محبت و ذہنی ہم آہنگی پہ سوائے پیچ و تاب کھانے کے اور کچھ نہ کر سکتی تھیں۔ کیونکہ مراد اپنے بھائی منیر کی طرح نہ تو کانوں کا کچا تھا' نہ ہی بیوی کے حقوق سے نابلد۔ ساجدہ' ماریہ کی طرف سے متفکر رہتی تھیں کہ کہیں اس کا بھی رابعہ کی طرح حال نہ ہو۔

سعدیہ کو گاہے بگاہے فون پہ بہنوں کی خیریت پوچھنے کا کہتی رہتیں۔

"ارے امی! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں رابعہ باجی کی طرح سر جھکانے کی نہیں' بلکہ سر ٹکرانے کی قائل ہوں۔ اگر مقابل عزت دینے پہ آمادہ نہ ہو تو اپنے حقوق کی حفاظت کرنا مجھے خوب آتا ہے۔" وہ خوشی سے کھنکتے لہجے میں انہیں مطمئن کرتی۔

"اور وہ دھول مٹی سے اٹی فضا تمہیں پریشان تو نہیں کرتی۔ وہ ہر وقت مویشیوں کے ڈکرانے کا شور تمہیں سر درد میں مبتلا تو نہیں کرتا؟" سعدیہ شرارت بھرے انداز میں اسے اس کے سابقہ اعتراضات یاد دلاتی۔

"ارے ان سب کو چھوڑو۔۔۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ یہاں کتنا سکون ہے۔ ہر طرف ہریالی' فطری خوب صورتی' سچ ایسی فطری زندگی مجھے بہت اٹریکٹ کرتی ہے۔" ماریہ کا لہجہ سو فیصد صداقت لیے ہوتا۔

✡ ✡ ✡

"بیٹا! یہ سب لانے کی کیا ضرورت تھی؟" ساجدہ کا اشارہ سموسوں اور جلیبیوں کے تھیلوں کی طرف تھا جو فہد ابھی ان کی طرف آتے ہوئے بازار سے لیتا آیا تھا۔

"ماں جی! ماریہ کے لیے پہلے بھی تو لاتا تھا۔ اب وہ تو نہیں ہے' مگر مجھے خالی ہاتھ آتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔" فہد نے مؤدب ہو کر جواب دیا تو ساجدہ بے ساختہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگیں' جس کی موجودگی نے انہیں کبھی نرینہ اولاد کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔

"محترمہ تو کافی خوش و خرم ہیں اپنے گھر۔ دعوت دی ہے اپنے گھر آنے کی۔" کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے فہد نے ماریہ کی بابت بات کی۔

"ہاں اللہ کا شکر ہے۔ دونوں بہنیں کافی خوش اور آسودہ ہیں۔ ماریہ کے جانے سے اب رابعہ کو بھی کافی سہارا مل گیا ہے۔ وہ دبو اور بے وقوف اپنی کم اعتمادی سے جو بات کہہ نہیں سکتی تھی اب ماریہ اسے بے دھڑک منوا لیتی ہے۔"

ساجدہ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ بیاہتا بیٹیوں کی آسودگی نے انہیں ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔

"بس ماں! ساری بات اپنے شوہر کی ہوتی ہے۔ اگر

وہی ہمدرد' مہربان اور دوستانہ فطرت کا ہو تو ماریہ کیا ہر لڑکی ایسے ٹھاٹ سے جی سکتی ہے۔" فہد گہری نظروں سے سعدیہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ جو ابھی اس کے لیے چائے لے آئی تھی اور نیچے پنجوں کے بل بیٹھی اس کے لیے کپ بنا رہی تھی۔

"بیٹا! یہ جلیبیاں' سموسے اور مٹھائی بھی پلیٹوں میں نکال کر لے آؤ۔" ساجدہ نے سعدیہ سے کہا تو وہ سر ہلا کر اندر کچن میں چلی گئی۔

"فہد چندا! تم چائے پیو' میں تب تک عصر پڑھ لوں۔" ساجدہ اپنے گھٹنوں پہ زور دے کر کھڑے ہوتے ہوئے بولیں اور اندر کمرے میں چل دیں۔

"ارے آؤ۔ تم بھی ٹیسٹ کرو نا یہ مٹھائی' میں تمہارے لیے لے کر آیا ہوں۔" سعدیہ پلیٹیں فہد کے سامنے میز پر رکھ کر جوں ہی پلٹی تو فہد نے آواز دی۔

"کس خوشی میں لے کر آئے ہو؟" اس نے برفی کا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ جی نے ماسی دلشاد کو دو بیٹوں سے نوازا ہے۔ اس خوشی میں۔" چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے فہد نے بتایا۔

"یہ کیا بات ہوئی فہد۔ فضول مذاق۔۔۔" سعدیہ ناراض ہوئی۔

"ارے مذاق نہیں سچ کہہ رہا ہوں۔ ایسے بیٹھے بٹھائے ایک دم مجھے خیال گزرا کہ اگر خدا نے ماسی دلشاد کو تیسرا بیٹا دیا ہوتا تو وہ تمہیں بھی اپنے گاؤں لے جا چکی ہوتیں' جیسے ماریہ کو بلیک میلنگ سے اپنی بہو بنا چکی ہیں۔ سوچو ایسے میں مجھ بے چارے کا کیا حال ہوتا۔" آنکھیں لٹپٹاتے ہوئے فہد نے سراسر مصنوعی انداز میں دریافت کیا۔ سعدیہ جو توجہ سے فہد کی بات سن رہی تھی اس کے آخری فقرے پہ کانوں تک سرخ پڑ گئی۔

"تو وہی ہوتا جو منظور خدا ہوتا۔" سرسری انداز اپناتے ہوئے وہ برتن ٹرے میں رکھنے لگی۔

"وہی تو کہہ رہا ہوں کہ لڑکی تم بھی میرے ساتھ خوشی کی مٹھائی بانٹو۔ بلکہ ہو سکے تو شکرانے کے نوافل ادا کرتی رہا کرو۔ بالفرض میرا "رقیب روسیاہ" ماسی دلشاد کے گھر جنم لے چکا ہوتا تو میری ان کے ہتھکنڈوں کے سامنے کتنی چلتی؟" جلیبیاں کھاتے ہوئے وہ مزے سے کہہ رہا تھا۔

"توبہ ہے فہد! بس باتوں کے شہنشاہ ہو تم۔" وہ بے ساختہ ہنستی چلی گئی اور اس کے چہرے پہ ہنسی نے اتنے خوب صورت رنگ بکھیرے کہ فہد یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

☼ ☼ ☼

دلشاد کے بڑے بھائی نے اپنے بیٹے شوکت کے لیے ثوبیہ کا ہاتھ مانگا تو ثوبیہ نے رو رو کر برا حال کرلیا۔

"مگر ثوبیہ! شوکت میں آخر کس چیز کی کمی ہے۔ تمہارا کزن ہے۔ زمین دار ہے۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔" ماریہ نے نرم و دوستانہ انداز میں اس کے انکار کی وجہ جاننا چاہی۔

"ہونہہ۔۔۔ کس چیز کی کمی ہے۔ نہ شکل' نہ تعلیم' میں بی اے پاس اور وہ گھڑی پہ ٹائم نہیں دیکھ سکتا۔ کیلنڈر پہ تاریخ نہیں ڈھونڈ سکتا۔ سایوں سے وقت بتا سکتا ہے۔ موبائل پہ صرف سرخ اور سبز بٹن دبانے کا پتا چلتا ہے اور پوچھتی ہیں کس چیز کی کمی ہے؟" ثوبیہ حلق کے بل چلائی' آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"اچھا نہ رو میری بچی! تیرے ساتھ کوئی زور زبردستی تو نہیں۔ جیسا تو کہے گی ویسا ہی کریں گے۔" دلشاد اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پیار سے بولیں۔

"میں تو اسی لیے خوش ہو رہی تھی کہ شوکت میرا بھتیجا ہے۔ میری بیٹی اپنوں میں جائے گی' میری آنکھوں کے سامنے رہے گی اور بس۔"

"تو اور کیا اماں! میں بھی تو یہی چاہتی ہوں کہ میں خاندان سے باہر نہ جاؤں۔ مگر یہ دیہات نہ ہو۔ مجھے شہری زندگی بہت اچھی لگتی ہے۔ پڑھا لکھا اور منظم ماحول۔" ثوبیہ کا لہجہ خواب آگیں تھا۔

"تو کہنا کیا چاہتی ہے؟" دلشاد کے پلے کچھ نہ پڑا۔

ٹھٹک کر ثوبیہ کا چہرہ دیکھا' جہاں اب دھیمی دھیمی مسکان سجی ہوئی تھی۔

"میں فہد سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ پھپھو شگفتہ کے بیٹے فہد سے۔" ثوبیہ نے آرام سے بم پھوڑا۔

☼ ☼ ☼

ابھی ڈلیوری میں پورے دو ماہ پڑے تھے۔ مگر ماریہ نے میکے کی پیکنگ کرنا شروع کر دی۔

"اب تو مسلسل مجھے گائنی کے ہاں جانا ہو گا۔ میں باربار لمبا سفر نہیں کر سکتی۔ اچھا ہے کہ امی کے ہاں قیام کر لوں۔" مراد کی بے قراریوں کو نظرانداز کرتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولی۔ ماریہ کو تیاری کرتا پا کر رابعہ کے دل میں بھی ماں سے ملنے کی ہڑک جاگ اٹھی۔ سو وہ بھی ساتھ ہو لی۔

بیٹیوں کو خوش و مطمئن پا کر ساجدہ کا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ ماریہ نے ایک صحت مند بچے کو جنم دیا۔ مراد ملتان سے سیدھا اپنے بچے و بیوی کو دیکھنے مع ڈھیروں مٹھائی اور کھلونوں کے ساتھ آپہنچا۔ پھر ایک دو دن بھرپور خوشگوار وقت گزار کر ملتان سدھارا۔

"مگر یہ بھابھی دلشاد کیوں نہیں آرہیں پوتے کو دیکھنے۔" ساجدہ کو ایک نئی فکر نے آن گھیرا۔

"امی! ان کے ذمے ڈھیروں مویشیوں کا چارہ بھوسہ ہوتا ہے۔ انہیں کس کے سہارے پہ چھوڑ کر آئیں۔" رابعہ نے انہیں تسلی دی۔ دلشاد بیگم نے کیا آنا تھا۔ البتہ ان کا نیا مطالبہ ضرور سامنے آگیا تھا۔ ثوبیہ کی فہد سے شادی ورنہ بصورت دیگر ماریہ اور رابعہ تاحیات ماں کے گھر پہ بیٹھی رہیں گی۔

"اف۔۔۔ میرے خدایا! پھر نئی مصیبت۔" سب نے سر تھام لیا۔ لو جی میں فہد اقبال کوئی چھ فٹ کا انسان نہ ہوا کوئی کھلونا ہو گیا' جو ثوبیہ بی بی بڑے دھڑلے سے مانگ رہی ہیں۔"

فہد کو ثوبیہ کی ڈھٹائی' بلکہ بے حیائی پہ جی بھر کے غصہ آرہا تھا۔

"بھابھی دلشاد تو سراسر بلیک میل بنی ہوئی ہیں۔ پہلے رابعہ کو بٹھا کر ماریہ کا ہاتھ مانگ لیا اور اب دونوں کی زندگی برباد کر کے اپنی بیٹی کا گھر آباد کرنا چاہتی ہیں۔ تف ہے ایسی پلاننگ پہ۔" شگفتہ کو بھی بڑی بھابھی کی منصوبہ ساز طبیعت پہ بے حد غصہ آیا ہوا تھا۔

"یا اللہ! یہ کیسی آزمائش میں ڈال دیا ہے میری بچیوں کو۔ ہوا کی زد پہ ان کے گھر آیا ہوا ہے۔" ساجدہ رندھے ہوئے لہجے میں بولیں۔ منیر تو تھا ہی موم کی ناک والا۔ جدھر ماں' بہن نے موڑا' مڑ گیا۔ مگر مراد کو کیا ہوا۔ وہ تو ہر وقت ماریہ کی محبت کا دم بھرنے والا شوہر تھا۔ مراد کی خاموشی سب کو ہی معنی خیز لگ رہی تھی۔ ماریہ نے مراد کا نمبر ملایا۔

"سوری ماریہ! میں تمہیں لینے نہیں آسکتا۔ جب تک پھپھو شگفتہ' ثوبیہ کا ہاتھ مانگنے نہیں آجاتیں۔" مضبوط مرد کا لہجہ بہت کمزور تھا۔ مارے بے یقینی سے ماریہ سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

"مگر مراد! سب جانتے ہیں پھپھو نے سعدیہ کو بچپن میں مانگ لیا تھا۔ اب انہیں یہ ثوبیہ کا خیال کیوں آیا۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"تو کون سا نکاح ہوا ہے۔ تم چاچی پہ زور دو کہ وہ خود ہی یہ رشتہ توڑیں۔ میری یتیم بہن کی خوشیوں کا سوال ہے۔" وہ کٹھور پن سے بولا۔

"اور یہ میری بہن کے بھی خوابوں کا سوال ہے۔" ماریہ نے غصے سے فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"امی! میں فہد سے شادی نہیں کر سکتی۔ آپ پھپھو کو انکار کر دیں۔" سعدیہ بے حد سنجیدہ تھی۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے کہ تم انکار کرو گی تو میں ثوبیہ سے شادی کر لوں گا۔" فہد ایک دم سے سامنے آکر بولا تھا۔ چہرے پہ بے قراری اور اضمحلال چھایا ہوا تھا۔ دلشاد کے مطالبے نے حقیقتاً" سب کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔

"تو لو۔۔۔ کیا میرے خواب' خواہش سب کسی بچے کا
دیوانے کی باتیں ہیں۔ جو آج تم سے نسبت ٹوٹی تو کل

کسی اور کے خیالوں سے اپنا خوابوں کا جہاں بسا لوں گا۔" وہ اس کے سامنے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے ونگ انداز میں پوچھ رہا تھا۔ ساجدہ بے بسی سے دونوں کو دیکھنے لگیں۔

"میری بہنوں کی زندگی میری وجہ سے خراب ہو رہی ہے۔ دلشاد چاچی جس بالک ہٹ پہ آئی ہوئی ہیں۔ ان کا اثر باجیوں اور ان کے بچوں پر پڑ رہا ہے۔" وہ غمناک لہجے میں بولی۔ فہد اس کی اولین چاہت تھا۔ اس کے نوخیز جذبوں کا امین' اپنی دوستی کے شفاف و بے داغ ریکارڈ میں لپٹی محبت سے دستبرداری کا خیال ہی ان دونوں کے جسموں سے روح نکال رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

دلشاد نے بانس والی سیڑھی کچے کوٹھے کے پچھواڑے سے لگائی اور دھوئی ہوئی گندم سے بھرا تھال سر پر رکھ کر سیڑھی پہ چڑھنے لگیں۔ سالہا سال کی مشق سے وہ پاؤں جما جما کر چڑھتے ہوئے با آسانی چھت پہ پہنچ گئیں۔

آج انہوں نے گھر کے سارے کام پس پشت ڈالتے ہوئے گندم دھونے کا کام شروع کر رکھا تھا۔

چار کنال پہ محیط صحن کے دو دروازوں میں سے کبھی محلے کا بھٹکتا ہوا جانور گھر میں آنکلتا' تو کبھی گھر کا کوئی مویشی رسی تڑوا کر گندم کے دانوں پہ ٹوٹ پڑتا' جنہیں دلشاد سکھانے کے لیے زمین پہ پھیلاتی تھیں۔

پچھلی بار بھی کٹا اپنے کھونٹے سے چھوٹ کر سیدھا دانوں پہ کھڑا ہو گیا تھا۔ جب دلشاد کی نظر کٹے پہ پڑی اس وقت تک وہ کافی مقدار میں دانے اپنے پیٹ میں منتقل کر چکا تھا۔ بہتیرا تیل' دوائی اس کے منہ میں انڈیلے۔۔۔ مگر چار ہزار کا جانور چند گھنٹوں میں چٹ پٹ ہو گیا۔

دلشاد کئی دنوں تک اپنے لاڈلے کلوٹے کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہیں' ساتھ اپنی عقل کو بھی کوستی رہیں کہ کھونٹا مضبوط کیوں نہ باندھا؟ ایسے میں ہمسائی صغریٰ نے آئیڈیا دیا کہ اگر دانوں کو تم چھت پہ خشک ہونے ڈال دو تو آئندہ کے لیے ایسے نقصانات سے بچا سکتا ہے۔ آئیڈیا دلشاد کے دل کو لگا تھا اور وہ اس پہ دل سے عمل کرتی آرہی تھیں۔ نہ رکھوالی کا سر درد نہ کسی بے زبان جانور کی جان جانے کا اندیشہ۔

ساتھ والی زلیخاں بھی اپنی کچی چھت کی لپائی میں مصروف تھی۔ زلیخاں سے باتوں کے دوران دلشاد تیزی سے ہاتھ مار کر گندم پھیلاتی جا رہی تھیں۔ ایسے ہی بے دھیانی میں بولتے بولتے گندم ہتھیلی سے برابر پھیلاتے پھیلاتے دلشاد چھت کے عین کنارے پہ پہنچ گئیں اور اگلے ہی لمحے بد قسمتی سے وہ ذرا پیچھے ہوئیں اور دھڑام سے پیچھے گلی میں جا گریں۔ گلی میں جا بجا پتھر اور ٹوٹے ہوئے اینٹ کے ٹکڑے پڑے تھے۔ جن پہ دلشاد کا بھاری بھرکم وجود زور سے جا ٹکرایا تھا۔

✲ ✲ ✲

دلشاد کے کولہے اور ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ پتھر کی نوک لگنے سے پیچھے سر پہ بھی کافی ٹانکے لگے تھے۔ دایاں بازو الگ مجروح ہوا تھا۔

مراد کو ماں کے گرنے کی اطلاع ملی تو وہ فورا" اسے شہر کے اسپتال لے گیا۔ اسپتال کے سرد کمرے' دوائیوں کی بدبو اور سنجیدہ چہروں والے ڈاکٹروں سے خوف زدہ دلشاد نے ایک ماہ ایڈمٹ رہنے کے بعد مراد سے گھر چلنے کی رٹ لگا دی۔

"مراد! مجھے بس یہاں سے لے چل۔ میں اپنی آخری سانسیں اس گھر میں لینا چاہتی ہوں۔ جہاں تیرا ابا مجھے بیاہ کر لے آیا تھا۔" سراپا پلستر اور پٹیوں میں جکڑی درد سے بے حال وہ رو پڑی تھیں۔ گھر آکر سکون کیا ملنا تھا۔ الٹا ایک ایک ضرورت کے لیے انہیں چیخنا پڑ گیا تھا۔

"ارے ثوبیہ! اری او ثوبی!!" انہوں نے دروازے کی طرف منہ کر کے ثوبیہ کو آواز دی۔

"کیا ہے اماں! کیوں چلا رہی ہے؟" بگڑے ہوئے انداز میں آکر پوچھا۔ گاؤں میں موبائل سگنلز ٹھیک نہیں آرہے تھے۔ دوستوں سے کئی دنوں سے رابطہ نہ

ہو پارہا تھا۔ تب ہی اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔

"مجھے باہر صحن میں لے چل۔ مجھے دھوپ سینکنے کا جی کر رہا ہے۔" دلشاد نے کراہتے ہوئے کہا۔

"ہاں تجھے باہر لے چلوں اور تھوڑی دیر بعد تجھے سردی لگنے لگے گی تو پھر تجھے اندر لے آنا ہو گا۔ مجھ سے یہ خواری نہیں ہوتی اور ویسے بھی تیرے جیسی تن و توش والی عورت کو میں بمشکل ہلا سکتی ہوں۔" ثوبیہ بے مروتی سے بولی تو دلشاد کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔

"شاباش میری بچی' تیری پڑھائی لکھائی کو سلام۔ آج ماں محتاج' لاچار چارپائی پہ پڑی ہے تو تجھے بوجھ محسوس ہونے لگی ہے۔" دلشاد کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھلی ہوئی تھی۔ اسے حقیقتاً اپنی بے بسی اور لاچاری سارا دن رلاتی تھی۔

"اچھا۔ زیادہ جذباتی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔" ثوبیہ بدتمیزی سے بولی۔

"تجھے اندر' باہر لے جانا' دائیں بائیں کروٹ دلانا' بار بار واش روم لے جانا' تیری دوا' خوراک کا خیال رکھنا' یہ سب کتنا مشکل اور تھکا دینے والا ہے' تو سمجھ نہیں سکتی۔" ثوبیہ جھنجلا کر بولی۔ اس کا بھلا کب ایسے کاموں سے پہلے واسطہ پڑا تھا۔ اس کا کام تو بس چارپائی پہ بیٹھ کے کھانا اور پڑھنا تھا۔ دلشاد نے اسے بہت ناز سے پالا ہوا تھا۔ گھر گھرداری سے تو اس کا برائے نام واسطہ پڑتا تھا۔ اب تو اپنے ساتھ ساتھ ماں کے لیے بھی پرہیزی کھانا تیار کرنا پڑا تو بی بی ثوبیہ کے تو اوسان ہی جواب دے گئے۔ چار دن ہی میں فیصلہ سنا دیا۔

"اماں! یا میں تیرے ساتھ لگ کر تیری خدمت کر سکتی ہوں یا پھر چولہا سنبھال سکتی ہوں۔ میں کوئی جادوگرنی نہیں ہوں کہ دونوں طرف کام سنبھالے رہوں۔" وہ روہانسی ہوئی تھی۔

"تو کیا کبھی چولہا چکی نہیں کرنی۔ سچ تجھ سے تو میری دونوں بہویں اچھی ہیں جنہوں نے آتے ہی پورا گھر اسلیقے سے سنبھال لیا تھا اور تو ہے کہ چار جماعتیں پڑھ کر پتا نہیں خود کو کیا سمجھنے لگی ہے۔ آخر وہ بھی تو شہری اور پڑھی لکھی ہیں۔" دلشاد کو اعتراف کرنا ہی پڑا۔

"اچھا تو اتنی ہی اچھی بہویں ہیں آپ کی تو انہیں لے آئیں جا کر۔ خوب خدمت کروائیں اور مجھے معافی دو۔" ثوبیہ بھی آخر ان ہی کی بیٹی تھی سو ترخ کر بولی۔

"کرواتی خدمت۔ ذرا' ذرا سی حاجت کے لیے مجھے حلق پھاڑ کر آوازیں نہ لگانی پڑتیں۔ وہ تو تیرا رشتہ جوڑنے کے چکر میں انہیں ماں کے گھر بٹھا دیا۔ ان ہی دو معصوم یتیموں کی بددعائیں مجھے لگی ہیں جو آج میں چارپائی کی ہو کر پڑی ہوں۔" دلشاد پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ پٹیوں میں جکڑا ان کا مجروح وجود ہولے ہولے ہل رہا تھا۔

"اپنے بچوں کا گھر خراب کیا۔ مراد تو اپنی بیوی کو دیکھ دیکھ کر جیتا تھا کیسے میں نے جدائی کی دیوار دونوں کے بیچ کھڑی کی اور میری پوتی اپنے باپ سے کتنی محبت کرتی ہے۔ آہ۔ کتنے دل اجاڑے ہیں میں نے صرف تیرا گھر بسانے کے لیے۔"

"اچھا۔ اب سارے گناہ میرے کھاتے میں نہ ڈال۔ بھابھی رابعہ پہ جو ظلم کے پہاڑ تو نے توڑے تھے۔ وہ میں نے کیے تھے۔ بھائی منیر سے آتے جاتے اسے پٹواتی رہیں۔ کیا وہ میری منشا پہ ہوا تھا؟" ثوبیہ طنز سے بولی۔

"دونوں بھابھیوں کو میکے بٹھانے کی اسکیم تیری تھی۔ میں نے تو سیدھا سیدھا فہد کا ساتھ مانگا تھا۔ تو خود ہی گھی نکالنے کے لیے انگلیاں ٹیڑھی کرنے لگ گئی تھی۔"

"ہاں تیری چاہ کو پورا کرنے کے لیے انگلی کیا ٹیڑھی کی کہ میرا پورا وجود ہی چور چور ہو گیا۔" ندامت سے چور بھرے ہوئے انداز میں بولتے ہوئے دلشاد نے آنکھیں چھت پہ ٹکا دیں۔

☆ ☆ ☆

"او بوا شادو! آج تو مجھے تو بھلی چنگی نظر آرہی ہے۔ خیر نال جلد ہی چلنے پھرنے لگے گی۔" ہشاش بشاش انداز میں بولتے ہوئے شوکت اندر کمرے میں داخل

ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں موسمی پھلوں کے شاپر تھے۔

"میرا چن! اماں بھلی چنگی ہوں۔ گوڈے گٹے تڑوا کے پڑی ہوں۔ بس تیرے چہرے کو دیکھ کے کلیجے میں ایسی ٹھنڈ پڑی ہے کہ تجھے میری حالت بہتر لگنے لگی ہے۔"

دلشاد بھتیجے کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ شوکت بلاناغہ ان کی حالت دریافت کرنے آجاتا تھا۔ ایک تو دلشاد کی خیریت اور دوسرا ثوبیہ کو بھی تو دیکھنا مقصود ہوتا تھا۔ بس اسے ایک نظر دیکھنے سے ہی من اندر تک شانت ہوجاتا تھا۔ روم روم میں سکون در آتا۔

ثوبیہ اس کے اس طرح والہانہ و پرشوق انداز پہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتی رہتی۔ چہرے کے زاویے خوب بگاڑ بگاڑ کے اپنی ناگواری جتاتی مگر مجال ہے جو شوکت اثر لے لے۔ وہ تو ثوبیہ کی اس بے نیازی اور بے اعتنائی کو محسوس کرنے کی بجائے جمال یار کی ایک ادا ہی سمجھتا تھا۔

"مراد پتا نہیں تجھے کن ڈاکٹروں کے پاس لے گیا ہے۔ اگر تو میرے ساتھ ادھر قریب والی بستی کے "جراح" کے پاس چلتی نا تو آج تو یہاں چارپائی کی بجائے باہر ڈھور ڈنگروں کا کھل بھوسہ کررہی ہوتی۔" شوکت' دلشاد کی پائنتی پہ بیٹھتا ہوا ان سے بولا۔

"ارے بچے! تیری محبت سر آنکھوں پہ۔ مگر مراد بھی مجھے وڈے اسپتال لے گیا تھا۔ وڈے وڈے ڈاکٹر' انگریزی بولنے والے۔ ہر وقت دوا' پانی پلانے والی نرسیں۔" دلشاد ذرا سا مسکراتے ہوئے بولیں۔ جسمانی توڑ پھوڑ نے انہیں حقیقتاً "اندر تک توڑ ڈالا تھا۔ نہ وہ پہلے سا طنطنہ' نا غرور سے بھرا لب و لہجہ۔

شوکت نے محبت سے مغلوب ہو کر سر دبانا چاہا تو دلشاد درد سے بلبلا اٹھیں۔ گھبرا کے کمبل کے نیچے چھپی ٹانگوں کو دبانے کے لیے ہاتھ لگایا تو بھی دلشاد چیخ اٹھیں۔ وہ گھبرا کر باہر نکل آیا۔

ثوبیہ اسے چھپر کے نیچے ہیڈ فون کانوں سے لگائے

میوزک سنتی نظر آئی۔

"تو ٹیپ سن رہی ہے نا؟" پرشوق انداز میں پوچھا گیا۔

ثوبیہ کو خاک سنائی نہ دیا۔ کھینچ کر تاریں کانوں سے نکالیں۔

"کیا کہہ رہا ہے؟" تند انداز میں پوچھا۔

"وہ میں کہہ رہا تھا کہ مجھے بھی تیری طرح گانے سننے کا بڑا شوق ہے۔" وہ گھبرا کر کہنے لگا۔

"میرے ٹریکٹر پہ ٹیپ لگا ہوا ہے۔ جسے میں ہل چلاتے وقت چلا لیتا ہوں۔" سادہ انداز میں بات برائے بات کی۔

"صرف ہل چلاتے وقت کیوں، تم اسپرے کرتے وقت بھی تو سن سکتے ہو نا۔" ثوبیہ نے سراسر شرارتی انداز میں کہا۔

"ہاں ہر وقت سن سکتا ہوں۔ میرے گھر میں بھی بڑا سا ٹیپ ہے۔" دونوں بازوں پھیلا کر ٹیپ کا سائز بتایا گیا۔ انداز کچھ کچھ متاثر کرنے والا بھی تھا۔

"ہاں.... وہ صندوق نما ٹیپ میں اس وقت سے دیکھتی آرہی ہوں۔ جب میں سات سال کی تھی اور جس کے اوپر چڑھائے گئے غلاف کو دنیا جہاں کے موتیوں اور نگوں سے نجانے کس نے سجایا تھا۔" ثوبیہ کا انداز خاصا طنزیہ تھا۔ وہ کانوں میں دوبارہ ہیڈ فون لگانے ہی والی تھی کہ شوکت جلدی سے بول پڑا۔

"وہ ثوبیہ! مجھے تیرے شناختی کارڈ کی نقل چاہیے۔"

"کیوں تو نے میرے شناختی کارڈ کو کیا کرنا ہے۔ ہاں اگر میری تصویر اپنے پاس رکھنا چاہتے ہو تو نقل پہ سادا تصویر اتنی اچھی نہیں ہے۔ البتہ اوریجنل تصویروں میں، میں پوری انوشکا شرما لگتی ہوں۔" وہ خود ستائشی سے بولی۔

"نہیں مجھے نقل ہی چاہیے۔ میں مشرق والی زمین تیرے نام کرنا چاہتا ہوں۔ پٹواری صاحب کو تیرا شناختی کارڈ چاہیے۔" نرم لہجے میں شوکت بولا۔

"مگر کیوں؟ میرے نام تو زمین کس لیے کر رہا ہے۔" وہ شدید حیرت کے زیر اثر بولی۔

"اس زمین پہ میں تجھے اسکول بنوا دوں گا۔ تو اس اسکول کی ہیڈ ماسٹرنی ہوگی۔ گاؤں کے بچوں کو تعلیم دے گی۔ چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں پڑھ لکھ کر اس گاؤں کا نام روشن کریں گے۔" شوکت مضبوط لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کے لفظوں سے جھلکتی سچائی اس کے ارادوں کی پختگی کا پتا دے رہی تھی۔

"اگر مجھے اسکول بنانے کے لیے زمین کی ضرورت پڑی بھی تو میں اپنے بھائیوں سے مانگوں گی۔ تجھے دل بڑا کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔" ثوبیہ رکھائی سے بولی۔

"ارے بھائیوں سے کیوں مانگے گی۔ جب تیرا شوہر کئی مربعوں کا مالک ہوگا تو تجھے کسی سے بھی کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں۔" شوکت اسے نرم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بڑے جذب سے بولا۔ ثوبیہ محض اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"اماں! مجھے لگتا ہے تیرے دماغ پہ چوٹ کچھ زیادہ ہی لگی ہے۔ تب ہی تو ایسی الٹی باتیں کر رہی ہے۔" ثوبیہ ماں کی چارپائی کے قریب ادھر ادھر چکر لگاتے ہوئے غصے سے بولی۔

"میرا دماغ تو ٹھیک ہے۔ مگر تیری مت ضرور ماری گئی ہے۔ تو شکل پہ مرنے والی ہے۔ میں نہیں۔ وہ سولہ جماعتیں پڑھا ہوا، قد میرے بھتیجے شوکت کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہے اور تو چلی ہے اسے میرا جوائی بنانے۔" دلشاد غصے سے ثوبیہ کو دیکھ کر بولیں۔

"ایک ان پڑھ کسی پڑھے لکھے کی برابری نہیں کر سکتا۔" ثوبیہ فوراً بولی۔

"ہاں خوب پڑھا لکھا ہے۔ جسے معلوم ہے کہ ماں مرتے مرتے بچی ہے۔ مگر کبھی جھانک کر میرا حال نہ پوچھا اور یہ شوکت ہے صبح و شام کتنی بار میرا حال

پوچھنے آتا ہے۔"

"ہاں تو اسے مطلب جو ہے نا اس گھر سے۔" ثوبیہ نے یاد دلایا۔

"جو بھی ہے' تو یاد رکھ' اگر تو نے شوکت کو انکار کر کے اس فہد کے لیے اپنی ہٹ دھری جاری رکھی تو میں تجھے اپنا دودھ نہیں بخشوں گی۔" دلشاد نے انگلی اٹھا کر قطعی انداز میں کہا۔ ثوبیہ لب بھینچے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"شوہر وہ ہوتا ہے جس کے لہجے میں بیوی کے لیے محبت اور نظر میں احترام ہو اور تجھے شوکت یہ سب کچھ دے سکتا ہے۔"

"اماں! میرا دل شوکت کے لیے نہیں مانتا۔" ثوبیہ روہانسی ہو کر بولی۔

"دیکھ میری چندا! فہد کے دل میں سعدیہ بستی ہے۔ تو کبھی اس کے دل کو جیت نہ پائے گی۔ شوکت تجھے چاہتا ہے۔ تجھے آرام' محبت اور عزت سے رکھے گا۔ تو میری اکلوتی دھی ہے۔ میں تجھے ادھر اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں' تو صرف اپنے دل کو نہ دیکھو' جسے ہر وقت فہد کا ذکر اچھا لگتا ہے۔ تو یہ دیکھ کہ کوئی دوسرا دل بھی تجھے شدت سے مانگتا ہے' چاہتا ہے۔" دلشاد ٹھہر ٹھہر کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ثوبیہ کے چہرے پہ بے بسی اور اضطراب کی لہریں ابھر رہی تھیں۔

"اور پھر کیا فائدہ کسی کا دل اجاڑنے کا۔ سعدیہ معصوم ہے' بچی ہے۔ سب سے بڑھ کر یتیم ہے۔ خدانخواستہ اس کے ٹوٹے دل کی آہ تمہیں میری طرح کہیں نقصان نہ پہنچا دے۔" دلشاد خوف زدہ ہوتے ہوئے بولیں۔ باہر سے کچھ آوازیں آرہی تھیں۔ ملی جلی مرد و زن کی آوازیں۔ وہ دونوں چونکیں' پھر ثوبیہ باہر نکل آئی۔ باہر صحن کے وسط میں سارے ہی تو موجود تھے۔ چاچی ساجدہ سے لے کر پھپھو' شگفتہ اور ان کے سارے بچے وہ حیرت سے اپنی جگہ جم کر رہ گئی تھی۔

"ہمیں بھابھی کے گرنے کا پتا چلا۔ تو بہت دکھ ہوا۔ ہم ان کی خیریت پوچھنے کو آئے ہیں۔" ساجدہ نرمی سے بولتے ہوئے آگے بڑھیں اور ساکت کھڑی ثوبیہ کو پیار سے گلے لگا لیا۔ ماریہ نے فوراً" چادر اتار کر تار پہ لٹکائی۔ ننھا گل تو تھنا ثوبیہ کی گود میں دے کر چولہے پہ آگئی۔ دن کے کھانے کا ٹائم ہو رہا تھا۔

رابعہ نے جھاڑو اٹھائی اور صحن کی صفائی میں جت گئی۔ حبہ کو سینے سے لگائے دلشاد بیگم کو ایسے لگا جیسے ان کے سارے زخم ایک دم سے مندمل ہو گئے ہوں۔ سینے میں ڈھیر ساری ٹھنڈک اتر گئی تھی۔

ماریہ اور رابعہ نے اس محبت' اپنائیت اور فکر مندی سے خیریت پوچھی کہ انہوں نے اشک ندامت بہانے میں ذرا تامل نہ کیا۔

"ارے چاچی! رو کیوں رہی ہیں؟ خدانخواستہ کوئی زیادہ نقصان تو نہیں ہوا۔ بس اب ہم دونوں آگئی ہیں نا دیکھیے گا ایسا خیال رکھیں گی' دنوں میں چلتی پھرتی نظر آئیں گی۔" ماریہ نے انگلیوں سے ساس کے آنسو پونچھتے ہوئے۔ ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو سب ہی نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ سعدیہ کو بکریوں اور بھیڑوں کے نرم نرم خوب صورت بچے اب بھی اتنے اچھے لگ رہے تھے۔ جتنے کہ اسے اپنے بچپن میں لگتے تھے۔ فوراً" آگے بڑھ کر ایک سرخ و سفید دھبوں والا منمنا اپنی گود میں بھر لیا۔

"تمہاری جانوروں سے محبت کو دیکھتے ہوئے مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے مستقبل میں میرے گھر میں ایک چھوٹا موٹا لائیو اسٹاک ہو سکتا ہے۔" فہد اس کے قریب آکر بولا۔

"جی نہیں۔ مجھے جانوروں سے نہیں صرف ان کے بچوں سے پیار ہے۔" وہ میمنے کی نرم کھال پہ پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"تو کیا خیال ہے ایک' دو ماہی دلشاد سے مانگ نہ لیں تمہارے لیے۔ ساری زندگی انہیں پالتی رہنا۔" فہد نے آئیڈیا دیا۔ "کوئی فائدہ نہیں۔ یہ صرف دو ماہ تک ہی بچے رہتے ہیں۔ پھر بھیڑیا بکری بن جاتے ہیں مجھے

صرف بچوں میں انٹرسٹ ہے۔" سعدیہ منہ بنا کر بولی' تو فہد کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اس لمحے وہ اسے ایک بچی ہی لگ رہی تھی۔

"تو بھی کوئی پرابلم نہیں ہے۔ یہی بھیڑیں اور بکریاں جب بچے دیں گی تو تم ان سے دل بہلاتی رہنا۔ یہ بڑی ہو گئیں تو آگے ان کے بچے۔ تم ہر حال میں خوش رہو گی۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ یہ بڑی ہو جائیں گی تو پھر ان کے بچے آ جائیں گے۔" وہ بے ساختہ خوش ہو کر بولی۔ فہد کا آئیڈیا اس کے دل کو لگا تھا۔

ثوبیہ دروازے کی چوکھٹ پہ کھڑے ہو کر ان دونوں کو آپس میں باتیں کرتا اور ہنستے مسکراتے کافی دیر سے دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا کہ فہد اس درجہ محبت سے اسے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ جتنا اس وقت سعدیہ کو دیکھ رہا ہے۔ اتنی اپنائیت سے اس سے باتیں نہیں کر سکتا۔ اس کی باتوں پہ ہنس نہیں سکتا۔ اسے سراہ نہیں سکتا' کیونکہ اس کے دل پہ تو سعدیہ کا بسیرا ہے۔ وہی اس کے تمام تر جذبوں کی امین ہے۔

وہ کھڑے کھڑے شدید ترین قسم کے احساس کمتری کا شکار ہوئی تھی۔ عجب کم مائیگی کی چادر نے اسے سر تا پیر لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تو پھر کون ہے جو اس کی ذات کو اس کی نظروں میں معتبر کر سکے۔ اسے چاہ سکے' اسے سراہ سکے۔ کون۔ کون؟ وہ یکلخت مڑی اور اندر کمرے میں چلی آئی۔ یہ اس کا اور دلشاد کا مشترکہ کمرہ تھا۔

ٹرنک کھول کر فائل میں سے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی نکالنے میں اسے چند منٹ لگے تھے۔ اس نے لگاتار کئی لمبے لمبے سانس لیے۔ پھر پر حدت چہرے کو پر سکون کرنے کی خاطر ذرا سا تھپتھپا کر باہر نکل آئی۔

شوکت نجانے کس وقت آیا تھا۔ حسب معمول اس کے ہاتھ میں پھلوں کے لفافے تھے۔ فہد سے بہت تپاک سے ملا۔ شگفتہ اور ساجدہ کو شوکت کے سراپے پہ چھائی عاجزی اور شرافت نے بہت متاثر کیا تھا۔ "بڑا ہی نیک اور تابع دار ہے میرا بھتیجا۔ اللہ اسے خوش رکھے۔ میرا تو تیسرا بیٹا ہے یہ۔" دلشاد محبت سے شوکت کو دیکھتے ہوئے ساجدہ سے مخاطب ہوئیں۔ ماشاء۔ ماشاء اللہ دونوں نے قدردانی سے سر ہلایا تھا۔ سب کے درمیان بیٹھا اعتماد سے گفتگو کرتا شوکت' ثوبیہ کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کیونکہ آج وہ اسے پہلی بار دل کی آنکھ سے جو دیکھ رہی تھی۔ ذرا بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کم تعلیم یافتہ انسان ہے۔

"شوکت بھائی! کھانا آپ کھا کر جائیے گا۔ بس روٹیاں ڈالنی ہیں۔" رابعہ نے اسے مخاطب کیا کہ اس گھر کے اکلوتے داماد کو عزت دینا سب پہ فرض تھا۔

"یہ ہے میرے شناختی کارڈ کی کاپی' سنبھال کے رکھنا۔" کھانے کے بعد وہ فوٹو کاپی شوکت کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ شوکت کا دل ایک دم سے کھل اٹھا تھا۔ آنکھوں میں شوق کے جگنو چمکنے لگے تھے۔

"جب اسکول کھلے گا تو دیکھنا میری نور کیسے بنی گی گاؤں میں۔ سب ماسٹر جی ماسٹر جی کہہ کر پکاریں گے مجھے۔" شوکت نے کالر اکڑائے تھے۔

"منہ دھو کے رکھو۔ میں تمہیں اپنے اسکول میں چوکیدار تو رکھ سکتی ہوں۔ مگر استاد بنا کر بچوں کا مستقبل خراب کرنے کا رسک نہیں لے سکتی۔" ثوبیہ نے صاف اسے چڑایا پھر۔ مسکراتی ہوئی ماریہ کے پاس آ گئی۔

"ارے تم سمجھی نہیں' ماسٹرنی کا شوہر ماسٹر ہوتا ہے نا' جیسے تھانیدار کی بیوی تھانیدارنی کہلاتی ہے۔ پڑھانا میرے بس کی بات ہے بھی نہیں۔"

خوب زور سے بولتے ہوئے شوکت نے اسے وضاحت دی تھی۔ پھر کھل کر مسکرا دیا تھا۔

☼ ☼

شگفتہ بڑی فراغت سے کچن میں کھڑی گھر بھر کے کھانے کے لیے روٹیاں پکا رہی تھی۔ جب سعد کی کال آئی تھی اور گویا منٹوں میں اس کی دنیا تہ و بالا ہو کر رہ گئی تھی۔ "آپا! میں صدف کو اس کے گھر سے لے آیا ہوں۔ آپ اسے بھگا لانا بھی کہہ سکتی ہیں۔"

"یہ... یہ تم کیا کہہ رہے ہو سعد!" اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ بڑی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہو سکی تھی۔ جواباً اس کا لہجہ پہلے سے

بڑھ کر سفاک تھا۔

"وہی جو آپ سن رہی ہیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا آپا کہ میری شادی ہوگی تو صرف اور صرف صدف سے ہوگی' ورنہ نہیں ہوگی۔" یہ ماڈ زمانے کی بے حیائی تھی کہ اس کی سرکشی کہ وہ آج احترام کی حد پار کر رہا تھا۔ ورنہ سعد اس کا بڑا ادب و لحاظ کرتا تھا۔ ان دونوں کے مابین عمروں کا واضح فرق تھا۔ والدین کی وفات کے بعد تو جیسے وہ اس پر شجر سایہ دار بن کر رہی تھی۔ وہ مانتا بھی تھا۔ مگر سعد کا یہ جملہ بڑا جتاتا ہوا سا تھا۔ جیسے وہ اسے مورد الزام ٹھہرا رہا ہو کہ اس خرابی و بگاڑ' بلکہ اس کے اس انتہائی اقدام کی ذمہ دار وہی ہو۔ کال کب ڈراپ ہوئی۔ اسے پتا ہی نہ چل سکا۔ سعد نے شاید یہی اطلاع دینے کے لیے اسے فون کیا تھا۔ مگر اس کے جسم سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ وہ بے دم ہو کر گری تو ہادیہ نکل کر آئی تھی۔ ہادیہ اس کا خیال بھی کرتی تھی۔ اس کی ایک پکار پر دوڑ کے آتی۔ اس کے ساتھ لگی رہتی اور شانزے۔۔۔ اس کی چودہ سالہ اور سب سے بڑی بیٹی' جس سے شگفتہ کو امید تھی' اس کے لیے پڑھائی کا بہانہ ہی کافی تھا۔ اسکول ٹیوشنز کے اوقات کے علاوہ کمرہ بند کیے سوتی رہتی تو اس میں اصل قصور اس کے باپ کا تھا۔ شگفتہ کے خیال میں چاروں بچوں کو باپ کے لاڈ پیار اور ہر معاملے میں کھلی چھوٹ و ڈھیل دینے کی عادت نے بگاڑا تھا۔ ارسلان بچوں میں بچہ بن کے رہتا۔ ان کی ہر بات مانتا۔ اس کی جا و بے جا حمایت' خود شگفتہ کو رد کر جاتی تھی۔ بچوں نے تو پھر سر پر چڑھ کر رقص کرنا ہی تھا۔ کاشان کمپیوٹر کے سامنے بیٹھتا تو ہٹانہ تھا۔ کوئی کام پڑتا تو بابا پر ٹالتا۔ زین اور ہادیہ ابھی چھوٹے تھے۔ مگر وہ اسی بگڑی روش کی بدولت انہیں خود سے لگا کے رکھتی۔

چولہا جل رہا تھا۔ شانزے کو ناچار باقی ماندہ روٹیاں پکانی پڑی تھیں۔ وہ ابھی ابھی اسکول سے لوٹی تھی۔ بیگ رکھ کر منہ ہی دھویا تھا۔ مگر شگفتہ کو ہوش کہاں تھا۔ ہادیہ نے اس کا سر سہلایا۔ لیموں پانی بنا کے دیا۔ مگر

وہ لاؤنج کے صوفے پر پڑی نیم جان سی تھی۔ غم' غصہ' اندیشے' خوف' سب یکجا ہو کر حملہ آور تھے۔

"اب کیا ہوگا؟" ذہن میں بار بار یہ خوف سر اٹھاتا' دم توڑتا۔ چشم تصور میں بار بار وہ گھر گھوم رہا تھا جہاں بیٹی کے فرار پر موت کا سناٹا چھا گیا ہوگا۔

"اف خدایا!" یہ تصور ہی روح لرزا دینے والا تھا۔ اس کی سات پشتوں نے کبھی اس قبیح فعل کا ارتکاب نہ کیا تھا۔ سعد یہ کر گزرے گا۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ ارسلان لنچ کے لیے آیا تو اس کا انداز اسنجیدہ تھا۔ خبر اس تک بھی پہنچ چکی تھی۔ شگفتہ اس کے کندھے سے سر ٹکا کر رو دی اور اس کی تسلی دینے کا انداز بھی دل جلا دینے والا تھا۔

"تم سے کہا بھی تھا۔ اپنے کام سے کام رکھو' کیا ضرورت تھی منہ کھولنے کی۔۔۔ اب بھگتو۔" اب وہ اسے یہ تو جتانے سے رہی کہ خود ارسلان کی غیر ذمہ داری اور لاپروائی کے سبب خود اس نے زندگی کا جو تلخ روپ دیکھا تھا' وہ اس آگ میں قصداً" کسی اور کو جھونکنے کا جگر نہیں رکھتی تھی کہ اس کے نزدیک یہ سراسر انسانیت کے خلاف تھا اور یہ کہ میں ان عورتوں میں سے نہیں جو لڑکوں کو اس گمان پر بیاہ دیتی ہیں کہ شادی کر کے سدھار جائے گا۔ زندگی کسی کی بھی ہو' اتنی ارزاں نہیں کہ کسی رسک کی نذر کر دی جائے۔ صدف کے بارے میں بتا کر سعد نے پہلے اسے ہی نہایت عزت و شرافت سے رشتہ دے کر بھیجا تھا۔ گو کہ سعد کی شادی کے لیے اس کا دور' دور تک کوئی ارادہ ہی نہ تھا کہ اس کی روش ہی ایسی تھی اور اگر وہ ایسا سوچتی تو بھی انتخاب کے نام پہ در' در جھانکنا اور ایک کے بعد ایک لڑکی رد کرنا اس کے نزدیک ظالمانہ فعل تھا۔ یہاں معاملہ جدا تھا' مگر وہ خود میں اتنی سکت نہ پاتی کہ سعد کے عیوب ڈھکا چھپا کر اسے پیش کر دیتی۔ سعد کی اصلیت اس پر خوب عیاں تھی۔ شگفتہ کی شادی کے بعد بھی اس کا بڑا اوس کے سسرال میں ہی رہا اور یہ ان سب کی اعلا ظرفی ہی تھا کہ سعد کو اس کی خامیوں سمیت سب نے اپنایا تھا۔ وہ یہاں وہاں پڑا

سوتا رہتا، جتنا کام ملتا، پکڑ لیتا۔ پیسے ہاتھ میں آجاتے تو چھوڑ دیتا، کہیں منہ ماری کرلی۔ کہیں سر پھوڑ دیا۔ کہیں اپنا پھڑوا لیا۔ نہ کھانے پینے کی فکر، نہ رہنے سہنے کا غم ۔۔۔ ارسلان نے ہزار بار کہا کہ اس کے کام میں اس کا ہاتھ بٹائے ۔۔۔ وہ بڑے پیمانے پر کمپیوٹر اکیڈمی کوچنگ کا ادارہ چلا رہا تھا، مگر وہی معاملہ تھا جس کو ملے یوں۔ وہ کچھ کرے کیوں۔

صدف کے معاملے میں اسے نہ چاہتے ہوئے بھی جاننا پڑا تھا کہ سعد نے ضد ہی پکڑلی تھی۔ سعد نے اس کی توقعات کے عین مطابق وہاں ڈھیروں ڈھیر سبز باغ دکھا رکھے تھے۔ وہ لاکھوں کی مالیت کے گھر کا مالک ہے۔ وہ بک جائے تو کاروبار کرے گا۔ اپنا ایک لگژری فلیٹ خریدے گا۔ مزید توقعات بھی بہن ہی سے تھیں کہ اس کو ہر معاملہ میں سنبھالے رکھے گی۔ تب اسے کہنے سے کون روک سکتا تھا کہ سعد مرد ہے۔ اسے اپنی آئندہ زندگی کا لائحہ عمل اپنے بل بوتے اور اپنی قوت بازو پر بھروسا کرکے ترتیب دینا چاہیے، نہ کہ اس پہ۔۔۔ آبائی گھر کسی کھنڈر سے کم نہیں، جس کے چند لاکھ بھی مل جائیں تو غنیمت ہے۔ آگے کے لیے جدوجہد سعد کو ہی کرنی ہے اور وہ اب تک بلا کا غیر ذمہ دار ثابت ہوا ہے۔ اس کی اپنی آمدنی کچھ بھی نہیں۔ اسے اب تک شگفتہ نے سنبھالا ہے۔ آگے بھی وہ اسی سے امید رکھتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ فیصلے کا اختیار صدف کے والد کے ہاتھ میں ہے۔ گھر بھر پر ان کی دھاک تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ چالاک و ہوشیار ثابت ہوئے تھے۔ کرید کرید کر اک اک بات پوچھتے رہے۔ شاید وہ خود کسی کم حیثیت کو اپنی بیٹی بیاہنے کے حق میں نہ تھے۔ انہیں شگفتہ کی حیثیت کے حوالے سے کافی خوش گمانیاں تھیں، تو یہ سعد کا ہی کمال تھا۔ سعد کو مستقبل کے حوالے سے بھی ساری امیدیں بہن ہی سے تھیں کہ اب خیر سے ارسلان کا کاروبار پھل پھول رہا تھا۔ مگر سعد اپنے کنبے سمیت شگفتہ کی ذمہ داری ہے۔ یہ خیال غلط تھا۔ صدف کے گھر والوں کو اندھیرے میں رکھنا، اسے دھوکہ دہی کے مترادف لگا تھا۔ اس نے صاف بتا دیا کہ ارسلان کے اصرار کے باوجود بھی سعد نے کبھی اس کا ہاتھ بٹانے کی نہیں سوچی۔ یوں نہ تھا کہ سعد کوئی بگڑا ہوا، آوارہ یا بدقماش لڑکا تھا۔ وہ تو اک مہذب، حساس اور خیال رکھنے والا لڑکا تھا۔ مگر اس کی حد سے بڑھی ہوئی بے پروائی بیاہ کر آنے والی کو کیا دن دکھا سکتی تھی۔ یہ عذاب وہ خود پر جھیل چکی تھی۔ اس کے عادت و خیال جان کر بھی اگر وہ صدف کا ہاتھ اسے دے دیتے تو اسے بھلا کیا عذر تھا۔ شگفتہ کو سعد کی شادی پر نہیں، اس کی غیر ذمہ داری پر اعتراض تھا۔ صدف کے معاملے میں بھی سعد کی من مانی کی یہ روش نئی نہ تھی۔ دیگر معاملات میں بھی وہ اسی طرح ہٹ دھرم ثابت ہوا تھا۔ اب بھی اس معاملے میں اسے کیا کچھ سننا پڑ سکتا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ تھا۔ مگر وہ مطمئن تھی کہ اس نے سعد کو بے نقاب کردیا تھا۔ جواباً" صاف انکار ہوگیا۔ صدف نے تفصیلاً" اک اک بات اس کے کانوں میں اتار تھی۔ نتیجتاً" سعد نے بڑا شور مچایا۔ اٹھا پٹخ، چیخ پکار مچائی۔

"میری شادی ہوگی تو صرف اور صرف صدف سے ہی ہوگی۔" اس نے خاک بھی نہ پروا کی۔ بلکہ اس کا خیال تھا کہ یہ سبق اس کے سدھار اور امیدوں پر پانی پھیرنے کے لیے کافی ہوگا۔ وہ سنجیدگی سے خود کے لیے کوئی بہتر راہ چنے گا۔ تب وہ ضرور اس کی شادی کے لیے سوچے گی!

آج اگر شگفتہ کے حالات کچھ بہتر تھے تو یہاں تک آنے کے لیے اس نے اک برا وقت بھی گزارا تھا، وہ خوب جانتی تھی کہ دست نگر زندگی کا کیا عذاب ہوتا ہے۔ غیر ذمہ داری کتنی بری لعنت ہے۔ ارسلان نے گھر بھر سے لڑ کر بلکہ زبردست جنگ کرکے اس سے شادی کی تھی۔ یہ اور بات کہ گھر بھر کی مخالفت کے اسرار اس پر شادی کے بعد کھل سکے تھے، ارسلان سے اس کی شادی سال بھر کے دھواں دھار افیئر کا نتیجہ تھی، اس کے گھر والوں کی مخالفت کا محرک وہ افیئرس کو ہی سمجھتی آئی تھی۔ مگر یہ تو بہت آگے جاکر معلوم ہوا کہ وہ دو سروں پہ انحصار کرنے والا آدمی تھا۔

"تمہیں بیاہ کر اس گھر تک لانا میرا کام تھا۔ اب ان سب کے دلوں میں جگہ بنانا تمہارا کام ہے۔" اس نے شادی کی رات پہلا جملہ یہی کہا تھا جواباً" شگفتہ نے بھی ان سب کو اپنانے میں سردھڑ کی بازی لگادی تھی۔ اس میں کچھ شک نہ تھا کہ سسرال کے نام پر اسے وسیع القلب لوگ نصیب ہوئے تھے جنہوں نے اسے اس کے مسائل سمیت سمیٹا تھا شگفتہ اور سعد! ان دونوں کا ایک دوسرے کے سوا تھا بھی کون! والدین کے گزرنے کے بعد ماموں چھپڑ چھاؤں بنے رہے "مگر شگفتہ کی شادی کے بعد سعد ان کے لیے بھاری پڑ گیا کہ ممانی کو ڈھیروں بہانے ہاتھ آگئے تھے 'ان کا جوان بچیوں کا ساتھ تھا۔ لہٰذا سعد کو خود کے ساتھ رکھنا بھی اس کی مجبوری ٹھہری۔ جسے ان سب نے خندہ پیشانی سے بھگتا تھا۔ ارسلان اس گھر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جو درست معنوں میں والدین کی لاکھوں کی جائیداد پر انحصار کرکے کبھی ذمہ داری سے کچھ نہ کرسکا۔ والدین کے کرائے کئی کاروبار ڈوبے تو اسی غیر ذمہ داری کے سبب اور یہی اس کی شادی کی مخالفت کی اصل وجہ تھی۔ وہ اگر ارسلان کی شادی کا ٹھان ہی لیتے تو یقیناً" کسی ہم پلہ گھرانے کی لڑکی چنتے اور اس میں حق بجانب بھی تھے۔ ارسلان کے بعد اک نند تھی اس کی بھی شادی سال بھر بعد بھگتائی گئی تھی۔ ساس اک نفیس و ہنرمند خاتون تھیں۔ شگفتہ گھرداری کے معاملہ میں چوپٹ اس نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ شادی کے بعد بچوں کی پیدائش سے لے کر کھانے پینے اوڑھنے غرض گھر کے تمام اخراجات وہی اٹھاتی رہی تھیں اور وہ بھی بھرپور خوش دلی کے ساتھ۔ شادی کے سالوں بعد بھی ارسلان کی روش نہ بدلی تب درست معنوں میں عاجز آکر والدین نے ان کا پورشن جدا کرکے ان کا چولہا چوکی ان کے حوالے کردیا تھا تو پھر ارسلان کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا تھا۔ وہ ان دنوں کی سنگینی فراموش نہ کرسکی تھی۔ بچے عیش کے عادی تھے' اسی حوالے سے دونوں کا ناطقہ بند رکھتے۔ اسکول کی بھاری فیس۔ دوا دارو' راشن' بند... یہ وہ... بچے اک اک چیز کو ترستے۔ ان دونوں کے درمیان آئے روز تلخ کلامی رہتی۔ کبھی کبھی تو بات بہت بگڑ جاتی۔ اور ان ہی حالات کے پیش نظر ساس نے جائیداد میں ارسلان کے حصہ کا دس فیصد اسے کسی کاروبار کے لیے بخشا تھا۔ اور تب حالات کچھ سدھرے مگر دست نگر زندگی کا عذاب کیا ہوتا ہے' بھرپور روشن تھا۔ راوی میرے لیے چین ہی چین لکھتا' اگر جو ارسلان اسی روش پر چلتا رہتا۔ مگر شادی کے کچھ ہی عرصے بعد اسے اندازہ ہوا کہ ارسلان اک دل پھینک آدمی ہے۔ آئے روز اس کے نت نئے افیئرز سامنے آتے رہتے۔ یہ اور بات کہ انجام ہر بار اک سا رہا تھا۔ نئے زمانے کی ماڈل لڑکیاں بال بچے دار آدمی میں ان کے لیے چارم ہی کیا تھا۔ کچھ اچھا وقت گزار لے کھایا پیا۔ یہ جاوہ جا۔ لہٰذا۔

وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی

والا معاملہ رہتا۔ اب تو اس نے پروا بھی کرنی چھوڑ دی تھی۔ شادی کے چودہ سال بعد چار بچوں کی پیدائش کے بعد وہ بے ڈول ہوچکی تھی تو اس کا یہ مطلب کہاں سے نکلتا تھا کہ ارسلان دل بہلانے اور وقت گزاری کے نام پر ادھر ادھر منہ مارتا پھرے۔ وہ فطرتاً" سادگی پسند تھی۔ پھر گھر اور بچوں میں گھن چکر بن کے رہ گئی تھی۔ اور ارسلان نے زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنا شروع کردیا تھا۔ جس کا عذر وہ یہ پیش کرتا کہ وہ بیوی کی اک مسکراہٹ تک سے محروم ہوگیا ہے اور یہ کہ اسے دینے کے لیے شگفتہ کے پاس وقت ہی نہیں رہا۔ وہ اس سے ہی نہیں' خود سے بھی بے پروا ہوگئی ہے۔

اکثر اس کی واپسی رات گئے ہی ہوتی۔ اب آدھی رات میں تو کوئی سولہ سنگھار کرکے بیٹھنے سے رہا۔ مگر اس وقت اس سب سے بڑھ کر اہم اور غور طلب مسئلہ یہ تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے' سعد نا صرف صدف کو اس کے گھر سے نکال لایا تھا بلکہ ارسلان کی اطلاع کے مطابق کچھ ہی دیر میں اس گھر میں بھی لانے والا تھا کہ وہ اور کہاں جاتا...؟ ارسلان کا کہنا بھی درست ہی تھا کہ ان دونوں کا یوں ساتھ رہنا بھی خطرے کی گھنٹی

ہے۔ اک اک پل قیمتی ہے۔ لہٰذا فوراً" ان دونوں کا نکاح پڑھوا دیا جا رہا ہے۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا اور اس خیال ہے ہی شگفتہ کے پیروں تلے سے زمین سرکنے لگی تھی' اس کی نیت میں راستی تھی۔ اسی راستی کے سبب اس نے سچائی سے کام لیا تھا۔ مگر اب جب سعد اور صدف اک انتہائی اقدام کا ارتکاب کر ہی چکے تھے تو کیونکر اس معاملے کو نمٹایا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے!!!

٭ ٭ ٭

صدف زار و قطار رو رہی تھی کہ ملامت کے سارے لفظ اس کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئے۔ اس نے اسے بولنے پر آمادہ کرنا چاہا تھا مگر وہ خائف تھی۔

"آپ ابا کو نہیں جانتیں' ان کے تعلقات وسیع ہیں۔ وہ ہر معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ ورنہ یہ نوبت کیوں آتی؟ سعد کو صبح سے فون پر دھمکیاں مل رہی ہیں۔ وہ سعد کے خلاف پرچا کٹوانے پر تلے ہیں۔ کچھ کرائے کے لوگوں کو بھی ہمارے پیچھے لگایا ہوا ہے۔ صبح ہم پر حملہ ہوا۔ تب ہی سعد نے آپ کے گھر میں پناہ دی ہے کہ وہ یہ گھر نہیں جانتے۔ میرے پاس آپا کا فون آیا تھا۔ وہ یہی کہہ رہی تھیں کہ اگر میں خاموشی سے واپس نہ لوٹی تو ابا پرچے میں میرے لیے لاکھوں کی چوری کا الزام بھی لکھوائیں گے۔ مگر مجھے پتا ہے اب اگر میں لوٹی وہ میرے ٹکڑے کر دیں گے۔"

"اف خدایا!" اس نے سر تھام لیا۔ چاروں طرف خطرے کی گھنٹیاں ہی گھنٹیاں سنائی دے رہی تھیں۔ سعد کے ساتھ تو جو ہو گا سو ہو گا۔ برسوں کی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا۔ وکیل سے عقل قائل ہوتی ہے عشق نہیں۔ لیکن اگر سعد یا صدف کو قائل کر بھی لیا جاتا تو بات ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ رات دن ایسی ہزار کہانیاں ہماری نظروں سے گزرتی ہیں۔ مگر ان کی سنگینی کا درست ادراک تب ہوتا ہے جب خود پر آ پڑتی ہے۔ اسے کوئی راستہ سجھائی نہ دے رہا تھا۔

٭ ٭ ٭

شام تک اک نئی خبر سننے کو ملی۔ صدف کی والدہ کو دل کا اٹیک پڑا ہے۔ وہ اسپتال میں ہیں۔ اسے بخوبی ادراک تھا۔ صورت حال مزید گمبھیر ہو سکتی تھی۔

اگر خود کو ان کی جگہ رکھ کر دیکھا جائے تو زیادتی ہماری جانب سے تھی یا شاید شگفتہ کی پہلو تہی سے ہی یہ نوبت آ سکی تھی' ورنہ سعد نے تو اپنے ارادے اس پر عیاں کر ہی دیے تھے اور وہ ایسی نادان کہ ان لفظوں میں چھپی سنگینی' تنبیہہ یا دھمکی کو نہ جانچ سکی۔ ورنہ شاید کسی طرح معاملے کو سنبھالنے کی سعی کرتی۔ مگر اس نے جو کرنا تھا کر لیا تھا۔ اور اب کیا ہو سکتا ہے' یہ نکتہ توجہ طلب تھا۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ ان معاملات میں سمجھوتا ناممکن ہوتا ہے۔ جب عزت پر بن جائے تو جنازے اٹھ جاتے ہیں۔ رات' سعد آیا تو اس کے چہرے پر معمولی چوٹوں کے نشان تھے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے کم از کم اک بار تو سوچا ہوتا۔ کہ ہم سر اٹھانے بلکہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔"

"مجھے اس اقدام پر مجبور کرنے والی بھی آپ ہی ہیں۔ ورنہ پہلے میں نے درست راہ ہی اپنائی تھی۔"

"رشتے جھوٹ کی بنیاد پر نہیں جوڑے جاتے میں تمہیں طمع چڑھا کر پیش کرتی اور دوسروں کو اندھیرے میں رکھ کر ان کی بیٹی بیاہ لاتی؟ یاد رکھو کہ میرے اپنے سامنے بھی بیٹیاں ہیں۔"

"تو پھر لے کے بیٹھی رہیں اپنی سچائی اور کھدرے پن کو۔" اس نے پہلی بار سب کے سامنے سر اٹھا کر بلند آواز میں بات کی تھی۔ وہ دنگ رہ گئی۔

"اور اگر آپ کو صدف کے یہاں رہنے پر بھی اعتراض ہے تو میں اس کو کہیں اور لے جاتا ہوں۔" اس کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ "دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ اور جب تک صدف یہاں ہے' اس طرف کا رخ بھی کیا تو اچھا نہ ہو گا۔"

وہ بھناتا ہوا دروازہ پٹخ کر نکل گیا تو یہ بھی اس کے لیے خلاف توقع ہی تھا! بچے سہم کر کونے کھدروں میں گھس گئے تھے' ارسلان کی واپسی تک میرا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا رات دیر تک وہ اسے سمجھاتے رہے۔

"اب جو ہو گیا وہ تو ہو ہی گیا' ان دونوں کا نکاح پڑھا دینے میں ہی عافیت ہے' اگر صدف کے گھر والے اپنی دھمکیوں کو پورا کرنے پر اتر آئے تو بات الٹی پڑ سکتی ہے' یہ معاملات سنگین ہوتے ہیں۔ صدف کے بیان پر بھروسا رکھنا بے وقوفی ہے' معاملہ سنگین پڑ جائے تو لڑکیاں بیان بدل بھی دیتی ہیں۔ سارا عتاب سعد پر ہی پڑے گا۔ تم خود سوچو کہ صورت حال کتنی گمبھیر پڑ سکتی ہے۔ ان کا نکاح ہو جائے تو آدھا خطرہ ٹل جائے گا۔"

مگر اس خیال سے بھی اس کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی۔ اپنی بچیوں کے چہرے اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگتے۔ اس کا آج کا فیصلہ ان کے مستقبل کے لیے بیج بو سکتا تھا۔ اور کوئی ایسا فیصلہ جس سے کسی کی زندگی یا عزت پر بن جائے' اسے منظور نہ تھا۔ اسے اپنی نیت کی راستی پر بھروسا تھا۔ اور اسی کو زادِ راہ بنا کر اگلا قدم اٹھانا تھا۔ گو کہ یہ اقدام بھی خطرے سے خالی نہ تھا مگر اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

☼ ☼ ☼
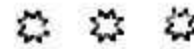
شاید اسے بھی کسی انتہائی شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑتا مگر اس کی سچائی و کھرے پن نے آگے کی راہ سہل بنائی تھی۔ صدف کے گھر میں واقعی موت کا سناٹا تھا۔ چوبیس گھنٹے! اور ان چوبیس گھنٹوں میں وہ گھرانا کس قیامت سے گزرا ہوگا وہ خوب جانتی تھی۔ رشتہ داروں کو ابھی صدف کی والدہ کے اسپتال میں ہونے کی خبر نہ دی گئی تھی اور محلہ والوں کو یہی پتا تھا کہ صدف والدہ کے ساتھ اسپتال میں ہے۔ گویا معاملہ ابھی مٹھی میں تھا۔ اس نے صدف کا ہاتھ اس وعدہ کے ساتھ اس کے والد کے ہاتھ میں دیا تھا کہ اگلے ہفتہ تک اسے عزت و احترام کے ساتھ بیاہ کر لے جاؤں گی۔ وہ بھی اس حادثہ سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے تھے۔ بیٹی فرار' بیوی اسپتال۔ شاید انہیں بھی معاملہ یہاں تک جا پہنچنے کی توقع نہ تھی۔ انہیں بھلا اور کیا درکار تھا۔ وہ ہار کر رو دیے تھے مگر اس کے اندر اک طمانیت سی اتر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سعد دو دن بعد لوٹا تو اس کا انداز خاصا شکستہ سا تھا۔ وہ موبائل ہاتھ میں لیے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی یہی سوچ رہی تھی کہ اسے کال کرے یا نہ کرے سعد کا اجڑا بکھرا حلیہ اور اتری شکل دیکھ کر اس کا دل کٹنے لگا مگر طنز کیا۔

"آ گئے؟ کہاں رہے اب تک۔؟"

"بس یہاں وہاں۔ دوستوں میں۔"

"تو جہاں اب تک رہے' وہاں آج رات سونے کا ٹھکانہ نہ تھا؟"

"آپا!" وہ دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ گیا "مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ سے گستاخی کی۔ آپ میری بہن نہیں' ماں ہو۔"

"ہاں۔ اسی لیے تمہارے لیے جو بہتر سمجھا' وہی کیا۔" میری آواز گلوگیر ہو گئی۔

"آپ نے ٹھیک کیا۔ میں برا ہوں' بہت برا۔" وہ میری گود میں سر رکھ کر جو منہ میں آیا بکتا رہا۔ دو دن کی دربدری نے اس کو فیصلے کی سنگینی ہی نہیں' آٹے دال کا بھاؤ بھی یاد دلا دیا تھا۔ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے جدوجہد لازمی ہے۔ گاڑی کتنی ہی قیمتی ہو۔ پیٹرول ڈالنے سے ہی آگے بڑھتی ہے۔ شکر ہے یہ نکتہ اس سمجھ میں آ گیا تھا۔ پھر شاید اس نے بھی پہلی بار ارسلان سے اس کی سفارش کی تھی۔ سعد کو اب ان کا دست راست بننا تھا۔ اور اسے امید تھی کہ وہ اپنے وعدہ کی پاسداری کرے گا۔ اس نے رب سے اپنے نیک فعل کا انعام اسی صورت مانگا تھا۔

☼

☼

ناولٹ
عائشہ ناز علی

"خدا کچھ لوگوں پر ضرورت سے زیادہ ہی مہربان ہوتا ہے۔ عطا کرنے پر آئے تو عطا کرتا ہی چلا جاتا ہے۔" توین شزا سے کہہ رہی تھی۔

"تم کس کی بات کر رہی ہو؟" شزا نے پوچھا تھا۔

"اپنی انیقہ کی اور کس کی۔" توین نے گڑیا کی طرح سجی سنوری انیقہ کی طرف ابرو سے اشارہ کیا۔ میں ذرا فاصلے پر بیٹھی ان کی باتیں اتفاقاً" سن رہی تھی۔ مجھے توین کی بات سے سوفیصد اتفاق تھا۔

"واقعی یار! ہر چیز میں بازی لے جاتی ہے۔ لائف پارٹنر کے معاملے میں بھی بازی لے گئی ہے۔" شزا کے لہجے میں رشک تھا۔ وہ دونوں اسٹیج پر بیٹھے جوڑے پر تبصرہ کرتی رہیں۔ میری نگاہیں بھٹکیں اور غیرارادی طور پر اسٹیج پر بنے کراؤن اسٹائل صوفے پر شان سے براجمان انیقہ اور شمروز پر ٹک گئیں۔ دونوں ساتھ ساتھ کس قدر مکمل لگ رہے تھے۔

مجھے کبھی کبھی لگتا تھا (بچپن میں) کہ انیقہ اللہ تعالیٰ کی بہت پسندیدہ ہے۔ وہ اس قدر مکمل لگتی تھی کہ مجھے اس پر رشک آتا تھا۔ آج اس کے نکاح کی تقریب تھی اور اس کی خواہش پر پاپا نے فائیو اسٹار ہوٹل میں سارا انتظام کرایا تھا۔ سنہرے اور ایپل گرین کے دیدہ زیب کنٹراسٹ اور بھاری بھرکم پشواز میں پور پور سجی سنوری انیقہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ وہ تو ڈھلے چہرے سے بھی ہوش اڑا دیتی تھی اور آج تو چھب ہی نرالی تھی۔ سبھی بس اسی کو دیکھ رہے تھے۔ تمام کزنز اور انیقہ کی سہیلیاں اس کے گرد یوں گولائی میں جمع تھے جیسے چودھویں کے چاند کے گرد نور کا ہالہ ہوا کرتا ہے، کچھ دیر قبل میں بھی اسی ہالہ کا حصہ تھی۔ اس کے برابر سیاہ ڈنر سوٹ میں شمروز بیٹھا تھا اور شیطانی ٹولے کی گولہ باریوں کا برجستہ جواب دے رہا تھا مگر اس کی نگاہ بار بار ہال میں بھٹک سی جاتی۔

اسٹیج پر وہ ہوہا مچی ہوئی تھی کہ الاماں الحفیظ۔ وقتاً" فوقتاً" اسٹیج قہقہوں سے لرز اٹھتا۔ میں خاموشی سے تنہا کرسی پر بیٹھی تھی۔ اتنے ہنگامے میں ویسے بھی ایک میری غیر موجودگی کا کسے احساس ہوتا تھا۔ میری نگاہیں بار بار نہ چاہتے ہوئے بھی انیقہ اور پھر اس کے برابر میں بیٹھے شمروز پر جا کر ٹک جاتیں۔ بڑا ہی غیر ارادی عمل تھا۔

"کوئی اتنا بھی خوش قسمت ہو سکتا ہے۔" میں نے بے اختیار سوچا اور پھر خود کو خود ہی ڈانٹ دیا۔

"ماشاءاللہ۔" میں نے دل ہی دل میں کہہ کر گھبرا کر نظروں پر پابندی لگائی۔ اب میں اپنا دھیان ہال میں گردش کرتی ہوئی زندگی پر لگا رہی تھی۔ رنگ، حسن، خوشبو، خوشی ہر شے آج اس ہال میں اتر آئی تھی۔ میری ننھیال اور ددھیال اس محفل میں ان الفاظ کا مجموعہ بنے ادھر ادھر رونق افروز ہو رہے تھے۔ میری نظریں امی اور عالیہ آنٹی پر جا کر ٹک گئیں۔

انیقہ بالکل امی کی طرح لگتی تھی۔ میری امی بے حد حسین تھیں۔ اس عمر میں بھی ان کی دلکشی و شادابی عروج پر تھی۔ میں کہنی میز پر ٹکائے اپنے ہاتھ کی مٹھی بنا کر رخسار پر ٹکائے انہیں دیکھ رہی تھی اور پھر میرا دھیان ہال میں بجنے والی بے حد خوب صورت اور دھیمی سروں میں بجنے والی موسیقی پر چلا گیا۔ نجانے کتنے لمحے سرکے تھے کہ پاپا کی شفیق آواز نے میری سماعتوں میں رس گھولا۔

"ہماری بٹیا یہاں اکیلی کیا کر رہی ہے بھئی؟" وہ میرے برابر والی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور مسکرا کر انہیں دیکھا۔

"ویسے ہی۔۔۔ تھک گئی تھی۔" میں نے پاپا کو محبت سے دیکھا۔

"بھئی تھکاوٹ تو مجھے بھی ہو گئی ہے؟ مگر یہ سب ابھی نہیں تھکے' لگتا ہے ہوٹل کی انتظامیہ آکر تمام لائٹس آف کردیں گی تب ہی نکلیں گے یہ سب۔" پاپا نے شگفتگی سے ہال میں بکھرے موتی جیسے مہمانوں پر نگاہ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"انجوائے کر رہے ہیں۔ اچھا لگ رہا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"انیقہ کتنی خوش لگ رہی ہے نا بہت اچھی لگ

رہی ہے دونوں کی جوڑی' ہے نا؟" میں نے پاپا سے تائید چاہی۔

"مراد پاپا ہے' خوش کیوں نہ ہو گی۔" پاپا نے گہری سانس لی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"اچھی بات ہے نا پاپا بامراد لوگ ہی مطمئن رہتے ہیں۔" میں نے کہا پاپا کچھ نہیں بولے۔

"شموز انیقہ کی پسند ہے پاپا۔"

"ہاں۔ اسے بھی اتفاق سے وہی چیز پسند آتی ہے جو تمہیں پسند آتی ہے۔" پاپا کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ میں دم بھر کو چپ ہو گئی۔

"آپ اس سوٹ میں بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ یہ کلر آپ کو بہت سوٹ کرتا ہے۔" میں نے موضوع اور موڈ دونوں بدلے۔

"اس عمر میں یہ عالم ہے پاپا تو جوانی میں کیا حال ہو گا؟" میں نے انہیں چھیڑا۔ وہ مجھے دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائے اور میں ان کی مسکراہٹ کو نظرانداز کر گئی۔

"الحمدللہ.... بھئی میں تو ابھی تک جوان ہوں' یقین نہ آئے تو اس جگہ موجود سبھی خواتین سے پوچھ لو ماسوائے اپنی امی کے' وہ تو مجھے بیس میں بھی ایک سو بیس کا سمجھتی تھیں۔" انہوں نے کہا تو میں مسکرا دی۔ ہم دونوں میں بہت دوستی تھی' پاپا نے اپنے اور میرے درمیان کوئی جنریشن گیپ نہیں رکھا تھا۔

"بڑا' ہنسی مذاق چل رہا ہے۔ مجھے بھی لطیفہ سنائیے۔" عالیہ خالہ ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے ایک کرسی پر براجمان ہو گئیں۔

"کچھ نہیں پاپا کی عادت کا تو پتا ہے آپ کو۔" میں مسکرائی۔

"بھئی عالیہ! اپنی بہن سے کہو یہ ہوٹل والے میرے رشتے دار نہیں ہیں۔ بارہ بج رہے ہیں۔ اب سمیٹنے کی کرو۔ رت جگا گھر چل کر ہو جائے گا۔ ہوٹل والے ہمیں سحری تک نہیں بیٹھنے دیں گے۔" پاپا نے موقع اور خاتون دیکھا۔ دونوں مناسب تھے' فٹافٹ مدعا بیان کر ڈالا۔

"جی بھائی جی! میں ابھی بجو سے یہی کہہ رہی تھی۔ بس چلنے کی تیاری کرتے ہیں۔" عالیہ آنٹی نے جواب دیتے ہوئے مجھ سے پانی کا گلاس لانے کے لیے کہا۔ میں جب پانی لے کر آئی تو وہ پاپا کے ساتھ بڑا سنجیدہ سا چہرہ بنائے کوئی بات کر رہی تھیں۔

"لیجیے۔" میں نے گلاس ان کی طرف تھما دیا۔

"خوش رہو۔" انہوں نے گلاس میرے ہاتھ سے لے کر لبوں سے لگا لیا۔ پاپا بہانے سے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے اور عالیہ آنٹی نے میری طرف رخ روشن کر لیا۔

"چندا! اب آگے تمہارا کیا پلان ہے؟ تعلیم تو اسی سال مکمل ہو جائے گی۔"

"پاپا کے ساتھ ان کے بزنس کو دیکھوں گی۔ کام سیکھوں گی اور بھی پلاننگز ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"بس اب باقی پلاننگز چھوڑو اور شادی کے بارے میں سوچو۔" انہوں نے اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا۔

"ناٹ اگین۔ مجھے شادی کے بارے میں نہیں سوچنا اور بہت سے کام ہیں جنہیں کرنا ضروری ہے شادی تو۔" میں نے قدرے بے زاری سے ان کی بات کاٹی۔

"شادی ان سب کاموں سے زیادہ ضروری کام ہے۔" انہوں نے بھی میری بات میں اپنی بات شامل کی۔

"کرلوں گی آنی۔ ویسے بھی شادی ہر کسی کی ہو جائے یہ ضروری تو نہیں۔" میں نے بے زاری سے کہا۔

"شادی تو ہوتی ہی ہے گڑیا! سبھی کی ہوتی ہے۔ وقت پر ہو جائے تو بہتر ہے۔" وہ نرمی سے بولیں۔ وہ میری خالہ کم سہیلی زیادہ تھیں۔

"ہر کسی کی نہیں ہوتی۔ کچھ کی قسمت میں نہیں ہوتی' کچھ خود نہیں کرتے۔" میں آہستگی سے بولی۔

"قسمت سے ہم نہیں لڑ سکتے مگر رشتہ اچھا ہو اور خود چل کر آئے تو ٹھکرانا بھی ناشکری ہوتا ہے۔" وہ مجھ سے ہاں کروانے پر مصر تھیں۔ مجھے یہ موضوع پسند

نہیں تھا۔

"چلو اس موضوع پر پھر میں بات کرتی ہوں تم سے۔" بڑی خالہ مسرت اور امی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ بولیں اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

کہانی آگے بڑھانے سے قبل میں آپ کو اپنی نھیال اور ددھیال سے متعارف کرانا چاہتی ہوں کیونکہ بغیر اس تعارف کی شاہراہ سے گزرے میری کہانی کا سفر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ شروعات میں اپنے تعارف سے کرتی ہوں۔ میرا پورا نام آئینہ ایمان علی ہے۔ مجھ میں اور انیقہ میں صرف ڈیڑھ سال کا فرق ہے۔ مزید ہمارا کوئی بھائی بہن نہیں ہیں۔ میرے پاپا ایمان علی اور امی الفت دونوں فرسٹ کزنز بھی ہیں۔ دونوں میں پہلے لو ہوا اور بعد میں بڑوں کی باہمی رضا مندی سے میرج۔ میری امی کی مزید دو بہنیں اور ہیں۔ مسرت خالہ امی سے بڑی ہیں اور ان کے شوہر بھی ان کے دور کے کزن ہی ہوتے ہیں۔ اچھے خاصے امیر ہیں۔ خالہ اور خالو دونوں اپنے تین عدد بچوں کے ہمراہ انگلینڈ میں ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی بیٹی سپنا ہے جو کہ شادی شدہ ہے۔ پھر شمروز اور آخر میں مونا ہے۔ مونا کالج میں ہے۔ شمروز انکل سمیر کے ساتھ بزنس میں بھی انوالو ہے اور ایم بی اے بھی کر رہا ہے۔ بہت لائق اور سلجھے ہوئے ذہن کا ہے۔ چار سال پہلے وہ چھٹیاں گزارنے ہمارے گھر آیا تھا۔ یوں تو وہ آتا ہی رہتا تھا، مگر اس بار گزارے دو ماہ میری زندگی میں ہی نہیں میری سوچ میں بھی تبدیلی لے آئے تھے۔

عالیہ خالہ میری سب سے چھوٹی خالہ ہیں جنہیں میں آنی کہتی ہوں۔ عالیہ خالہ سے بڑے دو ماموں ہیں۔ وہ بھی شادی شدہ اور اپنی اپنی زندگیوں میں سیٹل ہیں۔

آنی کہنے کو تو مجھ سے دس سال بڑی ہیں۔ مگر مزاج کی شگفتگی کا یہ عالم کہ فرق سمٹتے سمٹتے صرف دس دنوں کا رہ گیا۔ میرے ددھیالی اور نھیالی رشتہ دار سبھی بے حد حسین ہیں۔ عالیہ آنٹی کے حسن کا بھی کچھ ایسا ہی عالم ہے اس پر ان کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاج۔ عالیہ آنٹی کی کہانی بھی ان کی طرح عجیب اور حیران کن ہے۔ وہ امی سے بے حد مانوس تھیں۔ اس حد تک کہ جب امی کی رخصتی ہوئی تو عالیہ آنٹی نے رو رو کر سب کی ناک میں دم کر لیا۔ بے وقت کے اس راگ سے گھبرا کر پاپا نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ عالیہ آنٹی کو جہیز میں ساتھ لے کر جائیں گے۔ سب لوگ ہکا بکا رہ گئے اور آنی امی کے ساتھ دلہا والی گاڑی میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔ تب سے عالیہ آنٹی ہمارے ساتھ ہی ہمارے گھر پر ہی تھیں اور اگر میرے چھوٹے چچا شبیر میری پیاری سی عالیہ آنٹی کے اول جلول عشق میں گرفتار ہو کر انہیں ڈولی میں بٹھا کر نہ لے جاتے تو شاید عالیہ آنٹی نے پاپا کے گھر کی دہلیز پر ہی بوڑھا ہو جانا تھا۔

یہ ڈولی والا محاورہ بھی عالیہ آنٹی نے سچ کر دکھایا۔ شادی کے لیے انہوں نے تین شرائط رکھی تھیں۔ پہلی شرط یہ کہ شبیر چچا ہمارے بنگلے کے بالکل ساتھ والا بنگلہ خریدیں اور شادی کے بعد وہ دونوں وہیں رہیں گے۔ دوسری شرط یہ کہ عالیہ آنٹی کو امی سے ملنے سے نہیں روکا جائے گا اور تیسری شرط سن کر تو بقول امی شبیر چچا انگشت بدنداں رہ گئے کہ عالیہ آنٹی کو ڈولی میں بیٹھ کر رخصتی کروانی تھی۔ خیر۔۔۔ شبیر چچا نے عالیہ آنٹی کے عشق کا بھرم رکھتے ہوئے تینوں شرائط کو پورا کر دکھایا۔ ڈولی نے تو یوں بھی دیوار پار ہی جانا تھا۔ دونوں گھروں کے بیچ صرف ایک دیوار کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے کو بھی مزید کم کرنے کی غرض سے درمیانی دیوار توڑ کر ایک گیٹ بنوا دیا گیا تھا، جس کے ارد گرد اور اوپر کی طرف پھولوں اور پودوں کی بیلوں کو سجا دیا گیا تھا۔ اس طرح دونوں گھروں کے فاصلے مزید سمٹ گئے تھے۔ شبیر چچا مزاج اور طبیعت کے بہت اچھے اور قدرے سنجیدہ تھے۔ مگر دونوں کی خوب تھی۔ جب عالیہ خالہ کی شادی ہوئی تو میں امی کے شکم میں پل رہی تھی۔

عالیہ آنٹی کی شادی کے آٹھ ماہ بعد میں اس دنیا میں آگئی۔ اب آپ کہیں گے کہ دنیا میں آکر میں نے کون سا تیر مارا ہے تو میں بھی کافی عرصہ تک یہی سوچتی رہی تھی کہ میں نے پیدا ہو کر کون سا کارنامہ انجام دیا ہے۔

میرا پورا خاندان حسن و نزاکت و وجاہت کا پیکر ہے۔ مرد 'عورتیں سب ہی حسین ہیں۔ سرخ سپید رنگت ' خوب صورت قد کاٹھ۔ اس پر اچھا پہننا اوڑھنا۔ میں پیدا ہوئی تو پہلا صدمہ امی کو یہ ہوا کہ میری رنگت گندمی تھی۔ دوسرا صدمہ یہ کہ امی کو بیٹے کی خواہش تھی مگر قدرت نے ان کی جھولی میں کالی کلوٹی بیٹی ڈال دی۔ یہ زریں خیالات میری امی کے تھے جو میری رنگت کے غم میں اتنی دکھی تھیں کہ بیٹا نہ ہونے کا دکھ بھی بھول گئیں۔

امی بلا کی حسن پرست تھیں انہوں نے تو مجھے دودھ پلانے اور گود میں لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ کہتی تھیں کہ نرس نے ان کا اصلی بچہ بدل کر یہ کالا کلوٹا بچہ ان کے حوالے کر دیا ہے۔ حالانکہ جب امی ڈلیوری روم میں تھیں تو عالیہ آنٹی جیسے میری بلی بنی دروازے کے باہر مارچ پاسٹ کر رہی تھیں اور دروازہ بھی اکلوتا تھا۔ بچہ بدلنے کا کوئی چانس نہ تھا۔ میری پیدائش کے بعد نرس نے مجھے سیدھا عالیہ آنٹی کی گود میں ڈال دیا تھا۔ انہوں نے مجھے اسی روز سے اپنی بیٹی مان لیا تھا۔ بعد میں پھر ہم دونوں پکی سہیلیاں بن گئیں۔

پاپا میری پیدائش پر بہت خوش تھے اور مطمئن بھی۔ مگر امی نے یہ وطیرہ بنا لیا کہ ہر آنے جانے والے سے مبارکباد وصول کرنے کے بعد ہی میری بدصورتی اور رنگت کی دہائیاں دینے لگتیں۔ پاپا کو اس "قصیدہ گوئی" پر سخت غصہ آتا اور امی کو اسی بات پر ڈانٹ پڑتی۔ امی کو بڑا قلق تھا کہ ان کی بڑی بیٹی جو کہ ہو بہو امی کی کاربن کاپی تھی اور باقی خاندان والوں کی طرح میں بھی حسین اور گوری رنگت والی کیوں نہ تھی۔ لوگوں کو کسی کے عیب تراشنے کا موقع چاہیے ہوتا ہے اور میری سگی ماں نے لوگوں کو یہ موقع خود فراہم کیا تھا۔

رفتہ رفتہ عمر کی منازل طے کرتے کرتے چھوٹی سی عمر میں ہی رویوں اور نگاہوں کے اور اک کا عذاب اپنی ننھی سی جان پر سہتے سہتے میں نے لوگوں کے رویوں کا زہر پینا شروع کر دیا تھا۔ ہم دونوں بہنوں میں عمر کا فاصلہ کم ہونے کی بنا پر ہم نے ایک ہی کلاس میں تعلیمی سفر شروع کیا۔ گھر اور خاندان والے تو انیقہ سے محبت کرتے ہی تھے 'اسکول میں بھی اس کے حسن کی وجہ سے اسے خصوصی توجہ ملنی شروع ہو گئی۔ جب کسی کو پتا چلتا کہ ہم دونوں بہنیں ہیں تو پہلے تو وہ حیران ہوتا اور پھر پہلا سوال یہ ہوتا کہ تم دونوں سگی بہنیں ہو اور مثبت جواب پر حیرت کا برملا اظہار کیا جاتا۔ اسے کسی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ جبکہ میں لاکھ کوشش کے باوجود کسی کی توجہ اپنی جانب مبذول نہ کرا سکی۔ اگر پاپا اور عالیہ آنٹی نہ ہوتے تو میں بری طرح ٹوٹ جاتی 'بکھر جاتی۔ مجھ میں یہ بیج بو دیا تھا میری ماں نے کہ میں چونکہ بدشکل ہوں لہٰذا مجھ میں کوئی دوسری خوبی بھی نہیں ہے۔ امی کی دیکھا دیکھی انیقہ کے رویے میں بھی بہت واضح تبدیلی آچکی تھی کہ بچے کچی مٹی ہوتے ہیں۔ جس سانچے میں ڈھال دو ڈھل جاتے ہیں۔ انیقہ نے لوگوں کے رویے سے جو سیکھا اسی کو عملاً "کرنا شروع کر دیا۔ "برتری" کی کرسی تک پہنچنے کا راستہ اسے لوگوں نے ہی دکھایا اور باقی کا کام وہ خود کرتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

پہلی جماعت میں اچھی خاصی اسٹوڈنٹ ہونے کے باوجود میں فیل ہو گئی تو شاک صرف پاپا کو لگا تھا امی اور انیقہ نے تو طعنوں کی برسات کر دی تھی۔ اس روز پاپا کو واقعی حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا اور اس روز پاپا نے زندگی میں پہلی بار امی کو سخت سست سنائیں۔ اسی روز پاپا نے پہلی بار انیقہ کو پوری طرح نظر انداز کر کے مجھ پر بھرپور توجہ دی۔ وہ پہلی بار مجھے لانگ ڈرائیو پر تنہا اپنے ساتھ لے گئے اور جتنی دیر ہم دونوں باہر رہے وہ مجھے سمجھاتے رہے۔ اس روز ان سے میری دوستی کا آغاز ہوا تھا پاپا اس روز باپ سے دوست بن گئے تھے اور پھر اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک انہوں نے دوستی نبھائی۔

پاپا اپنی بے حد مصروفیات میں سے بھی اب میرے لیے خصوصی وقت نکالتے تھے۔ وہ مجھے خود پڑھاتے

تھے۔ اسکول کی پرنسپل سے انہوں نے بطور خاص ریکویسٹ کر کے مجھے اگلی کلاس میں پروموٹ کرایا اور اس وعدے کے ساتھ کہ آئینہ ایمان علی اس بار فرسٹ کلاس میں پاس ہوگی۔ میں نے ان کے وعدے کا پاس رکھا اور دن رات ایک کر دیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں دوسری جماعت میں ٹاپ آئی تھی اور اسی سال مجھے بیسٹ اسٹوڈنٹ آف دی ایئر کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔ یہ کامیابی کی پہلی سیڑھی تھی جس کے بعد کامیابیوں کا لامتناہی سلسلے شروع ہونے تھے۔ پاپا اس روز بہت خوش تھے۔ امی بھی اس روز میری ذہانت کے گن گا رہی تھیں۔ سارے اساتذہ' خاندان والے' پاپا اور امی کے فرینڈز سبھی مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔ پاپا نے اس روز میری کامیابی کی خوشی میں میرے اعزاز میں بہت شاندار پارٹی دی تھی۔

اس روز شاید زندگی میں پہلی بار انیقہ کو کسی حد تک نظر انداز کیا گیا تھا۔ وہ بہت اچھی اور ذہین اسٹوڈنٹ تھی مگر جو شاندار کامیابیاں میرے حصے میں آئی تھیں وہ کبھی بھی ان تک نہ پہنچ سکی تھی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے پاپا کی باتوں کی سچائی کا اور اک ہوا پہلی بار میں نے یہ جانا کہ وہ جو سمجھاتے تھے محض باپ کا جذباتی پن نہیں ہوتا تھا۔ میرے پاپا کی باتیں میرے لیے زریں اقوال بنتے چلے گئے۔ پاپا نے مجھے جیتنا سکھا دیا تھا اور مجھے جیتنے کی عادت ہوتی چلی گئی۔ ہر کامیابی کے بعد مجھے میری ذات' میرے ہونے کا احساس ہوتا۔ پاپا کہتے ہیں۔

"وہ شکل و صورت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ دھندلا جانے والی چیزیں ہیں۔ ماند پڑ جاتی ہیں۔ یہ کامیابیوں اور جیت کے جو جھنڈے تم گاڑ رہی ہو یہ رہ جانے والی چیز ہے۔ ضروری یہ نہیں کہ لوگ تمہیں خوش شکل کہیں۔ ضروری یہ ہے کہ لوگ تمہیں تمہارے کردار سے یاد رکھیں۔

تم سیرت و گفتار و کردار و عمل میں اتنی بلند ہو جاؤ کہ لوگوں کو تمہارا ظاہر نظر ہی نہ آئے۔ ہر کامیابی کے بعد تم بھری ہوئی شاخ کی طرح جھکتی رہنا' جتنا جھکو گی اتنی بلند مقدر بنے گی۔ دنیا والوں کی پروا مت کرنا۔ یہ لوگ چڑھتے سورج کے پجاری ہیں۔ صرف اپنے دل کی سننا۔ دل کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ دل میں خدا ہوتا ہے۔ اس میں غرض کا رنگ مت لگنے دینا۔ تمہیں یہ بات یاد رکھنی ہے کہ تم اللہ کے سامنے جوابدہ ہو اور بس۔ جس دن دنیا والوں کی پروا کرنی شروع کر دی دھوبی کے کتے والا حال ہو جائے گا خدا نا خواستہ۔" پاپا کی ہر بات میرے دل پر نقش ہوتی تھی۔ میرے حافظے کی کتاب میں ہمیشہ ان کے سنہری قول حفاظت سے لکھے رہے۔

اس کے بعد میں وہی کرتی تھی جو پاپا نے مجھے سکھایا تھا۔ رفتہ رفتہ کامیابیاں میرے قدموں میں ڈھیر ہوتی گئیں اور میرے مداحوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ لوگ اب میری شکل و صورت اور رنگت پر بحث نہیں کرتے تھے بلکہ میری صلاحیتوں اور کامیابیوں اور فتوحات کے گن گاتے تھے اور ان میں سرفہرست میری ماں تھیں۔ اب امی کے پاس میری ذات کو لے کر ڈھیروں فخریہ قصے ہوتے تھے۔ انیقہ کی ویلیو کب کم ہو گئی کسی کو پتا نہیں چلا' خود مجھے بھی نہیں اب لوگ اسے میرے حوالے سے جانتے تھے۔ میرا حوالہ کب اس کے لیے حسد و نفرت میں بدل گیا پتا بھی نہ چلا۔

☼ ☼ ☼

میٹرک کا رزلٹ آنے میں کچھ دن رہ گئے تھے جب شمروز کے آنے کی خبر ملی۔ شمروز سے میری اچھی دوستی تھی۔ وہ بہت سلجھے ہوئے ذہن کا لڑکا تھا۔ ہر بار وہ مسرت خالہ کے ساتھ آتا تھا مگر اس بار وہ اکیلا آ رہا تھا۔ وہ مجھے بہت باقاعدگی سے ای میلز بھیجتا تھا۔ میری برتھ ڈے' میری ہر کامیابی پر وہ مجھے کارڈز سینڈ کرتا تھا۔ وہ اپنی نئی نئی تصاویر مجھے پوسٹ کرتا تھا۔ ہر بات مجھ سے شیئر کرتا تھا حالانکہ وہ عمر میں مجھ سے بڑا تھا مگر وہ اس طرح مجھ سے اپنے مسئلے اور باتوں کو شیئر کرتا تھا جیسے میں اس کی ہم عمر ہوں۔ وہ کہتا تھا کہ اسے میرے مشوروں اور باتوں سے بہت فائدہ پہنچتا ہے اور میں کہتی کہ اسے میری صرف عادت ہوئی ہے۔ ورنہ وہ

مجھ سے زیادہ ذہین ہے۔ رفتہ رفتہ میں نے لاشعوری طور پر شمروز سے امیدیں وابستہ کرلیں۔

پاپا کہتے تھے کہ خود کو اس قابل بناؤ کہ دوسروں کی امید بن سکو مگر کسی سے امید مت رکھو۔ امید صرف اللہ سے رکھو کیونکہ وہ کبھی مایوس نہیں کرتا اور بس پہلی بار میں نے پاپا کی نصیحت کو بھلا دیا اور پھر مجھے اس نافرمانی کی سزا بھی ملی۔

شمروز پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گیا تھا۔ وہ باتونی تھا مگر اب کی بار اس کی باتیں عجیب طرح کا حسن و کشش لیے ہوئے تھیں۔ اس روز میں شاپنگ کرنے عالیہ آنٹی کے ساتھ بازار گئی تھی۔ واپسی پر وہ میرے ہمراہ گھر آگئیں۔ لاؤنج میں ہی شمروز باقی گھر والوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ انیقہ وہاں موجود نہیں تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ پرجوش انداز میں ملا۔ میں نے اسے چور نظروں سے دیکھا۔ لیمن کلر شرٹ اور بلیک جینز میں وہ کمال کا جاذب نظر لگ رہا تھا۔ قد بھی لمبا ہو گیا تھا اور صحت بھی پہلے سے اچھی ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے بلا تکلف باتیں کرتا رہا لیکن میرے انداز میں جھجک تھی۔ زندگی میں پہلی بار میں کسی مرد سے یوں جھجک محسوس کر رہی تھی۔ اور اپنی اس کیفیت پر خاصی جھلا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد انیقہ ٹرالی گھسیٹتی ہوئی اندر آگئی۔ میں نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا پانی کا گلاس لینا ہو تو وہ ملازموں کی دوڑ لگوا دیتی تھی اور اس وقت چائے کے لوازمات سے بھری ٹرالی گھسیٹتی ہوئی وہ خود کچن سے آ رہی تھی۔ شمروز انیقہ سے اسی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا جو اس کی طبیعت کا خاصہ تھی اور پھر اس میں انگلینڈ کے ماحول کا بھی خاصا عمل دخل تھا۔ وہ اس کی تعریفیں کر رہا تھا اور نجانے کیوں زندگی میں پہلی بار مجھے انیقہ کی تعریفیں کھلی تھیں۔ یہ بھی زندگی کا ایک رخ ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے کسی پیارے سے شکایت ہو جاتی ہے اور اگر یہ شکایتیں نوک زباں پر نہ آئیں تو دل کی کدورت کا سبب بن جاتی ہیں۔ میں اس عجیب و غریب مگر سخت اذیت ناک اور ناپسندیدہ لمحات سے گزر رہی تھی۔

اس وقت جب انیقہ اور شمروز محو گفتگو تھے اور شمروز مجھے مکمل طور پر نظرانداز کیے ہوئے تھا (میری نظر میں) تو میں سوچ رہی تھی کہ انیقہ۔ میری سگی بہن سے مجھے اور کتنے زخم ملیں گے۔ پہلے وہ امی 'پاپا' عالیہ آنٹی کی توجہ مجھ پر سے ہٹانے کی سعی کرتی تھی اور اب شمروز۔۔۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شمروز کے لیے میرے احساسات کیا ہیں۔ صرف وہی نہیں پاپا بھی یہ بات جانتے تھے۔ میں بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ پہلے مجھے خود کا نظرانداز کیے جانا تکلیف دیتا تھا۔ آج شمروز کے چھن جانے کا احساس یکلخت اندر پیدا ہوا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ ہر گزر جانے والی تکلیف حالیہ تکلیف سے کم لگتی ہے اور حالیہ تکلیف بیت جانے والے درد سے زیادہ لگتی ہے۔ کبھی کبھی ہم یہ فیصلے نہیں کر پاتے کہ کون سی تکلیف زیادہ ہے۔ پہلے والی کہ موجودہ؟ جیسے اس وقت شمروز کا نظرانداز کیے جانا مجھے تکلیف دے رہا تھا۔ انیقہ اسے اس طرح خود میں مگن کیے ہوئے تھی کہ وہ آکٹوپس کے چنگل کی طرح اس میں پھنسا ہوا تھا اور پھر نجانے مجھے کیا ہوا کہ میں یکدم محفل سے اٹھ کر چلی گئی۔

مجھے انیقہ پر بے تحاشا غصہ تھا مگر مجھ میں کمال کا ضبط تھا۔ انیقہ شمروز کا دم چھلا بن چکی تھی۔ وہ جب سے آیا تھا میں اکیلے میں اس سے دو منٹ بیٹھ کر بات نہیں کر سکی تھی۔ مجھے اپنی سگی بہن سے چڑ محسوس ہو رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار۔

☆ ☆ ☆

جس روز میرا رزلٹ نکلا تھا میں نے پورے صوبے میں ٹاپ کیا تھا اور اس روز شمروز نے پاپا کی اجازت سے مجھے لنچ پر باہر لے کر جانا تھا۔ میں مسرور سی بڑے دل سے تیار ہو کر باہر نکلی تو کار میں فرنٹ سیٹ پر پہلے سے ہی انیقہ براجمان تھی۔ میری ساری خوشی کرکری ہو گئی۔ شمروز نے کہا تھا صرف ہم دونوں جائیں گے۔ پھر یہ کہاں سے ٹپک پڑی۔ میں کلس کر رہ گئی تھی۔

"بھئی انیقہ کی ضد تھی کہ ساتھ جانا ہے تو اسے بھی لے جانا پڑ رہا ہے۔" شمروز نے آہستگی سے کہا۔

"اٹس اوکے۔" میں جبراً" مسکرا کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ لائٹ بلیو کلر کے کرتے اور ٹراؤزر اور ہلکے سے میک اپ کے ساتھ میں بڑے دل سے تیار ہوئی تھی صرف شمروز کی خاطر۔ مگر اسے تو شاید انیقہ کے سوا کوئی نظر ہی نہیں آرہا تھا یا پھر شاید یہ میری نظروں کا دھوکا تھا۔ بہرحال وہ لنچ میری زندگی کا بور ترین لنچ تھا۔

واپسی پر میں عالیہ آنٹی کے گھر چلی آئی۔ وہ آج کل امریکہ جانے کی تیاریوں میں تھیں۔ وہاں انکل شبیر کو ان کی کمپنی کسی کورس کے سلسلے میں بھیج رہی تھی اور عالیہ آنٹی اپنے اور شبیر چچا کی روانگی کی تیاریوں میں مگن تھیں۔ عالیہ آنٹی کا ایک ہی بیٹا تھا۔ ہارون مجھ سے ڈیڑھ 'دو سال چھوٹا۔ مگر وہ عالیہ آنٹی جیسا نہیں تھا۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہنے والا باسی تھا۔ ریزرو اور کسی حد تک سنجیدہ نظر آنے والا۔ ازراہ کزن ظاہر ہے ہماری گپ شپ تھی مگر اس کے انداز خاصے مشکوک تھے۔ میں نے عالیہ آنٹی سے کئی بار کہا کہ مجھے ان کا بیٹا زیرو زیرو سیون لگتا ہے۔ مشکوک اور پراسرار اس کی کیا ایکٹیویٹیز ہیں کیا ہابیز ہیں مجھے نہیں پتا اور میں نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ گھر میں کم کم ہی نظر آتا تھا اور جب جب نظر آیا تو اپنے کمرے میں بند نجانے کیا کرتا رہتا اور یا پھر اپنے پالتو پرندوں کے آس پاس منڈلاتا رہتا۔ مگر یہ اچھی بات تھی کہ اس کی اس دنیا میں "آمد" کے بعد میری اور عالیہ آنٹی کی محبت اور رشتے پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ البتہ امی کا وہ بڑا چہیتا تھا۔

میں آنی سے کچھ نہیں چھپاتی تھی۔ وہ باتیں بھی جو پاپا سے نہیں کہتی تھی وہ ان سے بلا جھجک کہہ دیتی تھی۔ اس وقت بھی لٹکے ہوئے منہ کے ساتھ ان کے پاس بیٹھی تھی۔

"آنسو بہانے میں ہم لیڈیز کا جواب نہیں ہے۔ سوچتی ہوں کہ اگر آنسو بہانے کا بھی بل ادا کرنا پڑتا تو ہم تب بھی یونہی بے دریغ استعمال کرتیں یا پھر کفایت شعاری کا مظاہرہ کرتیں۔" وہ میری درد بھری کہانی سننے کے بعد اطمینان سے جوس کا گلاس مجھے تھماتے ہوئے بولیں۔

"یہاں میری جان جل رہی ہے اور آپ کو جوس کی پڑی ہے آنی۔" میں نے سوں سوں کرتی ناک کو رگڑ کر اور سرخ کر دیا۔

"ہاں تو اچھا ہے نا۔ جوس پینے سے افاقہ ہو گا۔ تمہاری جان ہے ہی کتنی جو جلا رہی ہو۔ چلو جوس پیو شاباش۔" انہوں نے چمکار کر مجھے گلاس تھما دیا۔

جوس پی کر خالی گلاس میں نے میز پر رکھ دیا۔ اسی وقت ہارون کمرے میں جھانکتے ہوئے آنکھیں گھمانے لگا۔

"کیا ہے؟" عالیہ آنٹی نے پوچھا۔

"بالٹی لا دوں؟ کارپٹ گیلا نہ ہو جائے؟" اس نے دیکھا مجھے مگر مخاطب ماں سے تھا۔

"چلو بھاگو یہاں سے تمہارے مطلب کی بات نہیں ہے۔" انہوں نے اسے ڈپٹا۔

"پورے صوبے میں ٹاپ کرنے پر رو رہی ہو؟" وہ حیران تھا یا بن رہا تھا۔ مگر مجھے اس پر بہت غصہ آرہا تھا۔

"تمہیں کیا میں رووں یا ہنسوں۔" میں نے نزلہ بے چارے پر گرایا۔

"اوکے اوکے میں تو یہ بتانے آیا تھا کہ میں رفی کے ساتھ جا رہا ہوں۔" اس نے باہر نکلتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"جلدی آجانا۔" عالیہ آنٹی نے اندر سے کہا۔

"اوکے بائے۔" اس نے وہیں سے جواب دیا۔

"اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ شمروز نے تم سے کسی قسم کی بات کی جس سے پتا چلے کہ وہ تمہارے لیے کیسی فیلنگز رکھتا ہے؟" عالیہ آنٹی نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کلیئر تو کچھ نہیں کہا البتہ اس کی ای میلز اور کارڈز وغیرہ پر لکھی عبارتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔" میں نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

"تو انیقہ کے بارے میں اس نے تم سے کچھ کہا؟"

انہوں نے پوچھا۔
"نہیں مگر وہ اس کے ہوتے مجھے بالکل اگنور کر دیتا ہے۔"
"ہو سکتا ہے کہ یہ تمہاری سوچ ہو۔ وہ فارن سے آیا ہے۔ وہاں پیدا ہوا ہے پلا بڑھا ہے۔ یہ بے تکلفی اس کے مزاج و ماحول کا خاصا ہے۔ تم فضول باتوں کی طرف دھیان دے کر اپنی انرجی ویسٹ مت کرو۔ میں کوشش کروں گی اس کا حال دل جاننے کی۔ تم تو پازیٹو سوچ رکھتی ہو آئینہ! پھر یہ بات کیسے تمہارے دماغ میں آگئی۔" وہ حیران تھیں اور میں سوچ رہی تھی کہ انیقہ کو مجھ سے عجیب سی ضد ہے اور اسی ضد کی بنا پر وہ ہر اس چیز کو مجھ سے دور کرنے اور خود سے قریب کرنے کی کوشش کرتی ہے جو مجھے عزیز ہو یا جس سے مجھے خوشی ملتی ہو اور شمروز کے سلسلے میں بھی وہ یہی کر رہی تھی۔ مگر میں امی کو یہ نہ بتا سکی۔ مگر بہرحال میں اس روز بہت اپ سیٹ تھی۔ میں کبھی کبھی گھر کے پاس ہی ڈرائیونگ کر لیا کرتی تھی۔ ڈرائیونگ مجھے پاپا سکھا رہے تھے اور میں ابھی کچی ڈرائیور تھی۔ اکثر ڈرائیونگ میں تب کرتی تھی جب مجھے ذہنی سکون چاہیے ہوتا تھا۔ ہمارے گھر کے پاس اور اطراف کی سڑک تقریباً" خالی ہی ہوتی تھی۔ کیونکہ ہمارا گھر مین روڈ سے خاصا دور تھا۔ اسی لیے پاپا مجھے ڈرائیو کرنے کی اجازت بھی دے دیتے تھے۔ مگر ہمیشہ ڈرائیور یا پاپا میرے ساتھ ہوتے تھے۔ آج پاپا بھی آفس میں تھے اور ڈرائیور بیماری کی وجہ سے سرونٹ کوارٹر میں تھا۔ میں نے امی سے کہا کہ مجھے ڈرائیونگ کرنے جانا ہے۔ وہ فون پر مصروف تھیں۔ صرف اثبات میں سر ہلا کر اجازت دے دی۔ انیقہ اور شمروز بھی اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ میں نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر آگئی۔ کار کو احتیاط سے ڈرائیو کرتے ہوئے مین روڈ پر لے آئی تھی۔ میرا دھیان بٹا ہوا تھا اور ذہنی طور پر بھی پریشان تھی لہٰذا مجھے اندازہ ہی نہ ہوا کہ کب میں کار مین روڈ پر لے آئی۔ مین روڈ پر رش خاصا تھا کیونکہ عصر کا وقت تھا۔ یہ وقت تو ہوتا ہی رش کا ہے۔ اسی وقت میرا موبائل فون بج پڑا۔ میں نے جھلا کر اسکرین پر چمکتا ہوا نمبر دیکھا۔ پاپا کا فون تھا۔ میں نے Yes کا بٹن دبا دیا۔

"تم ڈرائیور اکیلی کیوں نکلی ہو؟ فوراً" گھر جاؤ۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ تمامت نکلنا جب تک ٹھیک سے ڈرائیونگ سیکھ نہیں لیتیں۔" پاپا بہت ناراض ہو رہے تھے۔

"جی پاپا۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ انہیں امی نے ہی بتایا ہو گا کہ میں اکیلی نکلی ہوں۔ میں نے سوچا۔ اس وقت امی پاپا سے ہی بات کر رہی تھیں فون پر میں نے گاڑی کا اسٹیئرنگ گھمایا اور گیئر بدلنے کے لیے ہاتھ گیئر پر رکھا ہی تھا کہ بائیں جانب سے تیز رفتاری سے آتی پجارو کو دیکھ کر میرے حواس باختہ ہو گئے۔

"ہیلو آئینہ۔۔۔ تم مجھے سن رہی ہو؟" پاپا کی آواز نے مجھے مزید گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ گاڑی کا ڈرائیور زور زور سے ہارن بجا رہا تھا مگر میں اتنی جلدی گاڑی کو سائیڈ نہ دے سکی۔ دوسری گاڑی نے یقیناً" بریکس پر پاؤں رکھے ہوئے تھے کیونکہ ٹائروں کی زبردست چرچراہٹ سے فضا گونج اٹھی تھی۔ موبائل میرے ہاتھ سے گر چکا تھا۔ پاپا کی ہیلو ہیلو کی آواز مدھم ہو رہی تھی۔ پجارو رکتے رکتے بھی بری طرح میری کار سے ٹکرائی تھی اور ایک چیخ کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔

میں زبردست جھٹکے سے ونڈ اسکرین سے ٹکرائی تھی کانچ کے ٹکڑے میرے بائیں بازو میں گھس چکے تھے۔ مجھے ہوش آیا تو میری ذات ادھوری ہو چکی تھی۔ میں ہمیشہ کے لیے اپنا بایاں بازو اور ہاتھ کھو چکی تھی۔ اس حادثے نے مجھے گہن لگا دیا تھا۔ کانچ کے ٹکڑوں نے بازو اور ہاتھ میں گھس کر ساری رگوں کو کاٹ دیا تھا اور ہڈیاں چکنا چور ہو گئی تھیں۔ زہر جسم میں نہ پھیل جائے اس لیے ڈاکٹرز نے بازو کاٹ دیا تھا۔ جس گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا اسی کے ڈرائیور نے میرے موبائل سے پاپا کو اطلاع دی تھی۔ کیونکہ موبائل آن تھا اور پاپا نے قیامت کی آواز سنی تھی۔ وہ ڈرائیور خدا

ترسی اور پھر پاپا کی ریکویسٹ کی وجہ سے مجھے قریبی ہسپتال لے گیا تھا۔ یوں میری جان تو بچ گئی تھی مگر میرا وجود ادھورے پن کا شکار ہو گیا تھا۔ اس حادثے پر سبھی افسردہ تھے۔ پاپا بہت ضبط سے کام لے رہے تھے۔ امی اور عالیہ آنٹی بہت رو رہی تھیں۔ انیقہ بھی میری دلجوئی میں مصروف تھی۔ اس حادثے نے جیسے اس کے دل کو جھٹکا دیا تھا۔ کچھ دن ہسپتال میں رہنے کے بعد مجھے ڈسچارج کر دیا گیا۔ مگر تیمارداری کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔

اور ان سب کی دلجوئی میرے دل کے درد کو بڑھاتی رہی۔ شمروز بھی ان دنوں انیقہ کو بھول بھال کر میرے سرہانے بیٹھا رہتا۔ ہارون جیسا ریزرو لڑکا بھی دن میں تین مرتبہ تو آ کر چہرہ دکھا جاتا تھا۔ مگر مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں بالکل ہی بجھ گئی تھی۔ جب جب میری نظر اپنے اس کٹے ہوئے بازو پر پڑتی میری آنکھیں چھلک جاتیں۔ میں پہلے بھی کم گو تھی مگر اب تو بالکل ہی گم سم ہو گئی تھی۔ لوگوں کی ہمدردیاں مجھے نشتر بن کر چبھتی تھیں۔ کوئی آتا تو میری مستقل خاموشی سے اکتا کر چلا جاتا۔ آخر کوئی کتنا کس کا ساتھ دے؟ یہ دنیا ہے۔ یہاں کسی کے پاس کسی کے لیے اتنا فارغ وقت نہیں ہوتا کہ وہ اپنا قیمتی وقت کسی کی بے کار سی دلجوئی میں برباد کرے۔

رفتہ رفتہ دن سرکنے لگے۔ سبھی اپنی زندگی کی طرف لوٹ گئے۔ پاپا کا وقت میرے ساتھ خاصا گزرتا تھا۔ وہ میرے پاس ہی رہتے تھے۔ پہلے کی طرح مجھ سے ہر موضوع پر بحث چھیڑتے مگر میرا دل اب کسی بھی بحث میں الجھنے کو نہیں چاہتا تھا۔ امی تو پہلے ہی فکر مند تھیں کہ معمولی شکل و صورت کے ساتھ رشتوں میں مسئلہ ہوتا ہے۔ اب تو ادھورا پن بھی آ چکا تھا۔ میں خود پر ترس کھانے لگی تھی اور اس خود ترسی کی بیماری نے مجھے توڑنا شروع کر دیا تھا۔ پاپا کا سخت آرڈر تھا کہ مجھ سے کسی قسم کی "ہمدردانہ" گفتگو نہ کی جائے۔ نہ ہی "دردمندانہ" رویہ روا رکھا جائے۔ سب کو نارمل بی ہیو کرنے کا حکم ملا تھا۔ پاپا بھی کتنے معصوم ہیں

ماضی اور حال کا فرق اتنا واضح ہے پھر بھی۔

اس روز شمروز ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ لے کر آ گیا۔ میں بالکنی میں کھڑی تھی۔

"ہیلو ہیلو۔ کیا ہے بھئی! ہر وقت ایک ہی پوز میں رہنے لگی ہو۔ میرے جانے میں صرف ایک روز باقی رہ گیا ہے اور تمہیں میری کوئی فکر ہی نہیں۔" وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم واپس جا رہے ہو؟" میں چونکی۔

"ہاں۔۔۔ اور جانے سے پہلے تم سے بہت ساری ضروری باتیں کرنی ہیں مگر موقع نہیں مل رہا۔" وہ ریلنگ سے ٹیک لگا کر میری طرف رخ کیے کھڑا تھا۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ گرین ٹی شرٹ اور جینز میں ہمیشہ کی طرح نکھرا نکھرا' زندگی سے بھرپور۔ کیا تم اس کے قابل ہو آئینہ؟ وہ ہے کہ زندگی ہے اور تم۔۔۔ اداسی۔۔۔ وہ کتنا مکمل ہے اور تم۔۔۔ نامکمل بے حد تکلیف سے میرے ذہن نے موازنہ کیا۔ میں نے اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں جھانکا۔ مجھے اپنا عکس وضاحت سے نظر آیا تھا مگر میں حقیقت سے نظر نہیں چرا سکتی تھی۔ دنوں کے اندر میرے اندر پختگی آ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی بات کرتا پاپا اندر آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں کچھ کاغذات وغیرہ تھے۔

"شمروز۔۔۔ بیٹا! تمہاری ممی کا فون ہے۔" انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

"او۔۔۔ میں فون سن کر آتا ہوں۔ ایکسکیوزمی۔" وہ چلا گیا تو میں اور پاپا کمرے میں آ گئے۔

"یہ کیا ہے پاپا؟" میں نے کاغذات کی طرف دیکھا۔

"تمہارے کالج کا ایڈمیشن فارم۔ تم فل کر دو میں اگلے ہفتے جمع کرا دوں گا۔ اگلے ہفتے سے ہی داخلے ہیں اور دس دن بعد کلاسز اسٹارٹ ہیں۔"

"سوری پاپا۔۔۔ مگر میں آگے نہیں پڑھنا چاہتی۔" میں نے رکھائی سے کہا۔

"کیا؟" پاپا کا منہ کھلا رہ گیا۔

"مگر کیوں بیٹا؟" وہ ششدر تھے۔

"وجہ یہ ہے۔" میں نے اپنے بائیں طرف اشارہ کیا جہاں اب صرف کندھا ہی رہ گیا تھا۔

"میں کسی کی نظروں کو نہیں سہہ سکتی۔ پہلے لوگ مجھے کم صورت' سانولی رنگت والی لڑکی سمجھتے رہے اور اب مجھے معذور کہیں گے۔" میں رو پڑی۔

"میں اس طرح نہیں جی سکتی ہوں پاپا۔ دعا کریں کہ میں مر جاؤں۔" میں سسک اٹھی اور پاپا میرے تڑپنے پر کیسے اپنی تڑپ' اپنے آنسو روک رہے تھے' یہ تو وہی جانتے ہوں گے۔

"پاپا کی گڑیا! تم تو پاپا کی جان ہو۔ تمہارے پاپا تمہیں اس طرح قطرہ قطرہ زہر پی کر خودکشی نہیں کرنے دیں گے۔ ہیرے کی قدر جوہری کو ہوتی ہے۔ پتھر تراشنے والے بھلا ہیرے کی اہمیت و قدر کیا جانیں؟ ادھر آؤ میرے پاس۔" انہوں نے اپنے پاس والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہوئی ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"دیکھو بیٹا!" انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"موت کا ایک وقت مقرر ہے مگر یہ موت طبعی موت ہے۔ جو لوگ خود سے ہار کر' حالات سے ہار کر جینا چھوڑ دیتے ہیں وہ بزدل ہوتے ہیں۔ کیونکہ دراصل وہ لوگ مرحلہ وار خودکشی کے عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں کیا تم بزدل کہلانا پسند کرو گی؟" انہوں نے نفسیاتی "ٹریٹمنٹ" کا آغاز کر دیا تھا۔ میں نے بے ساختہ نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ دنیا بزدلوں کا ساتھ دیتی ہے نہ ہارنے والوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ تمہیں یہ زندگی گزارنی ہے۔ جیت کے ساتھ' ہمت سے کچھ تو ہو گا نا۔ جو تمہارے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا۔ کبھی کبھی سوچا ہے کہ تمہارے ساتھ یہ سب کیوں ہوا؟" پاپا نے میرے رخساروں پر لڑھکتے آنسو اپنی شفیق پوروں سے پونچھے۔

"کیونکہ تم اللہ کی پسندیدہ ہو۔ اللہ صرف اپنے پسندیدہ لوگوں کا امتحان لیتا ہے۔ باہمت اور حوصلہ مند لوگوں کا۔ تمہیں ابھی خبر نہیں کہ تم کیا ہو میری گڑیا۔ لوگوں کی پروا مت کرو۔ لوگ تو کانچ کے ٹکڑوں کو ہیرے سمجھ لیتے ہیں۔ یہ سوچو کہ آخر تمہیں اس آزمائش کے لیے کیوں منتخب کیا گیا؟" وہ آہستہ آہستہ سمجھا رہے تھے۔

"مگر پاپا! میں لوگوں کی نظروں کا مقابلہ کیسے کروں گی؟" میں نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

"جیسے پہلے کرتی تھیں۔" پاپا برجستہ بولے۔

"پہلے تو تم چھوٹی تھیں۔ سمجھ کم تھی۔ اب تو ماشاء اللہ سمجھ دار ہو گئی ہو۔ تم یہ سوچو اور دیکھو کہ دنیا میں کئی لاکھ بلکہ کروڑوں کی تعداد میں لوگ ہیں جو اس طرح کے حادثات میں اپنا کچھ نہ کچھ قیمتی گنوا کر بھی نہ صرف زندہ ہیں بلکہ کتنی ہمت سے حالات و دنیا کا مقابلہ کر رہے ہیں اور ہنستے مسکراتے ان میں سے کتنے ایسے ہوں گے جنہیں مورل یا ایموشنل یا فائنشل سپورٹ ملتی ہو گی۔ تم نیٹ پر سروے کرو یا مختلف ہسپتالوں اور رفاہی اداروں میں جا کر دیکھو تو پتا چلے کہ تم تو بہت ہی خوش قسمت ہو۔ تمہارا تو صرف ایک بازو گیا ہے' وہ بھی بایاں لوگوں کے تو دونوں ہاتھ یا پیر یا آنکھیں تک چلی جاتی ہیں۔ مفلوج ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ ہمت سے جیتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں۔ تم شکر کرو بیٹا کہ تمہارا باقی جسم محفوظ ہے۔ صحت مند ہے۔ تم سوچ سمجھ سکتی ہو' دیکھ بول سکتی ہو۔ چل پھر سکتی ہو۔ سیدھا ہاتھ محفوظ ہے۔ تم دونوں ہاتھوں کا کام ایک سے ہی لے سکتی ہو۔ بجائے افسوس کرنے کے اللہ کا شکر ادا کرو کیونکہ اسے شکر کرنے والے پسند ہیں۔"

اور وہ کافی دیر تک مجھے سمجھاتے رہے۔ مثالوں کے ذریعے۔ آیات و حدیث و اقوال زریں سناتے رہے۔ میرا ذہن ان کی باتوں کو قبول کرتا گیا اور دل مطمئن ہوتا چلا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ نے مجھے جو یہ تکلیف دی یا جس آزمائش میں ڈالا اس کی کوئی حکمت کار فرما ہو گی۔

"انکل بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم تو آئیڈیل لڑکی ہو۔ ہر لحاظ سے بہترین ہو۔ مجھے تو تم پر رشک آتا ہے۔" شمروز اندر آتے ہوئے ٹکڑا لگاتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی پاپا کو دیکھ کر مسکرایا۔

"آپ کو پتا ہے انکل۔ میں اپنے بزنس پروجیکٹس کو آئینہ سے ڈسکس کرتا تھا اور اس کی کسی نہ کسی بات سے مجھے اتنا فائدہ پہنچتا تھا کہ بتا نہیں سکتا۔ آپ آئینہ کو اپنے ساتھ بزنس میں لگالیں۔ پھر دیکھیے گا کہ آپ کا بزنس کتنا فائدہ اٹھاتا ہے۔" اس نے ماحول کو ہلکا کرنے کی غرض سے مسکرا کر کہا۔

"بالکل بھئی... آئینہ تو میرا بیٹا ہے۔ سب کچھ اسی نے سنبھالنا ہے۔ انیقہ کے بس کا تو کچھ بھی نہیں۔" پاپا نے بھی فوراً "اپنی فرنچ کٹ داڑھی کو کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ یہ فارم مجھے دیں۔ میں اسے فل کرواتا ہوں۔" اس نے فارم پاپا کے ہاتھ سے لے لیا اور پھر اپنے جانے سے قبل اس نے خود جا کر میرا ایڈمیشن فارم کالج میں جمع کرادیا۔

میرا داخلہ ہو چکا تھا۔ انیقہ نے بھی میرے ساتھ ہی ایڈمیشن لیا تھا۔ تیمور اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ہی واپس جا چکا تھا۔ میں نے خود کو سمجھا لیا تھا کیونکہ جب انسان خود کو سمجھا لے تو پھر اگلے مراحل اس کے لیے آسان اور قابل قبول ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا میں نے بھی یہی کیا اور دنیا کا سب سے مشکل کام بالآخر کر ہی لیا۔ یعنی خود کو سنبھال لیا۔

☆ ☆ ☆

عالیہ آنٹی اور شبیر چچا کی امریکہ روانگی ہو چکی تھی۔ ہارون کے پیپرز ہو رہے تھے لہٰذا آنٹی اسے امی اور پاپا کی سرپرستی و ذمہ داری میں چھوڑ گئی تھیں۔ ہارون سارا وقت ہمارے گھر پر نہیں ہوتا تھا۔ صرف کھانے کے لیے اور پھر رات کو سونے کے لیے آتا تھا۔ اس کے بقول وہ اپنے کمرے میں زیادہ ایزی اور ریلیکس ہو کر پڑھ سکتا ہے کیونکہ اس کی ضرورت کی ہر چیز وہیں ہے۔ پاپا کو اس کی بات ٹھیک لگی۔ انہوں نے اصرار نہ کیا۔ البتہ اکثر اس کے کھانے پینے کی ٹائمنگ کا خیال کرتے ہوئے امی سے کہہ کر وہ اس کے لیے کھانا بھجوا دیتے تھے۔ کبھی خود گھر پر ہوتے تو خود لے جاتے یا پھر کچھ نہ کچھ میرے ہاتھ سے بھجوا دیتے تھے۔ انیقہ تو اپنے کام بمشکل کرتی تھی' ہارون کی ڈیوٹی کہاں سے دیتی۔ ہارون کے ساتھ کچھ وقت گزرا تو پتا چلا کہ وہ تو کمال کا ذہن رکھتا ہے۔ زیرو زیرو سیون جیسا زرخیز دماغ پایا تھا اس نے۔ مجھے کمپیوٹر اور میتھس میں کچھ پرابلم ہو رہی تھی تو پاپا کے کہنے پر میں نے اس کی مدد لی تھی۔ میں تو اسے ڈفر سمجھتی تھی مگر وہ واقعی کمال نکلا۔ اس کا سمجھانے اور سکھانے کا انداز کسی ماہر استاد کی طرح تھا۔ اس نے مجھے اتنے اچھے طریقے سے سمجھایا تھا کہ مجھے وہ تمام چیزیں حفظ ہو گئیں۔

"میں تو تمہیں اوسط درجے کا اسٹوڈنٹ سمجھتی تھی۔ تم تو بہت لائق ہو۔" میں نے بے ساختہ اس کی تعریف کر دی تھی۔

"جانتا ہوں تم مجھے اور بھی بہت کچھ سمجھتی ہو۔" وہ مسکرایا اور پھر ہر روز ہی میں اس سے سیکھنے بیٹھ جاتی۔ اس کے پاس نصاب سے ہٹ کر بھی معلومات کا ایک خزانہ تھا۔ مجھے اس کی معلومات اور "علمی خزانے" پر حیرت ہوتی تھی۔

زندگی اپنی بندھی ڈگر پر چل رہی تھی۔ انیقہ بھی واپس پہلے والی انیقہ بن چکی تھی۔ اس حادثے نے اس کے دل کو کچھ دیر کے لیے موم کیا تھا' پھر وہ بعد میں اپنی جون میں آگئی۔ اس رات میں اپنے لیے کافی بنا رہی تھی جب امی نے مجھ سے کہا کہ ہارون کو کھانے کے لیے بلالاؤں۔ نو بج رہے تھے اور وہ ابھی تک اپنے گھر پر ہی تھا۔ میں نے کافی بنانے کا ارادہ ترک کیا اور "شارٹ کٹ" یعنی دونوں گھروں کو ملانے والے گیٹ سے ہو کر ہارون کی طرف چلی گئی۔ گھر میں گہرا سناٹا تھا۔ مجھے اس قدر خاموشی سے وحشت ہونے لگی۔ لگا ہے یا بھوت۔ اسے ڈر نہیں لگتا میں تقریباً بھاگتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ ہارون کا کمرا اوپر کی منزل پر تھا۔ میں سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھلا تھا اور وہ صرف جینز اور بنیان چڑھائے کمپیوٹر کے آگے بیٹھا تھا۔ وہ اس قدر محو تھا کہ اسے میری آمد کا احساس تک نہیں ہوا۔ اگر میں

دروازہ پر دستک نہ دیتی تو اس نے تو مڑ کر دیکھنا بھی نہ تھا میری طرف۔ دستک نے اسے چونکا دیا۔

"اوہ... تم آؤ۔" اس نے قدرے خجل ہو کر اٹھ کر بیڈ پر رکھی ٹی شرٹ اٹھا کر پہن لی۔ میں بھی قدرے شرمندہ سی ہو گئی۔ مگر میں بھی کیا کرتی دروازہ جو کھلا تھا۔

"تم آئے نہیں کھانے کے لیے تو امی نے کہا کہ تمہیں بلا کر لے آؤں چلو آجاؤ۔ کھانا کھالو۔" میں نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔

"چلتے ہیں۔ بس ذرا یہ پانچ منٹ کا کام ہے۔" وہ واپس کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔

"کیا کر رہے ہو؟ ای میلز؟ فیس بک؟" میں نے وہیں کھڑے کھڑے سوال کیا۔

"یہ سب خرافات کے لیے وقت نہیں ہوتا میرے پاس۔ ادھر آؤ بتاتا ہوں۔" اس نے اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر کہا اور میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر آ گے آ گئی۔

"بیٹھو وہ کرسی لے آؤ۔" اس نے اسی مصروف سے انداز میں کہا۔ میں نے کرسی کھینچی اور اس کے قدرے فاصلے پر بیٹھ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" مانیٹر اسکرین پر نجانے کیا ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچی تھیں۔

"میں ایک سوفٹ ویئر بنا رہا ہوں۔ اس سوفٹ ویئر کے ذریعے کمپیوٹر کی رفتار دس ہزار گنا بڑھ جائے گی۔ مثلاً" اگر موسٹ لیٹسٹ کمپیوٹر میں تین ہزار گنا کام کرنے کی طاقت گنجائش اور رفتار ہو تو اس سوفٹ ویئر کے بعد وہ دس ہزار گنا بڑھ جائے گی۔ جو کام گھنٹوں میں ہوتا ہے وہ سیکنڈز میں ہونے لگے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کی میموری پاور بھی عام کمپیوٹر سے پندرہ گناہ زیادہ ہو گی۔ اس سوفٹ ویئر کا فائدہ یہ ہے کہ موبائل اور لینڈ لائن فونز سے بھی آپ اس کو کنیکٹ کر سکتے ہو اور قدرتی طور پر آنے والی آفات اور جغرافیائی تبدیلیوں کے بارے میں یہ کم از کم دس ماہ پہلے آگاہ کر دے گا۔ اس کے علاوہ اس سوفٹ ویئر کے ذریعے ایسی گاڑیاں اور بائیکس چلا سکتے ہیں جیسے سولر انرجی سے گاڑیاں چلتی ہیں۔" وہ بتا رہا تھا اور میں منہ کھولے اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"امیزنگ۔" میں بس اتنا ہی کہہ سکی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ وہ دوسرے لڑکوں کی طرح مختلف خرافات میں وقت کا ضائع کرتا ہے مگر وہ تو کمال نکلا۔

"ذرا سوچو آئینہ! اس سوفٹ ویئر سے ہم اپنے ملک اور دنیا کو کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور اس سوفٹ ویئر کے ساتھ میں نے ایک ایسی مشین بنائی ہے جو انگلش، عربی، اردو، جاپانی اور رومن زبانیں سکھا سکتی ہے۔ یہ مشین کسی بھی ایریا میں کام کر سکتی ہے۔ یہ ہیڈ فون، ایئر فون، موبائل غرض ہر الیکٹرانک ڈیوائس سے کنیکٹ کر سکتے ہیں۔ چند ایک کو چھوڑ کر۔ لاسٹ منتھ ہمارے کالج کی طرف سے سائنس ایگزیبیشن ہوئی تھی جس میں اس مشین کو بھی رکھا گیا ہے۔ اب پلان یہ ہے کہ اگلے چھ مہینوں میں اس مشین کو امریکہ اور پھر جاپان کی سائنس ایگزیبیشن میں رکھا جائے گا۔ مگر تب تک شاید میں یہاں نہ ہوں۔" وہ بتا رہا تھا۔

"تم نے یہ سب اکیلے کیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آف کورس ناٹ۔ آئیڈیا اور تھیم میرے تھے مگر میرے ٹیچر کی ہیلپ سے ہی یہ کام ہوا ہے۔ میں نے اس مشین اور اس سوفٹ ویئر کو اپنا نام دیا ہے۔" وہ بتا رہا تھا۔

"آئی ایم پراؤڈ آف یو تم نے تو کمال کر دکھایا۔ تو تمہاری مشکوک سرگرمیوں کا راز یہ تھا۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"جانتا ہوں تم ممی کو میرے بارے میں کیا کمنٹس دیتی تھیں۔" وہ شوخی سے بولا۔

"007۔"

"تمہاری حرکتیں بھی تو ایسی تھیں۔ آنی کو پتا ہے؟" وہ ہنس رہا تھا۔ میں نے بات بدلی۔

"ابھی نہیں خاندان میں تمہیں ہی پہلے بتایا ہے۔ سرپرائز ہے ممی اور ڈیڈ کے لیے۔" وہ مسکرایا مجھے اپنی

اس کزن پر فخر محسوس ہوا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو حقیقت میں ملک و قوم کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ وہ مجھ سے چھوٹا ہے مگر اسکول میں ڈبل ڈبل کلاسز پاس کر کے وقت سے پہلے ہی کالج جوائن کر چکا تھا۔

"چلو اب چلتے ہیں۔ یہ سب بند کرو۔ صبح کر لینا باقی۔" میں کھڑی ہو گئی۔

"اکیلے میں تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ کتنا سناٹا ہے؟" میں نے ماحول کی خاموشی کو محسوس کیا۔

"ڈر کیسا؟ مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا۔" وہ بے نیازی سے بولا اور کمپیوٹر آف کر کے کھڑا ہو گیا۔

"تم دونوں یہاں گپیں ہانک رہے ہو۔ وہاں امی نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے کہ تم لوگوں کو بلا کر لاؤں۔ اب چلو۔" انیقہ نجانے کب آکر کھڑی ہوئی تھی۔ میں اور ہارون دونوں ہی چونکے۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے رکی نہیں تھی۔ میں دل ہی دل میں شرمندہ سی ہو گئی۔ ہارون سپاٹ چہرے کے ساتھ میرے پیچھے ہو لیا۔

☼ ☼ ☼

صبح میرا ٹیسٹ تھا لہٰذا میں ابھی تک پڑھ رہی تھی اور اس وقت خاصی تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ کافی بنالوں۔ کچن کی طرف بڑھتے ہوئے میں لاؤنج کے قریب سے گزری تو انیقہ کی آواز سن کر ٹھٹک گئی۔ رات کے گیارہ بجے یہ کس سے باتیں کر رہی ہے؟ فطری طور پر سوال میرے ذہن میں آیا۔ امی اور پاپا یقیناً سو چکے ہوں گے۔ ہارون بھی گیسٹ روم میں تھا۔ اب پتا نہیں سو رہا تھا کہ جاگ رہا تھا۔ میں لاؤنج میں آئی تو انیقہ فون کا ریسیور تھامے ارد گرد سے بے نیاز محو گفتگو تھی۔

"نہیں شموز! بلیو می میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ تم سے نہیں ہارون سے محبت کرتی ہے۔ میرا یقین کرو۔ مجھے پتا ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو اور شادی کے لیے خالہ مسرت سے بات بھی کر چکے ہو۔ مگر اس طرح اپنی زندگی کیوں خراب کرنے پر تلے ہو؟ میں تمہاری ہمدرد ہوں۔ آئینہ کبھی بھی سچ تمہیں نہیں بتائے گی۔ صرف تم اس سے اتنا پوچھ لینا کہ وہ رات کے دس بجے اکیلے گھر میں ہارون کے ساتھ اس کے کمرے میں کیا کر رہی تھی؟" وہ نجانے کیا کیا کہتی چلی جارہی تھی اور میرے دماغ میں جھماکے ہو رہے تھے۔ یہ میری سگی بہن کیا یہ اپنی نفرت اور کینہ پروری میں اتنا گر سکتی ہے؟

مجھے نجانے کیا ہوا کہ میں چیل کی طرح اس پر جھپٹی اور اس سے ریسیور چھین کر کان سے لگایا۔

"ہیلو شموز۔۔۔" میری آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

"آئینہ۔۔۔ یہ انیقہ کیا کہہ رہی ہے؟" شموز مجھ سے تصدیق چاہ رہا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے قبل ہی انیقہ نے کریڈل دبا کر فون ڈسکنیکٹ کر دیا۔

"کیوں کیا تم نے یہ ذلیل کام؟ بولو۔۔۔ کیوں شموز سے جھوٹ بولا۔" میں چیخ پڑی اتنی زور سے شاید میں زندگی میں پہلی بار چلائی تھی۔ انیقہ بس مسکرائی رہی میں نے اپنے دونوں ہاتھ سے اس کا شانہ جھنجوڑ دیا۔

"انیقہ۔۔۔ آئینہ کیا ہو رہا ہے؟" امی پاپا اور ہارون میری آوازوں سے باہر نکل آئے تھے۔

"کیسا شور ہے یہ؟" امی بدحواس ہو رہی تھیں۔

"امی۔۔۔ پاپا یہ۔" میں ان سے کچھ کہنے والی تھی کہ ہارون کو دیکھ کر میرے لب سل گئے۔ "کیا میں اب ان تینوں کے سامنے یہ ذلت آمیز شرمناک بات دہراؤں؟"

میری سوچ کی حیا نے میرے لبوں کو سی دیا تھا۔ ریسیور ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے آہستگی سے اسے کریڈل پر ڈال دیا اور مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہاں مزید کیا ہوا' کس نے کیا کہا' میں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ مگر مجھے انیقہ سے جواب لینا تھا۔ وہ رات میں انگاروں پر لوٹتی رہی تھی۔ مجھے انیقہ کے رویے کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پھر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں اس کے کمرے میں آگئی۔ انیقہ کا کمرا گیسٹ روم کے ساتھ ہی تھا۔ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ ایزی چیئر پر جھولتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ میں دھڑام

سے دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ انیقہ چونک گئی تھی۔
"کیوں آئی ہو؟" وہ بد تمیزی سے بولی۔
"اس ذلت کا جواب لینے آئی ہوں کیوں کی تم نے وہ ساری بکواس۔۔۔ اب مجھے بتاؤ۔ کوئی شکایت ہے' کوئی بات ہے تو مجھے کہو۔۔۔ مجھ پر الزام لگا کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔" میں اس سے پوچھ رہی تھی۔
"مجھے معلوم ہے کہ تم بھی شمروز سے محبت کرتی ہو اور اگر واقعی ایسی بات ہے تو تم مجھ سے کہو' میں خود تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گی۔" میں نے پہل کرنے کی ٹھانی تھی۔ "بس کرو تم ہو کیا چیز۔۔۔ ایک معمولی صورت والی معمولی ادھوری لڑکی۔" اس نے میری بات کو چلا کر کاٹا۔ میں جھٹکے سے جیسے دم بخود ہو گئی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے احساس نہ تھا اور انیقہ کا بھی دھیان نہیں تھا کہ وہ دروازہ بند کرتی۔ امی' پاپا کب وہاں آکر کھڑے ہو گئے۔ ہمیں پتا بھی نہ چلا۔
"تم۔۔۔ تم جب سے پیدا ہوئی ہو میرے لیے مصیبت بنی ہو۔ امی کی گود میں آئیں تو پہلے تو وہ تمہاری بد صورتی کے قصوں سے ہی فارغ نہ ہوتیں کہ مجھ پر توجہ دے سکتیں۔ پاپا امی کے رویے کی وجہ سے تمہارا زیادہ خیال رکھنے لگے کہ کہیں تم ہرٹ نہ ہو جاؤ۔ تمہاری نفسیات نہ بگڑ جائے۔ ہر معاملے میں وہ تمہارا زیادہ خیال رکھتے۔ اچھے یا بری دونوں ہی حالتوں میں امی اور پاپا سمیت ہر ایک کی توجہ کا مرکز تم بنی رہیں۔ موازنہ کی صورت میں بھی موضوع تم ہی بنتی۔ پھر تمہاری پے در پے کامیابیوں نے میرے ہر گن' میرے حسن کو گہنانا شروع کر دیا آئینہ۔۔۔ میں تمہارے اندر اپنا عکس دیکھتی تو مجھے اپنا آپ تم سے زیادہ معمولی اور زیادہ تنہا لگنے لگتا۔ جانے 'انجانے ہر زبان پر تمہارا نام ہوتا ہے۔ پاپا کو تمہارے بغیر کچھ نہیں نظر آتا۔ امی کی زبان پر تمہاری باتیں ہیں۔ عالیہ آنٹی' شمروز' ہر کوئی آئینہ کے نام کی مالا جپتا ہے۔ تم نے مجھے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے آئینہ! شمروز تم سے محبت کرتا ہے' اسے میں کیوں نظر نہیں آئی۔۔۔؟ تمہاری اچھائیوں اور تمہاری خوبیوں نے مجھے توڑ ڈالا ہے آئینہ۔۔۔! میں وہ سب شمروز سے نہیں کہنا چاہتی تھی مگر کہہ ڈالا۔۔۔ تم نے تو مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا آئینہ مجھے تم سے نفرت ہے۔ مگر یقین جانو۔ مجھے تم سے نفرت نہیں ہے۔" انیقہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ لیے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میں بت بنی کھڑی تھی۔ میں جو سمجھتی تھی کہ انیقہ مکمل ہے۔ انیقہ خوش قسمت ہے۔ وہ سب کے دلوں پر راج کرتی ہے۔ وہ پیدا ہی راج کرنے کے لیے ہوئی ہے۔ مگر میں تو جو اس کے لیے سوچتی تھی۔ وہ سب وہ میرے لیے سوچتی تھی۔ میری خوبیوں نے اسے احساس کمتری اور تنہائی کے زندان میں ڈال دیا تھا۔ کیا یہ بھی زندگی کی کوئی حقیقت ہے؟ کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟
میں زندگی کی تہوں پر حیران تھی۔ میں اس کی پرتوں کے اترنے پر حیران تھی۔ وہ انجانے میں کئی قسم کی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو گئی تھی۔ میری نظر امی اور پاپا سے ہوتی ہوئی ہارون پر پڑی جو اب آہستگی سے واپس لوٹ رہا تھا۔ جبکہ امی اور پاپا اپنی اپنی جگہ احساس جرم میں مبتلا تھے۔ پھر پاپا نے خاموشی سے امی کو چلنے کا اشارہ کیا اور دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ پاپا جانتے تھے کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم دونوں اس مسئلے کو خود حل کریں۔ میں گہری سانس لے کر اس کے پاس آئی۔
"انیقہ! جو تم نے کہا وہ صرف تمہاری سوچ ہے۔ امی در حقیقت تم سے بہت محبت کرتی ہیں۔ ہوتی ہے نا نیچرل فیلنگز کہ ماں باپ اپنے سب بچوں میں سے کسی ایک سے زیادہ پیار کرتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ باقی کے بچوں سے وہ محبت نہیں کرتے۔" میں نے کہنا شروع کیا "مجھے مت سمجھاؤ" وہ چلائی۔
"دیکھو میری طرف۔ میری بات سنو۔" میں نے اس کا شانہ تھام لیا۔
"ہم دونوں کو مدد کی ضرورت ہے انیقہ۔۔۔ اور ایک دوسرے سے زیادہ ہماری مدد کوئی تیسرا نہیں کر سکتا۔ پلیز میری بات سنو۔" میں نے نرمی سے کہا۔ وہ شاید

اپنی بہتان تراشی پر شرمندہ تھی جبھی چپ چاپ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو انیقہ! مجھ پر بچپن سے ہی تنقید کی گئی تھی۔ میری نسبت تمہاری تعریفیں ہوتی تھیں۔ اگر پاپا مجھے سہارا نہ دیتے تو سوچو کہ میری زندگی برباد ہو جاتی۔ انہوں نے تو ماں اور باپ دونوں کا رول نبھایا ہے۔ مگر تم پر تو ہر ایک کی توجہ ہوتی تھی اور بے جا ہے مانو یا نہ مانو۔ ہم سگی بہنیں ہیں۔ ہمارا دکھ ایک 'تکلیف ایک اور احساس بھی ایک ہمیں ایک دوسرے کے لیے اچھی سوچ رکھنی ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے دشمنی نہیں کرنی تم بہت اچھی ہو بس کبھی مجھے ایک بڑی بہن بن کر قریب نہیں کیا۔۔۔ شمروز تمہیں مبارک ہو۔ میری زندگی کا مشن کچھ اور ہے۔ تم نہ بھی کہتیں تو شمروز کے پروپوزل کو میں نے قبول نہیں کرنا تھا۔ وہ تمہارے ساتھ بہت سوٹ کرے گا۔ وہ بہت اچھا ہے اور تمہیں خوش رکھے گا۔" میں نے نرمی سے کہا۔

انیقہ نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

"مجھے یوں مت دیکھو۔ بس کوئی اچھا لگے تو ضروری نہیں ہوتا کہ اس سے شادی کرلی جائے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر محبت کا رنگ ایک ہو۔ جیسے ماں باپ 'بھائی' بہن' دوست ہر محبت کا رنگ جدا ہوتا ہے۔" میں اس سے کافی دیر باتیں کرتی رہی۔ اس کے دل کا زنگ صاف کرتی رہی۔ میں جانتی ہوں کہ برسوں کا زنگ چند لمحوں میں نہیں اتر سکتا۔ مگر مجھے اپنی بہن کو بچانا تھا۔ اسے مدد کی ضرورت تھی۔ مجھے شمروز کی محبت کو قربان کرنا تھا۔ یہ گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ مجھے انیقہ کے ساتھ نفسیاتی اور جذباتی ٹریٹمنٹ کرنا تھا' کیونکہ وہ ان دو پہلوؤں سے ہرٹ ہوئی تھی۔ مجھے بلاوجہ قربانیاں دینے کا شوق نہیں ہے۔ میرا موقف ہے کہ قربانیاں دینے کا جواز ہونا چاہیے اور جن کے لیے آپ قربانیاں دے رہے ہیں انہیں اس سے فائدہ ہو وہ اس کی اہمیت کو سمجھیں۔ انیقہ کی نفسیاتی ٹوٹ پھوٹ کی پیوند کاری کرنی تھی۔ اس میں کچھ خامیاں ہیں تو خوبیاں بھی بہت ہیں۔ میں ایک اچھی خاصی لڑکی کو جو کہ میری بہن بعد میں مگر انسان پہلے ہے' محض اپنی انا اور جذباتی تسکین کی خاطر اس کنویں میں نہیں دھکیل سکتی تھی جو اس نادان نے خود اپنے لیے کھود لیا تھا۔۔۔ انجانے میں ہی سہی۔ مجھے اس کا سارا مسئلہ سمجھ میں آ گیا تھا۔

گڑھے سے نکلنا آسان ہوتا ہے مگر کنوئیں کے اندر سے بغیر کسی سہارے 'بغیر رسی کے نہیں نکلا جا سکتا۔ شمروز وہ رسی تھا جس کے سہارے مجھے اپنی بہن کو باہر نکالنا تھا۔ اس رسی کو میں انیقہ کی کمر سے باندھ چکی تھی' بس اب شمروز کو راضی کرنا تھا۔ مجھے اپنی محبت کی قربانی دینی تھی۔ وہ قربانی جو خدا کی راہ میں کی جائے میرے نزدیک اسی کی ویلیو ہے' میں ان لوگوں میں سے ہوں جو خدا کی راہ میں کی جانے والی قربانی کے سوا ہر چیز کی "قربانی" کا صحیح جواز ڈھونڈتے ہیں اور پوری تسلی ہونے کے بعد "عمل" کرتے ہیں۔ انیقہ کے معاملے میں بھی یہی ہوا تھا۔ میں لمحوں میں انیقہ کی "بیماری" سمجھ کر فیصلہ کر چکی تھی اور میں فیصلہ کرنے کے بعد اس سے ہٹتی نہیں ہوں۔ مجھے اب شمروز کو بھی منانا تھا۔ تاکہ آئندہ کی زندگی ان دونوں کی پرسکون گزرے۔ کام مشکل تھا مگر چونکہ نیت و ارادہ صحیح تھا اور جذبے میں خیر خواہی تھی تو قدرت نے راہ آسان کر دی۔ بہت مشکل کام ذرا سی محنت سے ٹھیک ہو گیا۔

"میں تمہاری قربانی رائیگاں ہونے نہیں دوں گا۔ تمہارا بھرم مجھے عزیز ہے۔" شمروز نے اس رات یہ آخری جملہ کہا تھا۔ اس کے بعد مسرت آنٹی کی امی سے بات ہوئی اور شمروز کا رشتہ انیقہ کے لیے قبول کر لیا گیا۔

☼ ☼ ☼
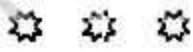
انیقہ اور شمروز کو دو بجے ایئرپورٹ پہنچنا تھا۔ میں پیکنگ میں اس کی مدد کر رہی تھی۔ شمروز پاپا کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس رات مجھے بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ انیقہ نے کل رات میری کمرے میں آکر مجھ سے معافی مانگی تھی پہلی بار اس نے اپنی غلطی اور اپنے غلط ہونے کا

اعتراف کیا تھا۔ اس نے اعتراف کیا تھا بہت سے کام وہ محض مجھے ہرٹ کرنے کے لیے کرتی یا پھر حسد میں آ کر۔ وہ اکیس سال تک میرے ساتھ رہی۔ ایک ہی گھر میں ایک ساتھ۔ ہماری لڑائیاں بھی بہت ہوتیں اور شروعات ہمیشہ وہ کرتی تھی مگر دوستی میں پہل میں کرتی تھی۔ وہ اپنے ان منفی جذبات و احساسات جو مجھ سے منسلک تھے کے ساتھ پلی بڑھی اور میرا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ اس پر اس کی تقدیر پر رشک کرتی۔ ہم دونوں کی سوچ ہی غلط تھی ایک دوسرے کے حوالے سے۔ نہ ہی انیقہ کا حسن میری ذہانت و اہمیت کو کم کر سکتا تھا اور نہ ہی میں اپنی بھرپور قابلیت کے باوجود انیقہ کی جگہ لے سکتی تھی۔ ہم دونوں کو وہی ملا جو قسمت ہمارے لیے منتخب کر چکی تھی۔ ایئرپورٹ پر وہ مجھے گلے سے لگا کر رو پڑی۔

"جب قریب تھی تو کبھی خیال تک نہیں آیا تھا کہ تم سے دور ہوتے ہوئے اتنا تمہیں مس کروں گی اور اب...."

"بہنوں کا پیار سمندر کے پانی جیسا ہوتا ہے بظاہر وہ الگ الگ رنگ ہوتے ہیں اور دونوں نظر بھی الگ الگ آتے ہیں، مگر درحقیقت ایک ہوتے ہیں۔ ہم سگی بہنیں ہیں انیقہ۔ ہم کبھی جدا نہیں ہو سکتیں۔" میں نے اپنی انگلی کے پوروں سے اس کے آنسو پونچھے۔

زندگی اپنی مخصوص چال چلتی رہی۔ انیقہ شموز کے ساتھ سیٹل ہو گئی تھی۔ میں نے ایم بی اے کے بعد آفس جوائن کر لیا تھا۔ میرا دماغ اور پاپا کا تجربہ مل کر ہمارے بزنس کو بڑھا رہا تھا۔ میری صلاحیتیں صرف کاروبار تک محدود نہ تھیں۔ میں نے اپنی صلاحیتوں کو ملک اور عوام کے مفاد میں صرف کرنا شروع کر دیا تھا۔ امی پاپا کی نسبت مجھ پر برہم ہوتیں اور پاپا سے لڑتیں کہ وہ میری نکلتی ہوئی عمر کو دیکھے بغیر مجھے سپورٹ کر رہے ہیں۔

"تیس کی ہونے والی ہے۔ ہمارے خاندان میں کسی کی اس عمر میں آ کر شادی نہیں ہوئی۔" امی ایک روز سخت غصے میں آ کر کہہ رہی تھیں۔

"کوئی بات نہیں ہے۔ دنیا میں ہر کام کبھی نہ کبھی پہلی مرتبہ ہوتا ہے۔ ہماری بیٹی نے اس خاندان کا اس معاملے میں بھی ریکارڈ توڑ دیا ہے۔" پاپا بھلا کب سنجیدہ ہونے والے تھے مجھے ہنسی آ گئی۔

"بس یہی.... ہر وقت مذاق ارے انیقہ کے دو بچے ہو گئے ہیں اس کی ڈولی کب اٹھے گی؟" وہ بھڑک اٹھیں۔

"اب ڈولی کا زمانہ نہیں ہیلی کاپٹر کا دور ہے امی۔ پتا ہے اس روز میں نیوز پر دیکھ رہی تھی کہ ایک امریکی جوڑے نے سمندر کے اندر شادی کی ہے۔" میں نے پانی کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"میری بلا سے چاند پر جا کر کریں شادی۔ میں تمہاری بات کر رہی ہوں۔" وہ جھلا گئیں۔

"ارے بھئی ہو جائے گی شادی۔ جس کے ساتھ اس کا نصیب لکھا ہو گا وہ اچانک آئے گا اور لے جائے گا۔" پاپا نے ٹرائفل کا ڈونگا اٹھا لیا۔

"میٹھا مت کھائیں ڈاکٹر نے منع کیا ہے پاپا۔" میں نے امی کی توجہ خود پر سے ہٹانے کی غرض سے پاپا کی طرف متوجہ کر دیا۔ امی نے ان کو میٹھا کھانے کے نقصانات پر اچھا خاصا لیکچر سنا دیا۔ پاپا کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں بدلہ لینے کی دھمکی دے رہے تھے مجھے ہنسی آ گئی۔ میں میز سے اٹھنے لگی تو توپوں کا رخ میری طرف ہو گیا پاپا نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھا۔ میں نے مدد طلب نظروں سے انہیں دیکھا۔

"غداری کا انجام...." وہ زیر لب بولے اور للچائی ہوئی نظروں سے ٹرائفل کو دیکھتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

"عالیہ پہلے بھی کئی بار تذکرہ کر چکی ہے۔ اب کی بار تو اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ قاضی کو لے کر پہنچ جائے گی۔" امی کی بات پر میں نے نیپکن سے منہ صاف کیا اور خاصی ناراضی سے انہیں دیکھا۔

"چھوٹا ہے ہارون مجھ سے اور نجانے وہ راضی بھی ہو یا نہیں؟ آئی زبردستی نہ کر رہی ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہارون کی اپنی مرضی شامل ہے اس میں اور ایک صحت مند خود مختار انسان کے ساتھ کون زبردستی کر سکتا ہے۔ باقی رہا عمر کا فرق تو ایک دو سال کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس نے شادی کے لیے تمہارا ہی نام لیا ہے مینا۔" امی کے بجائے پاپا نے جواب دیا۔

"مگر پاپا! میں اس کے قابل نہیں۔ آپ جانتے ہیں نا۔" میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"کیوں؟ کیا کمی ہے تم میں؟ تم سے زیادہ مکمل میں نے اپنی پوری زندگی میں کسی کو نہیں دیکھا۔" پاپا نے نارمل سے انداز میں کہا۔

"اس کا اسکائپ آئی ڈی مجھ سے لے لو اور اطمینان سے اس سے بات کر لو۔ جہاں اتنی دیر ہوئی ہے وہاں دو چار دنوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" پاپا نے کہا اور اٹھ کر اندر چلے گئے اور میں سوچ میں ڈوب گئی۔

اس رات میں خاصی ڈسٹرب تھی۔ بات انہونی نہ تھی۔ بس مجھے عجیب لگ رہی تھی۔ ہارون عرصہ دراز سے امریکہ میں مقیم تھا۔ وہیں اس نے تعلیم مکمل کی تھی پھر وہیں جاب بھی کر لی۔ کسی امریکی ریسرچ سنٹر سے بھی اس کا تعلق تھا۔ اس کی قابلیت سے تو میں واقف تھی ہی۔ کئی سالوں سے مسلسل اس کی کارگزاریاں اور کارنامے مختلف غیر ملکی اور لوکل چینلز پر سننے اور دیکھنے کو ملتی تھیں۔ وہ امریکیوں کو کیش کر رہا تھا یا امریکی اسے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ عالیہ آنٹی اور شبیر چچا تو یہیں تھے مگر وہ ان سالوں میں شاید بمشکل دو یا تین بار پاکستان آیا تھا۔ وہ کمپیوٹر سافٹ ویئر انجینئر بن چکا تھا اور دنیا بھر میں شہرت کے جھنڈے گاڑ رہا تھا۔ انیقہ اور شمروز سے بھی اس کی ملاقات ہوتی تھی۔ ارے ... انیقہ اور شمروز کا حال سنانا تو بھول ہی گئی۔ وہ دونوں بہت خوش ہیں دو بچے بھی ہیں۔ روحیل اور آیت۔ شمروز نے اپنے وعدے کا پاس رکھا ہوا ہے۔ وہ واقعی بہت اچھا ہے۔ مجھ سے کئی بار کہہ چکا ہے کہ میں بھی اب گھر بسا لوں۔

اور اب میں سوچ رہی ہوں کہ ہارون سے کیا بات کروں؟ نجانے کیوں میں اسے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ کچھ بھی نہ پوچھ سکی۔ امی نے مجھ سے اجازت یا پوچھنے کا تکلف کیے بغیر آئی کو نکاح کی تاریخ دے دی۔ جی ہاں ... ڈائریکٹ نکاح کی تاریخ۔ ہارون کے مشورے سے ہی تاریخ طے ہوئی تھی۔ وہ اگلے ماہ چھٹیوں پر آ رہا تھا۔ سب کچھ بہت ہی جلد ہو رہا تھا۔ میں نے تھک کر اس بارے میں کچھ بھی سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ ہارون نے میری ایک بار بھی بات نہیں ہوئی تھی۔

✵ ✵ ✵

اس روز میں آفس سے سیدھی اس زیر تعمیر اسکول کی عمارت کا معائنہ کرنے پہنچ گئی۔ یہ اسکول میں غریب اور ضرورت مند بچوں کے لیے بنوا رہی تھی۔ جس میں ساری سہولیات اور تعلیم کا معیار ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک بہترین انگلش میڈیم اسکول کا ہوتا ہے۔ اس اسکول میں غربا کے بچوں کے لیے کتب، یونیفارم اور دوسری سہولیات حتیٰ کہ پک اینڈ ڈراپ کی سہولیات بھی مفت تھیں۔ یہ اسکول صرف امیروں کے بچوں سے فیس لیتا تھا۔ میں نے ایک بار پاپا سے کہا تھا کہ اگر ہر متمول گھرانا ایک ضرورت مند غریب بچے کی تعلیم کی ذمہ داری اٹھا لے تو ہمارے ملک سے جہالت ختم ہو جائے اور اپنی مدد آپ کے تحت ہر صاحب حیثیت شخص بے روزگار شخص کی کچھ اس طرح مدد کرے کہ اسے روزگار دلانے میں مدد کرے تو ہمارے ملک سے نوے فیصد جرائم تو ختم ہو ہی جائیں گے۔ کیونکہ جرائم کی جڑ بے روزگاری اور جہالت ہوتی ہے۔ اس بات کے جواب میں پاپا نے یہ کہا تھا۔

کہ ہمارے ملازمین اور کام کرنے والی ملازمین کے بچوں کی تعلیم کے اخراجات اٹھانے کا ذمہ لے لیا۔ یعنی ابتدا تو ہمارے گھر سے ہی ہو گئی۔ میں نے اور پاپا نے صرف زبانی خرچ کے بجائے عمل کیا تھا اور دوسروں کو

بھی اس کی ترغیب دیتے تھے۔ لوگ ہماری باتوں کو کچھ سراہتے، کبھی مذاق میں اڑا دیتے۔ بہت کم ایسے لوگ تھے جو عملاً سامنے آتے۔ لاکھوں روپے صرف اپنے لباس، کھانے پینے اور دوسری خرافات پر ایک ہی دن میں اڑا دینے والوں کے دل اتنے تنگ تھے کہ خیرات اور زکواۃ کے نام پر چند روپے نہ نکلتے تھے ان کی جیبوں سے۔

بابا کے بزنس میں جتنا پرافٹ ہوتا تھا اسے ہم اسی طرح کے کاموں میں زیادہ تر صرف کرتے تھے اور آج بابا اور میری کوششوں سے یہ ہوا کہ اپنے شہر کے علاوہ بھی چند ایک شہروں میں اسی طرح کے اسکول اور رفاحی ادارے کھل گئے تھے۔ ہماری طرح کے چند مخیر حضرات تھے جو اس کار خیر میں ہمارا ساتھ دے رہے تھے اور آنی اور شبیر چچا بھی انہی میں شامل تھے۔

مسرت آنٹی اور ان کی فیملی بھی ہر سال خاصی بڑی رقم ان اداروں کے لیے بھیجتے تھے۔ اس قسم کے کاموں میں ڈوب کر مجھے دلی اور ذہنی سکون ملتا تھا۔ مجھے اب اپنے جسم کا ادھورا پن نہیں ستاتا تھا۔ بس جب بھی شادی کا ذکر ہوتا تو ایک احساس سا گزر جاتا تھا قریب سے اور کچھ نہیں۔

میں بہت تھک گئی تھی۔ کھانا کھا کر جو سوئی تو دروازے پر ہونے والی تیز دستک سے ہی جاگی۔

"آجاؤ۔" نجانے کیا وقت تھا۔ میں نے سستی سے آنکھ ملی۔ دروازہ کھلا اور کوئی اندر آگیا۔

میں سمجھی ملازمہ ہوگی۔ "سلمی! پردے سرکا دو۔ کیا وقت ہو رہا ہے؟" میں نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔

"شام کے ساڑھے سات بج رہے ہیں جناب۔" کھٹ کھٹ... ساری روشنیاں جل اٹھیں اور سامنے کھڑے زیرو زیرو سیون کو دیکھ کر میں جمائی لینا بھول گئی۔

"تم۔" میں ابھی تک لیٹی ہوئی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور پاس رکھا دوپٹا اٹھا کر اوڑھ لیا۔

"مانا کہ خدا نے مجھے بہت ہینڈسم بنایا ہے مگر اب اتنا بھی نہیں کہ تم نظریں ہٹانا بھول جاؤ۔" وہ ہارون ہی تھا۔ اونچے لمبے قد اور مضبوط ڈیل ڈول کے ساتھ وہ اپنی عمر سے زیادہ اور مجھ سے کم سے کم چھ سال بڑا لگ رہا تھا۔ وہ واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ ہینڈسم ہو گیا تھا۔

"تم کب آئے؟" میں نے پوچھا۔

"بیٹھنے کو نہیں کہو گی؟" وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ رشتہ بدل رہا تھا لہٰذا انداز اور نظر کا بدلنا فطری تھا۔ میں نروس ہو رہی تھی۔ کیوں...؟ حالانکہ اس عمر میں یہ حرکتیں اچھی نہیں لگتیں۔ میں جھلا گئی۔

"بیٹھو میں فریش ہو کر آتی ہوں۔" میں نے اپنے اکلوتے ہاتھ سے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹا اور باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ فریش ہو کر نکلی تو کھڑکیوں سے پردے ہٹے ہوئے تھے اور کپ گرم بھاپ اڑاتی چائے میری منتظر تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں یہاں آنے سے پہلے ملازمہ سے کہہ کر آیا تھا چائے کا۔" وہ میرے کچھ پوچھنے سے قبل بول پڑا۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل پر سے برش اٹھایا اور بالوں میں کرنے لگی۔

"خالہ نے بتایا تھا کہ تم سو رہی ہو تو میں نے سوچا کہ تمہیں ڈسٹرب کرتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"نارملی میں اتنا سوتی نہیں۔ آج تھکاوٹ زیادہ ہو گئی تھی۔ تم کب آئے؟ آنی نے بتایا نہیں۔" میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"رات دیر سے آیا تھا۔ آتے ہی سو گیا۔ دوپہر میں جاگا تو تم آفس گئی ہوئی تھیں۔ میں تو دو چکر لگا چکا ہوں یہاں کے۔ تم دستیاب ہی نہیں ہو رہی تھیں۔" وہ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"یہ تمہاری کانوکیشن کی تصویر ہے نا۔" کرسٹل کے فریم میں جکڑی میری تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا گاؤن اور کیپ پہنے میں مسکرا رہی تھی۔

"ہاں۔" میں نے اختصار برتا۔

"تم مسکراتے ہوئے بہت اچھی لگتی ہو آئینہ۔ کیا باتیں اور مسکرانا دونوں کم کردیے ہیں؟" ہارون نے مجھے دیکھا۔ مجھے آج اس کی نظروں سے گھبراہٹ ہو رہی تھی یا حیا آرہی تھی میں نہیں جانتی۔ مگر مجھ سے اس کے سامنے نہیں بیٹھا جارہا تھا۔

"جو تم سمجھو۔" میں نے برش اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔

"تمہاری نفاست و نزاکت پسندی کی عادت تو جوں کی توں ہے۔ مجھے تمہارا کمرا دیکھ کر اندازہ ہوگیا ہے۔" وہ کمرے پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ میں ہلکے سے مسکرادی۔

"لیکن اکثر خواتین شادی اور پھر بچے ہوجانے کے بعد یہ عادت ترک کردیتی ہیں۔ تم تو ایسا نہیں کروگی؟" اس بار بھی اس کا لہجہ نارمل تھا۔ میں نے گڑبڑا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی چمکدار آنکھیں شوخی سے مسکرا رہی تھیں۔

"مجھے بھی صفائی اور نفاست پسند ہے۔ اگر تم نے بعد میں یہ عادت ترک کربھی دی تو۔" وہ کہتے کہتے رکا۔

"تو میں خود کرلیا کروں گا۔" وہ ہنس پڑا میں گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

"میں... ابھی آتی ہوں۔" میں نے وہاں سے رفو چکر ہوجانا چاہا مگر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھالیا۔ میں کوئی سولہ سترہ سال کی لڑکی نہیں تھی ایک میچور اور پریکٹیکل لڑکی تھی۔ مگر کچھ باتیں فطری ہوتی ہیں۔ ان پر اختیار نہیں ہوتا۔

"مجھے تم سے اکیلے میں کچھ ضروری باتیں کرنی تھیں۔ آج موقع میسر ہے پھر پتا نہیں شادی سے پہلے موقع ملتا ہے کہ نہیں۔ چلو ابتدا سے شروع کرتے ہیں۔" اس نے آغاز کیا۔

"جس رات انیقہ نے وہ گھٹیا ڈرامہ کیا تھا تو مجھے اس پر بے حد غصہ آیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس کے منہ پر تھپڑ رسید کروں۔ مگر میں ضبط کرکے کمرے میں چلا گیا اور میں نے شمروز کو کال کرکے ساری بات کلیئر کردی۔" میں چونک گئی۔

"ہاں آئینہ! میری اس رات شمروز سے بات ہوئی تھی۔ مگر میں نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کسی سے حتیٰ کہ تم سے بھی اس بات کا ذکر نہ کرے۔" ہارون نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے انیقہ پر غصہ تو آیا تھا مگر اس کے اور تمہارے درمیان ہونے والی باتوں کو سننے کے بعد میں نے غور کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ انتہا کی خود پسندی اور دوسرے نفسیاتی مسائل اور عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہے۔ میں نے شمروز سے اس مسئلے کا حل طلب کیا تو اس نے مجھے تمہارے بڑے پن کا انکشاف کرکے حیران کردیا۔ تمہاری میچورٹی پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ پہلے بھی تم اپنی عادات کی وجہ سے مجھے اچھی لگتی تھیں۔ مگر اس واقعہ کے بعد سے میں نہ صرف تمہاری عزت کرنے لگا تھا بلکہ تمہارے بارے میں خاص انداز سے سوچنا شروع کردیا تھا۔ پتا نہیں وہ محبت تھی کہ نہیں۔ مگر یہاں سے جانے کے بعد کوئی دن ایسا نہ تھا جب تم مجھے یاد نہ آتی ہو۔ مگر میں تم سے بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں تمہیں برا نہ لگے۔" اس نے چائے کا کپ میری طرف بڑھا دیا۔ مجھے اس کی یہ ادا اچھی لگی۔ اس نے کلام کا سلسلہ پھر سے جوڑا۔

"ممی تو پہلے ہی تمہارے عشق میں گرفتار تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم سے شادی کے بارے میں سوچوں میں نے اس پل ایک لمحے کی دیر لگائے بغیر ان سے کہہ دیا تھا کہ سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر پھر تمہاری طرف سے کوئی واضح جواب نہیں آرہا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ تمہیں وقت دینا چاہیے اسی لیے میں نے ممی سے کہا کہ تم پر زور نہ ڈالا جائے۔ اور دیکھو... میرا انتظار رنگ لے آیا۔" وہ مسکرایا۔

"تمہاری کارگزاریاں مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں۔ جتنا خیال تم غریب عوام کا کرتی ہو اگر اس بچارے کا بھی کرلو تو میرا بھی بھلا ہوجائے۔ ابھی تک اکیلا ہوں۔"

وہ معصوم سی صورت بنا کر بولا تو مجھے ہنسی آگئی۔

"دیکھو نا کھانا پکانا، صفائی کرنا، کپڑے دھونا کوئی ایک کام تو ہے نہیں۔ پھر آفس، ریسرچ۔ الاں فلاں۔ کچھ رحم کھاؤ بھئی۔"

"تمہیں بیوی چاہیے یا ملازمہ؟" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"نوکرانی سے رومینس تو نہیں کیا جاتا نا۔" وہ سر کھجا کر بولا تو میں جھینپ گئی۔

"لیکن یہاں بھی مجھ پر بہت ذمہ داریاں ہیں۔" میں سنجیدہ ہو گئی۔

"معلوم ہے مجھے اور میں ان ذمہ داریوں کو بانٹنا چاہتا ہوں۔ میں بھی کچھ ایسا ہی پلان کر رہا ہوں مجھے پاکستان میں ایک ایسا ٹیکنیکل انسٹیٹوٹ بنانا ہے جہاں ہمارے ملک کے ٹیلنٹڈ نوجوان اپنی صلاحیتوں کو نکھار کر ترقی کر سکیں۔ یہ کام مشکل ہے۔ مگر جس طرح تم نے مشکل میں گھبرانا نہیں سیکھا، اسی طرح میں نے بھی ہار ماننا نہیں سیکھا۔ بلکہ سچ پوچھو تو یہ آئیڈیا مجھے تم سے ہی ملا ہے۔ تم نے پہلا سنگ رکھا ہے، دوسری اینٹ میں نے رکھنے کی تیاری شروع کی ہے۔ ہمارے ملک کو ایسی ہی اینٹوں کی ضرورت ہے۔ جو ایک مضبوط عمارت بنا سکے۔ ہر کوئی حکومت پر ذمہ داری ڈال کر خود بری الذمہ ہو جانا چاہتا ہے۔ اگر حکومت آگے نہیں آرہی تو ہم جیسے لوگوں کو ہی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔"

ہارون سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ مجھے اس کی بات سن کر بہت خوشی ہوئی تھی۔

"بہت اچھا خیال ہے تمہارا۔ خدا بھی ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو خود اپنی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ اور عملاً کر کے بھی دکھاتے ہیں۔" میں نے اسے سراہا "مجھے ہر قدم پر تمہاری ضرورت رہے گی آئینہ۔۔۔ میری زندگی میں آنے والی تم پہلی اور آخری لڑکی ہو۔ سوچتا ہوں کہ خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ اتنے طویل انتظار کے بعد تم مجھے ملی ہو۔ یہ نعمت کیا کم ہے۔" وہ محبت اور احترام بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا بہت پہلے پاپا نے مجھے ایک بات کہی تھی۔

"تمہیں شمروز نہیں ملا کوئی غم مت کرو۔ اللہ نے اس بہتر کوئی تمہارے لیے رکھا ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے تمہارے لیے ایسا ہی چنا ہو گا جو مردوں میں بہت خاص ہو گا۔ وہ چنا ہوا مرد ہو گا۔" پاپا نے صحیح کہا تھا۔ ہارون بہترین تھا۔ ہر لحاظ سے اگر شمروز سے اس کا موازنہ کروں تب بھی۔ میں نے اللہ کی طرف سے ملنے والے اس تحفے کو قدر و محبت سے قبول کرلیا۔

اور آج شادی کے چھبیس برس گزر جانے کے بعد بھی وہ میرا دیوانہ ہے اور اسی طرح میری عزت کرتا ہے۔ ہارون ایک بہترین انسان ہے۔ بہترین شوہر ہے۔ بہترین باپ ہے۔ بہترین بیٹا ہے۔ بہترین محب وطن پاکستانی ہے۔

آج اس کا ریسرچ سنٹر اور ورک شاپ بین الاقوامی لیول تک پہنچ چکی ہے۔ ہمارا ساتھ دینے والے "بڑے دل والے" حضرات میں اضافہ ہو چکا ہے۔ پاپا کہتے تھے کہ اگر انسان کرنے پر آئے تو مٹی کو سونا بنا دے۔ بس اپنی صلاحیتوں کو پہچان کر ان کا مثبت استعمال کریں۔ اپنی راہیں منتخب کرنے سے پہلے اچھی طرح دیکھ بھال کر لینی چاہیے۔

میرا ایک ہاتھ لے کر اللہ نے مجھے پورے کا پورا ہارون دے دیا۔ میری طرح ہر انسان کو اپنی اپنی زندگی پر لگے جالوں کو صاف کرنا چاہیے تاکہ سب کچھ صاف صاف نظر آئے اور اس سے سب سے پہلے جو چیز نظر آئے وہ یہ ہو کہ اللہ ہم سے کس قدر محبت کرتا ہے اور اس کے کنبے سے محبت کر کے ان کا خیال کر کے ہمیں اس کی محبت کا یہ حق ادا کرنا ہے۔

☆ ☆

شعلہ عنبر

القرآن

☆ اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں اور وہ جو اپنے پروردگار کے آگے سجدے کر کے اور عجز و ادب سے کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں۔

(الفرقان 24'23)

☆ وہ (خدا) جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے بڑی برکت والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے اور وہ زبردست بخشنے والا ہے۔

(الملک 2-1)

☆ ہر متنفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور تم کو قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا تو جو شخص آتش دوزخ سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

(آل عمران 185)

☆ (اور دیکھو) شیطان (کا کہنا مانناوہ) تمہیں تنگ دستی کا خوف دلاتا ہے اور بے حیائی کے کام کرنے کو کہتا ہے اور خدا تم سے اپنی بخشش اور رحمت کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ بڑی کشائش والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔

(البقرہ 268)

امینہ ملک.... کراچی

انسان کی خوبی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ غیر ضروری کاموں کو چھوڑ دے۔'' (جامع ترمذی)

آسان حساب کس کا ہوگا؟

رسول اکرم صلی علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تین چیزیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں ہوں اللہ تعالیٰ اس سے حساب آسانی والا فرمائیں گے اور اسے جنت میں داخل کریں گے (1) جو اسے محروم رکھے' وہ اسے عطا کرے (2) جو ظلم کرے' اسے معاف کرے (3) اور جو تعلق توڑے' اس سے تعلق جوڑنے کی کوشش کرے۔'' (مستدرک حاکم)

خالدہ پروین.... بھائی پھیرو

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا

☆ کامیابیاں حوصلوں سے ملتی ہیں' حوصلے دوستوں سے ملتے ہیں اور دوست مقدروں سے ملتے ہیں اور مقدر انسان خود بناتا ہے۔

☆ اے لوگوں جو جان بوجھ کر محتاج بنتا ہے وہ محتاج ہی ہو جاتا ہے۔ اور جس کی عمر بہت زیادہ ہو جاتی ہے وہ مختلف بیماریوں اور کمزوریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بلا اور آزمائش کے لیے تیاری نہیں کرتا جب اس پر آزمائش آتی ہے تو وہ صبر نہیں کر سکتا۔

☆ جو کسی چیز پر قابو پالیتا ہے وہ اپنے سے زیادہ دوسروں کو ترجیح دیتا ہے۔ جو کسی سے مشورہ نہیں کرتا اسے ندامت اٹھانی پڑتی ہے۔

آسیہ زیب.... 113 این بی

بکھرے موتی

☆ اگر دنیا میں سکون چاہتے ہو تو کسی کو دل کی

گہرائیوں سے مت چاہو۔
☆ آزمائے ہوئے کو آزمانہ جہالت ہے۔
☆ زندگی نہ جانے کس کس کا انتظار کرتی ہے۔ اور موت بن بلائے مہمان کی طرح اچانک آجاتی ہے۔
☆ انسان کی ہر خواہش کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ ہر پھول کی کچھ پتیاں بکھر جاتی ہیں۔
☆ زندگی پھول کی مانند ہے۔ جس کے چار اطراف کانٹے ہی کانٹے ہیں۔

اسماء خان۔۔۔ کے ایم جی

فلسفہ مسرت

کہا جاتا ہے کہ زندہ رہنے کے لیے خوشی اک امر لازم ہے۔ ایسی خوشی۔ جو رنج کی گھڑی بھی اپنے تصور میں ہی گزار دے۔

کہتے ہیں کہ قدرت ہر وقت متبسم رہتی ہے اور مسرور مجسم ہوا فرط مسرت سے اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ پتے شوخی سے تالیاں بجاتے ہیں۔ چاند ہنستا ہوا نکلتا ہے اور اپنی سہانی سہانی چاندنی میں سب کو لپیٹ لیتا ہے اور پہاڑ بادلوں سے دھیمی دھیمی سرگوشیاں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن کون کہتا ہے کہ قدرت رنج والم سے بے نیاز ہے ورنہ بادلوں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو کیوں گرتے ہیں؟ ہوا کے جھونکوں پر غم کا عنصر کس لیے چھا جاتا ہے۔ پتے ساکت ہو جاتے ہیں۔ چاند کی زردی بڑھتی جاتی ہے۔ اور حسین چاندنی اداس! اداس!۔ یہ سچ ہے کہ سمندر کی الھڑ موجیں پوری طاقت سے بڑھتی ہیں، قہقہے لگاتی بڑھتی ساحل کو گیت سناتی ہیں اور چٹانوں سے کھیلتی ہیں اور وقت معینہ پر واپس لوٹ جاتی ہیں۔ مسرور شاد شاد!! اس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ یہی موجیں حالت رنج والم میں طوفان بپا کرتی ہیں۔ جھاگ بہا بہا کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہیں اور آخر کار تہہ وبالا ہو جاتی ہیں۔

موسم سرما آسکتا تو بہار کیوں نہیں، لیکن بہار کے بعد خزاں کچھ اس انداز سے آتی ہے کہ افسردہ سا ماحول، پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ ترو تازگی کے بجائے بے سروسامانی چھا جاتی ہے۔ اور عیش وسرف کی جگہ رنج وکلفت۔

(خلیل جبران کی تصنیف سے)

امن عامر۔۔۔ کراچی

شاید کے تیرے دل میں اتر جائے

☆ انسان کے چند الفاظ اسے دوسروں کی نظروں سے گرا دیتے ہیں اور چند دلوں پر راج کرواتے ہیں۔
☆ کسی ایسی خواہش کے پیچھے بھاگنا فضول ہے۔ جس کے نہ پورا ہونے کا گمان ہو۔
☆ انسان اپنے اوصاف ہی عظیم ہوتا ہے ناکہ عہدے سے کیوں کہ محل کے سب سے اونچے مینار پر بیٹھنے سے کوا عقاب نہیں بن جاتا۔
☆ اگر چاہتے ہو کہ سب تمہاری عزت کریں تو اپنے لہجے میں مٹھاس پیدا کرو۔
☆ کسی کی طرف انگلی اٹھانے سے پہلے سوچ لو کہ تین انگلیاں اپنی طرف ہیں۔

دو باتیں

1۔ زندگی صرف وہ نہیں ہوتی جو ہم گزار رہے ہوتے ہیں بلکہ زندگی وہ بھی ہوتی ہے جو ہم گزارنا نہیں چاہتے۔
2۔ محبت صرف وہ نہیں ہوتی جو ہم کسی سے کرتے ہیں محبت وہ بھی ہوتی ہے جو ہم کسی کو دے نہیں پاتے۔

حافظ میرا۔ 157 این بی

سات عادات

ایک روز خلیفہ ہارون الرشید نے لوگوں سے کہا کہ "اگر نیک بندے بننا چاہتے ہو تو بچوں جیسی عادات بنالو"۔ لوگوں نے پوچھا "وہ کیسے" آپ نے فرمایا سات عادات بچوں میں ہوتی ہیں۔ اگر بڑوں میں ہوں تو ولی اللہ بن جائیں۔

1 بچے مل کر کھاتے ہیں۔
2 رزق کا غم نہیں کرتے۔

3 لڑتے ہیں تو دل میں کینہ نہیں رکھتے۔
4 لڑائی کے بعد صلح کر لیتے ہیں۔
5 اپنے بڑوں سے ڈرتے ہیں۔
6 ذرا سے دھمکی سے رونے لگتے ہیں۔
7 دشمن کا جامہ مستقل نہیں پہنتے۔

رشیدہ فیض۔۔۔ جام پور

شاہی لبادہ

ایک دن بادشاہ نے بڑی شاندار ضیافت دی، جس میں بڑے بڑے امرا اور حکام مدعو تھے۔

اس موقع پر بادشاہ نے آفندی کو بھی بلایا۔ دعوت کے بعد بادشاہ نے ہر مہمان کو قیمتی لباس تحفے میں دیا لیکن آفندی کو ٹاٹ کا ٹکڑا تھما دیا جو گدھے کی پیٹھ پر رکھا جاتا تھا۔ آفندی نے بڑے ادب سے بادشاہ کے ہاتھ سے ٹاٹ لیا، کئی بار جھک کر شکریہ ادا کیا اور تمام مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"حضرات، بادشاہ سلامت نے آپ لوگوں کو جو ریشم و کم خواب کے لبادے عطا فرمائے وہ سب بازار میں مل جاتے ہیں مگر ذرا غور فرمائیے بادشاہ سلامت میری کتنی عزت کرتے ہیں، انہوں نے مجھے اپنا شاہی لبادہ عطا فرمایا ہے۔"

ثمینہ اعجاز۔۔۔ سعودی عرب

فیصلے کا لمحہ

فیصلے کا لمحہ بڑا مبارک ہوتا ہے۔ زندگی میں بار بار یہ لمحات نہیں آتے صحیح وقت پر مناسب فیصلہ ہی کامیاب زندگی کی ضمانت ہے۔ اگر غلطی سے کوئی فیصلہ غلط بھی ہو جائے تو اس کی ذمہ داری سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے فیصلے اپنی اولاد کی طرح ہیں۔ جیسے بھی ہیں ان کی حفاظت تو کرنا ہو گی دنیا کی تاریخ کو بغور دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ اگر تاریخی فیصلے غلط تھے لیکن تاریخی تھے۔ تقدیر اپنے بغیر کام انسان کے اپنے فیصلے میں ہی مکمل کرتی ہے انسان راہ چلتے چلتے دوزخ تک جا پہنچتا ہے یا وہ فیصلے کرتے کرتے بہشت میں داخل ہو جاتا ہے۔ بہشت یا دوزخ انسان کا مقدر ہے لیکن یہ مقدر انسان کے اپنے فیصلے کے اندر ہے۔

(واصف علی واصف)

فوزیہ ثمرث ہانیہ۔۔۔ عمران گجرات

دوست پر خرچ کرنا

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

"میرے نزدیک اپنے دوست پر بیس درہم خرچ کرنا سو درہم فقیروں میں تقسیم کرنے سے بہتر ہے۔"

فوزیہ ثمرث۔۔۔ گجرات

لفظوں کی خوشبو

☆ دکھ انسان کو اللہ کے قریب لے جاتے ہیں اس لیے انسان کو ہمیشہ دکھوں پر بھی شکر ادا کرنا چاہیے۔

☆ خوشیوں میں ہم اکثر اپنے رب کو بھول جاتے ہیں اسی لیے تو ہم خوشی کو پوری طرح محسوس ہی نہیں کر پاتے۔

☆ اپنی ذات میں ایک ایسا انسان ڈھونڈو جسے صرف اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے بھی جینا آتا ہو۔

☆ اگر اپنی قسمت بدلنا چاہیے ہو تو زندگی کا مقصد ڈھونڈ لو۔

☆ اداسی میں ہم اکثر اپنوں کو یاد کرتے ہیں سو کبھی کبھی اداس ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

☆ عورت جب اپنی جنت (ماں) کی حفاظت کرتی ہے تو اپنے شوہر کی جنت (ماں) کی حفاظت کیوں نہیں کرتی؟

دعا ملک۔۔۔ لودھراں

زبان

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں۔

عقل مند کی زبان دل کے پیچھے ہوتی ہے۔ جب وہ کچھ کہنا چاہتا ہے تو پہلے دل کی طرف رجوع کرتا ہے اور اگر وہ بات اس کے فائدے کی ہوتی ہے تو کہتا ہے ورنہ رک جاتا ہے اور جاہل کا دل اس کی زبان کی نوک پر ہوتا ہے۔ وہ دل کی طرف رجوع نہیں کرتا بلکہ جو کچھ زبان پر آتا ہے فوراً بول جاتا ہے۔

مونا عامر۔ کراچی

بُشریٰ محمود

رباب سرفراز، کی ڈائری میں تحریر

نوشی گیلانی کی غزل

ہجر کی بددعا نہ ہو جانا
دیکھ لینا، سزا نہ ہو جانا

موڑ تو بے شمار آئیں گے
تھک نہ جانا جدا نہ ہو جانا

عشق کی انتہا نہیں ہوتی
عشق کی انتہا نہ ہو جانا

آخر شب اداس چاند کے ساتھ
ایک بجھتا دیا نہ ہو جانا

بے ارادہ سفر پہ نکلے ہو
راستوں کی ہوا نہ ہو جانا

زندگی درد سے عبارت ہے
زندگی سے خفا نہ ہو جانا

اک تمہی کو خدا سے مانگا ہے
تم کہیں بے وفا نہ ہو جانا

حافظہ سمیرا، کی ڈائری میں تحریر

احمد فراز کی غزل

ترس رہا ہوں مگر تو نظر نہ آ مجھ کو
کہ خود جدا ہے تو مجھ سے نہ کر جدا مجھ کو

چٹخ اٹھا ہوں سلگتی چٹان کی مانند
پکار اب تو میرے دیر آشنا مجھ کو

ستم تو یہ کہ ظالم سخن شناس نہیں
وہ اک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو

اسے فراز اگر دکھ نہ تھا بچھڑنے کا
تو کیوں وہ دیر تک دیکھتا رہا مجھ کو

افشاں، کی ڈائری میں تحریر

صابر ظفر کی غزل

جسے گاؤں کے چوبارے پہ تنہا چھوڑ آیا ہوں
نظر وہ مہرباں مجھ پر نہایت ہو بھی سکتی تھی

مری سوچوں کی گہرائی، تغیر اور تنہائی
مگر اس بت پہ مر مٹنے کی ہمت ہو بھی سکتی تھی

وہ جس مصرعے سے خوش ہوتا، میں کہتا اور مر جاتا؟
برابر شعر کہنا میری عادت ہو بھی سکتی تھی

تڑختی، ٹوٹتی سنجیدگی سے عمر جو گزری
وہ اک معصوم بچے کی شرارت ہو بھی سکتی تھی

مجھے اس یار کے پہلو کی مٹی میں سلا دینا
کہیں محفوظ اک ایسی وصیت ہو بھی سکتی تھی

کلی مرجھا چکی ہو گی، جو اب سونی حویلی میں
اسے صابر ظفر سے کوئی نسبت ہو بھی سکتی تھی

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر
نوشی گیلانی کی نظم

پچھلے سال کی ڈائری کا آخری ورق

کوئی موسم ہو وصل و ہجر کا
ہم یاد رکھتے ہیں
تری باتوں سے اس دل کو
بہت آباد رکھتے ہیں
کبھی دل کے صحیفے پر
تجھے تصویر کرتے ہیں
کبھی پلکوں کی چھاؤں میں
تجھے زنجیر کرتے ہیں
کبھی خوابیدہ شاموں میں
کبھی بارش کی راتوں میں
کوئی موسم ہو وصل و ہجر کا
ہم یاد رکھتے ہیں
تری باتوں سے اس دل کو
بہت آباد رکھتے ہیں

ثمرہ اقراء، کی ڈائری میں تحریر
امجد اسلام امجد کی ایک نظم

زوال

کبھی زوال نہیں آتا
اندر کی چپ محبتوں کو
منزلوں میں بھٹکتے لوگوں کو
ان کہی باتوں کو
باتوں میں چھپی حقیقتوں کو
کبھی زوال نہیں آتا
بچپن کی شرارتوں کو
شرارتوں میں چھپی ہنسی کو
ہنسی میں چھپے دکھ کو
چاند سے کی بزاد باتوں کو
کبھی زوال نہیں آتا

سائرہ پروا علی، کی ڈائری میں تحریر
محسن نقوی کی غزل

اُس کے لبوں پہ رات کہانی غضب کی تھی
جذبات بہہ رہے تھے، روانی غضب کی تھی

را جا بھی لاجواب تھا وادیٔ عشق کا
لیکن دیارِ حسن کی رانی غضب کی تھی

کیا کیا نہ شام آئی میری عمر میں مگر
گزری جو تیرے ساتھ سہانی غضب کی تھی

دیکھی ہے میں نے سحر میں چڑھتی جوانی
لیکن جو تجھ پہ آئی، جوانی غضب کی تھی

محسن میں اک عمر تک لکھتا رہا داستانِ غم
جو تم نے سنائی کل شب، وہ کہانی غضب کی تھی

فرح بشیر، کی ڈائری میں تحریر
سلیم کوثر کی نظم

محبت ڈائری ہرگز نہیں ہے
آب جو ہے
جو دلوں کے درمیان بہتی ہے
وہ خوشبو ہے
کبھی پلکوں پہ لہرائے تو آنکھیں ہنسنے لگتی ہیں
جو آنکھوں میں اتر جائے تو منظر اور پس منظر میں شمعیں
جلنے لگتی ہیں

کبھی بھی رنگ کو چھولے
وہی دل کو گوارا ہے
کسی مٹی میں گھل جائے
وہی مٹی ستارہ ہے

شگفتہ سلیمان

بشریٰ مزمل ———— بھائی پھیرو

کچھ نہیں چاہیے تجھ سے اے میری عمرِ رواں
میرا بچپن، میرے جگنو، میری گڑیا لا دے
جس کی آنکھیں مجھے اندر سے پڑھ سکتی ہوں
کوئی چہرہ تو میرے شہر میں ایسا لا دے

روبی ———— کراچی

اُسے پانا، اُسے کھونا، اسی کے ہجر میں رونا
یہی گر عشق ہے محسن تو ہم تنہا ہی اچھے ہیں

یاسمین ملک ———— چکوال

میرے دل کی وفاؤں کا حوصلہ تو دیکھو دوستو
طلب گار اس کا ہے جس کو میرا احساس تک نہیں
صرف وہ اک شخص کسی طرح سے مل جاتا
مجھے منظور تھے پھر جتنے ہی خسارے ہوتے

حنا ———— کوٹ لدھا کشن

وصل کی شب اور اتنی مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

حنا فرمان ———— راجن پور

تمام شب جہاں جلتا ہے اک اداس دیا
ہوا کی راہ میں اک ایسا گھر بھی آتا ہے
وہ مجھ کو ٹوٹ کر چاہے گا چھوڑ جائے گا
مجھے خبر تھی اسے یہ ہنر بھی آتا ہے

رخسانہ ———— شور کوٹ

پھر نہ ملنے کو بچھڑتا ہوں تجھ سے لیکن
مڑ کے دیکھوں تو پلٹنے کی دعا دینا

فرحانہ ناز ———— گوجرانوالہ

کل دھوپ کے میلے سے خریدے تھے کھلونے
جو موم کا پتلا تھا وہ گھر تک نہیں پہنچا

فوزیہ دلاور ———— جہلم

یہ جو رنگ بھی ہے دل میں گرہ کھل نہیں سکتی
تو لاکھ ملتا رہے ہم سے دوستوں کی طرح

شناء خان ———— بھائی پھیرو

پیچھے بندھے ہیں ہاتھ مگر شرط ہے سفر
کس سے کہوں کہ پاؤں کا کانٹا نکال دے

سیدہ نسبت زہرا ———— کہروڑ پکا

اس کی باتوں کو بھلا دیں یہ ممکن ہی نہیں ہے
اس نے جو بھی کہا، رونما ہونے کو ہے
اس کے چہرے کی اداسی سے ہی ظاہر ہے محسن
جیسے وہ ایک بار پھر مجھ سے جدا ہونے کو ہے

گڑیا شاہ ———— کہروڑ پکا

تم مجھے موقع تو دو اعتبار بنانے کا
تھک جاؤ گے میری وفا کے ساتھ چلتے چلتے

مدیحہ نورین مہک ———— برنالی

بربادیوں کا جائزہ لینے کے واسطے
وہ پوچھتے ہیں حال میرا کبھی کبھی

حمزہ اقراء ———— کراچی

وہ چاٹ لیتا ہے دیمک کی طرح مستقل
تمہیں پتا نہیں ماضی جو حال کرتا ہے

آسیہ ———— 113-1 این بی

تجھے میں نے بڑی آرزو سے چاہا ہے
یہ کیا کہ تو بھی چھوڑ چلا اوروں کی طرح

عابدہ غوری ———— کوٹ چھٹہ

تمہارے ذہن میں جو بھی ہے صاف صاف کہو
منافقت کا نشاں ہے اگر مگر کرنا
میرے مزاج کا اس میں کوئی قصور نہیں
تیرے سلوک نے لہجہ بدل دیا میرا

عائشہ ———— گوجرہ

ہم کہتے تھے کہ اب کے بچھڑیں گے تو مر جائیں گے فراز
کمال کا وہم ہوا تھا ہوا کچھ بھی نہیں

پارس ———— چکوال

کیسا دلکش و شاندار ہوتا ہے یہ معصوم بچپن
چلا جاتا ہے چپکے سے اپنی معصوم یادیں چھوڑ کر

ادارہ

شرمندگی

کوچوان نذیر نے اپنے تانگے کے لیے گھوڑا ادھار خریدا۔ چند دن بعد وہ گھوڑے کے سابق مالک کے پاس پہنچا اور بولا۔ "ویسے تو گھوڑا ٹھیک ٹھاک ہے، دوڑتا بھی ہے لیکن ہر وقت سر جھکائے رکھتا ہے، کبھی سر نہیں اٹھاتا، مجھے اندیشہ ہے کہ اسے کوئی بیماری نہ ہو۔"

"یہ بیماری نہیں، شرمندگی ہے۔" سابق مالک نے جواب دیا۔ "اسے احساس ہے کہ اسے ادھار خرید آگیا ہے۔ جس دن اس کی قیمت ادا کردی گئی وہ سر اٹھا کر چلنے لگے گا، بڑا احساس گھوڑا ہے۔"

مبین فضل۔۔۔ قصور

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں

ایک صاحب کی بیوی وہمی طبیعت کی تھیں۔ وہ روز رات کو گھر کے کسی نہ کسی حصے سے آوازیں بلند ہوتے سنتیں تو شوہر کو سوتے سے جگا کر مجبور کرتیں کہ وہ اس حصے کو جا کر چیک کریں۔ اس روز روز کی مشقت سے تنگ آ کر ایک دن صاحب نے بیگم کو یقین دلایا کہ چور چوری کرنے آئیں تو شور و غل نہیں مچاتے بلکہ خاموشی سے اپنا کام انجام دیتے ہیں۔

صاحب کی بیگم سمجھ دار تھیں، ان کی سمجھ میں یہ نکتہ آگیا۔ اس کے بعد سے آج تک وہ شوہر موصوف کو اسی وقت سوتے سے جگاتی ہیں۔ جب گھر پر خاموشی طاری ہو اور گھر کے کسی حصے سے کوئی آواز نہ آرہی ہو۔

فرحت جبیں۔۔۔ ڈی جی خان

لاجواب

ہوٹل کے منیجر نے سیاح کو کمرہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "اس کمرے کا کرایہ پانچ سو روپے اس لیے زیادہ ہے کہ کمرے کی کھڑکی سے آپ دور دور تک نظارہ کرسکتے ہیں۔"

سیاح نے کہا۔ "پھر تو آپ پانچ سو روپے فوراً" کم کردیں کیوں کہ میری دور کی نظر کمزور ہے۔ میں دور کا نظارہ نہیں کرسکوں گا۔"

عفت خان۔۔۔ لاہور

نیک کام

ایک کنجوس آدمی نے اپنے دوست سے کہا۔ "آج میں نے ایک بھکاری کی جان بچائی۔"

دوست نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"میں نے اس سے پوچھا کہ اگر میں تمہیں سو روپے دوں تو تم کیا کرو گے؟ اس نے کہا میں خوشی سے مر جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے اس کی جان بچانے کے لیے اسے پیسے نہیں دیے۔" کنجوس نے جواب دیا۔

صدف سیف۔۔۔ لطیف آباد

محنت کا نتیجہ

ایک یہودی لڑکے کو ایک کیتھولک امریکی لڑکی سے محبت ہوگئی۔ لڑکی کی ماں نے بیٹی کو سمجھایا کہ وہ لڑکے کو کیتھولک بنانے کی کوشش کرے۔

لڑکی نے روزانہ اس سلسلے میں محنت شروع کردی اور لڑکا جلد ہی کیتھولک عیسائی بن گیا مگر کچھ دن بعد اس نے شادی سے انکار کردیا۔

"آخر ہوا کیا۔۔۔؟" لڑکی کی ماں نے حیرت زدہ ہو کر

لڑکی سے پوچھا۔

"نہیں نے اسے عیسائیت کی کچھ زیادہ ہی تعلیم دے ڈالی ممی۔" لڑکی نے روتے ہوئے بتایا۔ "اب اس نے پادری بننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

افشاں۔۔۔ کراچی

خواہش ہو تو ایسی

ایک شخص نے اپنے دفتر کے باس سے کہا۔ "مجھے پندرہ دن کی چھٹی چاہیے۔"

"آخر ایسا کیا کام پڑ گیا کہ تمہیں پندرہ دن کی چھٹی چاہیے؟" باس نے پوچھا۔

"میری کزن کی شادی ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"کزن کی شادی پر پندرہ دن کی چھٹی۔۔۔! بات سمجھ میں نہیں آئی۔" باس نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں کہ کزن کی خواہش ہے کہ میں اس کی شادی میں بطور دولہا شرکت کروں۔" اس شخص نے مسکرا کر جواب دیا۔

عائشہ عامر۔۔۔ کراچی

سمجھوتہ

ایک نو آموز مصنف نے ایڈیٹر سے شکوہ کیا۔

"آپ نے مصنفوں پر یہ پابندی کیوں لگا رکھی ہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف ہی لکھیں؟"

"ارے میاں! یہ تو ہم نے حالات سے سمجھوتہ کیا ہوا ہے۔" ایڈیٹر نے گہری سانس لے کر کہا۔

"حالات سے سمجھوتہ۔۔۔! کیا مطلب' میں کچھ سمجھا نہیں؟" نو آموز مصنف نے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی کیوں کہ بعض لوگوں کے بارے میں تو ہمارا خیال ہے کہ وہ صفحے کے ایک جانب بھی نہ لکھیں۔" ایڈیٹر نے معصومیت سے جواب دیا۔

عروبہ عابد۔۔۔ ٹنڈو جان محمد

ہم بھی کسی سے کم نہیں

ریسٹورنٹ میں بیٹھی ہوئی ایک خاتون نے ویٹر کو بلا کر اے سی بند کرنے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد اسی خاتون نے ویٹر کو اے سی چلانے کو کہا۔ جب اس قسم کی فرمائشیں جاری رہیں تو ساتھ والی میز پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے اسی ویٹر کو بلا کر کہا۔ "یہ عورت تم کو بار بار اے سی چلانے اور بند کرنے کا کہہ کر پاگل بنا رہی ہے۔"

ویٹر نے کہا۔ "ارے صاحب۔۔۔! پاگل تو میں بنا رہا ہوں' ہمارے ریسٹورنٹ میں اے سی ہی نہیں ہے۔"

صبا کاشف۔۔۔ راجن پور

کامیابی کا راز

"تم کامیاب ترین سیلز مین ہو' بڑی خوبی سے گھر گھر اشیاء فروخت کرتے ہو' تمہاری کامیابی کا راز کیا ہے؟" ایک آدمی نے اپنے دوست سے پوچھا۔

"میری گفتگو کا پہلا جملہ" سیلز مین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دستک کے جواب میں جب کوئی عورت دروازہ کھولتی ہے تو خواہ وہ سو سال کی بڑھیا ہی کیوں نہ ہو' میں ہمیشہ یہی کہتا ہوں کہ مس! کیا آپ کی ممی گھر پر موجود ہیں؟"

ثبوت

"میرے شوہر بہت وفادار ہیں' میرے سوا وہ کسی عورت کے چکر میں نہیں رہتے۔" ایک عورت نے اپنی سہیلی سے کہا۔

"یہ بات تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو۔" سہیلی نے پوچھا۔

"جب میں انہیں بتاتی ہوں کہ وہ نیند میں باتیں کرتے ہیں تو وہ یہ سن کر بالکل پریشان نہیں ہوتے۔" عورت نے جواب دیا۔

حنا فرحان۔۔۔ مٹھن کوٹ

ذمہ داری

ایک عورت کا شوہر گیا' جنازے کے وقت وہ بین کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "ہائے میرا شوہر چلا گیا' اب

میری زمین کون سنبھالے گا؟"
رشتہ داروں میں سے ایک شخص اٹھا اور سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "میں سنبھال لوں گا۔"

عورت نے پھر فریاد کرتے ہوئے کہا۔ "مویشیوں کی کون دیکھ بھال کرے گا؟"

وہی آدمی پھر اٹھا اور کہنے لگا۔ "دیکھ بھال بھی میں کرلوں گا۔"

عورت نے پھر شکوہ کیا۔ "گھر کے دیگر کام کون کرے گا؟" اس آدمی نے پھر ذمہ داری قبول کرلی۔

اب عورت نے بین کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارا قرضہ کون اتارے گا؟"

وہی آدمی بڑے جوش سے اٹھا اور دوسرے رشتہ داروں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کوئی اور بھی تو حامی بھرے' کیا سارے کام میں ہی کروں گا۔"

ریحانہ۔۔۔ سانگھڑ

تجربہ کار

میڈیکل کالج کے پروفیسر نے طالب علموں سے ایک انسانی کھوپڑی کے متعلق پوچھا۔ "بتاؤ! یہ کھوپڑی کسی مرد کی ہے یا عورت کی؟"

ایک طالب علم نے ایک نظر کھوپڑی کو دیکھا اور فوراً جواب دیا۔ "سر! یہ کھوپڑی عورت کی ہے۔"

"شاباش! لیکن تم نے اتنی جلدی کیسے معلوم کرلیا کہ یہ کھوپڑی عورت کی ہے۔" پروفیسر نے حیرت سے پوچھا۔

"کھوپڑی کے گھسے ہوئے جبڑے سے۔" طالب علم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

حنا۔۔۔ کراچی

لمبی عمر کا راز

ایک بچہ پارک میں بینچ پر بیٹھا ایک کے بعد ایک ٹافی کھا رہا تھا۔ اس کے پاس بیٹھی ہوئی ایک عورت بولی۔ "جو زیادہ میٹھا کھاتے ہیں' وہ بیمار ہو کر جلدی مر جاتے ہیں۔"

بچے نے جواب دیا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ میری دادی کی عمر ایک سو چھ سال تھی؟"

عورت نے کہا۔ "وہ یقیناً" میٹھا کم کھاتی ہوں گی۔۔۔؟"

"جی نہیں۔۔۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی تھیں۔" بچے نے ٹافی کھاتے ہوئے جواب دیا۔

فوزیہ۔۔۔ اوکاڑہ

بھولے بھالے لوگ

کپڑے کی ایک دکان کے مالک نے اپنے نئے ملازم سے کہا۔ "محنت سے کام کرو گے تو ترقی ضرور کرو گے۔ مجھ ہی کو دیکھو' میں اس دکان میں پہلے ملازم تھا اور آج مالک بنا بیٹھا ہوں۔"

نیا ملازم بولا۔ "مگر جناب آپ کے پرانے مالک جیسے بھولے بھالے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں؟"

رازونیاز

ایک لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا۔ "باس کی بک بک سن کر میں تنگ آجاتی ہوں' وہ ہر وقت اپنے اخراجات کا رونا روتا رہتا ہے۔ آج ہی مجھ سے کہنے لگا کہ اسے فلیٹ کا کرایہ بہت زیادہ دینا پڑ رہا ہے۔"

سہیلی بولی۔ "کمال ہے۔۔۔! بھلا فلیٹ کے کرائے سے تمہارا کیا تعلق؟"

لڑکی نے کہا۔ "وہ میرے فلیٹ کے کرائے کا ذکر کر رہا تھا۔"

سحرش خان۔۔۔ بکھر

درخواست

عاصمہ نے اپنی دوست کو بتایا۔ "مجھ سے ہزاروں مرتبہ درخواست کی جاچکی ہے کہ میں شادی کروں۔"

"کون کرتا ہے تم سے یہ درخواست؟" آمنہ نے تجسس سے پوچھا۔

"میرے والدین۔" عاصمہ نے جواب دیا۔

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

بیکڈ میکرونی

اشیا :

گائے کا قیمہ	آدھا کلو
ٹماٹو ساس	آدھی پیالی
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
پسی ہوئی' پیاز	بڑی ڈلی باریک کٹی ہوئی
میکرونی	ڈھائی پیالی
بلو بینڈ مارجرین	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن کچلا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ پسی ہوئی
چیز	ایک پیکٹ کدوکش کریں
فریش کریم	ایک پیالی
کوکنگ آئل	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

ایک دیگچی میں گرم پانی کریں' جب خوب گرم ہو جائے تو ذرا سی چکنائی ڈال کر میکرونی ابال لیں۔ جب ابل جائیں تو چھلنی میں چھان لیں۔ ایک فرائنگ پین میں کوکنگ آئل گرم کریں' پیاز ہلکی گلابی کر کے قیمہ' لہسن' نمک' ڈال کر ہلکا سا بھون لیں۔ پھر لال مرچ' کالی مرچ ڈال کر ہلکا سا بھون لیں اور ٹماٹو ساس ڈال دیں۔ پھر ایک دیگچی میں بلو بینڈ مارجرین گرم کریں' میدہ ڈال کر بھون لیں' دیگچی نیچے اتار کر کارن فلور اور دودھ ڈال دیں' جب سب دودھ ڈل جائے تو ہلکی آنچ میں لکڑی کے چمچے کے ساتھ آہستہ آہستہ پکا کر ساس گاڑھی کریں۔ پھر اتار کر ٹھنڈا کریں اور کریم ملا دیں۔ اوون پہلی سے گرم کریں' ایک بڑے اور پھیلے ہوئے بیکنگ ڈش میں سب سے نیچے سارا قیمہ ڈال دیں پھر ابلے ہوئے میکرونی' وائٹ ساس اور کدوکش کیا ہوا چیز ڈال دیں۔ جب سب چیزیں اچھی طرح پھیلا پھیلا کر ڈال دیں تو تیس سے چالیس منٹ تک بیک کریں۔ جب اوپر سے گولڈن براؤن ہو جائے تو نکال کر گرم گرم پیش کریں۔

چکن ویجی ٹیبل

اشیا :

چکن	آدھا کلو
گاجر	ایک عدد
اجینو موتو	ایک چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
مٹر دانے	آدھا کپ
بند گوبھی	دو پتے
کوکنگ آئل	آدھا کپ
کارن فلاور	ایک کھانے کا چمچہ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچہ

چکن دھو کر معمولی پانی میں ابال لیں۔ اب چکن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں۔ اب کوکنگ آئل گرم کریں اور اس میں کدوکش کی ہوئی گاجر' مٹر' بند گوبھی (باریک کٹی ہوئی) چینی اجینو موتو' سویا ساس شامل کرکے بھون لیں۔ پھر اس میں چکن یخنی شامل کریں اور دو منٹ پکنے دیں۔ حسب ذائقہ نمک یخنی میں ڈال لیں (خیال رہے کہ سویا ساس میں بھی نمک ہوتا ہے) لیجیے کم از کم وقت میں تیار ہونے والی ڈش چکن ویجی ٹیبل حاضر ہے انجوائے کریں۔

قیمہ بھری شملہ مرچیں

ضروری اشیا:

قیمہ	250 گرام (دھو کر پانی خشک کرلیں)
شملہ مرچ	چھ عدد (اوپر سے کاٹ کر اندر سے بیج نکال کر خالی کرلیں)
پیاز	دو عدد (باریک کاٹ لیں)
تیل	آدھا کپ
ٹماٹر	دو عدد (باریک کاٹ لیں)
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن ادرک پیسٹ	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

سوس پین میں تیل گرم کرکے اس میں پیاز سنہری ہونے تک فرائی کرلیں۔ اس کے بعد اس میں ٹماٹر' ہلدی پاؤڈر' نمک' لال مرچ پاؤڈر' دھنیا' گرم مسالا پاؤڈر' لہسن ادرک پیسٹ اور شامل کرکے بھون لیں۔ پانی خشک ہوجائے تو قیمہ نکال کر ایک پلیٹ میں رکھ دیں۔ شملہ مرچ کے اندر قیمہ بھرلیں اور اوپر کٹا ہوا حصہ رکھ کر فرائی پین میں احتیاط سے فرائی کرلیں۔ چاروں اطراف سے فرائی ہوجائے تو ڈش میں ابلے ہوئے چاول کے اوپر رکھ دیں اور باقی بچا ہوا قیمہ بھی پھیلا دیں۔ مزے دار قیمہ بھری شملہ مرچیں تیار ہیں۔

چکن کباب

اشیا:

چکن (بغیر ہڈی)	500 گرام
ہرا دھنیا (باریک کترا ہوا)	دو کھانے کے چمچے
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچیں	تین عدد
نمک	ایک چائے کا چمچہ
پیاز (باریک کتری ہوئی)	ایک عدد
دال چنا (تقریباً" چار گھنٹے تک بھیگی ہوئی)	ایک کپ
آلو (چھیل کر ٹکڑے کاٹ لیں)	ایک عدد
زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
بھنے ہوئے چنوں کا پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
ڈبل روٹی کا چورا	حسب ضرورت

چکن کی بوٹیاں بنالیں اور ان میں لہسن ادرک پیسٹ' ہری مرچیں' نمک' پیاز' دال چنا' آلو' زیرہ پاؤڈر اور ہرے دھنیے کی آدھی مقدار شامل کرکے آدھا کپ پانی شامل کریں اور ہلکی آنچ پر اس وقت تک پکائیں جب تک کہ تمام اجزا اچھی طرح نہ گل جائیں۔ اس کے بعد آنچ تیز کرکے آمیزے کو بالکل خشک کرلیں۔ پھر اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے رکھ دیں۔ ٹھنڈا ہونے کے بعد تمام آمیزہ گرائنڈ کریں اور اسے ایک بڑے پیالے میں نکال لیں۔ اب اس میں چنوں کا پاؤڈر' پھینٹا ہوا انڈا' لیموں کا رس' گرم مسالا پاؤڈر اور باقی دھنیا شامل کرکے اچھی طرح مکس کرلیں۔ ڈبل روٹی کا چورا ذرا زیادہ ملالیں اور آمیزہ سخت ہو تو چورا کم شامل کریں یا چاہیں تو بالکل نہ ملائیں۔ اب کباب بنائیں اور انہیں ڈیپ فرائی کریں۔

حسن و صحت

ادارہ

سانس کی ورزش کے ذریعے اپنے وزن میں کمی کریں

سانس لینے اور خارج کرنے کے کئی عوامل ایسے ہیں جن کو اپنا کر وزن میں کمی کی جاسکتی ہے۔ یہ خواتین میں بہت زیادہ مقبول ہو رہا ہے اور خاص کر ان خواتین میں جو اپنے موٹاپے کی وجہ سے دیگر جسمانی ورزش نہیں کر سکتی ہیں۔ اس عمل کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اگرچہ آپ اس عمل میں معمول کا کردار ادا کر رہی ہوتی ہیں مگر آپ کے جسم سے ٹھیک ٹھاک پسینہ خارج ہوتا ہے اور چربی بھی موثر انداز میں پگھلنے لگتی ہے۔ سانس کے ذریعے وزن کم کرنے کا عمل طویل مدتی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے ذریعے کچھ رجحان پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے۔ **مثلاً** ضرورت سے زیادہ کھانا اور جس وقت پریشر میں ہوں تو کھانا کھانے لگنا۔

اس ورزش کے لیے آپ کو زیادہ وقت نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ محض آدھا گھنٹہ کی مشق سے بھی آپ کو وہی فائدہ پہنچ سکتا ہے جو ایک گھنٹہ کی چہل قدمی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس ورزش کے حوالے سے کچھ خاص پوائنٹس ملاحظہ کریں جس سے وزن میں کمی ہوتی ہے۔

☆ حرارت پہنچانے والا عمل یعنی آپ اپنے دونوں ہاتھوں کی رنگ فنگر سے انگوٹھوں کو ٹچ کریں۔ تاہم اس عمل سے وہ لوگ گریز کریں جن کے جسم میں پانی کی کمی ہے۔ بلڈ پریشر یا عارضہ قلب میں مبتلا ہیں۔ سانس لینے اور خارج کرنے کے دوران انگلیوں کو ٹچ کرتے رہنا ہے۔

☆ سانس کی ورزش کے دوران جسم میں حرارت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ پانی پیا جائے اور ایسی متوازن غذا لی جائے جس میں ایسی سبزیاں اور پھل ہوں جن میں زیادہ سے زیادہ پانی اور رس ہوتا ہے۔

☆ ورزش کا دورانیہ کم سے کم آدھا گھنٹہ ہونا چاہیے۔

☆ صبح کے وقت اگر یہ ورزش کی جائے تو اور زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ اگر وارمنگ اپ ورزش بھی کر لیا جائے تو نتیجہ اور موثر ہو جاتا ہے۔

☆ اس ورزش کے قبل کسی ماہر سے ضرور مشورہ کریں تاکہ آپ درست پوائنٹس کا پتا کر سکیں۔

☆ ماہر کے مشورے پر سختی سے عمل کریں۔

کپالا بھاتی

کپالا بھاتی کا مطلب ہے کھوپڑی صاف کرنے کی مشق۔ اس سے آپ فوراً چست ہو جاتے ہیں۔

☆ مراقبہ کی پوزیشن میں سیدھی بیٹھ جائیں۔

☆ گہری گہری سانس اندر اور باہر کریں تیزی سے۔ ایک راؤنڈ میں یہ عمل پانچ بار کریں۔

☆ اس کے بعد آرام کریں اور نارمل طریقے سے سانس لیں۔

☆ بعد میں دو راؤنڈ اور مکمل کریں۔

☆ سانس گہری ہو اور پیٹ سے باہر نکل جائے۔

☆ باقاعدہ ... کی تعداد میں ... سے ساٹھ تک ہو سکتی ہے۔

☆ عارضہ قلب' ہائی بلڈ پریشر اور مرگی میں مبتلا لوگ یہ ورزش نہ کریں۔

فوائد

سانس کے عمل پر اثر انداز ہوتی ہے یہ ورزش جس سے ڈپریشن دور ہوتا ہے اور خاص کر موسم کی تبدیلی سے جو گڑبڑ ہوتی ہے' وہ دور ہو جاتی ہے' ایسا عموماً" سردیوں اور گرمیوں میں ہوتا ہے۔ نظام ہضم کی فعالیت میں اضافہ کرتی ہے اور جسمانی نظام کو بھی بہتر کرتی ہے۔ ذہن کی تھکاوٹ دور کرتی ہے' پھیپھڑے کی کارکردگی اچھی ہو جاتی ہے اور چونکہ اس سے جسمانی نظام سرگرم ہو جاتا ہے تو چربی بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ اس ورزش سے جگر پر دباؤ پڑتا ہے' جس سے چکنائی زیادہ سے زیادہ خارج ہونے لگتی ہے۔ پیٹ اندر اور باہر دونوں طرف سے ٹون اپ ہوتا ہے۔

ایک اور ورزش

بالکل سیدھی سادی ورزش ہے' مگر بے حد فائدہ مند۔ اس سے بدن میں پھرتی آجاتی ہے۔ یہ جسم کو گرما دیتی ہے' ذہن کو تازہ کر دیتی ہے اور جسم میں توانائی پیدا کرتی ہے۔

☆ مراقبہ کے انداز بیٹھ جائیں۔

☆ سیدھے نتھنے سے سانس اندر لیں اور دونوں نتھنوں کو بند کریں۔

☆ نتھنوں کو بند کرنے کے لیے سیدھے نتھنے کو سیدھے ہاتھ سے انگوٹھے اور الٹے نتھنے کو بند کرنے کے لیے بائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی استعمال کریں۔

☆ اب سانس کو بائیں نتھنے سے خارج کریں' یہ گویا ایک راؤنڈ ہوا۔ ایسے دس راؤنڈ کریں۔

ہوشیار

اگر سینے میں جلن یا بلڈ پریشر کی شکایت ہو تو یہ ورزش نہ کی جائے۔

فوائد

اس سے ذہن کو سکون ملتا ہے اور تخلیقی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے۔ اس کے ذریعے بلغمی جھلی کو خشک کرنے میں مدد ملتی ہے اور دماغ سے فاسد مادوں کا خراج ہو جاتا ہے۔ جسمانی افعال میں اضافہ ہوتا ہے۔

Hissing کے انداز میں سانس لینا

☆ مراقبہ کے انداز میں بیٹھ جائیں۔

☆ آنکھیں بند کریں۔ زبان کو اس طرح پیچھے کی طرف موڑیں کہ تالو کو چھونے لگے۔

☆ دانتوں سے آرام سے نیچے کی طرف لا کر دانتوں کو آپس میں ہولے سے پریس کریں۔

☆ منہ سے سانس اندر لیں۔ سانس رگڑ کے ساتھ اندر جائے۔

☆ زبان کو اصل حالت میں لائیں اور ناک کے ذریعے سانس خارج کریں۔

☆ یہ ایک راؤنڈ ہے۔ ایسے مزید نو راؤنڈ کریں۔

ہوشیار

☆ اگر دانت حساس ہیں اور سانس کی تکلیف کا مسئلہ ہے تو یہ ورزش نہ کیا جائے۔

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

عرضِ حال

سیماسونا۔۔۔ بکیرا شریف

س ۔ ساس کو زیر کرنے کا طریقہ بتائیں؟

ج ۔ سنا ہے لوگ اس چکر میں بیوی کو خوب مکھن لگایا کرتے ہیں۔

شائستہ امتیاز۔۔۔ گجرات

س ۔ جب ہر شخص خود کو ایماندار سمجھتا ہے تو دنیا میں اتنی بے ایمانی کدھر سے آگئی؟

ج ۔ خود کو ایمان دار سمجھنے کی وجہ سے ہوئی ہے نا۔

صائمہ اشفاق۔۔۔ کراچی

س ۔ ذوالقرنین بھیا! شادی بیاہ کے گیت کی ہم نے خوب پریکٹس کرلی ہے۔ اب آپ اپنی شادی کر ہی ڈالیں؟

ج ۔ بھئی یہ تم لوگوں کی پریکٹس سے میری شادی کا کیا تعلق؟

رخسانہ جمیل۔۔۔ شاہ کوٹ

س ۔ ذوقی بھیا! پنچھی اور پردیسی کا اعتبار کیوں نہیں کیا جاتا؟

ج ۔ کیونکہ دونوں کو ہے اک دن جانا۔

عظمیٰ رانی۔۔۔ سیالکوٹ

س ۔ آپ کی بڑھتی ہوئی صحت کا راز کیا ہے؟

ج ۔ آئندہ گھٹتی ہوئی صحت کا راز پوچھنا۔

شہناز پروین۔۔۔ پنچھی آباد

س ۔ بھیا! آپ کی اس ناچیز بہن نے آپ کی رخصتی کے لیے جہیز اکٹھا کیا ہے۔ اس میں دو اہم چیزوں کی ضرورت ہے۔ جبڑے اور سر کا سائز بھیج دیں۔ مجھے وگ اور بتیسی خریدنی ہے ورنہ؟

ج ۔ آپریشن کلین اپ مکمل ہونے دو سندھ میں پھر؟

نیلو فرضیاء۔۔۔ کمالیہ

س ۔ عورت شادی سے پہلے سپنوں کی رانی ہوتی ہے اور بعد میں؟

ج ۔ عورت کی مرضی پر منحصر ہے۔ بعد والی بات تو۔

شگفتہ ناز۔۔۔ بکھر

س ۔ انکل دل دینا آسان ہے یا دل لینا؟

ج ۔ مجھے دینا کچھ نہیں آتا بس جو آسانی سے مل جائے لے لیتا ہوں۔

زلیخا منیر۔۔۔ وہاڑی

س ۔ نین بھائی! کسی شخص کو طوطا چشم کیوں کہتے ہیں۔ "طوطی چشم" کیوں نہیں کہتے؟

ج ۔ بھئی نور چشمی کو طوطی چشم کیسے کہہ دے کوئی۔

مدیرہ کرن

عندلیب عثمان... مکووال

مونگ پھلی کی پھڑچ پھڑچ پھانکنے کے دوران ایک مژدہ سن لیا۔ بڑی آپا نے فون کیا اور جنوری کے شمارے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔ یہ تو اچھی خبر ہے مگر بری یہ تھی "اس بار تم اپنا منگوا لو واقعی پڑھنے کا شمارہ ہے۔" یہ بھی بری خبر کیوں کہ میں ہمیشہ سے خواتین منگواتی ہوں اور آپا کرن اور اگلے مہینے ہم ایکسچینج کرلیتے ہیں اور اب جب انہوں نے اتنا فورس کیا تو منگوانا ہی پڑا۔ یقین مانیں پیسے ضائع نہیں گئے۔

سب سے پہلے حسب عادت افسانے پڑھے۔ سائرہ رضا کا "سوال" صرف 132 ماؤں کا نہیں بلکہ ساری دنیا کی ماؤں کا ہے جو تاحیات رہے گا۔ افسوس بھرا دل چیرتا ہوا۔ ہاں جناب "پیار کی کلیاں" بھئی شروع میں تو اتنا بورنگ تھا کہ جمائی آگئی' مگر اینڈ بھی... جمائی رک گئی۔ "پپا" فرحی نعیم نے اچھا لکھ ڈالا اور "نیا عہد" میں واہ بھئی سزا ہو تو ایسی بلکہ میرا خیال ہے سب کو ذرا اور جوتے لگتے۔ فاخرہ گل پلیز اب اینڈ کریں۔

"محبت تیرے کتنے ہی رنگ" نے سلمیٰ فقیر نے گاؤں کی اچھی منظر کشی کی خاص کر خط والا واقعہ۔ قہقہے پر اینڈ اچھا لگا۔ راشدہ رفعت کی بات ہی کیا ہے۔ نام تو نام ہی ہوتا ہے نصیبا" ہویا بھائی۔ فرحانہ ناز کی جگہ فرحین اظفر نے لے لی۔ اور مصباح علی کا "مفصیل دل" زبردست۔ کہاں سے تعریف شروع کروں بلکہ میں کہوں گی رسالہ منگوایا ہی ان کی وجہ سے پڑا۔ آپا نے تعریف ہی اتنی کی تھی کہ ایک منفرد انداز کی تحریر۔ واہ بھئی۔ ان کا کچھ پہلے ناول پڑھا تھا "قلب جنوں" یقین مانیں ابھی تک نہیں بھولا اور اب "مفصیل دل" مجھے تو بار بار لگ رہا تھا کہ اس کا ٹریجڈک اینڈ ہوگا ولی ڈوب ڈوب کے ابھرا کیا فلسفہ بھگارا "یاد تو اسے کیا جاتا ہے جو بھولنے لگیں" جملہ رٹ لیا میں نے اور کتنی بڑی گرہ کھولی کہ ہمیں کفار کی مشابہت سے بچنا چاہیے۔ خواہ نام ہو یا کام اور کیسی پیاری دلیل کہ اللہ کو اپنے بنائے تمدن سے بہت پیار ہے۔ جیسے ماں کو اپنے بچوں سے "اف زبردست۔ یقیناً" یادگار ناول جو پرچے پر چھایا رہا اور بہت عرصہ اثر رکھے گا۔ پلیز مصباح جی آپ لکھتی رہیں۔ ہم شدت سے منتظر رہیں گے اور پلیز نمو آپ بھی کرن کے قارئین کے لیے بھی نظر کرم کردیں۔ ہمیں آپ کی آمد کا انتظار ہے اور پلیز سائرہ رضا' مصباح علی' نمیرا حمید اور ام طیفور کو "مقابل ہے آئینہ" میں لائیں "یادوں کے دریچے سے" روبینہ شریف کی ڈائری سے "جنوری کی سرد راتیں" نمبر لے گئی۔

حجاب فاطمہ... واہ کینٹ

دھند سے چھائے بادلوں میں کرن کی آمد اور رضائی کی گرمائش میں دب کر پڑھنے کا الگ ہی لطف آگیا۔ واہ بھئی واہ۔ خط لکھنے کا تو اکثر دل چاہتا ہے' مگر میرے جیسا کاہل اور سست انسان جو ڈائجسٹ بھی دب کر بلکہ کروٹ لے کر پڑھے وہ کیسے تبصرہ کرے تمام الجھنے والے سوالات "نامے میرے نام" میں پڑھ کے پھس پھس ہنس لیتے ہیں یا پھر عش عش کر اٹھتے ہیں' لیکن آج مصباح علی کے ناول "مفصیل دل" نے مجھ جیسی کاہل کو بھی خط لکھنے پر مجبور کردیا۔ مبارک باد ان کا حق تھا۔ بائے چانس پہلا صفحہ وہی نکلا اور پھر شروع کیا تو جیسے ایک طلسم میں جکڑ گئے۔

لفظ سے لفظ جڑے' بات سے بات' اف خدایا کیا

لفاظ" کیا انداز، منظر کشی، حسین تشبیہ، شاعرانہ لہجہ اور پھر کہانی واہ بھئی واہ واقعی کتنی گرہیں خود بخود کھل گئیں اور پھر کتنا خوب کہ اولاد واقعی اولاد ہوتی ہے۔ ازکا بیگم پر پھر بھی اثر نہ کریں، اولاد کا خون واقعی اثر کر گیا اور ضد کیسے پیدا ہوتی ہے اور کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔

کتنے پہلو تھے سب سے منفرد اور پورے پرچے کی جان۔ بہت مبارک ہو مصباح جی "دریچہ محبت" شفق افتخار کا بہت اچھا مکمل ناول رہا۔ "اک ساگر ہے زندگی" نفیسہ صاحبہ کی بہترین کوشش زینب کا کردار تمام خواتین کے لیے ایک مثل بنا دیا ہے۔ ایسی سزا ہو جو اس کے پس منظر کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے دی جائے۔

افسانوں میں "اک نیا عہد" سب سے پہلے پڑھا بہت اچھا کیا بھئی سائرہ نے خوب اچھی سزا دی۔ سائرہ رضا کا "سوال" سب ماؤں کے سینوں میں دفن ہے۔ مستقل سلسلوں کی کہوں گی کہ بہت اچھی ترتیب مدد اسے ہے اور شاید مدد ار ہے۔ یہ رسالے کا حسن ہیں۔ آخر میں "رسالہ در معرفت ابن انشا" اس پر جو بھی لکھتا ہے خوب ہی لکھتا ہے یقیناً ان کی شخصیت ہی ایسی تھی۔ اب میں پھر سے رضائی میں غڑپ۔ مجھ جیسی سست کو جھنجھوڑنے کا شکریہ۔ سردی یہاں بہت ہے وہاں بھی ہوگی۔ تو کافی پیتے ہوئے یاد رکھیے گا۔

ثناء شہزاد... کراچی

جنوری کے شمارے نے 12 تاریخ کی اداس شام میں اپنی جھلک دکھائی اور اسے دیکھ کر موسم اور میرے اپنے اندر کی اداسی کہیں دور جا سوئی۔ ماڈل بہت پیاری لگی کیونکہ مجھے یہ دونوں بہنیں اچھی لگتی ہیں بمعہ نام کے ساتھ۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا جس میں سانحہ پشاور کا ذکر تھا جسے پڑھ کر دکھ پھر سے تازہ ہو گیا۔ حمد و نعت پڑھی۔ اس کے بعد سمیرا حسن سے ملاقات کی ان سے ملنا اچھا لگا۔ سروے کے حوالے سے سب کے جوابات اچھے تھے۔ سمیع خان میرے موسٹ فیورٹ

قارئین سے سروے

الحمدللہ "کرن" کی کامیابی کا ایک اور سال مکمل ہوا۔ کامیابی کے اس سفر میں ہماری معزز مصنفین اور قارئین بہنیں ہمارے ہم قدم ہیں۔ "کرن" کی سالگرہ کے اس پر مسرت موقع پر ہم اپنی قارئین بہنوں کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ آپ کو اس خوشی کے موقع پر اپنے ساتھ شریک کرنے کے لیے ایک خصوصی سروے کا اہتمام کیا ہے سروے کے سوالات درج ذیل ہیں۔

1۔ کچھ لوگ سالگرہ دھوم دھام سے مناتے ہیں، مگر کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سالگرہ کے موقع پر زندگی کا ایک سال کم ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس موقع پر خوشی کس بات کی۔ آپ کس خیال سے متفق ہیں؟ اور آپ اپنی سالگرہ کیسے مناتی ہیں؟

2۔ سالگرہ پر یا ویسے تحفہ ملنے کی تو سب ہی کو خوشی ہوتی ہے۔
مگر کیا کوئی ایسا تحفہ بھی ہے، جسے آپ کو دے کر خوشی ہوئی ہو؟ یہ تحفہ آپ نے کس کو دیا تھا؟

3۔ کیا آپ "کرن" میں کوئی تبدیلی چاہتی ہیں۔ اگر ہاں تو کس قسم کی؟

4۔ اس سال کرن میں چھپنے والی آپ کو سب سے پسندیدہ تحریر کون سی لگی اور کیوں لگی؟ اس کی مصنفہ کا نام بھی لکھیں۔

5۔ سالگرہ کی روایت کیک کے تصور کے بغیر ادھوری سی ہے۔ کسی اچھے سے کیک کی ترکیب لکھیں، جو آپ خود تیار کرتی ہوں۔

آپ بہنیں ان تمام سوالات کے جوابات اس طرح بھیجیں کہ وہ ہمیں 25 فروری تک موصول ہو جائیں۔

ایلٹر ہیں مران کا اصلی نام منصور خان مجھے کرن کے توسط سے پتا چلا "مقابل ہے آئینہ" میں پارس شاہ کے جواب بہت اچھے لگے اور پلیز مجھے اس سلسلے میں جگہ دیے بغیر یہ سلسلہ بند مت کیجیے گا۔ یہ میری درخواست ہے ابن انشا کے لیے خصوصی دعائے مغفرت کی اللہ پاک انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں۔ (آمین)۔

افسانے سارے اچھے تھے "پیار کی کلیاں" میں جنت کے شوہر کے روپ میں عباس کی جگہ بادل کو دیکھ کر اچھا لگا۔ ویسے تائی اماں نے ان دونوں کو جدا کرنے کے لیے خوب ذہن لڑایا مگر اللہ نے ان دونوں کو ملانا تھا سو مل گئے۔ سائرہ رضا صاحبہ نے پشاور میں جو سانحہ ہوا معصوم بچوں کے ساتھ۔ اسے بہت خوب صورت انداز میں قلم بند کیا ان ماؤں کا دکھ ہم محسوس کر سکتے ہیں جن کے جگر گوشے سفید یونیفارم میں اسکول گئے اور سرخ یونیفارم میں واپس آئے "ایک نیا عہد" بھی زبردست موضوع پر لکھی گئی کہانی تھی کیونکہ آج کل یہ ہی سب ہو رہا ہے اینڈ میں رائٹر نے جو پیغام دیا کاش حقیقی زندگی میں بھی ایسا ہونے لگے اور ہماری قوم کے ہونہار مستقبل کے معمار سدھر جائیں۔

"پپیا" اور "سحر ضوفشاں" بھی اچھے ٹاپک پر لکھے گئے افسانے تھے۔ ناولٹ میں "خالہ' سالہ اور اوپر والا" ابھی تک نہیں پڑھا کیونکہ مجھے ایک ساتھ پڑھنے میں مزا آتا ہے۔ "محبت تیرے کتنے رنگ" میں رسالوں کے بارے میں جو بات کی وہ سو فیصد درست ہے جو بات ہم ایک دوسرے کو نہیں سمجھا سکتے وہ کتابیں اور کہانیاں بڑی خاموشی سے ہمیں سمجھا دیتی ہیں 'فریحہ کی بے وقوفی پر شروع میں تو بہت ہنسی آئی مگر اسے بروقت عقل آگئی ورنہ وہ ساری زندگی اپنی پھپھو جیسی زندگی گزارتی ویسے مجھے عدن اور اس کے باپ کی نفسیات سمجھ نہیں آئی لیکن ہوتے ہیں ایسے بھی کچھ لوگ' راشدہ رفعت صاحبہ جب بھی لکھتی ہیں زبردست لکھتی ہیں۔ اس مہینے کی بیسٹ کہانی تھی۔ "ایسا بھی ہوتا ہے" ویلڈن رفعت جی مجھے اس کہانی میں نصیبن کا نام بہت اچھا لگا۔ نصیبن کا اپنے دادا کے لیے اتنا کیئرنگ ہونا اور خیر دین عرف خاور کا محبت بھرا انداز اچھا لگا۔ نصیبن کی بد حواسی اور ایکشن سے ڈرنا مجھے میری طرح لگا۔

مکمل ناول دو تھے مگر میں نے صرف "فصیل دل" پڑھا مصباح علی نے بہت اچھا لکھا کرداروں کے نام اچھے لگے۔ فرحین اظفر کا "ردائے وفا" ابھی تو بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے امید ہے اچھا چلے گا آخر میں وثیقہ زمرد کو پھپھو بننے پر مبارکباد اور شمع مسکان صاحبہ کا شکریہ میرا تبصرہ پسند کرنے پر۔

فوزیہ ثمروٹ۔۔۔ آمنہ میر۔۔۔ گجرات

جنوری کا کرن ہاتھ میں آتے منہ سے ماشاء اللہ نکلا۔ سال نو کا ٹائٹل بے حد شاندار لگا۔ عروہ عتیق مسکان لیے بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔

ہمیشہ کی طرح اداریہ اک نظر دیکھا قارئین کو نیا سال کی مبارک کہتے ہوئے عجیب سا لگا۔ کیا ہے نئے سال میں سوائے اک ہندسے کے بدلنے کے کچھ بھی تو نہیں۔

حمد باری تعالیٰ نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے دل و ذہن کو روشن شاد کیا۔ میلاد شریف کا بابرکت سینہ تھا۔ فضا خوشبو سے منور رہی۔ انٹرویو میں کوئی بھی متاثر نہ کر سکا۔ شاہین جی سے درخواست ہے شائستہ جبیں کا انٹرویو کریں نا۔

اس بار افسانے سب کے سب ہی اچھے اور کچھ نہ کچھ پیغام لیے ہوئے تھے۔ ایک "نیا عہد" ربیعہ نے اچھا سبق دیا۔ لڑکوں کی چھچھوری قسم کو جو دوسروں کی عزت کو عزت ہی نہیں سمجھتے۔ ہاں جب خود پہ ایسا موقع آتا ہے پھر عقل شریف ٹھکانے لگی ہیں ان و۔

"سوال" سائرہ رضا نے حالیہ حادثے کو بڑے خوب صورت طریقے سے بیان کیا جس کا جانی نقصان ہو وہ ایسے ہی وہمی اور اندیشوں کا شکار رہتا ہے۔ اللہ پاک سب کی مغفرت کرے۔ اور آئندہ ایسے ظلم سے بچائے ہم سب کو۔

"پیار کی کلیاں" بھی اچھا افسانہ تھا سال نو کے حوالے سے۔ لوگ پتا نہیں کیوں اپنی جھوٹی انا اور ضد کی تسکین کے لیے دوسروں کی زندگیاں برباد کردیتے ہیں۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ اپنے ہر عمل کا حساب کتاب بھی دینا ہے۔

مکمل ناول "فصیل دل" تحریر اچھی تھی۔ تطہیر شاہ کی جو شخصیت رائٹر نے بیان کی تھی۔ ایسے شخص کو کون اگنور کرسکتا ہے۔ ازکا بیگم ایک تو نام بھی مجھے پسند نہیں آیا۔ اور وہ سراجو ان کی فرعونیت دیکھی تھیں عجیب مردار قسم کی خاتون تھیں۔ وہ شوہر کو شوہر نہیں زر خرید غلام سمجھتی تھیں۔ اچھا ہوا جو اس کا غرور کا جھنڈا گرایا اور رائٹر کا یہ پیغام بھی اچھا تھا۔

ناولٹ مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ سلمیٰ حسین کا "محبت تیرے کتنے رنگ" اچھا ہوگا بلکہ بہت اچھا لگا۔ فریحہ کی سادگی دیکھ کر دل خوش ہوا۔ شجاع کا کردار بس دل آہیں بھرتا رہ گیا۔ فریحہ کو ڈھیروں دعائیں دے ڈالی ہیں۔ چل یار تو خوش ہوجا ساڈی خیر اے۔

"دریچہ محبت" کہانی اچھی لگی۔ مگر علینہ کا کیس سائیکو لگتا ہے۔ ہاں جی یہ برگر فیملیز کو اور کوئی کام جو نہیں ہوتا۔ آخری قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ پتا نہیں علینہ نے اب کیا پلان بنایا ہے دونوں ناول وقت کی کمی کے باعث پڑھ نہیں سکی۔ آئندہ ماہ دونوں اقساط پڑھ کر لکھوں گی۔

"سالا' خالا اور اوپر والا" شروع کیا ہوا چھوڑ دیا۔ ارے بھئی ہر سطر میں ہنسی کا فوارہ ہوتا ہے۔ اور آج کل میری ہنسی کا بلب فیوز ہوا ہوا ہے اس لیے چھوڑ دیا۔

"کرن کرن خوشبو" میں فریحہ شبیر کی کرن اچھی لگی۔

"یادوں کے دریچے میں" مسز نگہت غفار بڑے عرصے کے بعد یہ نام پڑھا۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" زبیدہ ریاض۔ نورین مسکان کا اچھا تھا۔

"مسکراتی کرنیں" میں زینب بہاول پور "ڈاؤننگ" اچھا لگا۔ بیویاں شوہروں کے کان ہی تو کھاتی رہتی ہیں باتوں سے۔ ان محترمہ نے ویسے چبا لیا۔ بات تو ایک ہی ہے نا۔

"کرن کا دسترخوان" اچھا تھا۔ "حسن و صحت" کی تو کیا ہی بات ہے۔

"نامے میرے نام" مجھے مدیرہ صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا ہے جو ہر ماہ میرے بونگیاں بھرے خط کو جگہ دیتی ہیں۔ میں بھی کیا کروں کرن ڈائجسٹ پڑھا۔ اور پھر خط نہ لکھوں یہ کیسے ہوسکتا۔ مجھے یہ بھی میری زندگی کا لازمی حصہ ہے۔

افشاں علی .... کراچی

ہم نے سوچا کہ کیوں نا کرن میں تھوڑی افشاں بکھیر دی جائے ہم نے سوچا کیوں نا نئے سال کی شروعات کے ساتھ ہی ہم بھی کرن میں جلوہ گیر ہوں۔

دھند میں لپٹی یخ بستہ جنوری کی شاموں میں کرن کا سال نو شمارہ ہمارے ہاتھوں کی زینت بنا۔ اداریہ پڑھ کر پھر سے سانحہ پشاور کے لیے آنکھ اشک بار ہوچلی۔

یہ سال تو ملک و قوم کے لیے امن و خوشحالی کا پیامبر بن کر آئے (آمین)

حمد و نعت سے روح و ذہن مثل مشعل تابناک ہوگئے سحر احسن سے ملاقات اچھی رہی تو وہیں سال نو مبارک کے حوالے سے مختلف مشہور شخصیات سے کیا گیا سروے بھی خوب رہا "فصیل دل" میں جب "دریچہ محبت" کھلا تو چاروں اور "سحر فسوں فشاں" پھیلا اور بے ساختہ کہہ اٹھے "محبت تیرے کتنے رنگ" "ایک ساگر ہے زندگی" جس میں "ایسا بھی ہوتا ہے" کہ کسی "سوال" پر روح "چپ" ہوجاتی ہے پرچونکہ نئے سال کی آمد ہے تو کیوں نا "ایک نیا عہد" کریں "ردائے وفا" کی راہ میں آؤ پیار کی کلیاں چن لیں ہم"۔

اب ہوجائے تھوڑا تفصیلی تبصرہ "نزہت جبین ضیا" جانا پہچانا نام اپنے افسانے کے ہمراہ نظر آئیں کانٹوں بھرے سفر پر چل کر 6 سال بعد نئے سال کی شروعات پر پیار کی کلیاں چن ہی گئیں۔ "سائرہ رضا" جن کا نام ہی کافی ہے اپنے افسانے سے ہمیں رلا گئیں

اب دل بہت نازک مزاج ہو چلا ہے "پشاور کے سانحے پر لکھی گئی حساس تحریر۔ ہم الفاظوں پر ہی رو پڑتے ہیں نا جانے یہ کون سنگ دل بے نام سے دہشت گرد ہیں جن کے پاس دل کے بجائے پتھر ہے۔ جن کی رگوں میں انسانیت نہیں ورندگی دوڑتی ہے۔ آگے بڑھے تو "راشدہ رفعت" اپنے مخصوص انداز میں اپنے ناولٹ کے ہمراہ موجود تھیں واقعی ایسا بھی ہوتا ہے نصیب کے آگے کس کی نہیں چلتی وقت سے پہلے اور نصیب سے زیادہ کچھ نہیں ملتا بہت اچھی تحریر رہی "ندا حسنین" کرن کی نئی رائٹر اپنے نام کی طرح منفرد تحریر کے ہمراہ حاضر تھیں جنھوں نے بالکل ٹھیک کہا انسان کو تب تک ظلم و زیادتی کا اندازہ نہیں ہوتا جب تک وہ خود ان حالات سے نہ گزرے جب تک یہ حالات اس پر آشکار نہ ہو ایک نیا عہد سال نو پر دیا جانے والا ایک اچھا پیغام ان لوگوں کے نام جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتے ہیں اور پھر جب وہ خود اس میں گرتے ہیں تب انہیں اپنی حرکت کا اندازہ و پشیمانی ہوتی ہے۔ "مصباح علی" کا لکھا گیا مکمل ناول سراہے جانے کے قابل بہت خوب صورت جملوں و ناموں کا استعمال نظر آیا زبردست۔ "محبت تیرے کتنے رنگ" سلمیٰ فقیر حسن کا پیار بھرا ناولٹ مسکراہٹیں بکھیر گیا "فرحین اظفر" آپ کے ناول کی دوسری قسط بھی اچھی رہی ابھی تو شروعات وفا ہے آگے روائے وفا بھی سمجھ آئی ہے۔ "فرحی نعیم" نے اپنے افسانے میں بجا فرمایا عورت اور پردہ لازم و ملزوم ہے تب ہی تو اسلام عورت کو پردے کا حکم دیتا ہے "سمیرا غزل" نے مختصریئے پر ایک اہم نقطہ اٹھایا اور اپنے خیالات کو زبان دی واقعی کچھ لوگ سچ سننے دیکھنے اور پڑھنے کی ہمت نہیں رکھتے ایسے لوگ بہت بزدل و بے حس ہوتے ہیں بحیثیت رائٹر ہمیں سماجی معاشرتی اخلاقی و مذہبی ہر موضوع پر لکھنے کا حق حاصل ہونا چاہیے بشرطیکہ ہم اس موضوع کی تفصیلی جان کاری رکھتے ہوں اور اس موضوع سے کسی کی عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچ رہی ہو ویل ڈن سمیرا۔

الغرض سال نو کے حوالے سے سجا جنوری کا کرن واقعی ہمارے دل و دماغ میں خوشگواری و خوشی کی کرن بن کر اترا۔

شکیلہ شہزادی..... ملکوال

میری طرف سے تمام قاری اور لکھاری بہنوں کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔ خدا سے یہ دعا ہے کہ یہ نیا سال ہمارے لیے اور ہمارے پاکستان کے لیے بہت سی خوشیاں لائے۔ جاتا دسمبر بہت سے دکھ جھولی میں ڈال کر گیا۔ بے شک یہ دکھ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مدھم ہو جائیں گے مگر یہ دکھ چاند کے نہ مٹنے والے داغ کی طرح ہمیشہ نمایاں رہیں گے۔ "اک ساگر ہے زندگی" نفیسہ سعید صاحبہ ناول کو بہت خوب صورتی سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ پلیز ہیروئن صاحبہ کا نام تو بتاویں ہمیں چھ ماہ ہو گئے ہیں ناول پڑھتے ہوئے مگر ہیروئن کا نام ہی پتا نہیں۔ اور ایشال کو جلدی ہی ہیروئن کا صاحبہ کا دیدار کروائیں۔ ہیں ہیروئن حبیبہ ہی تو نہیں؟۔ فرحین اظفر کا ناول پڑھا۔ پہلی قسط تو اچھی لگی۔ انس اور حدید دونوں بھائی ہیں یوں لگتا ہے جیسے سوہا اور ماہا دونوں بہنوں کی بارا تیں ایک ہی گھر میں اترے گئیں۔ سوہا کی تو اتر گئی اور ماہا کو یقیناً" حدید ہی چاہے گا۔ بہرحال ان شاءاللہ آگے ناول بہت دلچسپ ہو گا۔ کرن ڈائجسٹ کا کوئی شمارہ بھی ایسا نہیں جس سے کوئی سبق نہ ملا ہو۔ جب بھی پڑھا کوئی ایک سبق تو ضرور ملا۔ کرن ڈائجسٹ ایک مدرسہ ہے۔ جس سے ہر نوخیز ذہن مضبوط ہوا۔ ہر ماہ اپنی تاج میں ڈھیر سارا اضافہ کیا۔

باقی سلسلے ہمیشہ کی طرح بیسٹ تھے۔ اور پلیز نبیلہ اور نایاب تک میری ریکویسٹ پہنچادیں کہ مہربانی کریں کہ کرن کے لیے خوب صورت سے ناول لکھیں۔

ماہم علی..... اٹک

میں پچھلے چار سال سے کرن ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ مجھے بہت پسند ہے۔ سب رائٹر بہت اچھا اور بہتر لکھ رہی ہیں فرحانہ ناز کے موت کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ نایاب جیلانی اور شگفتہ بھٹی آج کل کدھر ہیں۔ فوزیہ ثمر آپ کے تبصرے بہت بہترین ہوتے ہیں۔